انجمن ترقی اردو پاکستان ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۰ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۶۷ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

ارجمند بانو قزلباش

ثاقبؔ لکھنوی

ثاقبؔ لکھنوی میرے نانا تھے[1]

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو بلند مرتبت اور مشہور و معروف شخصیتوں سے وابستہ کرنے پر خوشی محسوس کرتا ہے ۔ اور اگر کسی ایسی ہستی سے اس کا دور دراز کا تعلق بھی نکل آئے تو اس کا جا و بیجا تذکرہ کرتا رہتا ہے ۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو دنوں، مہینوں اور برسوں کا طول دیتا ہے اور اس کی حیات درخشاں سے خود اپنی شخصیت کو منور کرتا ہے ۔ میں اس قسم کی خواہش کو نہ کسی بری نظر سے دیکھتی ہوں اور نہ ہی اس میں احساس کمتری کی جھلک پاتی ہوں ۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آتا ہے ۔ میں آگرے میں پیدا ہوئی تھی، ہم لوگوں کا آبائی مکان محلہ گلاب خانے میں تھا اور جب میں گھر سے باہر نکلتی تو میرے بزرگ اکثر ایک بڑی سی حویلی کی جانب اشارہ کرکے بتاتے " یہ کالا محل ہے وہی عمارت جس میں مرزا غالبؔ پیدا ہوئے تھے " نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوتی تھی ۔ اگرچہ میں جانتی تھی کہ ماضی کی نسلوں کے ہجوم میں سے گزرتی ہوئی میں دور تک چلی جاؤں تو بھی مرزا غالب سے جوڑنے والے رشتوں کی کڑیاں تلاش کرنے میں ناکام رہوں گی ۔ پھر بھی جب " کالے محل " پر نظریں پڑتی تھیں تو ایک عجیب سی مسرت ہوتی تھی اور میں سوچتی تھی کہ اگر آج غالب زندہ ہوتے تو شاید وہ میرے ہمسائے ہوتے ۔ کیا عجب جب مرزا غالب باہر نکلتے ہوں تو ان کی نگاہیں ہمارے گھر پر پڑتی ہوں شاید وہ ہمارے گھر کو دیکھ کر اس انداز سے نہ سوچتے ہوں لیکن یہ کیا کم بات ہے کہ مرزا غالب میرے آباد اجداد کے ہمسائے تھے ۔ " کالے محل " اور میرے گھر نے ایک ہی جگہ، ایک ہی زمین پر کھڑے ہو کر برسوں کے قافلوں کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ میری سوچ کا یہ رُخ میرے لئے بہت دلفریب تھا ۔

اسی طرح بچپن میں مجھے ایک بار جواہرلال نہرو سے ایک منٹ بات کرنے کا موقع حاصل ہوا تھا تو

---

[1] اس شمارے میں حضرت ثاقبؔ کی یاد میں خصوصی مضامین شائع کئے جا رہے ہیں ۔ سرورق کی تصویر ثاقبؔ مرحوم کی پوتی محترمہ سبیل فاطمہ بیگم [illegible]

میں اس کو آج تک فخریہ بیان کرتی ہوں۔ اگر میں ان ہستیوں سے اس قدر دور دراز کے تعلق پیدا کر کے خوشی محسوس کر سکتی ہوں تو اپنے نانا ثاقب لکھنوی کے متعلق اظہار خیال کرنے میں تھوڑی سی مسرت حاصل کر لوں تو کیا برائی ہے ؟

میرے نانا مرزا ثاقب لکھنوی دور متاخرین کے صف اول کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ اور لکھنؤ کے مکتب خیال کے مشہور شعراء میں آپ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔ ان کے زمانے کے بعض نقادوں نے تو ان کو میر و غالب کا جانشین کہا ہے۔ لیکن ثاقب خوددار اور غیور ہونے کے ساتھ ساتھ منکسر المزاج بھی تھے جس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

جانشینی میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں وہ خدائے فن تھے ان سے مجھ کو نسبت کچھ نہیں

اس دور میں صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی ہی ان کے ہمعصر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کی حکومت کا وقار رفتہ رفتہ ہندوستان میں ختم ہو رہا تھا۔ اور ہندوستان کے باشندے آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لکھنؤ جو علم و ادب کا عرصہ دراز سے گہوارہ بنا ہوا تھا اور جہاں شاعری کسی مخصوص طبقے کا حصہ نہیں تھی بلکہ اس کی مٹی میں رچی ہوئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے عہد طفلی کی چند یادیں اس تاریخی شہر اور اپنے نانا ثاقب لکھنوی سے وابستہ ہیں۔ جب کبھی مجھے اپنے نانا کے گھر کا خیال آتا ہے تو میری نظروں کے سامنے ایک پورا معاشرہ آجاتا ہے۔ میرے نانا کا وہ وسیع اور لق و دق مکان جو "گلی در گلی" میں واقع تھا۔ جس میں دالان در دالان تھے۔ اور جس کے صدر کمرے میں میرے نانا بڑے سے تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ہمیشہ ایک فرشی حقہ رکھا ہوتا تھا۔ مرزا ثاقب کثیر الاولاد تھے اور ان کے گھر میں چھوٹے بڑے ملا کر تقریباً چودہ پندرہ افراد تھے۔ ایک طرف اس گھر کے آنگن میں چند بطخیں گھومتی پھرتی کائیں کائیں کرتی نظر آتیں تو دوسری طرف میرے نانا صاحب شعر و شاعری کے بے کراں سمندر میں غرق نظر آتے۔

مرزا ثاقب کی ولادت اکبر آباد میں ایک حویلی میں ہوئی تھی جو "کالے محل" سے متصل تھی۔ انھوں نے تعلیم کا اہم زمانہ بھی اسی شہر میں گزارا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ ثاقب لکھنوی ہی کہلائے۔ آخر ایسا کیوں تھا۔ بچپن میں تو مجھے کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا۔ لیکن جب میں بڑی ہوئی تو اپنے بزرگوں سے اکثر اس کی وجہ دریافت کرتی رہی لیکن کبھی کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا مختلف لوگوں نے مختلف کہانیاں سنائیں۔ میرے ایک بزرگ نے بتایا کہ آگرے میں ان کو کسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن عقائد کے اختلاف کی بنا پر اس لڑکی کے گھر والوں نے ان کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔ شاید اس بات کا

ان کو اتنا صدمہ ہوا کہ انھوں نے اکبرآباد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اور لکھنؤ جا بسے اور پھر تاحیات ثاقب لکھنوی ہی رہے۔

ان کو میں نے اگرچہ بہت چھوٹی عمر میں ہی دیکھا تھا، لیکن ان کا سراپا اب تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ وہ ایک میانہ قد دبلے پتلے انسان تھے لیکن ان میں بلا کی کشش تھی۔ ان کا رنگ بہت صاف اور خدوخال دلکش، ان کی آنکھوں میں عجیب جاذبیت تھی۔ لیکن ان کے بڑھاپے میں جب میں نے ان کو دیکھا تھا تو ان کی سفید ریش اور بھاری آواز نے ان میں رعب اور دبدبہ پیدا کر دیا تھا۔

سنتے ہیں کہ شاعر تھوڑا بہت تنک مزاج ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں تنک مزاجی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ بہت جلدی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ جاتے تھے۔ نافہم اور کم عقل لوگوں کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اپنے اشعار سنانے کے معاملے میں حد سے زیادہ محتاط واقع ہوئے تھے کم پڑھے لکھے لوگوں کو اشعار سنانے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے سے زیادہ کسی کو قابل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لوگوں کے گھر بہت کم جایا کرتے تھے اور مشاعروں میں بھی بہت کم شرکت کرتے تھے۔ وہ ایک بے حد خوددار اور غیور شخص تھے۔ ملازمت کے زمانے میں بھی انھوں نے خودداری کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ راجہ محمودآباد کے یہاں ملازمت کے دوران وہ مہینے میں ایک بار سے زیادہ نہیں جاتے تھے۔ اور راجہ صاحب ان کی اتنی عزت کرتے تھے کہ ان کی تنخواہ ہمیشہ گھر بیٹھے آجایا کرتی۔

میں ثاقب مرحوم کی قدر صرف اس لئے نہیں کرتی ہوں کہ وہ میرے نانا تھے اور بڑے اچھے شاعر بلکہ میں بحیثیت معلم کے ان کی عزت سب سے زیادہ کرتی ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں دو تین سال اپنے نانا کے گھر میں رہی ہوں۔ اور جب میں ان کو ایک معلم کی حیثیت سے یاد کرتی ہوں تو میری نظروں کے سامنے وہ تخت آجاتا ہے جو مستقل طور سے ان کی نشست گاہ بنا ہوا تھا اور جس پر میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کے سامنے تمام دن مودبانہ بیٹھی رہتی تھی۔ اور وہ بے حد ہمدردی اور جانفشانی سے ہم لوگوں کو درس دیتے رہتے۔ ان کے سامنے ایک فرشی حقہ رکھا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھ کو حقہ بھرنے کا حکم صادر ہوتا تو میں چلم لے کر خوشی خوشی باورچی خانے میں دوڑی جاتی کیونکہ اس طرح چند منٹ کے لئے پڑھائی سے چھٹی مل جاتی تھی۔ پڑھائی کے دوران میں ان کی حرکات و سکنات کو بڑے تجسس اور حیرت سے دیکھا کرتی تھی۔ مجھے اکثر وہ کبھی دوسری دنیا میں کھوئے ہوئے نظر آتے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی پرزہ ہوتا اور وہ کچھ گنگناتے۔ اور کبھی وہ

عجیب طرح ہاتھ ہلا ہلا کر زیرِ لب مسکرا دیتے، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ کبھی ان کی آواز مدھم ہو جاتی اور کبھی اتنی اونچی ہو جاتی کہ ہم لوگوں کو پڑھتے پڑھتے بے تحاشہ ہنسی آجاتی اور اس ہنسی کو ضبط کرنے کے لئے بڑی کوششیں کرنا پڑتیں۔ اور آج جب کہ میں ایک اسکول کی پرنسپل ہوں اور میرا مشغلہ صرف تعلیمی طریقوں کا جائزہ لینا اور بہتر سے بہتر طریقہ تعلیم کو عمل میں لانا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے نانا کے طریقۂ تعلیم کے سامنے بڑی بڑی ڈگریاں ہیچ تھیں۔ ان کا طریقہ تعلیم بظاہر بہت سادہ تھا لیکن وہ جو کچھ پڑھاتے وہ اس طرح ذہن نشین ہو جاتا تھا کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں کو کوئی مرتے دم تک بھی نہیں بھلا سکتا۔ اگرچہ وہ ایک بہت ہمدرد اور نرم دل انسان تھے۔ لیکن اچھی تعلیم اور تنظیم کی خاطر وہ انتہا سے زیادہ سخت دل بھی ہو جاتے تھے اور عجیب عجیب سزائیں بھی دیا کرتے تھے۔ انھیں دروغ گوئی سے شدید نفرت تھی۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے بڑے بھائی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ وہ اس وقت پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ایک روز وہ اسکول سے قدرے تاخیر سے واپس آئے۔ میری نانی کے دریافت کرنے پر انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ آج کسی دوسرے راستے سے آئے ہیں جو بہت لمبا ہے۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ میری نانی تو یہ سن کر خاموش ہو گئیں۔ لیکن قریب ہی میں میرے نانا صاحب خاموش کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انھوں نے فوراً شیروانی گلے میں ڈالی اور میرے بھائی کو ساتھ لے کر اسی وقت باہر نکل گئے۔ میرے بھائی کو کچھ نہیں معلوم وہ کہاں جا رہے تھے نہ ان میں اتنی جرأت تھی کہ ان سے کچھ دریافت کرتے، خاموشی سے ساتھ ہو لئے۔ نانا صاحب دو تین گھنٹے ان کو لکھنؤ کی سڑکوں پر (نخاس، حضرت گنج وغیرہ) پیدل چلاتے رہے اور پھر اسی اسکول کے آگے لا کر کھڑا کر دیا اور کہا "یہ بھی ایک راستہ ہے" جب میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے بے حد ہنسی آئی۔ ستاروں اور سیاروں سے روشناس کرنے کے لئے وہ اکثر میرے بھائی کو آدھی رات کو بستر سے اٹھا کر چھت پر لے جاتے۔ یہ بھی ان کے تعلیم دینے کا ایک طریقہ تھا جو وہ کبھی کبھی شاعرانہ موڈ کے تحت اختیار کرتے تھے۔ بظاہر ثاقب صاحب کی زندگی ایک کامیاب زندگی تھی۔ گھر میں ہر قسم کی آسودگی نظر آتی تھی۔ لیکن نہ معلوم کیوں میر تقی میرؔ اور فانیؔ بدایونی کی طرح ان کے ہر شعر سے یاس و حسرت اور مایوسی ٹپکتی تھی۔ ان کا ہر شعر کسی شدید غم کی ترجمانی کرتا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی اس غزل کا ہر شعر پڑھنے والوں کے دلوں پر نشتر کا کام کرتا ہے ؎

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقت دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں — اف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

ہوسکتا ہے ان کو اس دنیا میں کچھ لوگوں سے مایوسی ہوئی ہو ۔ اس لئے بے ساختہ ان کی زبان سے یہ اشعار نکل گئے ہوں ۔

مرزا ثاقب کو فارسی زبان سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ۔ ثاقب صاحب نے فارسی میں میرے شوہر کے والد کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا تھا جو ان کی اپنی تحریر میں اب تک محفوظ ہے ۔ اس کا عکس یہاں درج کیا جارہا ہے ۔

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات میرزا سلطان مرزا مرحوم رئیس آگرہ

آں سعیدِ ازلی میرزا سلطان مرزا — راحتِ روحِ جہاں، نورِ نگاہِ عالم
نیک اطوار و خوش اخلاق و حمیدہ اوصاف — آدمیّت ہمہ تن گشتہ ز سر تا بقدم
چوں سوئے شام شب سیزدہم از شعبان — رہروِ خلدِ بریں گشت ازیں دارِ الم
در فراقش ہمہ احباب و اعزہ کردند — سینہ و سر، دل و جاں وقفِ فغان و ماتم

بہرِ ضبطِ سنِ ایں حادثہ پُر شد ثاقب
سینہ از آبلہ و دل ز غم و دیدہ ز نم
۵۰   ۲۳   ۱۰۴   ۴۴   ۳۸   ۱۲۵
سنہ ۱۳۵۰ ہجری

ثاقب مرحوم نے سلطان مرزا صاحب کی تاریخ وفات اردو میں بھی نظم کی تھی ۔ فارسی تاریخ کی طرح یہ بھی غیر مطبوعہ ہے ۔ اس کے آخر میں میرے شوہر کے نام ایک خط بھی ہے ۔ ان نادر تحریروں کا عکس بھی پیش کیا جاتا ہے ۔

قطعۂ تاریخ رحلت

جہاں سے اٹھ گئے سلطان میرزا افسوس — نہ دل کو بھائی یہ کون و فساد کی محفل
بھری ہوئی تھی رگ و پے میں حُبِّ آلِ عبا — حقیقتہً تھے صفاتِ حمیدہ کے حامل
بجان و دل تھے عزادارِ سیدالشہدا — غمِ حسین کو سمجھے تھے زلیست کا حاصل
بوقتِ شام کہ تھی تیرھویں مہِ شعباں — جسد سے روح ہوئی جانبِ عدم مائل

یہ سالِ فوت ہے ثاقب زبانِ رضواں سے
مقیم خلدِ بریں میں ہے اب وہ صاحبدل

سنہ ۱۳۵۰ ہجری

عزیز القدر دعا۔ لیجئے حضرت یہ تاریخ اردو زبان میں کہکر بھیجی جاتی ہے مہربانی سے بواپسی ڈاک رسید سے مطلع کیجئے گا۔ میری طرف سے سب کی تسلیم پرسی کیجئے اور دعائیں کہدیجئے فقط الراقم میرزا ثاقب

ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی

محمد غوث زرّیں

اور ان سے منسوب نوطرزِ مرصع

"رسالہ نوائے ادب بمبئی میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ چونکہ یہ رسالہ آپ کے وہاں لوگوں کی نظر سے شاید ہی گزرتا ہو اور چونکہ یہ مضمون تحقیقی کام کرنے والے کے لئے مفید ہے، اس لئے آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ آپ اس کو قومی زبان میں شائع کر دیں۔"

نورالحسن ہاشمی

باغ و بہار (میر امن) کے دیباچہ میں مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے باغ و بہار اور نوطرزِ مرصع (تحسین) کا موازنہ اور مقابلہ کرتے ہوئے ایک اور نوطرزِ مرصع مصنفہ محمد عوض زرّیں کا حوالہ دیتے ہوئے یوں لکھا ہے :-

"ایک اور کتاب نوطرزِ مرصع کے نام سے محمد عوض زرّیں نے لکھی ہے۔ جس میں انھیں چار درویشوں کے قصے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے :

"اس خاک پائے درویشان حق بیں محمد عوض زرّیں نے قصۂ چہار درویش زبان فارسی میں ترتیب دیا اور عبارت شگفتہ سے گلدستۂ مجالس کیا۔ راجہ صاحب سراپا حلم و تمکین رام دین کہ اس عالی منش کے برادرِ بزرگ خداوندِ عدل و داد راجا سیتل پرشاد اور برادرِ میانہ فیاضِ زمانہ راجا بھوانی پرشاد ادام اللہ اقبالہم ہیں، اس نحیف کی تصنیف ملاحظہ فرماتے اور حظّ وافر اٹھاتے ایک روز فرمایا کہ اگر کلام زبانِ ہندی میں انتظام پائے سامع کو بہ سہولت سرور آئے۔ میں نے خوشنودی آقا کو بہبودی دنیا و عقبیٰ جان کر سررشتۂ ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبان اردو میں قلم بند کیا۔"

مولوی صاحب اس کے آگے لکھتے ہیں :-

"میر امن کی طرح زرّیں نے بھی اپنی کتاب کا سنہ تاریخ "باغ و بہار" سے نکالا ہے (۱۲۱۷ھ) اس میں قصے بہت مختصر کر دیئے ہیں، حالات وہی ہیں، ایک آدھ جگہ فارسی نسخے اور نوطرزِ مرصع سے خفیف سا اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ زرّیں کی نظر سے تحسین کی نوطرزِ مرصع گزری تھی یا نہیں، البتہ نام سے شبہ ہوتا ہے

کہ ضرور دیکھی ہوگی دیباچہ میں کتاب کے نام کا کہیں ذکر نہیں، ممکن ہے کہ مطبع والوں نے یہ نام (نوطرز مرصع) خود رکھ دیا ہو عجیب بات یہ ہے کہ اس نے بھی تاریخ "باغ و بہار" ہی سے نکالی ہے۔ اس سے میرامن کی "باغ و بہار" اور اس کتاب کی تالیف ایک ہی سنہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی عبارت سادہ ہے۔ تحسین کے نوطرز مرصع کی طرح رنگین اور تشبیہ و استعارہ سے مملو نہیں ہے، مگر عبارت اور رجان میں کوئی خاص لطف نہیں ایک بات اس کتاب میں یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ زرین نے اس قصے کو فارسی میں بھی لکھا تھا اور اس سے ظاہر ہے کہ اس قصے کو فارسی میں بھی کئی شخصیوں نے تالیف کیا ہے۔[۱]

تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے اس مطبوعہ نوطرز مرصع (زرین) کے آخر کا حصہ کیوں ملاحظہ نہیں فرمایا جس سے اس نسخے اور اس کے مصنف کے متعلق کئی غلطیاں اور غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔

پہلی غلطی تو یہی ہے کہ مصنف کا نام محمد غوث ہے نہ کہ محمد عوض، جیسا کہ نسخے کے آخر میں جو غلط نامہ دیا گیا ہے۔ اس میں مندرج ہے اور جس کی تصدیق زرین کے اس فارسی نسخے سے بھی ہوتی ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

یہ مطبوعہ نسخہ نوطرز مرصع (زرین) ۲۶ رمضان ۱۲۶۳ھ میں مطبع حسنی (لکھنؤ) میں حلیہ انطباع سے آراستہ ہوا تھا (سائز ۱۰½ × ۶½، صفحات ۵۲ سطر ۲۱ سطری) اس مطبوعہ ایڈیشن کے نسخے لکھنؤ میں صفی لائبریری، ندوہ لائبریری اور لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

اس مطبوعہ نسخے کے آخر میں جو سبب انطباع مرتب نے تحریر کیا ہے۔ اس سے کئی باتیں اور معلوم ہوتی ہیں۔ لکھا ہے:-

"ان سطروں کی تحریر کا یہ باعث ہے کہ قصہ چہار درویش موسوم نوطرز مرصع ایک کاتب کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ دوسرا نسخہ کہیں سے نہ پایا۔ مصنف نے تذکیر و تانیث میں فرق کیا اور کاتب نے غلطیوں سے بھر دیا۔ ناچار حسب فرمائش برادر صاحب قبلہ، قدرشناس سخن، خجستہ خصائل، سعید دارین، بہ رضوی مشہور، یعنی میر حسن ابن میر کامل عرف میر حسین مرحوم و مغفور اس ہیچ مداں، مسایۂ بے ہنری، سرفراز علی متخلص بہ جری ابن مرزا نوازش علی خاں مرحوم، کمترین تلامذۂ فتح الدولہ بخشی الملک محمد رضا خاں بہادر فتح جنگ متخلص بہ برق نے فرصت قلیل میں بہ نظر اجمال موافق محاورۂ حال درست کیا۔ جو سخن ور شناس و نکتہ فہم نسخۂ قلمی اور نسخۂ مطبوعہ کو ملاحظہ فرمائیں گے، فرق بین پائیں گے۔ مگر ان کی خدمت بابرکت میں عرض یہ ہے کہ جس جگہ سہو و خطا ملاحظہ فرمائیں۔ دامان عطا سے چھپائیں۔"

{اس عبارت کے بعد جدول اغلاط دی گئی ہے جس میں صفحہ ۲ کی سطر تین محمد عوض نام کی تصحیح محمد غوث سے کی گئی ہے}

---

[۱] اس عبارت کے بعد متن میں مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں جن میں مادہ تاریخ بھی ہے:

"الٰہی رہے وہ سدا کامیاب	کہ جس کی بدولت بنی یہ کتاب
جوان و جواں بخت و روشن جبیں	گرامی منش راجہ رام دین!
ہوئی اس کی خواہش کہ یہ داستان	عبارات رنگین سے ہو گلستان
بنا کر یہ گلدستہ روزگار	لکھی اس کی تاریخ جو باغ و بہار"

آئیں " سبب انطباع " سے معلوم ہوئیں وہ یہ ہیں کہ :-

۱ - دراصل اس کا نام " قصۂ چہار درویش " ہے نہ کہ " نوطرز مرصع "

۲ - اسے محمد غوث زرّیں نے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء یعنی ابتدائے عہد سعادت علی خاں نواب لکھنؤ کے زمانے میں تحریر
سا تھا -

۳ - ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء یعنی عہد واجد علی شاہ میں سرفراز علی جری شاگرد برق لکھنوی نے اس کے محاورے اور
رو تانیث اپنے زمانے کے مطابق درست کرکے اسے مطبع حسنی سے شائع کروا دیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ انہیں
انے محاوروں اور پرانے طریقۂ تذکیر و تانیث کو برقرار رکھتے تو اس سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ شروع انیسویں صدی میں لکھنوی نثر ی
ن کیا تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محمد غوث صاحب کون تھے اور جن لوگوں کے لئے انہوں نے یہ قصہ چار درویش لکھا وہ کون تھے ؟
شلاً راجہ الہدین، راجہ سیتل پرشاد اور راجہ بھوانی پرشاد تو یہ سب باتیں ان کے اس دیباچے سے واضح ہو جاتی ہیں
انہوں نے اپنے فارسی قصہ چہار درویش کے شروع میں لکھا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محمد غوث زرّیں قصبہ بجنور
لکھنؤ کی تحصیل میں لکھنؤ سے جنوب کی طرف صرف سات آٹھ میل دور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے
۱۱ھ مطابق ۱۷۸۴ء یعنی عہد آصف الدولہ میں چہار درویش کے قصے کو مختصر کرکے فارسی میں لکھا تھا۔ یہ اس زمانے میں
رام دین چکلہ دار بیسواڑہ (چند اضلاع اودھ) کے ملازم تھے اور چونکہ راجہ صاحب موصوف مع اپنے دونوں مقتدر بھائیوں
راپنے مقتدر والد لالہ ٹھاکر داس کے چار مقتدر افراد ہو گئے تھے۔ اسلئے زرّیں نے یہ قصہ چہار درویش اپنی ادبی کار دانی دکھانے
لئے منتخب کیا اور پھر انہیں کی فرمائش پر اٹھارہ سال بعد اسے اردو میں منتقل کیا، فارسی قصہ چہار درویش کے دیباچے کی اصلی
بارت یوں ہے ۔

" حمدِ قادرے کہ درویشانِ ظاہر پریشان را بہ جمعیتِ باطن غنی ، تمراز شاہانِ عظیم الشان گردانیدہ و فرماں
روایانِ اورنگ نشیں را بہ دعائے خرقہ پوشانِ گوشہ گزیں بہ سر منزلِ مقصود رسانیدہ "

زقدرت کند قادر پاک ما گدا را شہنشاہ و شہہ را گدا

پس از نعمت سرورے کہ برائے تیرہ درونانِ خلاف آئیں از نور یقیں شمعے بر راہ دینِ مبیں افروختہ و در دفتر
ایام بہ سرگرمیٔ اسلام سر رشتۂ کفر و ظلام تمام سوختہ :-

شب و روز بر روئے او درود و سلام کہ کرد راست ایں نسخۂ دیں تمام

پوشیدہ مباد کہ محمد غوث زرّیں ساکن قصبۂ بجنور شگفتہ زمین است و حاشیہ نشین بزم ارم تزئین لالہ
رام دین، آں کہ از حضورِ آصف نظر نواب آصف الدولہ بہادر بہ انتظام چکلہ بیسواڑہ نامور و سرفراز است و

با ایں جاہ و حشم و اقبال ابد توام سرِ نیاز بہ درگاہ کریم کارساز۔ پدرش سراپا مروت و اخلاص لالہ ٹھاکر داس با حشمت و جاہ بہ علاقۂ محالات شاہزادہ کرس نیک نامی می نوازد و بہ حسن نیت سرمایۂ دنیا و آخرت ذخیرہ می سازد، و برادرِ بزرگش صاحب حکم و ارشاد لالہ سیتل پرشاد در سرکارِ جنیسر آباد یا فوج وسپاہ بلا اشتباہ نظم و نسقِ نادر شاہ دارد، مانند رستم و اسفندیار دمار ازیں مردان معرکۂ روزگار می پردازد، برادر میانہ اش خداوند عدل و داد لالہ بھوانی پرشاد مقرب و مشیر نواب امیر الدولہ بہادر نائب وزیر است و از غایت سخاوت و کرم خوے حاتم منظور نظر میر و فقیر:

الٰہی بود تا جہاں برقرار
بہ اقبال باشند ایں ہر چہار

قصۂ چہار درویش کہ ازیں پیش یکے از رقم پردازانِ خوش تقریر بہ زنجیرِ تحریر درآوردہ بود روزے آں صدر نشینِ چار بالش حلم و تمکین با ندمائے صاحب سخن درآں چار چمن سیر می کرد، چوں بہ طوالتِ کلام خار و خس تمام داشت پیرایش آں بہ اہتمام طبع و سہام گزاشت، الحمد للہ آں گل زمین بہ نو بادہ ہائے شگفتہ و مضامین از سرِ نو شادابی گرفت و ریاض آں رنگین بیاض چنانچہ باید بہ تازگی عبارت نظارت پذیرفت۔

چو انشا کردم از رنگیں عبارت — حدیث دل کشائے چار درویش
دلِ من سال فرّخ فال او گفت — مبارک قصہ ہائے چار درویش

آفرینندہ دریا و سحاب نہالِ اقبال آں فیض مآب کہ بہ آبیاری ایں کہنہ باغ تازگی بخش دل و دماغ گشت سرسبز و ریان دارد و در سایۂ دولت آں بلند احتشام مرا ہم جمعیت و آرام نصیب گرداناد۔

لہ۔ اس نسخے کے آخر میں ترقیمے کی عبارت یہ ہے:۔

"بہ عنوان الٰہی قصۂ چہار درویش تصنیف محمد عوض تبارخ بست و ششم ماہ دسمبر ۱۸۲۸ء مطابق بستم ماہ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ موافق ہفتم ماہ پھوس ۱۲۳۶ ۱۸۸۵ یوم یکشنبہ بہ خط بے ربط احقر العباد کشن لال دھوسر ولد رام بخش ساکن اکبر آباد باغ رام سہائے ..... صورتِ اتمام و ترکیب اختتام یافت۔

زرّیں کے ان ہر دو نسخہ ہائے فارسی و اردو کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زرّیں نے فارسی میں قصّہ اگرچہ فارسی کے نسخوں کے مقابلے میں مختصر کر کے لکھا تھا لیکن اُردو میں تو اور زیادہ مختصر کر دیا ہے۔ یعنی جتنے صفحات میں فارسی لکھا تھا اس کے تقریباً نصف صفحات میں اُردو میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ فارسی میں تو اکثر جگہ ادبیت کی چاشنی اور بیانی نظر آتی ہے۔ اردو میں تو بالکل سپاٹ انداز میں لکھا ہے گویا صرف قصّوں کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ قصّے کی ابتدا از ہی ہر دو میں ملاحظہ فرمائیے :-

" میر فیانِ دار العیارِ سخن دانی و جوہریانِ رستۂ بازارِ معانی گوہر تقریر را چنیں بہ رشتۂ تحریر کشیدہ اند کہ در زمانِ قدیم بادشاہے بود واجب التعظیم، صاحب احتشام، آزاد بخت نام، در اقصائے روم بہ شہر قسطنطنیہ مستقر۔ سلطنت داشت و بہ عالم علم نیک نامی می افراشت۔ اوقات بہ عبادت می گزرانید و بہجت بہ اہلِ حاجت می رسانید۔ رعیت پرور، عدل گستر۔ حاتم زماں، سلیمان ساماں، با ایں ہمہ اقبال آں دریا نوال فرزندے نہ داشت و تخم ملال در مزرع حال می کاشت۔

دلش پُر زخون دیدہ اش اشکبار   کہ بخشد خدا لولوے شاہوار

روزے آئینہ معائنہ می کرد، در محاسن موے سفید دید۔ از زندگی نا امید گردید و گفت۔

من از ہستی خود بریدم امید   کہ پیک اجل ہست موئے سفید
دریغا نہ آسودہ یک دم بہ کام   رسانید از مرگ عمرم پیام"

اسی عبارت کو اردو میں دیکھئے کس قدر مختصر اور سپاٹ کر دیا ہے :-

" سرزمین ولایت روم میں ایک بادشاہ (تھا) عادل، دریا دل۔ صاحب تاج و تخت، نام آزاد بخت اس کی عمر پچاس کے قریب مگر اولاد سے بے نصیب، ایک روز آئینہ روبرو تھا۔ بال سفید نظر آیا۔ فرمایا بے اولاد زندگی بے مزہ ہے اور دنیا دو روزہ ہے۔ گوشہ لیجئے اور عبادت کیجئے۔ ابیات:

نکلنے لگے بال میرے سفید   رہی اب کسے زندگی کی امید
اگر سو برس تک رہے جان و تن   پھر آخر وہی گور ہے اور کفن

جہاں تک درویشوں کی کہانیوں کی ترتیب کا تعلق ہے اس میں باغ و بہار (میر امن) اور نو طرز مرصع (تحسین) کی کہانیوں سے مختلف ہے۔ زرّیں کے یہاں فارسی اور اردو دونوں میں دوسرے درویش کی کہانی وہ ہے جو (امن) اور تحسین کی کتابوں میں تیسرے درویش میں بیان کی گئی ہے۔ بعض اور جزئیات میں بھی فرق ہے (جس کے لئے دیکھئے "اردو کی نثری داستانیں" از ڈاکٹر گیان چند جین صفحہ ۱۵۴ - ۱۵۷) اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زرّیں کے سامنے فارسی قصّہ چہار درویش کا کوئی ایسا نسخہ تھا جو میر امن اور تحسین کے سامنے نہ تھا۔

خلاصہ اس تمام تحریر کا یہ ہے کہ محمد غوث (نہ کہ محمد عوض) زرّیں قصبہ کجنور ضلع لکھنؤ کے رہنے والے آصف الدولہ کے زمانے میں ایک صاحب تھے جو فارسی انشا پردازی میں خاصا دخل رکھتے تھے اور فارسی نیز اردو میں شاعری بھی کر لیتے تھے (لیکن ایسے معروف یا مشہور نہیں تھے کہ کسی تذکرے میں ان کا ذکر لایا جا سکتا) اس عہد کے ایک رئیس ہنڈ گھرانے میں ملازمت رکھتے تھے۔ اپنے آقا راجا رام دین کی تفریح طبع کے لئے انہوں نے فارسی قصۂ چہار درویش کو جو بہت طویل تھا مختصر کر کے فارسی میں ۱۱۹۸ میں لکھا۔ ۱۲۱۷ھ میں پھر اپنے آقا کی ایما سے اسے اردو میں زیادہ مختصر کر کے منتقل کیا، اس اردو قصہ چہار درویش کو کسی کاتب نے اپنے لئے قلم بند کیا اور غلطی سے اس پر عنوان بجائے "قصہ چہار درویش" دینے کے "نوطرزِ مرصّع" لکھ دیا۔ (غالباً اسے تحسین کا قصہ چہار درویش فرض کر کے) یہ نسخہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۸ء) میں لکھنؤ کے ایک شاعر سرفراز علی جرّیؔ شاگرد محمد رضا خاں برقؔ کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کے محاورات کو اپنے زمانے کے محاوروں کے انداز پر درست کر کے اسے "نوطرزِ مرصّع" ہی کے نام سے چھپوا دیا حالانکہ مصنّف نے کہیں متن میں اس کا یہ نام نہیں لکھا تھا اور نہ اس کے اندازِ بیان ہی میں کوئی ایسی بات ہے جسے "نوطرز" یا "مرصّع" کہا جا سکے۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اس کو جانچے بغیر اسی طرح اس کا تعارف اپنے دیباچۂ باغ و بہار (میر امّن) میں کرا دیا اور غلطیاں اسی طرح باقی رہیں۔ وہ غلطیاں یہ ہیں کہ مصنّف کا نام محمد غوث ہے۔ محمد عوض نہیں، اس کی تصنیف کا اصلی نام قصۂ چہار درویش ہے۔ نوطرز مرصع نہیں۔ اور یہ کہ یہ محمد غوث زرّیں لکھنؤ کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کی نثاری کو لکھنؤ کے نثری ادب میں شمار کرنا چاہیے۔

مالک رام

اردو میں تحقیق[1]

میرے آج کے خطبے کا عنوان ہے : اردو میں تحقیق

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادّہ ہے : ح ق ق ۔ جس کے معنی ہیں، کھرے کھوٹے کی چھان بین یا
ں بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے علم و ادب میں، کھرے کو کھوٹے
ے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ملیا۔

دیانتداری سے دیکھا جائے تو اردو کی پرانی روایت میں تحقیق کی کوئی مثال نہیں ملتی؛ مل بھی نہیں سکتی تھی
ج تک ہماری تہذیب کے بازار میں بعض بندھے ٹکے سکّے رائج رہے ہیں : خطا بر بزرگان گرفتن خطا ست، یعنی
زرگوں کی غلطیاں نکالنا ٹھیک نہیں، ہمارا اصولِ حیات رہا ہے۔ جہاں سوچنے کا یہ انداز ہو اور اس طرح کی
تیں بچپن سے انسان کے کان میں پڑتی رہی ہوں، اگر وہ بڑا ہو کر سب کو کلمۂ خیر سے یاد کرے، اور کسی کے
لاف بھلی بُری سننے سے انکار کر دے، تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ تحقیق، کا مقصد ہی ٹھہرا کھرے
ھوٹے کی پہچان؛ اور ہماری تہذیب کہتی ہے کہ سب کھرے ہیں، کوئی کھوٹا ہے ہی نہیں، تو ظاہر ہے، اس پر کوئی
ہوں دھیان دیتا! یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی کا یہ شعبہ آج تک بے توجہی کا شکار رہا ہے۔

شروع میں تصنیف کا ایک میدان ایسا تھا، جس میں مصنف اگر چاہتا، تو کچھ تحقیق سے کام لے سکتا تھا۔
یری مراد "تذکرہ نویسی" سے ہے۔ لیکن یہ تذکرے دراصل بیاضوں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ اوائل کے جو تذکرے
ستبردِ زمانہ سے بچ گئے اور خوش قسمتی سے دستیاب ہو گئے ہیں، ان پر لفظ تذکرے کا کم اور بیاض کا زیادہ اطلاق

---

[1] اکتوبر ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتے میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی جناب مالک رام نے اس کے شعبۂ اردو کی
صدارت کی تھی۔ یہ مقالہ ان کا خطبۂ صدارت ہے (مدیر)

ہوتا ہے ۔ اس وقت ہمارے پاس سب سے پُرانے تذکرے میر کا نکاتِ الشعرا ، حمید کا گلشنِ گفتار اور افضل بیگ قاقشال کا تحفۃ الشعرا ہیں ۔ یہ تینوں ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں تالیف ہوئے ۔ گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں اور قائمؔ کا مخزنِ نکات اِن سے متصل مابعد ۱۱۶۸/ ۱۷۵۵ء میں مرتب ہوئے اور ان کے بعد بیسیوں اور تذکرے لکھے گئے ان سب کی صورت یکساں ہے ـــــ ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کی زبان فارسی ، حالات بہت کم ، بعض اوقات صرف شاعر کا نام ، یا ایک آدھ سطر اور سہی ، اور اس کے بعد کلام کا انتخاب ۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ یہ نقائص زیادہ تر اوائل کے تذکروں میں ہیں ۔ جوں جوں تذکرہ نویسی کے فن میں ترقی ہوتی گئی ، اور بعد کے آنے والوں کے سامنے پہلے کی مثالیں آنے لگیں ، انھوں نے حالات جمع کرنے کا زیادہ التزام کیا ۔ بہرحال اپنی تمام خامیوں کے باوجود ان تذکروں کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ، اگر یہ نہ ہوتے ، تو جتنے حالات ہمیں آج معلوم ہیں ، یہ بھی ضائع ہوگئے ہوتے ۔

نکات الشعرا کی تالیف (۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء) کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال کے طویل زمانے میں کم و بیش ۵۰ ۔ ۶۰ تذکرے لکھے گئے ۔ جب ہم ان کا ان کے محلِ ترتیب و تالیف کے پہلو سے جائزہ لیتے ہیں ، تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تذکرے دلّی میں یا اس کے گرد و نواح میں مرتب ہوئے یا کم از کم لکھنے والے دلّی ہی کے تھے اگرچہ انھوں نے انھیں لکھا کہیں اور جگہ ۔ اس کے بعد دکن کا نمبر آتا ہے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ لکھنوی مؤلفوں نے اس بارے میں کوئی خاص دلچسپی یا سرگرمی نہیں دکھائی ۔ گنتی کے پانچ چار تذکرے وہاں لکھے گئے ، اور ان میں بھی ایک سعادت خاں ناصر کے خوش معرکۂ زیبا (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) کے علاوہ اور کوئی قابلِ لحاظ نہیں ۔

اب تک شعرا کی سیرت اور حالات پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی تھی ۔ ہاں ، اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک مؤلف نے کم از کم اپنے معاصرین کے حالات کسی حد تک زیادہ تفصیل سے دے دیے ہیں ، خاص طور پر اگر کسی شاعر سے ان کی دوستی یا تعلقات خوشگوار تھے ، نیز اپنے مقامی شعرا سے زیادہ اعتنا کیا ہے ۔ کہیں کہیں باہمی چشمکوں اور چپقلشوں کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں ، جس سے ادبی تاریخ کے لئے بھی کچھ مواد مہیا ہوگیا ہے ۔

یہ صورتِ حال ۱۸۸۰ء تک قائم رہی ، جب مولانا محمد حسین آزادؔ (ف ۱۹۱۰ء) کا تذکرہ آبِ حیات پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوا (وکٹوریہ پریس ، لاہور) ۔ آزادؔ نے اپنے پیشرووں کی متعدد کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے حتی الوسع شعرا کے حالات پوری تفصیل سے درج کئے ، ان کے کلام پر تبصرہ کیا ، تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی بھی کوشش کی ۔ متعدد نقادوں نے آبِ حیات کے نقائص دکھلانے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً یہ کہ آزادؔ نے تاریخی واقعات کے بیان میں غلطیاں کی ہیں ، انھوں نے جنبہ داری کے باعث بعض شعرا کو ناحق دوسروں پر فوقیت دی ہے ، بعض مشہور شعرا کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے وغیرہ ۔ یہ سب الزامات

ت ہیں ۔ اس کے باوجود اس سے آبِ حیات کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہو جاتی بے شبہ، یہ اردو کا پہلا تذکرہ
، جس میں کچھ تحقیق سے کام لیا گیا ہے، بلکہ کسی حد تک اردو زبان کی تاریخ بھی پہلی مرتبہ اسی کتاب میں
گئی ہے ۔ اس کتاب کا مواد جمع کرنے میں انھیں بہت دن لگے ہوں گے، اور اس میں انھیں بہت مشکلات
امنا کرنا پڑا ہوگا ۔ ہمارا حق ہے کہ آزاد کی سہل انگاری پر نکتہ چینی کریں، ان کی ناانصافی اور کج بینی کے
ـ احتجاج کریں، ان کی افسانہ طرازیوں اور حق گوئی سے انحراف پر غم و غصہ کا اظہار کریں، لیکن یہ نہیں
چاہیئے کہ ہم اس سے آبِ حیات کی اس اہمیت کو بھی نظر انداز کر دیں، جس کا یہ جائز طور پر مستحق ہے ۔

اردو کی تاریخ میں سب سے پہلی اہم اور انگریزی محاورے میں دیو قامت شخصیت، سراج الدین علی خاں
رو (ف جنوری ١٧٥٦ء) کی ہے ۔ خان آرزو عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے، اور ان کی تحریروں سے
، ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کچھ سنسکرت بھی جانتے ہوں ۔ جس شخص کے فیضِ تربیت نے اردو کو میر (ف ١٨١٠ء)
سودا (ف ١٧٨١ء) کے سے شاعر دیے ہوں، اس کی عظمت اور بزرگی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس عہد
ئ اور اساتذہ مثلاً شاہ مبارک آبرو (ف ١٧٣٣ء)، شرف الدین مضمون (ف ١٧٤١ - ١٧٤٢ء)، انندرام مخلص
١٧٥٠ء)، غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ وغیرہ خان آرزو کے شاگرد ہیں ۔ خواجہ میر درد (ف ١٧٨٥ء) اور مظہر جانجاناں
١٧٨١ء) نے بھی ان سے فیض پایا ۔ حسین قلی خاں عاشقی نے نشترِ عشق (تالیف ١٨١٨ء) میں لکھا ہے کہ سودا پہلے
ـ فارسی میں کہتے اور اس میں آرزو سے مشورہ کرتے تھے ۔ آرزو نے ان سے کہا کہ فارسی تمہارے لیے اجنبی زبان
، تم لاکھ زور مارو، اس میں اتنا کمال پیدا نہیں کر سکتے کہ اہلِ زبان تمھیں مان لیں ۔ پھر اس میں وقت ضائع کرنے
ـ حاصل؟ اپنی مادری زبان میں کہو کہ اس میں ترقی اور کامیابی کی بہت گنجائش ہے ۔ اس پر سودا نے اردو میں
ا شروع کیا ۔

تحقیق کے میدان میں خان آرزو کی توجہ زیادہ تر لغات پر رہی ۔ ان کی نوادر الالفاظ یعنی تصحیح غرائب اللغات
دی، مطبوعہ موجود ہے ۔ غرائب اللغات عبدالواسع ہانسوی کی تالیف ہے ۔ خان آرزو نے اس کے اغلاط کی نشاندہی
ہے ۔ ان کی یہ کتاب بجا طور پر اردو کا ابتدائی لغات کہی جا سکتی ہے، اور اس کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے ۔

خان آرزو کے بعد کوئی سو سال تک اردو دنیا میں سناٹا رہا ۔ اس دور میں لوگوں کی توجہ زیادہ تر شعر اور
نثر کی طرف رہی، جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں ۔ تحقیق کی سب سے پہلی مثال مولانا الطاف حسین حالی (ف
مبر ١٩١٤ء) نے پیش کی ۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں: حیاتِ سعدی (١٨٨٢ء)، یادگارِ غالب (١٨٩٧ء) اور
سید احمد خاں کے حالات میں حیاتِ جاوید (١٩٠١ء) ان میں تحقیقی پہلو سے حیاتِ سعدی کا درجہ سب سے افضل ہے
کتاب پہلی مرتبہ ١٨٨٢ء میں شائع ہوئی تھی ۔ پچھلے ٨٥ برس میں کئی نئے مآخذ دریافت ہوئے، فکر و نظر کے زاویے

تک بدل گئے، لیکن حیاتِ سعدی میں حالی جو کچھ لکھ گئے ہیں، اس پر اضافہ نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یادگارِ غالب کو لیجئے، جسے انھوں نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں حیاتِ سعدی کے برابر کاوش نہیں کی گئی۔ اس کے دو سبب خیال میں آتے ہیں۔ شاید مصنّف کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ مرزا مرحوم کے ملنے والے اور دیکھنے والے موجود ہیں، وہ اُن کے بیشتر حالات جانتے ہی ہیں، اس لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بعض اہم اور نمایاں واقعات سے تجاوز نہیں کیا؛ اور زیادہ توجہ مرزا کے اردو فارسی کلامِ نظم و نثر کی خوبیاں اُجاگر کرنے پر مبذول کر دی کہ اُن کے خیال میں یہی اُن کی عظمت اور عزت کی یادگار تھی، جس کی بدولت ان کا نام صفحۂ ہستی پر زندہ رہنے والا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے کلام کی بلندی کا اصلی احساس یادگارِ غالب ہی نے دلایا۔ اسی بنیاد پر بعد کے شارحین نے وہ قصرِ فلک بوس تعمیر کیے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ اس سے سوانح عمری کا حصہ ضرور تشنہ رہ گیا۔ حالی خود غالب کے شاگرد تھے۔ انھیں اکثر ملاقات کے مواقع پیش آئے، بعض کا ذکر اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ اگر وہ چاہتے، تو اُن سے تفصیلی حالات معلوم کر سکتے تھے، لیکن شاید مرزا کی زندگی میں انھیں یہ خیال نہیں آیا کہ کسی دن مجھے یہ کتاب لکھنا پڑے گی اسی لیے انھوں نے استاد سے زیادہ کرید کر کے کچھ نہیں پوچھا۔

ایک دوسری وجہ بھی خیال میں آتی ہے۔ آج ہم مغربی تعلیم کے اثر کے تحت صاحبِ ترجمہ کے حالات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اور جزو کو جو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ حالی کے زمانے میں مسلّمہ نہیں تھی؛ اس لیے اگر اس صنف کی کچھ باتیں اُن کے علم میں تھیں بھی، تو عین ممکن ہے کہ انھوں نے انھیں غیر ضروری خیال کر کے نظر انداز کر دیا ہو۔ اس خیال کو تقویت خود اُن کی اپنی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> "ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اُس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے، اُس کی خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اُس کے عالی خیالات کے ساتھ اُس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنّفوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے، اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں، اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔"

یہاں جن "دو ایک مصنفوں" کی طرف اشارہ ہے۔ وہ سعدی اور غالب ہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ
ید ان کے علم میں کچھ اور واقعات بھی ہوں، لیکن چونکہ ان سے ان کے خیال میں غالب کے "پھوڑوں کو
یس" لگنے کا اندیشہ تھا، اس لیے وہ انھیں عمداً نظر انداز کر گئے۔ اسی وجہ سے یادگارِ غالب کے سوانحی حصے میں
نچے رہ گئے ہیں اور چونکہ اب کسی اور کو وہ مواقع میسر نہیں آ سکتے، جو حالی کو حاصل تھے۔ اس لئے ان کا پُر کرنا
، بظاہر محال نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا کہ یادگارِ غالب اپنے مقصد میں ناکام رہی
ں نے اس تصنیف کا مقصد یہ قرار دیا تھا۔

"اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب
غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے، جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی
فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایہ میں،
کبھی ظرافت و بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند
مشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوف اور حُبِ اہلبیت کی
صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے
علاقہ نہیں رکھتا، اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا
چاہیئے۔" (دیباچۂ یادگارِ غالب)

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سوانح حیات کو زیادہ اہمیت نہیں دی، بلکہ ان واقعات کو وہ "ضمنی اور
ستطرادی" حیثیت دیتے ہیں۔ ان کا اصلی مقصد مرزا کی شاعری اور انشا پردازی کی خوبیوں کا نمایاں کرنا
تھا۔ پس ہمیں اس کتاب کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

حیاتِ جاوید، سر سید کی سوانح عمری ہے۔ اگرچہ یہ کتاب انھوں نے سر سید کی حیات میں لکھنا شروع
ردی تھی، لیکن اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ اپنی زندگی میں سر سید کی ذات مدتوں ملک
بھر کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی رہی تھی۔ ناممکن تھا کہ اس کے اثرات حیاتِ جاوید
ک نہ پہنچتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو ایک صاحب نے اسے "کذب و افترا کا آئینہ" اور
مدلل مداحی" کے القاب دیئے۔ آج وہ ہیجانی دور نہیں، وہ بحثیں تاریخ کے اوراق میں تحفظ
ہوکر تقویم پارینہ بن گئیں۔ کون حق و صداقت پر تھا اور کون غلطی اور گمراہی کی طرف لے جا رہا تھا، اس
ا فیصلہ بھی زمانے نے کر دیا، جو سب سے بڑا اور بے رحم قاضی ہے۔ اب ہم حیاتِ جاوید کا مطالعہ کرتے
یں، تو معلوم ہوتا ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی خامی نہیں۔ مواد نہایت محنت اور کاوش سے جمع

کیا گیا ہے، یہ خوش اسلوبی سے قلم بند ہوا ہے، اور مصنف نے پوری ایمانداری اور خلوص سے اپنے نتائج بیان کر دیے ہیں۔

غرض تحقیقی لحاظ سے یہ بہت کامیاب تصنیف ہے اور اب اس پر کسی اضافے کا امکان نہیں ہے۔

لیکن حالی کا کام محدود سطح پر تھا۔ انھوں نے سیرت سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کی مثال زیادہ سے زیادہ، اسی میدان میں لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس سے عام تحقیقی ذوق اور تجسس کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ کام ان کے ہم عصر مولانا شبلی نعمانی (وف نومبر ۱۴، ۱۹۱۴ء) نے کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو پرانے ماحول میں پیدا ہوا، جس کی پوری تعلیم پرانے مکتبی انداز پر ہوئی، جسے مغربی زبانوں کی کچھ یونہی برائے نام سی شُد بُد تھی، اس نے تحقیق کے میدان میں ایسے دیرپا آثار چھوڑے ہیں! اس میں شک نہیں کہ یہ علی گڑھ کے قیام اور سرسید کی صحبت کا فیضان تھا۔ حالی کی طرح انھوں نے بھی چند سوانح عمریاں لکھیں۔ لیکن ان کے علاوہ انھوں نے تذکرہ نویسی اور تحقیقی مقالات میں بھی قابل قدر کام کیا۔ شعرالعجم (۱۹۰۸-۱۹۱۰ء) اگرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے، لیکن اردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ اردو داں طبقے کے لیے فارسی زبان کی عہد بعہد ترقیوں اور مختلف اصنافِ سخن سے تعارف کا بہت اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کی تدوین میں ان سے بعض تاریخی غلطیاں ہوئیں۔ کچھ تو اس لیے کہ کئی مآخذ اور مراجع کی کتابیں شعرالعجم کے زمانۂ تالیف تک شائع نہیں ہوئی تھیں، یا آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں؛ اور کچھ اس لیے بھی کہ خود شبلی نے سہل انگاری سے کام لیا۔ انھوں نے دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں اور تاریخوں پر اعتماد کر کے خود جستجو کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور انھیں بجنسہٖ شعرالعجم میں درج کر دیا۔ شبلی بے شک مورخ تھے، ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا؛ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حافظہ بہت اچھا پایا تھا، جو پڑھا تھا وہ مستحضر تھا۔ لیکن ان میں ایک بات کی افسوس ناک کمی ہے کہ وہ بالعموم اختلافی مسائل میں اپنی فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی نظریے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور انھیں اپنی تائید میں کچھ دلائل و شواہد مل جائیں، تو پھر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ زیادہ تگ و دو کر کے مخالف کے دلائل بھی دیکھ لیں، یا ان کی تردید کی کاوش کریں۔ مثال کے طور پر شعرالعجم کو لیجیے۔ اس میں انھوں نے سنین سے متعلق بیشتر یہ روش اختیار کی ہے کہ اگر مختلف تذکروں میں کسی شخص کی ولادت یا وفات کی مختلف تاریخیں ہیں، تو انھوں نے یہ سب جوں کی توں نقل کر دی ہیں اور یہ محاکمہ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ان میں سے کون سی درست ہے اور کون سی غلط۔ یا مثلاً موازنۂ انیس و دبیر کو لیجیے۔ اس میں انھوں نے انیس کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے مقابلے میں دبیر کے کسی ایک آدھ شعر کی مثال دے کر انیس کے لیے وجہ ترجیح پیدا کر لی ہے۔ حالانکہ دبیر کے

کلام سے اس سے بہتر مثالیں دی جا سکتی تھیں، لیکن چونکہ اس سے ان کے نظریے کے کمزور، بلکہ غلط ثابت ہو جانے کا اندیشہ تھا، اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔ بے شک انیس اس سے بھی زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں، جتنی شبلی نے کی ہے؛ لیکن یہ دبیر کے صحیح کمالات سے چشم پوشی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔

شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال اُن کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں: المامون (۱۸۸۷ء)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۲ء) الفاروق (۱۸۹۸ء) الغزالی (۱۹۰۲ء) سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) سیرۃ النبی انھوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھنا شروع کی تھی۔ صرف پہلی جلد مکمل ہوئی تھی اور دوسری پر کام جاری تھا کہ خاتمہ بالخیر، کا پیغام آ گیا۔ یہ دونوں جلدیں اُن کی وفات کے بعد اُن کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد شائع کیں، ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق، اُن کی ترتیب اور دروبست، اخذ نتائج وغیرہ ہر ایک بات قابلِ تعریف ہے۔ اب ان موضوعوں سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے کچھ خاص موضوعات سے متعلق بھی دادِ تحقیق دی ہے۔ اس ذیل میں اُن کے بعض مضامین بڑے معرکے کے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ مسلمانوں نے مصر فتح کرنے کے بعد اسکندریہ کا کتاب خانہ جلا دیا تھا۔ مولانا نے تحقیق سے ثابت کر دیا (۱۸۹۲ء) کہ یہ مسلمانوں پر افترا و اتہام ہے؛ یہ کتاب خانہ فتح مصر سے مدتوں قبل رومیوں کے زمانے میں جل چکا تھا۔ اسی طرح ان کے مضامین: مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۱۸۸۷ء) اسلامی کتاب خانے (۱۸۹۲ء) اسلامی حکومتیں اور شفا خانے (۱۸۹۵ء) الجزیہ (۱۸۹۵ء) وغیرہ۔ بڑی دیدہ وری اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر مقبول ہوئے۔

شبلی کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت اُن کے اسلوب بیان کی شگفتگی اور دل کشی ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت کے اصول جانتے ہیں۔ انھوں نے ہر موقع پر اُس کی مناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔ اسی باعث اُن کی بیشتر کتابیں انشا کا بھی بہت اچھا نمونہ ہیں، اور آج بھی اُسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، جس طرح جب وہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھیں۔

اردو کی خوش قسمتی، شبلی کو شاگرد بھی ایسے میسر آ گئے، جنھوں نے اُن کے کام کو آگے بڑھایا دار المصنفین کا منصوبہ اُن کے ذہن میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں آیا تھا؛ لیکن اس تجویز کی اشاعت انھوں نے اپنی وفات سے چند مہینے پہلے ۱۹۱۴ء میں کی، اور تکمیل موت سے شاید دو ہفتے قبل ہوئی۔ بارے، اُن کے تلامذہ نے اُن کا کام جاری رکھا۔ اسلامی تاریخ پر بہت بلند پایہ کتابیں یہاں سے شائع ہو کر قبول عام کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ خود سید سلیمان ندوی مرحوم (ف نومبر ۱۹۵۳ء) نے ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات، سیرۃ عائشہ، خیام وغیرہ

کی سی تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ انھیں نے اپنے اُستاد کی مفصل اور مستند سوانح عمری بھی حیاتِ شبلی کے عنوان سے لکھی شبلی کے ایک دوسرے شاگرد مولانا عبدالسّلام ندری (ف اکتوبر ۱۹۵۶ء) نے بھی اس سلسلے میں مفید کام کیا۔ اُن کی کتابیں سیرت عمر بن عبدالعزیز، امام رازی، سیر الصحابہ کے پہلے دو حصّے وغیرہ محنت سے لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے شعرالعجم کے تتبع میں شعرالہند بھی لکھی تھی، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی، دارالمصنفین کا فیضان اب بھی جاری ہے۔

شبلی کے ساتھ معاً خیال حافظ محمود خاں شیرانی کا آتا ہے۔ شبلی کی طرح شیرانی نے بھی انگریزی تعلیم نہیں پائی تھی۔ وہ ۱۸۸۰ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد اسمٰعیل خاں وہاں کے اچھے باحیثیت جاگیردار اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلے کے بزرگ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھرانے میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کا کیا سوال تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا، اور اس کے بعد فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ تکمیل کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ انیس برس کی عمر تھی، جب یہاں کے اورینٹل کالج سے منشی فاضل کی سند لے کر وطن واپس آئے۔ معلوم نہیں کیونکر، ۱۹۰۱ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ یہ بیرسٹری کی سند لینے کے لیے ولایت جائیں۔ انگریزی جانتے نہیں اور بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت کی روانگی۔ اُن سے کچھ بعد سر شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اپنی تعلیم کے سلسلے میں ولایت پہنچے، اور شیرانی کے اُن سے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، جن سے آگے چل کر شیرانی کو بہت مدد ملی۔ ولایت میں انھوں نے پہلے انگریزی سیکھی، اور اس کے بعد قانون کا ایک آدھ امتحان پاس کیا۔ لیکن تعلیم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ٹونک میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد بھائیوں نے یہاں سے خرچ کے لیے روپیہ بھیجنا بند کردیا۔ اس سے اُن کا ہاتھ بہت تنگ ہوگیا۔ بارے، پہلے سر ٹامس آرنلڈ نے کچھ مدد کی اور یہ معمولی وظیفے پر ان کے علمی کاموں میں مدد کرتے رہے۔ پھر لندن کی مشہور مشرقی کتابوں کی فرم لوزک کمپنی سے معاملہ ہوگیا۔ یہ ان کے لیے مشرقی علوم و فنون کی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابیں جمع کرنے لگے، اس پر انھیں معقول کمیشن ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ اس کمپنی کے حصہ دار بن گئے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ ہندوستان آئے۔ ارادہ یہ تھا کہ بھائیوں سے والد کے ترکے کی تقسیم کا معاملہ طے کرکے واپس انگلستان چلے جائیں گے۔ ایک آدھ برس اسی اُدھیڑبن میں گزرا، اتنے میں پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) شروع ہوگئی۔ اب سمندری سفر نا ممکن تھا، اور وہ مجبوراً یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اگلے سات آٹھ برس بیکاری میں ٹونک میں بسر ہوئے۔ جب یہاں بسر اوقات کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تو ۱۹۲۱ء میں وہ لاہور پہنچے۔ یہاں اپنے پرانے دوست شیخ سر عبدالقادر کی وساطت سے انھیں اسلامیہ کالج، لاہور میں فارسی اور اردو پڑھانے کا کام مل گیا۔ مشاہرہ اگرچہ قلیل، صرف ڈیڑھ سو روپیہ تھا۔ لیکن انھوں نے

سے صبر شکر سے منظور کر لیا - اسلامیہ کالج میں وہ ۱۹۲۸ء تک رہے - اسی سال وہ یہاں سے اورینٹل کالج میں اردو کے مدرس ہو کر چلے گئے، جہاں سے بارہ برس بعد ۱۹۴۰ء میں سبکدوش ہوئے - ان کا فروری ۱۹۴۶ء میں بعارضۂ دمہ ٹونک میں انتقال ہوا -

شیرانی فارسی کے فاضل تو تھے ہی، لیکن جو وقت انھوں نے انگلستان میں، آرنلڈ اور لوزک کمپنی کے ساتھ گزارا، اس نے انھیں فاضل یگانہ بنا دیا - یہی وہ زمانہ ہے، جب ان کی علمی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تکمیل ہوئی جس سے گویا ان کی آیندہ زندگی کا رُخ مقرر ہو گیا - کاروبار کے لیے ضرورت تھی کہ جو کتاب انھیں دستیاب ہو، وہ اس کی علمی حیثیت، اس کے زمانۂ تالیف و کتابت، مصنف کے حالات وغیرہ سے متعلق پوری معلومات بہم پہنچائیں - اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے انھیں کتنا وسیع مطالعہ کرنا پڑا ہوگا - نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں نہ صرف فارسی ادب کی مختلف اور گوناگوں شاخوں میں استادانہ مہارت حاصل ہو گئی، بلکہ اسی سلسلے میں تمام اسلامی ممالک کی تاریخ اور اس کی تفصیلات اور جزئیات بھی ان کی گرفت میں آگئیں - خطاطی، مصوّری، نقاشی تو گویا ان کے ثانوی موضوع تھے، ان میں بھی پوری مہارت پیدا ہو گئی - ان کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ عالم تھا کہ لبا اوقات وہ قلمی کتاب دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اس کا کاغذ کس زمانے کا ہے، کتابت کا عہد کون سا ہے، کاتب کس مدرسۂ کتابت کا فرد ہے، اور بیشتر کاتب کا نام تک بتا دیتے تھے -

اسلامیہ کالج لاہور کی ملازمت کے آخری زمانے میں ان کی توجہ اردو زبان کے آغاز کے مسئلے کی طرف منعطف ہوئی - آج تک لوگ اردو کی ابتدا کو مغلوں سے - خصوصاً اکبر یا شاہجہاں کے عہد سے منسوب کرتے آئے تھے، حالانکہ کوئی زبان کسی خاص تاریخ یا معیّن زمانے میں وجود میں نہیں آیا کرتی - اس کا خمیر لمبے عرصے تک پکتا رہتا ہے - اردو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی - اس کا ہیولیٰ بھی اس ملک کی مختلف زبانوں کے میل جول سے تیار ہو رہا تھا اور وہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اب کسی بیرونی زبان سے تعلق پیدا ہوتے ہی وہ نئی زبان کی شکل اختیار کر جاتا - اتفاق سے یہ بیرونی زبان مسلمانوں کے اس ملک میں پہنچ جانے سے فارسی ثابت ہوئی - گویا زبان کی بنیادی خصوصیات ملکی یا مقامی رہیں، بیرونی اثر صرف سطح پر پڑا، جس کی ظاہری شکل فارسی، عربی، ترکی الفاظ یا رسم الخط قرار دیئے جا سکتے ہیں - شیرانی کا نظریہ مختصراً یہ تھا کہ مسلمانوں کا یہاں کے لوگوں سے پہلا واسطہ پنجاب میں پڑا اور پھر صدیوں یہ اختلاط یہیں قائم رہا، اس لیے اردو کی موجودہ شکل و صورت بھی اسی علاقے میں متعین ہوئی - وہ فرماتے ہیں :

> " جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے، وہ نہ برج ہے، نہ ہریانی، اور
> نہ قنوجی ہے، بلکہ وہ زبان ہے، جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں

میں بولی جاتی تھی" (پنجاب میں اردو، ص ب)

پھر لکھتے ہیں:-

"ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت
قریب ہے" (ایضاً، ص ج)

یا پھر

"پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں" (ایضاً)

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے اتنے قوی دلائل پیش کیے کہ وہ لوگ تک جو شروع میں اسے سننے تک کے روادار نہیں تھے، مجبور ہوگئے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کریں - شیرانی نے تاریخ کے علاوہ پرانی کتابوں سے شواہد کا ایک انبار مہیا کر دیا - اس سے کئی ایسے قدیم مصنف نمایاں ہوگئے جو گمنامی کا شکار ہو چکے تھے میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا یہ نظریہ اپنی تمام تفصیلات میں بھی ہر طرح درست ہے یا اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں یا اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ـــ اور کون سا انسانی نظریہ ہے، جو اپنی تمام جزئیات میں درست اور ناقابل اعتراض ہوا کرتا ہے ـــ بلکہ میرا مقصود یہ کہنا ہے کہ جب وہ کسی مسئلے سے متعلق تحقیق شروع کرتے تھے، تو اس کے تمام گوشوں کو چھان پھٹک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے - اردو کے آغاز سے متعلق بھی انھوں نے یہی کیا - اس کتاب کے بعد بھی انھوں نے متعدد مضمون اردو سے متعلق لکھے -

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ گراہم بیلی نے اپنی تاریخ ادب اردو میں شیرانی کے نظریے کی تائید کی ہے -

شیرانی بڑے بت شکن تھے - انھوں نے متعدد ان نظریوں کی غلطی مستحکم دلائل سے ثابت کی، جو صدیوں سے مسلمہ کلیوں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے مثلاً (۱) فردوسی نے شاہنامہ سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر لکھا تھا، (۲) فردوسی نے سلطان کی ہجو لکھی؛ (۳) خالق باری، حضرت امیر خسروؒ کی تصنیف ہے؛ (۴) پرتھی راج راسا، محمد غوری کے عہد میں کسی شاعر چاند بردے نے تصنیف کیا؛ (۵) دیوان معینی حضرت معین الدین چشتیؒ کا کلام ہے؛ (۶) شاہنامے کے علاوہ فردوسی نے یوسف زلیخا نام کی نظم بھی لکھی تھی جب کوئی نظریہ کسی لمبے عرصے تک لوگوں میں تسلیم کیا جاتا رہے، تو یہ مذہبی عقیدے سے بھی زیادہ عزیز بن جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، تو وہ گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے - شیرانی خوب جانتے تھے کہ وہ ان اتنے سارے تسلیم شدہ مسئلوں میں اختلافی رائے دے کر کس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ رہے ہیں - لیکن انھوں نے اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنا پر ان سب نظریوں کی تغلیط کی - یہ کچھ

ن کام نہیں تھا ۔ اس کے لیے انھیں لسانی اور تاریخی ثبوت مہیا کرنے میں کتنی محنت کرنا پڑی ، اس کا کچھ
ہ ان مضامین کے غائر مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ۔

ان تحقیقی مضامین کے علاوہ شیرانی نے ہمارے ادب کی دو مشہور کتابوں پر طویل تنقیدی مضمون بھی
۔ پہلا شبلی کے شعرالعجم پر اور دوسرا محمد حسین آزاد کے آبِ حیات پر ۔ افسوس کہ بوجوہ یہ دونوں مضمون نامکمل
گئے ۔ تاہم تنقید شعرالعجم بہت حد تک مکمل کہی جا سکتی ہے ۔ آبِ حیات والا مضمون انھوں نے زندگی کے آخری
میں شروع کیا تھا ، اور وہ اس زمانے میں بہت بیمار رہنے لگے تھے ، اس لیے اسے مکمل نہ کر سکے ۔ تنقید شعرالعجم
ی صورت میں شائع ہو چکی ہے ؛ اس کا ایک ایک صفحہ اُن کے مطالعے کی وسعت ، اسلامی تاریخ پر عبور ، ذہانت
نکتہ سنجی کا شاہدِ عادل ہے ۔ جیسا کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم نے کہا تھا ، شیرانی کی گرفت درشت لیکن
ست ہوتی تھی ۔ اسی لیے آج تک کسی کو جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی ۔

شیرانی کے بعض شاگردوں نے ان کا تتبع کیا ہے ۔ اس پر مجھے بے اختیار محمد ابراہیم ڈار (ف مئی ۱۹۵۳ء)
ام یاد آگیا ۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی ، اور وہ قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے ۔ اُن کی مولانا سید سلیمان
دی کی حیاتِ شبلی پر تنقید خاصے کی چیز ہے ۔

اس سلسلے میں لاہور ہی کی ایک اور شخصیت بھی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے ۔ میری مراد پرنسپل محمد شفیع سے
۔ اُن کا بیشتر علمی کام بعض پرانے متون کی ترتیب و تحشیہ تک محدود رہا ۔ لیکن اُن کے فیضِ تربیت سے پنجاب
کام کرنے والوں کی ایک وقیع جماعت تیار ہو گئی ۔ اُن کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ کوئی بات بے ثبوت نہ
ی جائے ، ہر ایک بیان یا دعویٰ یا تحریر با دلیل اور با حوالہ ہونا چاہیے ۔ اُن کے نزدیک مآخذ اور مصادر
اہمیت خود مقالے سے کم نہیں تھی ۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہوں گے ، پروفیسر محمد شفیع ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور
سے انگریزی ادب اور عربی میں ایم اے کی اسناد لے کر ۱۹۱۵ء میں ولایت گئے ۔ ۱۹۱۹ء میں کیمبرج سے ایم اے
سند لے کر واپس آئے ، تو اپنی ' مادرِ علمی ' پنجاب یونیورسٹی ہی میں عربی ادبیات کے استاد مقرر ہو گئے اور ۱۹۴۲ء
، جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں ، اسی عہدے پر فائز رہے ۔ اس دوران میں ۱۹۳۲ء سے
۱۹۴۱ء تک وہ لاہور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے ۔ اس کے بعد جب پنجاب یونیورسٹی نے اردو
ائرۃ المعارف اسلامیہ یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کا منصوبہ بنایا ، تو وہ اس شعبے
ے صدر بنائے گئے ۔ اسی عہدے پر ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا ۔

انھوں نے جس محنت اور تن دہی سے ابنِ عبدِ ربہ کی کتاب عقد الفرید کے تفصیلی اشاریے تیار کیے ، وہ

تحقیق اور ترتیب و تحشیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے صبر و استقلال اور جفاکشی کا انداز اس سے لگائیے کہ اس کام میں ان کے پندرہ برس صرف ہوئے؛ یہ کام انھوں نے انگریزی میں کیا تھا۔ اس کے علا تذکرہ میخانہ عبدالنبی فخرالنبی قزوینی مطلع سعدین، مکاتیب رشیدی کو بھی انھوں نے حواشی اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ کتابیں فارسی میں ہیں۔ عربی تتمۂ صوان الحکمہ کے متن اور حواشی کی اشاعت بھی انھیں کی محنت کا نتیجہ ہے۔

تاریخ لاہور، تاریخ قصور (کہ ان کا مسقط الرأس تھا) فرقۂ نور بخشی، تاریخ خاندانِ تیمور، ان کے خاص موضوع تھے۔ ان کے علاوہ انھیں خطاطی اور خط کے ارتقا اور مختلف خطاطوں کے حالات سے بھی خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے ان سے متعلق متعدد مقالے لکھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ کاش کہ کوئی صاحب ہمت کرکے ان کے وہ مضمون کتابی صورت میں شائع کر دیں، جو فارسی اور اردو والوں کی دلچسپی کے ہیں۔

اب میں ایک ایسی شخصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہے۔ میرا اشارہ جناب قاضی عبدالودود کی طرف ہے۔ موصوف اب ستر کے پیٹے میں ہیں۔ وہ پٹنہ کے ایک مذہبی گھرانے میں ۱۸۹۶ء ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ان کی بھی عربی کی ہوئی، بلکہ انھوں نے قرآن تک حفظ کیا، اس کے بعد انگریزی پڑھی، پھر بیرسٹری کی سند لینے ولایت گئے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ علاج معالجے سے ٹھیک تو ہو گئے، لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ کی صحت مخدوش ہے، اس لئے آپ کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے، جس سے مرض کے عود کر آنے کا اندیشہ ہو۔ چونکہ خدا کا دیا گھر میں کافی تھا، اور بسر اوقات کے لیے نوکری یا وکالت کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی، انھوں نے پڑھنے لکھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ خوش قسمتی سے بانکی پور پٹنے کا شہرۂ آفاق کتاب خانہ گویا ان کے گھر میں تھا۔ اس سے انھوں نے جی بھر کے استفادہ کیا۔ میرا ایمان ہے کہ جہاں تک فارسی علم و ادب کا تعلق ہے، آج ملک بھر میں ان کی برابر کا شاید ہی کوئی اور عالم ہو۔ بدقسمتی سے انھوں نے کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کی، لیکن پچھلے ۳۵-۴۰ برس میں انھوں نے بیسیوں تحقیقی مقالات قلم بند کئے ہیں۔ ان میں انھوں نے اردو شعرا اور ادبا کے حالات لکھے ہیں، کتابوں پر تبصرے کئے ہیں، بعض کتابوں کی تلخیص کی ہے، اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ ان کے بعض مقالے خاصے طویل ہیں اور بآسانی الگ سے کتابی شکل میں چھاپے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ان کا مقالہ غالب بحیثیت محقق کم و بیش دو سو صفحات کو محیط ہے۔ ان کے تنقیدی مقالات کے دو مختصر مجموعے ـــ عیارستان اور اشتر و سوزن ـــ چھپ چکے ہیں۔ اگر ان کے تمام مضامین ہی جمع کیے جائیں تو کئی جلدوں کا مواد ہے۔

مقالات کے علاوہ انھوں نے بعض کتابوں کو مفید اور معلوماتی حواشی کے ساتھ مرتب کرکے شائع

ہے مثلاً دیوانِ شورش، تذکرۂ ابنِ امین اللہ طوفانؔ وغیرہ۔

لیکن میرے نزدیک تحقیق کے میدان میں موصوف کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے نئے ...نے والوں کے لئے احتیاط اور محنت کی مثال قائم کی ہے۔ اُن کی دیکھا دیکھی بعض نوجوان محقق بھی اب ...ے موضوع کے مالہٗ وماعلیہ کا پورا احاطہ کرنے لگے ہیں۔ اگر ان اصحاب نے حفظِ مراتب کا خیال رکھا، اور ...شی سے زیادہ درستی کو اپنا شعار بنایا، تو یہ تحریک ہماری زبان کی ترقی اور نیک نامی کا باعث ہوگی۔

میں نے اب تک اُن اکابر کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے مختلف مرحلوں پر نہ صرف خود تحقیق کا کام وسیع ...نے پر کیا، بلکہ اُن کے اثرات بھی دُور رس اور دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ اِن کے علاوہ متعدّد اصحاب ...انفرادی طور پر بھی بلند پایہ اور قابلِ فخر کام کیا ہے۔ اُن میں سے مولوی عبدالحق، شیخ چاند، محی الدین ...دری زورؔ، مولوی عبدالرزاق کانپوری، وغیرہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ زندوں میں جن اصحاب نے ...یقی کام کیا ہے، اُن کے نام آپ سے مخفی نہیں ہوں گے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اُن سے متعلق کچھ کہنے ...ضرورت نہیں ہے۔

(۲)

اب میں مختصراً اُن چند موضوعات سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں، اور جو کسی ...قیقی کام کے بھی بنیادی میدان ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف حیثیتوں سے یہ شعبے اہم ہیں۔

۱۔ سوانح عمریاں۔ یہ دو حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(الف) اردو کے مصنفوں، ادیبوں، شاعروں کی سوانح عمریاں

(ب) دوسری تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریاں

۲۔ تاریخی واقعات کی چھان بین

۳۔ غیر مطبوعہ متون کی تلاش اور مناسب ترتیب کے بعد انھیں شائع کرنا

۴۔ مطبوعہ کتابوں کے تازہ ایڈیشن تیار کرنا

۵۔ یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام

۶۔ تحقیقی رسائل و مجلّات

آیئے، ان پر سلسلہ وار غور کریں:

۱۔(الف) ۔ سب سے پہلے ادیبوں، شاعروں کے حالات اور سوانح عمری کو لیجئے۔ اس سلسلے میں کچھ ...م ہوا ہے، لیکن ابھی بہت کرنے کو پڑا ہے۔ ہمارے ہاں دس بیس نہیں، سینکڑوں ادیب اور شاعر ایسے

ہیں جن کی نگارشات ہماری زبان کی تاریخ کا اہم حصّہ ہیں ، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمیں اُن میں سے بیشتر کے تفصیلی تو درکنار ، اجمالی حالات بھی معلوم نہیں ہیں ۔ اُن میں بیسیوں ایسے ہیں جن کی ولادت یا وفات کی تاریخ تک کا پتہ نہیں ، یا اس سے متعلق یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ یہ صورتِ حال بہت افسوس ناک ہے ۔ جو چند سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ، اُن میں بھی غیر متعلق اور غیر تحقیقی رطب و یابس زیادہ ہے ، اور کام کی باتیں کم ۔ یہ یاد رکھیے کہ طول نویسی کوئی ہُنر نہیں ، بلکہ کلام کا حُسن ایجاز و اختصار میں ہے ۔ مَا قَلَّ وَ دَلَّ کا مقام حاصل کر لینا بہت بڑی کامیابی ہے ۔ جب کوئی شخص اپنے موضوع پر حاوی ہو جاتا ہے اور اُس نے اپنے خیالات کو ذہن میں مرتّب کر لیا ہے ، تو ناممکن ہے کہ وہ بسیار گو ہو سکے ، کیونکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ میرے موضوع سے متعلق کون سی بات ضروری ہے اور کون سی غیر ضروری ۔ اب تک وَلی ، مِیر ، سوؔدا ، مظہر جانجاناں ، دردؔ ، انشاؔ ، غالبؔ ، مومنؔ ، ذوقؔ ، ظفرؔ ، انیسؔ ، دبیرؔ ، امیرؔ ، داغؔ ، شبلیؔ ، نذیر احمد ، محمد حسین آزادؔ ، رنگینؔ ، جلالؔ ، اقبالؔ ، ریاضؔ ، جگرؔ کی سوانح عمریاں چھپ چکی ہیں ، شاید کچھ اور بھی ہوں ، جن کے نام مَیں بھُول رہا ہوں ۔ ان سب کا معیار ایک سا نہیں ۔ ان میں سے بعض مکمّل اور مدلّل ہیں ، بعض کچھ تھوڑی سی محنت اور غیر ضروری باتوں کو حذف کر دینے کے بعد اچھی سوانح عمریاں بن سکتی ہیں ۔ بقیہ نہ یہ ہیں ، نہ وہ ؛ ان میں نہ تحقیق ہے نہ حُسنِ بیان ۔ ان موضوعات سے متعلق از سرِ نو تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے

(ب) غیر ادبی شخصیتوں کے سوانح مرتب کرنے پر بھی توجہ ہوئی ہے ۔ حالیؔ اور شبلیؔ کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کا ذکر کر چکا ہوں ، اُن کے علاوہ آلِ برامکہ ، نظام الملک طوسی ، اسلامی تاریخ کے مشاہیر خصوصاً خلفائے راشدین فقہ کے چاروں امام ، رازی ، ابنِ رشد ، ابنِ تیمیہ ، متعدد بادشاہ اور حکمران یا ان کے وزرا ، البیرونی ، عبدالحق محدّث دہلوی ، صوفیائے کرام ، ان کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں سے بیشتر کا معیارِ تحقیق تسلّی بخش ہے ۔ ان میں کا سب سے کمزور حصّہ حضراتِ صوفیہ کے حالات ہیں ۔ جہاں نہ روایت کا لحاظ کیا گیا ہے ، نہ درایت سے کام لیا ہے ۔

ان ادبی اور غیر ادبی سوانح عمریوں کے درمیان مدارج کا جو فرق ہے ، اُس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے ۔ ادب سے باہر جتنے مشاہیر ہیں ، اُن کے حالات کم و بیش تفصیل سے عربی اور فارسی مآخذ میں موجود ہیں ۔ اگر کوئی شخص کام کرنا چاہتا ہے ، تو وہ اُن سے رجوع کرے ۔ لیکن اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات جمع کرنے کے لیے کہیں زیادہ عرق ریزی اور جانفشانی کی ضرورت ہے ۔ بسا اوقات اُن سے متعلق مواد نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ اُن کے پس ماندگان اور متوسلین کا کھوج لگایا جائے ، اُن سے مِل کر خاندانی روایات جمع کی جائیں ، اور عقل و نقل کے مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں انھیں پرکھا

کتابیں مرتب کی جائیں - ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں ؛ اس کے لیے بہت کاوش اور دیدہ ریزی درکار ہے لازماً اس کے بعد جو کتاب لکھی جائے گی ، اس کی حیثیت کا فیصلہ بھی اس تحقیق پر منحصر ہوگا ، جو اس کی تیاری میں صرف ہوئی ہے -

۲- تاریخی واقعات کی چھان بین - اس سے میری مراد یہ ہے کہ جہاں کسی شخص یا مسئلے سے متعلق اتنا مواد نہیں ہے کہ اس کی کوئی مفصل سوانح عمری یا پوری کتاب مرتب کی جا سکے ؛ لیکن موضوع اپنی جگہ اتنا اہم اور دلچسپ ہے کہ اس سے متعلق تحقیق کی جانا چاہیئے یا کی جا سکتی ہے - مثال کے طور پر — ذوالقرنین کون تھا ؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسّلام ؟ وغیرہ اس طرح کے مسائل پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے- اس سلسلے میں لے دے کر سرسید ، شبلی ، اعظم یار جنگ ، عبدالله عمادی ، شرر اور نیاز فتح پوری کے نام ذہن میں آتے ہیں -

۳- اردو میں پرانے متون کی اشاعت کا مسئلہ بہت مشکل ہے - بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری ادبی تاریخ کے بعض اہم اساتذہ کا کلامِ نظم و نثر آج تک شائع نہیں ہوا - اور جب تک یہ شائع نہ ہو جائے ، ہم بھلا اپنی زبان کی تاریخ کیونکر مرتب کر سکتے ہیں ! تاریخ انھیں مصنفوں کے حالات اور ان کی تصنیفات کے تذکرے اور ان کی اہمیت اور ادب کے تدریجی ارتقا میں ان کے مقام کے تعین ہی کا تو دوسرا نام ہے -جب ان کی سوانح عمریوں کا وہ حال ہے اور مصنّفات کا یہ ، تو کوئی شخص تاریخ قلم بند کرنے کا تصور ہی کیونکر کر سکتا ہے ! اس سلسلے میں ہمارے افلاس کا یہ عالم ہے کہ عہدِ ظفر کو مشکل سے سو سال ہوئے ہیں ، اور خوش قسمتی سے اس عہد کے بیشتر خطی نسخے تلف ہونے سے بھی بچ گئے ہیں ، لیکن ہم آج تک اس زمانے کے متعدد اساتذہ مثلاً نصیر ، ممنون ، قتیل ، احسان ، آزردہ ، حکیم قاسم ، اور ان کے بیٹے عشق ، ہدایت ، بیان ، فراق وغیرہ کے دیوان تک شائع نہیں کر سکے ، حالانکہ ان کے خطی نسخے کہیں نہ کہیں موجود ہیں -

ان سے ذرا پہلے کا زمانہ لیجئے تو حالت اور بھی المناک ہے - مصحفی ، جرأت ، حسن ، حاتم وغیرہ کے دیوان ہنوز طباعت سے محروم ہیں - جب صورتِ حال یہ ہو تو ہم کس منہ سے ان شعرا سے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں یا انھیں اپنی تاریخ میں شامل کر سکتے ہیں -

بات سے بات یاد آتی ہے - ابھی تک ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے کتاب خانوں کے اردو مخطوطات کی مکمل فہرست تک شائع نہیں ہوئی - ہندوستان میں کئی خانقاہوں ، قدیم مدرسوں ، خاندانی ذخیروں میں قیمتی مخطوطات منتشر پڑے ہیں جو بے توجہی اور ذوقِ جستجو کی کمی کا شکار ہو رہے ہیں ضرورت ہے کہ ملک کو چند ادبی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کچھ اہلِ ذوق و استعداد اصحاب ایک ایک حصے کے تمام مقامات پر ذاتی طور پر جانے اور

یہاں سے مخطوطات تلاش کرنے کا بیڑا اٹھائیں ۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی کتاب کہاں دستیاب ہو سکتی ہے
تو یہ بھی تکمیل کار کی طرف ایک قدم ہے ۔ ان خطی نسخوں کا یا ان کے عکس کا حصول اور ان کا کسی مرکزی کتاب خانے
میں محفوظ کر دینا اس سے اگلا قدم ہوگا ۔ مرحوم سید محی الدین قادری زور نے دکنی مخطوطات اسی طرح جمع کئے
تھے ۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد کا کتاب خانہ فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پانچ ہزار مخطوطات محفوظ ہیں ۔
یہ سب زور مرحوم اور ان کے فرض شناس رفقائے کار کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ اس سلسلے میں بہار کے بعض احباب
نے بھی بہت قابل تعریف کام کیا ہے؛ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ آندھرا پردیش یا بہار میں بھی اب اور کہیں
مخطوطات کے ملنے کا امکان نہیں ۔ ملک کے باقی حصوں میں تو ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام ہوا بھی نہیں ۔ پس
جب تک پوری کوشش — اور وہ بھی بلا تاخیر — نہیں کی جائے گی، قوی اندیشہ ہے کہ بہت سے قیمتی
نسخے ضائع ہو جائیں گے؛ اور چونکہ عین ممکن ہے کہ ان میں سے بعض نسخے وحید ہیں یعنی ان کی دوسری نقل کہیں
اور موجود نہیں ہے، اس لئے اس حد تک یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوگا ۔ غرض اردو کا غیر مطبوعہ ذخیرہ ایک
مردِ کلمی کا انتظار کر رہا ہے ۔

ان خطی نسخوں کے حصول کے بعد ان کے شائع کرنے کا مرحلہ ہے ۔ پرانے متن کا پڑھنا اور حل کرنا
ایک کٹھن کام ہے اور اگر نسخہ منحصر بفرد ہے اور اس متن کا کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوا، تو اس کا مرتب
کرنا اور بھی مشکل اور بہت بڑی ذمہ داری کا کام بن جاتا ہے ۔ شکر ہے کہ ہمارے اہلِ علم حضرات کو اس کام
کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر آج تک جتنے متن شائع ہوئے ہیں، مجموعی طور پر
غنیمت ہیں ۔

میں اس سلسلے میں دو ایک اور باتیں بھی عرض کر دوں :

کام مقدار میں بہت ہے اور مشکل بھی؛ اور کام کرنے والے آدمی کم ہیں، خاص طور پر وہ جو اس کے
اہل ہیں ۔ اس لئے بیحد ضروری ہے کہ کسی کا وقت ضائع نہ ہو اور دو آدمی ایک ہی کام پر نہ لگے رہیں ۔ اس
کے لئے ایک دوسرے سے تعاون اور تبادلۂ خیالات کی اشد ضرورت ہے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہی
موضوع پر دو دو، بلکہ بعض اوقات تین تین، جگہ کام ہو رہا ہے ۔ آخر یہ لوگ ایک دوسرے سے خط و کتابت
کر کے کیوں طے نہیں کر لیتے کہ ان میں سے ایک نہ ایک اس موضوع سے دست بردار ہو جائے! بعض جگہوں پر
بڑے راز داری سے کام لیا جاتا ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ کن موضوعات پر کام ہو رہا ہے ۔ یہ کوئی
فوجی اور جنگی راز نہیں، بلکہ علمی باتیں ہیں ۔ ان کی جتنی اشاعت ہو، اتنی ہی طلبہ کے مفید مطلب ہوگی ۔ کسی کام کو
مخفی اور پوشیدہ رکھنے سے نہ کام کی رفتار بڑھے گی، نہ اس کا معیار بلند ہوگا ۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اب تک جو متن شائع ہوئے ہیں، بحیثیت مجموعی اُن کا معیار بُرا نہیں - یہ میں
نے اس لئے کہا کہ ہمارے یہاں یہ کام ابھی حال میں شروع ہوا ہے - جو لوگ کام کر رہے ہیں، انھیں خود تو اس کا
ربہ تھا ہی نہیں، جو اصحاب اُن کے نگراں اور رہنما ہیں، وہ بھی کچھ زیادہ نہیں جانتے - پس ان حالات میں
ن سے بہتر نتائج کی توقع رکھنا بے سود ہے - لیکن ظاہر ہے کہ کام اس سے کہیں بہتر شکل میں ہو سکتا تھا اور
ونا چاہیئے تھا - لہٰذا جن اصحاب نے یہ کام کیا ہے، انھیں اس پر مطمئن ہو کے بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے - انھیں
ہیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہے، یہی کامیابی اور فلاح کا راستہ ہے -

اب تک جو پرانے متن چھپے ہیں، اُن کی فہرست کچھ ایسی طویل نہیں، اور یہ آپ میں سے کسی صاحب سے
شیدہ بھی نہیں ہوں گے؛ اس لئے میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ اُن سب کتابوں کے نام گنواؤں - ہاں، میں معیاری
م کی مثال پیش کرتا ہوں - اس سلسلے میں صرف تذکروں کو لیجئے - آپ نے محمود شیرانی کا مرتبہ تذکرہ مجموعۂ نغز
ردر دیکھا ہوگا - اگر عاری متن شائع کرنا مقصود ہے، تو یہ کم از کم اتنی توجہ اور محنت کا مستحق ہے - اگر اس
ر حواشی کا اضافہ کرنا چاہیں، تو اس کے لئے عرشی کا مرتبہ تذکرہ دستور الفصاحت یا قاضی عبدالودود کا تذکرہ
ن امین اللہ طوفان نمونے کا کام دے سکتے ہیں -

۴- اب مطبوعہ کتابوں کے تازہ ایڈیشن شائع کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہو گیا ہے، جتنا غیر مطبوعہ متون
ا - ستم ہے کہ معمولی کتابیں تو درکنار، آج بعض مشاہیر تک کی تصنیفات بھی سہل الحصول نہیں ہیں - میر، درد
ذوق، مومن، ناسخ، آتش، صبا، وزیر وغیرہ کے دیوان کا کوئی اچھا نسخہ بازار میں نہیں ملتا - رجب علی بیگ سرور
کے فسانۂ عجائب یا فخرالدین حسین خاں سخن کے سروش سخن کا نسخہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا -

مطبع نولکشور نے اس ملک میں علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، ہم رہتی دنیا تک اُس کے احسان سے
عہدہ برآ نہیں ہو سکتے - سینکڑوں، ہزاروں کتابیں محض اس کی بدولت محفوظ ہو گئیں، ورنہ وہ یقیناً صفحۂ ہستی
سے ناپید ہو گئی ہوتیں، منشی نولکشور مرحوم نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ مسودے کا موضوع کیا ہے
ور اس کی ضخامت کتنی ہے ان کے پاس جو مسودہ آیا، انھوں نے اسے شائع کر دیا - بدقسمتی سے، ان کتابوں
ں کتابت کی بہت اغلاط رہ گئی ہیں، کاغذ بھی کچھ اچھا استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن یہی کیا کم ہے کہ کتاب اس
رح ضائع ہونے سے تو بچ گئی -

ایک اور وجہ سے بھی یہ کام ضروری ہو گیا ہے - جب یہ کتابیں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہیں، تو
البا ان کا وہی ایک نسخہ تھا، جو مطبع کو اشاعت کے لئے دیا گیا تھا - آج عام طور پر ان کتابوں کے کئی کئی
لمی نسخے دستیاب ہو گئے ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر مناسب اہتمام اور حسنِ ترتیب سے یہ سب کتابیں از سرِ نو

شائع ہونا چاہیئں -

مناسب یہ ہوگا کہ دو تین ناشر مل کر آپس میں یہ کام تقسیم کرلیں - اہل علم و نظر حضرات مستند ایڈیشن تیار کریں، جن میں متن کی تصحیح، الفاظ کی فہرست، فرہنگ وغیرہ پر خاص توجہ دی جائے -

۵ - ہماری بعض یونیورسٹیوں میں بھی اردو سے متعلق کچھ کام ہونے لگا ہے - اب ہر وہ طالب علم جو ایم اے کا امتحان پاس کرلیتا ہے، ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنا ضروری خیال کرتا ہے، حالانکہ یہ بات لازمی نہیں کہ جو شخص امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے، وہ تحقیق کا بھی اہل ہے - ان دونوں کے لئے الگ الگ قسم کا مزاج درکار ہے یہی امتیاز مدِ نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ پی ایچ ڈی کی سند کے جو مقالے اب تک شائع ہوئے ہیں، افسوس کہ ان میں سے بیشتر مایوس کن ہیں -

میں اس افسوس ناک صورتِ حال کے لئے یونیورسٹیوں کے ان پروفیسروں کو ذمہ دار گردانتا ہوں جو ان طلباء کے کام کی نگرانی کرتے ہیں، یا جن کی راہنمائی میں یہ مقالے تیار ہوتے ہیں - اگر یہ حضرات چاہیں، تو معیار بلند ہو سکتا ہے - اور جب تک موجودہ سہل انگاری رہے گی، اس معیار کے بلند ہونے کا کوئی امکان نہیں یوں لگتا ہے جیسے ان یونیورسٹیوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ہر مقالہ نگار کو سند لازماً عطا کردی جائے گی - اگر آپ کو بالآخر یہی کچھ کرنا ہے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کوئی ممتحن مقرر کرنے کی ضرورت کیا ہے - جن بزرگوار کے زیرِ ہدایت مقالہ لکھا گیا ہے، اگر وہ مطمئن ہو جائیں، تو سند عطا کردی جائے -

مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اوقات سند دینے کے ساتھ یہ شرط عائد کردی جاتی ہے کہ مقالہ شائع نہیں کیا جا سکتا - اس شرط کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یونیورسٹی کی رائے میں مقالہ اس قابل نہیں کہ اسے منظرِ عام پر لایا جائے - اگر یہ بات صحیح ہے، اور بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ یہ کیوں صحیح نہ ہو، تو اس سے زیادہ صریح اقبالِ جرم تصور میں نہیں آسکتا - یہ اجازت نہ دینے کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ مقالہ معیاری نہیں، وہ اس قابل نہیں کہ اہلِ نقد و نظر اسے دیکھیں، اور علم و فن کی کسوٹی پر اسے کسیں - سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت میں مقالہ نگار سند کا مستحق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے -

یاد رکھئے، اس سے آپ اُردو کا مستقبل روشن نہیں کر رہے ہیں، بلکہ یہ اور تاریک ہو رہا ہے - معاملہ ایک ڈگری یا سند عطا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتا - ان نو وارد ڈاکٹر صاحب کی بنیاد ہی کمزور اور کچی ہے، وہ آگے طلبہ کو کیا پڑھائیں گے، اور کیا ان کی رہنمائی کریں گے! لازماً اس کا اثر نئی نسل کے طلبہ پر پڑے گا اور یوں یہ دیوار تا ثریا کج ہی چلی جائے گی -

خدارا، اپنی ذمہ داریوں کا خیال کیجئے اور ہر سال ناپختہ اور خام کار استادوں میں اضافہ نہ کیجئے بلکہ

اس وقت آپ کو کوئی ٹوکنے والا نہ ہو، لیکن مستقبل کا مورخ آپ کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ خدا کرے یہ دردمندانہ نصیحت صدا بصحرا ثابت نہ ہو اور متعلقہ حضرات اس سے زیادہ محتاط ہو جانے کا تہیہ کرلیں۔

۱۔ اب مجھے ایک آخری مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے:۔

اردو میں تحقیقی رسائل و جرائد گویا ہیں ہی نہیں۔ بیشک، معارف اور برہان موجود ہیں، لیکن ان کا کار محدود ہے؛ وہ زیادہ تر دینی اور فقہی مسائل کے لئے مخصوص ہو کے رہ گئے ہیں۔ ان میں گاہے گاہے کوئی مضمون کبھی غلطی سے چھپ جاتا ہے؛ لیکن سچ مانئے کہ ان کی عام افتاد کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بے محل سا معلوم ہے۔

کیا واقعی اردو داں طبقہ علمی اور ذہنی اور مالی لحاظ سے اتنا ہی افلاس زدہ ہے کہ وہ اپنے دو چار کام کے تحقیقی رسالے جاری نہیں رکھ سکتا۔

میں نے آپ حضرات کا بہت وقت لیا۔ میں انگریزی محاورے کے مصداق اونچی آواز میں سوچتا رہا ہوں۔ ن کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں — اچھے بھی، برے بھی، بے ربط بھی۔ بار ہا وہ انھیں روں کے سامنے رکھنے پر بھی تیار نہیں ہوتا۔ میں نے یہ تکلف نہیں کیا، بلکہ جو بات ذہن میں آگئی، اسے جوں ں، بے جھجک آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس سمع خراشی کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

شکریہ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

خطوط عبدالحق[1]

مولوی عبدالحق صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اردو کے لئے وقف تھا۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور انہوں نے پوری زندگی اسی کی خدمت میں کھپا دی۔ اردو پر ان کے احسان ایک نہیں کئی ہیں۔ جب تک اردو دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، مولوی عبدالحق مرحوم کا نام احترام سے لیا جائیگا۔ بزرگوں کی یاد تازہ کرنا، ان کے کام کو سامنے رکھنا، ان کے مقصد کو جاننا اور انکی خوبیوں کو پرکھنا بعد میں آنے والوں کا اہم ترین فرض ہے۔ اڈمنڈ برک نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو اگلوں کو بھلا دیتے ہیں پچھلے بھی انہیں جاننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ مولوی عبدالحق سے متعلق ان چند دنوں میں ایک کتاب اور ایک رسالے کا خاص نمبر سامنے آئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے رسالہ قومی زبان کا عبدالحق نمبر شائع کیا ہے اور محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے عبدالحق صاحب کے مکتوبات کو خطوطِ عبدالحق کے نام سے حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے مولوی صاحب کے مکتوبات کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، اس لحاظ سے یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے خط ہیں جو مولوی صاحب نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو لکھے تھے۔ ظفر الرحمٰن کے نام خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب میں جوہر قابل کو پہچاننے کی کیسی زبردست صلاحیت تھی۔ مولوی صاحب نے انہیں تصنیفی اور تالیفی کاموں کے لئے ابھارا اور ان سے "فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں" اور "ہماری کہاوتیں" جیسی اہم کتابیں لکھوائیں جن کے لئے اردو دنیا ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔ ظفر الرحمٰن کے علاوہ دوسرے خطوط سید ساجد علی، منشی محمد علی، غلام ربانی، ابو محمد عمر بن صلاح اور عبدالرحیم خاں فیضی کے نام ہیں، مرتب نے پنڈت ونشی دھر کے نام بابائے اردو کے انگریزی خطوں کو بھی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کتاب میں شامل کئے گئے خطوں کی کوئی فہرست شروع میں درج نہیں اور نہ ہی کتاب کے آخر میں ناموں کا اشاریہ پیش کیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

مولوی صاحب کو زبان و بیان اور ادائے مطلب پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ ان کے اسلوب کی سادگی، صفائی اور روانی ان خطوں میں بھی موجود ہے۔ جگہ جگہ مولوی صاحب کی پرخلوص شخصیت الفاظ کے پردوں سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اردو سے عشق، محنت کی عادت اور مقصد کی لگن۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بنیادی جوہر تھے۔ اور ان خطوں میں یہ اور بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں اور بعض ایسے واقعات کی تفصیل بھی مل جاتی ہے۔ جو مولوی صاحب کے سوانح نگار کے لئے نہایت اہم ہیں۔

محمد اکبرالدین صدیقی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان خطوں کو جگہ جگہ سے تلاش کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے، یہ کام آسان نہیں۔ اس راہ کی مشکلوں کو کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں ایسے کاموں کا تجربہ ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب کا جامع مقدمہ ہے جس میں ان تمام حضرات کی زندگی اور حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے نام کے خط اس مجموعے میں شامل ہیں اور ساتھ ساتھ ان خطوں کا ادبی اور سوانحی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ کتاب اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اور مصنف سے مل سکتی ہے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

---

[1] مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی لکچرار جامعہ عثمانیہ چار قندیل آغا پورہ حیدرآباد دکن۔ صفحات ۲۶ + ۱۹ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت پانچ روپے

جلیل قدوائی

مطائباتِ سالک

سالک راہ فنا صورت شبنم ہوں عزیزؔ[۱]
دامن گل پہ بھی ٹھہروں تو اُسے بار نہ ہو!

سالک صاحب سے میری ملاقات غالباً ۱۹۳۶ء میں میرے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سابق حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات میں چلے جانے کے کچھ دن بعد ہی دہلی یا شملہ میں ہو گئی تھی اس لئے کہ وہ اُردو کے ایک سربرآوردہ اخبار نویس اور روزنامۂ انقلاب کے ایڈیٹر کی حیثیت سے، نیز اپنے دوستوں سے ملنے ان مقامات پر آتے جاتے رہتے تھے لیکن زیادہ رسم و راہ دوسری جنگ عظیم میں ۱۹۴۲ء میں دہلی میں اقامتی تنگی کے باعث حکومت ہند کے اس فیصلے کے بعد کہ اُردو پبلسٹی کا مرکز لاہور رہے جو مرحوم کا مستقر تھا ہے وہاں تبدیل ہو جانے کے بعد پیدا ہوئی۔ ایک پریس کانفرنس میں جو لارڈ ویول وائسرائے ہند کا اوکاڑہ کی منڈی میں گیہوں کے ذخیرے معائنہ کرنے کے بعد فلیٹیز ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی تھی یہ رسم و راہ بے تکلفی میں تبدیل ہو گئی۔ تقسیم کے بعد وہ کراچی تشریف لاتے تھے اور کچھ عرصہ تو ہمارے محکمہ سے تعلق قائم ہو جانے کے سبب ان کا یہاں مسلسل قیام بھی رہا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ ہمارے دفتر تشریف لائیں اور مجھ سے ملے یا میرے پاس کچھ دیر بیٹھے بغیر واپس چلے جائیں۔ موخرالذکر صورت میں خاصی ہماہمی پیدا ہو جاتی اور چند دوسرے اصحاب یا اِدھر اُدھر سے ان کے نیازمند اور مخلص بھی جمع ہو جاتے اور ایک چھوٹی سی محفل آراستہ ہو جاتی جس میں سالک صاحب کے لطیفوں اور حسنِ کلام کو جانِ محفل کی حیثیت حاصل ہوتی۔

سخن آرائی واقعی مرحوم کا حصہ تھی۔ خشک سی خشک محفل میں وہ اپنی بذلہ سنجی اور دلچسپ گفتگو سے زندگی کی لہر دوڑا دیتے۔ ایک مرتبہ اُردو کاتبوں کی ستم ظریفیوں کا ذکر تھا کہ الفاظ کو کچھ کا کچھ بنا کر کس طرح عبارت کے معنی و مفہوم ہی بدل دیتے ہیں۔ فرمانے لگے مجھے اس کا خوب تجربہ ہے۔ مولانا شبلی کا ایک خط نقل کرنے کے سلسلے میں کاتب صاحب نے خاتمہ پر "شبلی عفی عنہ" کو "شبلی تین عدد" کر دیا۔ کسی صاحب کے بارے میں ایک مسودہ میں لکھا تھا۔ "بڑے مرنجاں مرنج انسان تھے"۔ کاتب صاحب کی ستم ظریفی کے

---

[۱] اپنے ایک خط کے سرنامے پر میں نے سالک صاحب کو لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی کا یہ مقطع لکھ کر بھیجا جسے موصوف نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد سے جب ان سے ملاقات ہوتی میں اسی شعر سے موصوف کا خیر مقدم کرتا۔ یہ روایت اس مضمون میں بھی قائم رکھنا چاہتا ہوں۔

بقول ہی صاحب" مرغیاں مرغ" انسان ہو گئے۔ کراچی میں موصوف کا قیام "نگار ہوٹل" میں ہوتا تھا۔ ایک بار ان کی طبیعت کچھ ناساز ہونے کی خبر سنی۔ شدید قبض اور بخار کی شکایت تھی، میں مزاج پرسی کو گیا تو دیکھا مرغ پلاؤ تناول فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا "کوئی دوسری زیادہ ہلکی غذا ہونی چاہیے تھی۔" فرمانے لگے "قدوائی صاحب! کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ معدے کے تمام امراض میں مرغ کا استعمال کس قدر مفید ثابت ہوتا ہے؟" ایک محفل میں ڈاکٹر اقبال کا لطیفہ سنایا جواب مشہور ہو چکا ہے خلیفہ شجاع الدین مرحوم صدر پنجاب صوبائی اسمبلی آبنوس کی مثال سیاہ فام تھے۔ کسی دعوت میں سیاہ سوٹ پہن کر تشریف لائے۔ اقبال نے کہا "خلیفہ صاحب! آج بغیر کپڑے پہنے ہی چلے آئے!" اور سکھوں کے لطیفے تو انہیں اتنے یاد تھے کہ پوری پوری رات سناتے تو ختم نہ ہوتے۔

پختہ کار اخبار نویس تھے اور اپنے مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" میں بڑے بڑے مسائل پر لطیف تبصرے کرتے تھے۔ ان کی طنز عموماً خندۂ زیر لب ہوتی مگر کبھی کبھی اس میں قہقہے کی نشتریت بھی شامل ہو جاتی۔ عبارت اُس وقت کے اردو کے بعض دوسرے مزاحیہ کالم نویسوں کے برخلاف آورد سے بری، ہلکی پھلکی اور رواں دواں ہوتی۔ کسی طرح بوجھل نہ ہوتی۔ پھر بھی معنی خیز ہوتی۔ اس خصوصیت میں اُن سے اُن کے شاگردوں میں حسرت کو کم اور مجید لاہوری کو زیادہ حصہ ملا تھا۔ سالک کی تحریروں کو مہدی افادی کی اصطلاح میں "معالیات" کہنا چاہیے۔ وہ قلم برداشتہ، بغیر حک و اضافہ کے لکھتے اور لکھتے چلے جاتے تھے۔ انہیں ہر موضوع پر لکھنے کی قدرت حاصل تھی۔ "ماہ نو" کی نگرانی میرے سپرد تھی کئی بار میرے دفتر میں بیٹھے بیٹھے مضمون لکھ کر عطا کر دیا۔ یا میں خود خدمت میں پہنچا اور کچھ لکھوا کر لے آیا۔ خط نہایت خوبصورت اور پختہ تھا اور مرتے دم تک اس میں جھول نہیں آیا۔ ان کی تحریر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی تھی۔ مسودات کو پڑھنے یا ان پر نظر ثانی کرنے میں تو کمال حاصل تھا۔ جس زمانے میں ہماری وزارت سے متعلق تھے، خواجہ ناظم الدین کی کئی تقریروں کے ترجمے جو انہیں اپنے ایک طولانی دورے میں ساتھ لے جانے تھے سالک صاحب کو بھیجے گئے۔ سارا پلندہ لئے ہوئے دفتر تشریف لے آئے اور چائے پیتے پیتے انہیں دیکھ ڈالا کم جگہوں پر تبدیلیاں کی تھیں، مگر جہاں کی تھیں عبارت میں جان ڈال دی تھی۔

۱۹۳۷ء میں متحدہ ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریس کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو اودھم مچا رکھا تھا الم نشرح ہو چکا تھا مگر مرکز میں عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے شامل نہ ہونے سے پہلے بھی انہوں نے کچھ کم گل نہیں کھلائے تھے۔ اسی زمانے میں، میں ایک ضروری کام سے اپنے سابق وطن اناؤ گیا تو صوبۂ متحدہ (حال اتر پردیش) کے اسکولوں کی اردو ریڈروں میں چند بڑے دل چسپ اسباق نظر سے گزرے مثلاً محمود غزنوی کو بعض ہندو سورماؤں نے بار بار بری طرح مار بھگایا مگر آخر میں وہ بعض ہندو راجاؤں میں پھوٹ ڈلوانے اور انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا پھر بھی خوف کے سبب اس سے اس سرزمین پر ٹھہرا نہ جا سکا وغیرہ۔ میں نے وہ ریڈریں سالک صاحب کو سفر سے لائے ہوئے تحفے کے طور پر پیش کیں تو مرحوم نے اپنے کالم میں مزہ لے لے کر بڑے ہی لطیف انداز میں ان کتابوں پر تبصرے کئے

مرحوم سے مجھ سے خط وکتابت کم رہی۔ ان کے جو خطوط مل سکے حاضر ہیں۔ جیسا کہ ان پر ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں، وہ اپنے دوستوں کے کام آنے میں ماہر تھے۔ ان خطوط میں ان کی سیرت کا یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ یہ خط وکتابت کم وبیش اس عرصہ پر محیط ہے جب وہ بیمار چلے جا رہے تھے۔ میری شرمندگی مسلّم ہے، مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علالت تک میں اپنے دوستوں کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے۔

(۱)

مسلم ٹاؤن لاہور

۲۰ر اپریل ۱۹۵۷ء

برادرِ محترم، السلام علیکم۔

کارڈ ملا، میں نے پبلشر سے بات کی ہے لیکن وہ لوگ آج کل درسی کتابوں کی منظوری اور اشاعت میں بے طرح الجھے ہوئے ہیں اور کسی تجویز پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دو تین ہفتے گزر جانے دیجئے انشاء اللہ دونوں کتابوں کے متعلق بات چیت کرکے آپ کو اطلاع دوں گا۔[۱]

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

(۲)

مسلم ٹاؤن لاہور

۱۰ر جولائی

محترمی ومکرمی، السلام علیکم۔

مدت سے آپ کا کارڈ آیا رکھا ہے جس میں لکھا تھا کہ کتابیں ارسال کرنے کے بعد اطلاع دوں گا، لیکن کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ میں نے پبلشر کو اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ کتابیں آ رہی ہیں لیکن اب تک پبلشر نے بھی مجھے اطلاع نہیں دی کہ کتابیں آ گئی ہیں۔ ازراہِ کرم لکھئے کیا آپ نے کتابیں میسرز احسن برادرز بیرون لوہاری دروازہ، لاہور کو بھیج دیں، اور بلٹی بھی روانہ کر دی۔

جلد سے جلد مطلع فرمایئے اور عدمِ ترسیل کی وجہ بھی لکھئے۔

(۳)

مسلم ٹاؤن، لاہور

۲۳ر جولائی

برادرِ مکرم، السلام علیکم ——— کتابوں کی بلٹی میسرز محمد احسن کو مل چکی ہے۔ پارسل بھی چھڑا لیے جائیں گے

---

[۱] مرحوم نے میری دو کتابوں کی یکمشت خریداری کی بات چیت کرکے، جیسا کہ آئندہ خط سے معلوم ہوگا ایک پبلشر سے معاملہ طے کرا دیا تھا۔

اور پبلشروں کی طرف سے آپ کو کتابوں کی مفصل رسید پہنچ جائیں گی۔ ۲۵م ؁ کے معاملے کے متعلق بھی ان سے ذکر کروں گا امید ہے کہ وہ مان جائیں گے لیکن اگر بفرض محال نہ بھی مانیں تو آپ محسوس نہ کریں۔ یوں اپنی طرف سے کوشش ضرور کرونگا اور ستمبر میں یہ رقم بھجوانے کا بندوبست بھی کروں گا۔

ریٹائر ہونے کے بعد کیا کرنا ہوگا، اس کے متعلق تو سوچنا چاہیئے۔ کیونکہ محض کتابیں لکھکر پبلشروں کو دینا تو کوئی معتدبہ آمدنی نہیں دے سکتا۔ آپ کی مطبوعات و مسودات کے سلسلے میں گفتگو وقت پر کی جائے گی لیکن مشغلۂ بعد سبکدوشی کے متعلق کوئی زیادہ مستقل انتظام سوچنا چاہیئے۔ آپ کے پیش نظر کیا کیا تدبیریں ہیں لکھئے تو مشورہ عروض کروں، پنشن کتنی ملے گی اور مزید کتنی رقم چاہیئے، جس میں حسب معمول گزران ہوتی رہے۔ تفصیلی نقشہ سامنے ہو تو شاید کوئی عملی تدبیر ذہن میں آجائے۔ والسلام

(۴)

محترمی۔ السلام علیکم

کئی روز ہوئے آپ کا ایک خط آیا تھا جس میں آپ نے اپنے حالات لکھے تھے۔ اگر آپ نے سبکدوشی کے بعد لاہور میں قیام کرلیا تو ظاہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا کہ آپ کو کوئی نہ کوئی کام مل جائے اور آپ بے فکری سے زندگی بسر کرسکیں۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ کو بھی کہیں نہ کہیں ضرور کام مل سکتا ہے لیکن بہرحال اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ خاص لاہور میں ان کے لئے آسامی کا نکل آنا ذرا وقت طلب ہے۔

بہتر یہی ہوگا کہ جب آپ سبکدوش ہوں تو بدستور کراچی ہی میں رہیں۔ اگر بالآخر لاہور ہی میں رہنا مقصود ہو تو اس نقل مکانی میں بھی تدریج زمانی مدنظر رہنی چاہیئے۔ آہستہ آہستہ کراچی کو "لف" کرکے لاہور میں "نشر" کرنا بہتر ہوگا۔ اس طرح انشاء اللہ تمام معاملات رو براہ ہوجائیں گے۔ فوری طور پر کچھ انتظام ہوجانا بے حد محال ہے۔

بچی کے لئے فاطمہ جناح کالج کا پراسپکٹس اور فارم داخلہ ارسال خدمت ہے۔[۱]

مسلم ٹاؤن، لاہور

۱۲ر اگست

---

[۱] میری بڑی لڑکی ڈاکٹر پروین نے مرحوم ہی کی ہدایت پر لاہور کے متذکرہ کالج میں داخلہ لیا تھا جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا اسی زمانے سے بیمار رہنے لگے اور بڑے متاسف تھے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کرسکے۔

(۵)

مسلم ٹاؤن، لاہور

۸ اکتوبر

مکرمی، السلام علیکم

آپ کا کارڈ ملا تھا لیکن میں صحت ہو جانے کے باوجود نقاہت کا شکار رہا اور کہیں آنا جانا خارج از بحث تھا۔ اب کسی قدر ہوش آیا ہے۔ پروین کی پریشانی طبعی ہے۔ وہ بالکل ہی بچہ ہے، اس لئے کچھ مدت نئے حالات میں دقت ضرور ہوگی۔ میں انشاء اللہ پرنسپل صاحب اور بیگم تاثیر[1] کو تاکید کروں گا۔ کہ خاص خیال رکھیں اور خود بھی کسی دن شام کو ہوسٹل میں پروین سے ملنے جاؤں گا۔

اس بے وقت کی بیماری نے جہاں اور بہت سے کاموں سے مجھے قاصر رکھا وہاں ایک کام یہ بھی ہے کہ پروین کی خبر گیری نہ ہو سکی۔ خیر، انشاء اللہ چند روز میں صحت ایسی ہو جائے گی کہ ادھر ادھر گھوم پھر سکوں گا۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

(۶)

مسلم ٹاؤن، لاہور

۷ نومبر ۵۷ء

برادر مکرم، السلام علیکم

آپ کا کارڈ ملا۔ میری طبیعت اب فی الجملہ بہتر ہے۔ لاہور کے مشہور ڈاکٹر محمد یوسف علاج کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خرابیٔ معدہ یا کچھ اور نہیں ہے۔ بلکہ قلب کا معاملہ ہے۔ بہرکیف اب طبیعت اچھی ہے لیکن کھانے پینے، چلنے پھرنے پر پابندیاں ہیں۔ یہی بے حرکتی ہے جس کی وجہ سے میں اب تک عزیزہ پروین کی خبر بھی نہیں لے سکا۔ لیکن یقین ہے اب اس کا دل لگ گیا ہوگا۔ انشاء اللہ دو چار دن میں ذرا درست ہو کر اس کے حالات معلوم کروں گا۔ بیگم خلیل کی خدمت میں آداب و نیاز ــــــ رزاقی[2] صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے۔

---

[1] فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور میں غالباً طالبات کی ویلفیئر آفیسر تھیں۔

[2] رشید رزاقی مرحوم، حکومت پاکستان میں میرے ساتھ انفارمیشن افسر تھے۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے اور سالک صاحب ملاقات کو تشریف لاتے تھے تو ان سے اور بعد میں بعض دوسرے سرکاری کارے جن کی نشست میرے ساتھ تھی ان کی اچھی رسم ہو گئی تھی۔ رزاقی مرحوم پنڈی میں موٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ پاکستان کے منتخب اخبار نویسوں میں تھے۔ قبل تقسیم ہندوستان کی خبر رساں ایجنسی اے پی آئی میں اپنی قابلیت سے اس وقت منتخب ہوئے تھے جب مسلمانوں پر اس کا دروازہ بند تھا۔ ریاست حیدرآباد دکن میں عارضی طور پر ڈائرکٹر آف انفارمیشن بھی رہ چکے تھے۔

(۷)

مسلم ٹاؤن، لاہور

۲۶؍ جنوری

مشفقی و مکرمی، السلام علیکم،

آپ کے دو مفصل خط مل گئے تھے۔ اب ایک کارڈ ملا۔ میں نہایت شدید بیمار ہو گیا تھا۔ اب بھی نقاہت اس قدر ہے کہ دو سطریں بھی لکھنا بار ہے۔ ذرا ہوش آتا ہے تو مولوی شفیع صاحب[1] سے آپ کے متعلق بات کروں گا۔ آپ کی محبت اور فکرمندی کے لئے شکرگزار ہوں۔

(۸)

مسلم ٹاؤن لاہور

۲۸؍ فروری

مکرمی و محترمی، السلام علیکم،

آپ کا خط ملا، میری صحت تو اب درست ہے۔ لیکن عمر کے تقاضے کی وجہ سے کمزوری ابھی چلی آتی ہے۔ اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ انسائیکلو پیڈیا والوں کے ہاں سے کوئی معتدبہ کام آپ کو مل سکے گا تو یہ صحیح نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جتنا کام سمجھیں گے آپ کو بھیجیں گے اور وہ "بقدر کفاف" ہرگز نہ ہوگا۔ اس لئے آپ اس کام پر تکیہ نہ فرمائیں۔ اس کی حیثیت یونہی ضمنی سی ہے۔

توسیع ملازمت وغیرہ کی صورت ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ آپ کوشش کیجئے کہ کراچی ہی میں کوئی بندوبست ہو۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن میں تقرر مشکل ہے۔ وہ اگر عمر کی قید نہ بھی رکھیں تو محکمہ تعلیم کے کسی تجربہ کار آدمی کو لے لیں گے۔

مولوی ہاشمی کے ڈیولپمنٹ بورڈ میں کوئی صورت نکل سکتی ہے اور ممتاز حسن صاحب کو توجہ دلانے والے آپ کو کراچی میں متعدد مل سکتے ہیں۔ غرض مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی بندوبست کراچی ہی میں ہو جائے گا۔ لاہور میں چند در چند دقتیں اور رکاوٹیں ہیں آپ شیخ اکرام صاحب سے ضرور ملیں۔ وہ ممتاز حسن صاحب سے بات کریں تو کوئی صورت نکل آئے گی۔

میں ابھی گھر ہی پر ہوں باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی

---

[1] پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم صدر شعبۂ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی جن سے کچھ کام ملنے کی بات چیت ہو رہی تھی۔

(۹)

مسلم ٹاؤن لاہور

۳ر مئی

مکرمی محترمی، السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میری صحت فی الجملہ تو اچھی ہے۔ لیکن کبھی نزلہ، کبھی سوءِ ہضم، کبھی کچھ اور عارضہ رہتا ہی ہے۔ بہرحال بسر ہو رہی ہے۔ آپ کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ میں نے مجید ملک صاحب کو لکھ دیا ہے ممکن ہے وہ توجہ فرمائیں۔[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے چیئرمین صاحب سے ملوں گا۔ لیکن جہاں تک میں مولوی صاحب کو جانتا ہوں وہ آپ کو کراچی میں کام دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ میں کراچی جانے سے پہلے تصحیح کا کام کیا کرتا تھا۔ جب کراچی چلا گیا تو اصرار کے باوجود مولوی صاحب نے مجھے وہاں ایک پیسے کا کام نہ بھیجا۔ اس کے علاوہ انسائکلو پیڈیا کا کام بھی آج کل کچھ رک سا گیا ہے۔ توجہ زیادہ تیار مسودے کی چھپائی پر مرتکز ہو رہی ہے۔ بہرحال مولوی صاحب سے ضرور ذکر کروں گا۔

میرا تو خیال ہے کہ آپ کو غالباً وہیں توسیع مل جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو بہرحال کوشش تو کریں ہی گے کہ کہیں نہ کہیں صورت نکل آئے۔ اللہ مالک ہے۔

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔ بیگم صاحبہ قدوائی کی خدمت میں میری جانب سے آداب پہنچا دیجئے۔ بچوں کو دعائیں۔

(۱۰)

مسلم ٹاؤن، لاہور

۱۰ر مئی

محترمی، السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ خدا کرے آپ کی توسیع ملازمت کا کچھ بندوبست ہو جائے اور آپ کے تفکرات کم ہوں پنشن کے بعد کسی کام کی تلاش بہرحال کچھ وقت چاہے گی۔ انسائیکلو پیڈیا والوں سے بات ہوئی تھی۔ آج کل بعض وجوہ سے نظر ثانی کا کام زیادہ تر رکا ہوا ہے، کیونکہ جو ترجمے ہوئے تھے ان کی نظر ثانی ہو چکی اور مزید کام ابھی زیادہ تر بند ہے۔ میں برابر دریافت کرتا رہوں گا۔ جونہی کوئی امکان پیدا ہوا، انشاء اللہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔

امید ہے کہ آپ مع متعلقین کے خیریت سے ہوں گے بیگم صاحبہ قدوائی کی خدمت میں آداب اور بچوں کو دعا۔

---

[1] کرنل مجید ملک ہمارے پرنسپل انفارمیشن آفسر تھے اور میرے ذاتی قدیمی دوست بھی ہیں [illegible] انہیں حکومت کو میری توسیع ملازمت کی سفارش کے لئے از خود لکھ دیا تھا۔

(۱۱)

مسلم ٹاؤن، لاہور

یکم فروری ۵۹ء

برادرم مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ کل میں نے مولوی شفیع صاحب سے ٹیلیفون پہ بات کی تو معلوم ہوا کہ آپ کے اور ان کے درمیان خط وکتابت ہو چکی ہے اور وہ آپ کو لکھ چکے ہیں کہ اگر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے فیسیکول کراچی میں آپ کو دستیاب ہو سکیں تو لکھئے کہ دفتر سے آپ کو وہ مقالات لکھ کر بھیجے جائیں جن کا ترجمہ مطلوب ہے، بس وہ کام آپ کیجئے گا۔ جس کا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب لاہور سے باہر کسی شخص کو انسائیکلو پیڈیا کا کوئی فیسیکول بھیجنے کا خطرہ قبول نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اگر ایک فیسیکول بھی گم ہو جائے تو پورا انسائیکلو پیڈیا بے کار ہو جاتا ہے۔

آپ کسی مقامی لائبریری سے بات کرکے ان سے فیسیکول استعمال کرنے کی اجازت لے لیں اور مولوی صاحب کو اطلاع دے دیں تاکہ کام بھجوایا جاسکے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ جلیل کی خدمت میں آداب۔ میری نقاہت ابھی چل رہی ہے، تحریر ہی سے معلوم ہو رہا ہوگا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے انتقال نے کمر توڑ دی۔ بڑا فاضل، بڑا فلسفی، بڑا محفل آرا، خوش مزاج، نیک آدمی تھا۔ خیر یہی راستہ سب کو درپیش ہے۔ اللہ مغفرت کرے۔

(۱۲)

مسلم ٹاؤن لاہور

۱۹ر فروری

مشفقی حضرت جلیل۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ ابھی میری طبیعت پوری طرح اچھی نہیں ہوئی۔ لیکن فی الفور مولوی صاحب کو فون کیا اور غالباً انہوں نے آپ کو کام بھجوا دیا۔ کم از کم انہوں نے مجھ سے یہی فرمایا ہے۔

اب آپ ازراہ کرم اتنا اہتمام کیجئے کہ ترجمہ خط شکستہ میں نہ لکھئے بلکہ صاف صاف ما یُقرئ طریق پر لکھئے کہ لفظ لفظ الگ الگ پڑھا جائے کیونکہ مرحبگہ کے نقل نویس یا کاپی نویس شکستہ نہیں پڑھ سکتے۔ یہ امر خاص طور پر ضروری ہے۔

کامل صحت کے لئے دعا کا طالب ہوں۔

(۱۳)

مسلم ٹاؤن لاہور

۱۱ر اپریل

مشفقی و مکرمی۔ السلام علیکم

آپ کا خط کئی دن سے آیا پڑا ہے۔ صرف کمزوری اور لکھنے پڑھنے سے بے زاری تحریر جواب میں حائل ہوئی۔ ابھی طبیعت قطعی طور پر بحال نہیں ہوئی۔

میں نے آپ کی سبکدوشی کا حال اخباروں میں پڑھا، خیر کوئی وسیع ملازمت ہو جاتی تو بہتر ہوتا لیکن جو خدا کو منظور۔

مع متعلقین کے مری جانے کا ارادہ مبارک ہے۔ ضرور جائیے اور نئے سرے سے دماغ کو تر و تازہ کر آئیے۔ فرینکلن والوں سے بات کروں گا اور خیال یہ ہے کہ شاید کوئی کام نکل آئے۔

میری عمر ۷۶ سال سے اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ صحت کامل کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ نے میری کتابیں طلب کی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ میرے پاس بعض کا صرف ایک ایک نسخہ ہے اور بعض سرے سے ہیں ہی نہیں۔ پبلشروں سے بات کروں گا۔ اگر وہ مہربانی کرسکیں تو ضرور حاضر خدمت کروں گا۔

(۱۴)

مسلم ٹاؤن لاہور

۲۷ر اگست

برادرم، السلام علیکم،

آپ کا گرامی نامہ ملا، میری طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ لیکن ابھی فراش ہی ہوں کہیں آنے جانے اور پڑھنے لکھنے کی نہ توفیق ہے نہ اجازت۔ ڈاکٹروں کا خیال یہ ہے کہ موسم گرما کے خاتمے پر طبیعت درست ہو جائے گی۔ اور معلومات سابقہ بڑی حد تک دوبارہ جاری ہو جائیں گے۔

پریذیڈنٹ صاحب نے جو وظیفے کا اعلان کیا تھا اس پر چار ماہ گذر چکے ہیں لیکن اب تک عملاً ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوا۔ خدا جانے حکومت کے دفاتر کی یہ کیا کیفیت ہے۔ میری مالی مشکلات روز افزوں ہیں۔ سال بھر سے آمدنی مسدود ہے۔

یہ ادارہ نگارشِ مطبوعات کیا چیز ہے[۱] ؟ آپ نے اپنی موجودہ مصروفیتوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

امید ہے آپ مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔ بیگم طلیل کی خدمت میں آداب

---

[۱] انہیں دنوں یہ ادارہ میں نے قائم کیا تھا جو دو کتابیں شائع کر چکا ہے۔

(۱۵)

مسلم ٹاؤن لاہور
۸ ستمبر ۵۹ء

مجی و مکرمی، السلام علیکم، آپ کا کارڈ ملا۔ آپا نذر سجاد[1] نے بالکل صحیح کہا۔ گذشتہ دسمبر میں انتہائی خطرناک طور پر بیمار ہو گیا تھا اور اڑتالیس گھنٹے آکسیجن پر رکھا گیا تھا۔ خیر اللہ نے فضل کیا اب میری طبیعت اچھی ہے۔ صرف کمزوری چلی آتی ہے۔ ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش علاج کر رہے ہیں جن سے بڑا ڈاکٹر پاکستان میں موجود نہیں۔ لیکن اصل شفا تو شافی مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ لکھنے پڑھنے کی طاقت ذرا بہت ہو جائے تو سمجھوں کہ صحت ہو گئی۔ آپ سے دعائے صحت کا طالب ہوں۔

(۱۶)

مسلم ٹاؤن، لاہور
۲۹ ستمبر ۵۹ء

مشفقی و مکرمی، آداب[2]

آپ کا کارڈ ملا۔ میری طبیعت روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ خدا کرے یہ بہتری بے خلل جاری رہے اور صحت کامل ہو جائے۔

سید ہاشمی صاحب کے متعلق مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں ہوا کہ وہ لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ اگر وہ مجھے کسی مشورے کے سلسلے میں کوئی حکم دیں گے تو حسب توفیق و استطاعت ضرور تعمیل کروں گا۔[3]

"پطرس نمبر" نے بہت سی پرانی یادیں تازہ کر دیں اور وہ زمانہ یاد آ گیا جب ہم حقیقتاً زندہ تھے اور احباب کی محفل آباد تھی۔ حسرت، تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، بخاری وغیرہ کے مرنے کے بعد انتہائی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ انسان کی عمر میں یہ مرحلہ نہایت دردناک ہوتا ہے جب اسکے ہم ذوق اور بے تکلف دوست باقی نہ رہیں اور وہ نئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو موافق نہ بنا سکے۔

ملنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ کیا مستقبل قریب میں آپ لاہور نہیں آ رہے ہیں؟ کتنی عجیب بات ہے کہ جب سے میری بھتیجی یہاں تعلیم حاصل کرنے لگی، اسی زمانے سے میں بیمار چلا آ رہا ہوں اور ایک دفعہ بھی اسکی پرسش کا فرض ادا نہیں کر سکا۔ بیگم جلیل آداب قبول فرمائیں۔

---

[1] مشہور مصنفہ بیگم سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم، عزیزہ قرۃ العین حیدر کی والدہ، ہمارے خاندان کی مربیۂ محسنہ ان دنوں کراچی میں تھیں

[2] جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ سالک صاحب کا آخری خط ہے یعنی اسکے بعد وہ کسی کو خط نہیں لکھ سکے۔ اس لئے کہ فوراً بعد موت نے ان کا زندگی سے ہمیشہ کے لئے رشتہ منقطع کر دیا۔ اس خط کی داستان بڑی ہی دردناک ہے۔ ۲ ستمبر کی صبح کو ڈان میں مرحوم کی وفات کی خبر پڑھی تو جی دھک سے ہو گیا۔ یقین ہی نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاک سے یہ خط ملا۔ اب تو طبیعت نے ان کی موت کا یقین کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا مجھے خط لکھ کر ڈاک میں ڈلوایا اور کسی کام سے موٹر میں باہر گئے۔ راستہ سے گھر واپس آئے، کچھ ساتھ لینا بھول گئے تھے۔ مگر گھر موت واپس لائی تھی۔ کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ قلب کا دورہ پڑا اور اسی دم اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خط اور زیر اِ مضمون اسی زمانے میں "قومی زبان" میں چھپے تھے۔

[3] ان دنوں عبدالحق جوبلی کمیٹی کے پروگرام کے بارے میں مشورہ لینے لاہور تشریف لے گئے تھے۔

ملاذ حسین عارف

ثاقب لکھنوی اور ان کی ادبی محفلیں

میرزا ذاکر حسین ثاقب کا وطن مالوف طبرستان ، مولد اکبر آباد اور گہوارۂ تربیت لکھنؤ تھا۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش
ندرانی المعروف بہ علی قلی خان ، شاملو سے ملتا ہے جو موصوف کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اور شاہ ایران طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ امرائے
ہار میں سے تھے۔ تقریباً ڈھائی سو سال کا زمانہ گذرا ثاقب کے اسلاف کو اقتصادی کش مکش کی بنا پر طبرستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آنا پڑا
زا کے اجداد نے اکبر آباد جیسے مرکزِ علم و ادب کو اپنا مستقر بنایا جس کی داغ بیل شہنشاہِ اکبر اعظم نے کچھ ایسی مبارک ساعت سے ڈالی تھی کہ
وڑے ہی عرصہ میں اکبر آباد علوم و فنون کا مرکز ہو گیا تھا۔ اور ارباب کمال جوق در جوق وہاں مجتمع ہونے لگے تھے۔ اسی گہوارۂ تہذیب و
تن نے میر و غالب جیسے ناخدایانِ سخن کو جنم دیا اور اسی مرکزِ علم و فن میں ثاقب بھی ۱۸۶۹ء میں تولد ہوئے۔

ثاقب کی خاندانی وجاہت ہندوستان میں بھی برقرار رہی۔ ان کے اسلاف میں بہت سے حضرات اپنی ذاتی قابلیت اور علم و فضل کی
، پر اچھے مراتب پر فائز رہے۔ ان کے والد آغا محمد عسکری قزلباش ایک عرصۂ دراز تک سرکاری ملازم رہے۔

ثاقب شیر خوارگی کے عالم میں تھے کہ والدین بعض ناساعد حالات کی بنا پر اکبر آباد سے مراجعت کرکے لکھنؤ آ گئے۔ فکرِ معاش کی بدولت
ان کو ایک جگہ قرار نہیں ملتا ، چنانچہ پندرہ سولہ سال تک الہ آباد میں سرکاری ملازمت کے سلسلہ سے ان کے والد کا قیام رہا اور ثاقب ان کے
راہ رہے۔

دلی تاراج ہوئی تو لکھنؤ زبان و ادب کا مرکز قرار پایا۔ میرزا اسی زبان کی چاشنی سے بہرہ ور ہوتے جسے ناسخ و آتش اور انیس و دبیر
ے سے ارباب کمال نے نکھار کر تمام کثافتوں سے مصفیٰ کیا تھا۔ میرزا کی تعلیم اردو ، فارسی ، عربی سے حاصل ہوئی۔ انگریزی میں وہ انٹرمیڈیٹ
سے آگے نہ بڑھ سکے جو انھوں نے سنٹ جانس کالج آگرہ میں حاصل کی جہاں حسنِ اتفاق سے ان کی ملاقات میر حسین صفی امروہوی شاگرد رشید
شعراء مہدی علی خان ذکی مراد آبادی سے ہو گئی صفی اپنے زمانہ کے مشہور و معروف ادیب ، انشاء پرداز ، ماہرِ فن شاعر مانے جاتے تھے ، اور
ردو ، فارسی ، عربی زبانوں میں مصنف و مولف کا درجہ رکھتے تھے۔ صفی سے تقرب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ثاقب کی فطری صلاحیتیں ابھریں اور
وڑے ہی عرصہ میں اچھے خاصے شعر کہنے لگے۔

جذبات کا جوار بھاٹا ، احساسات کے اونچ نیچ ، تمناؤں کا ہجوم ، ناکامیوں کی تلخیاں ، نیرنگئ خیالات ، فراوانی تجربات ، فریب

کاری نفس انھیں کیفیتوں سے دوچار ہوکر انسانی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی کشمکش کا نام زندگی ہے۔ اسی میں انسان نکھر کر منظر عام پر آنے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ ذوقِ فطری کا خاصہ ہے کہ اگر انھیں دبایا جائے تو ہیجان برپا کر دیتے ہیں۔ حکمائے نفسیات کا قول ہے کہ جذبات کو روکئے نہیں۔ ضرورت پڑے تو دھارے کو بدل دیجئے۔ ثاقب کے والد ماجد کو ان کے اس شغلِ طبعی سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انھیں اپنے جیسا وکیل بنا دیکھنا چاہتے تھے، اور اس لئے انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دیں مگر کامیاب نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ ثاقب کا ذوقِ فطری آمادۂ پیکار ہوکر دفعتاً منظرِ عام پر آ گیا۔ جن دنوں آغا محمد عسکری قزلباش الہ آباد میں پریکٹس کرتے تھے انھیں ایام میں شہزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دہلوی وہاں انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ شاہزادہ موصوف اور آغا صاحب کے مابین اچھے مراسم تھے۔ ایک شب فروغ کے یہاں چند مخصوص احباب کی صحبت تھی جس میں ذکریا خان زکی، شاگرد غالب نجم الدین خان برق، شاگرد مومن، خواجہ غلام غوث بیخبر اور شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان دہلوی جیسے عالم و ادیب رونق افروز تھے۔ اتفاق سے ثاقب کی بھی اس بزمِ شعر و ادب میں رسائی ہو گئی۔ شعر و شاعری کی محفل گرم تھی ہی۔ ایسی منتخب محفل میں ایک مبتدی کا زبان کھولنا ہی بڑی جرأت کا کام ہے لیکن انھوں نے موقع پا کر اپنا کلام سنایا۔ حاضرین میں سے کسی نے تحسین کی۔ کچھ نے باوجود ہی نہ کیا۔ اس قدر صغر سنی اور کلام میں اتنا سوز و گداز! چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ شاہزادہ صاحب نے ان کا امتحان لینا چاہا۔ مگر ثاقب کے سن و سال نیز ان کے والد سے اپنے تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مصرعِ پر گرہ لگانے کی فرمائش کی۔ ثاقب فوراً تعمیلِ حکم کے لئے تیار ہو گئے۔ مصرع دیا گیا۔

"برماتے ہیں چرخ کے سینے پہ پھٹا پھٹ"

ثاقب نے ذرا سے غور و خوض کے بعد گرہ لگائی

ایسے ہیں مرے نالہ و افغاں کے کبوتر

حاضرین اس بدیہہ گوئی پر کافی محظوظ ہوئے اور تحسین و آفریں فرمائی گئی۔ برق نے ایک اور مصرع دیکر غزل کی فرمائش کی۔ ثاقب نے تھوڑی دیر کی کاوش میں ایک مرصع غزل کہہ کر حاضرین کو سنائی۔ شاباش و آفریں کی صداؤں سے پوری محفل گونج گئی۔ مصرع تھا:

نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں، نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

ثاقب نے جو گرہ اس مصرع پر لگائی وہ ہے؛

نہ وہ مہر و ماہ کی تابشیں، نہ وہ اختروں کی نمائشیں

غزل ملاحظہ ہو ؎

رُخ و زلف کا ہوں فسانہ خواں، یہی مشغلہ یہی کام ہے ✤ مجھے دن کا چین عذاب ہے، مجھے شب کی نیند حرام ہے

ترے انتظار میں ہے تعب، یہ مریضِ ہجر ہے جاں بلب ✤ کہیں آ بھی وعدہ خلاف اب کہ یہاں تو کام تمام ہے

کبھی حسرتوں کا ہجوم کیا، دردِ دل تک آ کے وہ بے وفا ✤ مجھے یہ سنا کے پلٹ گیا کہ یہاں تو مجمعِ عام ہے

نہ وہ مہر و ماہ کی تابشیں، نہ وہ اختروں کی نمائشیں، ✤ نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں، نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

تپِ غم سے ہوتی ہے اب مفر کہ طبیب مرگ ہے چارہ گر ٭ مرا قصہ آج ہے مختصر، مری داستان تمام ہے

ہیں کہاں وہ ساقیِ تند خو کہ ہے میکدہ میں یہ ہا یہو ہو ٭ کہیں سرنگوں ہیں خم و سبو، کہیں شیشے کہیں جام ہے

نہیں دل کو فکر یہ بے سبب گیا دن کہاں ہوئی رات کب ٭ مجھے روزِ وصل یہ ہے عجب، ابھی صبح تھی، ابھی شام تھی

نہ ہے میہمانِ حریمِ دل، نہ خیال اس کا مقیمِ دل ٭ ہوئی قطع رسمِ قدیمِ دل، نہ پیام ہے نہ سلام ہے

کہیں حسن والوں کے درمیاں یہ غزل سُنی تو کہاں سُنی
یہ ہے نظمِ ثاقبِ خوش بیاں یہ اسی کا طرزِ کلام ہے

یہ تھی ثاقب لکھنوی کی پہلی ادبی محفل۔ حاضرین ان کا کلام سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ خان نے یہاں تک کہا کہ میاں صاحب زادے! اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہوں گے۔ ثاقب کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی مگر وہ اپنا مقام جانتے اور فطری منکسر المزاجی کی دلیل میں اپنے کو ہمیشہ ناخلفائے سخن کے گلشن کا خوشہ چین سمجھتے رہے۔ کہتے ہیں ؎

جانشینیِ میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں　　　وہ خدائے فن تھے ان سے مجھ کو کچھ نسبت نہیں

میرزا اخلاق کے بلند، عادات کے سادہ واقع ہوئے تھے۔ بڑے متواضع اور منکسر المزاج لیکن بڑے خوددار اور بناوٹ سے کوسوں دور، راست گو، مروت شعار، شہرت و نمود سے گریزاں، تحسین و ستائش سے بے پروا مخلص و با وضع۔ اور ام و کمال اوصافِ حمیدہ ان کے کلام میں جاری و ساری ہیں۔ سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے، وہ اپنے ہم جنسوں میں شاعر ہو گئے۔

ثاقب کی دوسری ادبی محفل جو دلی میں منعقد ہوئی وہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ قاری سرفراز حسین جو کئی ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے کافی مشہور تھے۔ ان کے یار دیرینہ اور عقیدت مندوں میں سے تھے انھوں نے اُستادِ ذوق کی غزل "جو آئے ہے ہے" کی طرح میں تھی۔ اس طرز پر ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ اس مخصوص نشست میں علاوہ اور خاص احباب کے پنڈت رام آنجہانی مصنف "خمخانۂ جاوید" بھی شریک تھے۔ صاحبِ محفل کی فرمائش پر ثاقب نے مندرجہ ذیل غزل وہیں بیٹھ کر کہی اور بعد پڑھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اس کے در سے روک کر، مجھ کو کوئی کیا پائے ہے ٭ نامرادوں کو بھی ایک دن مدعا مل جائے ہے

لاکھ میں اس کو سنبھالوں پھر بھی تڑپا جائے ہے ٭ کیا کہوں، اس سے، دل ایسوں سے کوئی بہلائے ہے

اک نہ اک دن آ ہی جائے گا ترس ظالم کو بھی ٭ دل کی صورت اب زمانہ بھی پلٹتا جائے ہے

خاطرِ غم تا کجا! یہ میہماں تو راست دل ٭ یا لہو دل کا پئے ہے! یا کلیجہ کھائے ہے

دید کے قابل نہیں ہے صورتِ انجام کار ٭ تم سے کیوں کر زخم میرے دل کا دیکھا جائے ہے

تھما نہ رووں کس لئے اور وہ نہ تڑپے کس طرح ٭ جتنی طاقت دل میں ہے، اتنا مجھے بہلائے ہے

بزم کی راحت وہی ہیں شمع کی محنت کو دیکھ   کیا یوں ہی سر کا پسینہ پاؤں تک آ جاتا ہے

نواب بہاؤ الدین احمد خاں طالب دہلوی جو نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے بڑے بھائی اور فصیح الملک نواب میرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ثاقب سے ان کی گہری دوستی تھی۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر جلسۂ احباب میں فی البدیہہ ایک غزل ثاقب نے کہی اس کے چار شعر ملاحظہ ہوں:

تختۂ رہِ غربت کا ہوں، داغِ کفِ پا ہوں ؛ وہ گل ہوں کہ میں چشم و چراغِ کفِ پا ہوں

جادے سے الگ، خاکِ بیاباں سے ہم آغوش ؛ گم کردۂ منزل کا سراغِ کفِ پا ہوں

تلوؤں سے مرے خون یہ کہتا ہے نکل کر ؛ میں بادۂ سرجوشِ ایاغِ کفِ پا ہوں

خواہش ہے یہ اے گرمیٔ راہِ طلب ست ؛ جل کر ہمہ تن صورتِ داغ کفِ پا ہوں

دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن رئیس لاہور نے ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر صدارت ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، الٰہ آباد میں منعقد کیا۔ اس محفل میں علاوہ اور ممتاز ہستیوں کے سید محمد سلیمان شاہ چیف جسٹس الٰہ آباد ہائی کورٹ زینت افروز بزم مشاعرہ تھے مصرع طرح تھا

ہمارا نالۂ دل کیا کرے گا با اثر ہو کر

ثاقب لکھنوی نے غزل پڑھی۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؂

خبر جب ہو نہ پھولوں کو، تو مر جائے بے خبر ہو کر ؛ چمن کی دھن، قفس میں کس لئے بے بال و پر ہو کر

لگا دی آگ دل میں، دیدۂ گریاں نے تر ہو کر ؛ بہا دامن میں شامِ غم کے، اپنی شمع سحر ہو کر

وہ رشتۂ دوست جو تقدیر سے ایک روز پہنچا تھا ؛ مرے سینے کے اندر رہ گیا داغِ جگر ہو کر

مرے صد پارہ دل میں زندگی کب تک چھپتی رہی ؛ اجل کو راستہ بتلا دیا، زخموں نے در ہو کر

مرے ضائع شدہ نالوں کی مجھ کو یاد دلوا دی ؛ جہاں والوں نے محوِ نالۂ مرغِ سحر ہو کر

ابھی تو نقطۂ موہوم ہستی ہوں زمانے میں ؛ کسی دن دیکھ لینا، پھیل جاؤں گا خبر ہو کر

وجودِ بے ضرر ہوں، باغباں گلشن میں رہنے دے ؛ کسی جا پڑ رہوں گا سایۂ برگ شجر ہو کر

سمجھ میں عالمِ غربت کے قصے آ نہیں سکتے ؛ ہماری منزلوں کو دیکھ لیجے ہم سفر ہو کر

نہیں معلوم پائے سعی میں کانٹے کہاں کے ہیں ؛ مرادیں ہٹ کے چلتی ہیں، نکلتا ہوں جدھر ہو کر

ہزاروں کاروانِ غم ہیں منزل پھر بھی خالی ہے ؛ یہ دل کتنا بڑھا اے دوست، تیری رہگزر ہو کر

نہیں ہے قوتِ پرواز تو رہنا مبارک ہو
چمن کی سیر کر ثاقب یوں ہی بے بال و پر ہو کر

پروفیسر شیخ مہدی حسین ناصری فیلو الہ آباد یونیورسٹی، ثاقب کے مخصوص دوستوں میں تھے۔ مسلم ہوسٹل کی بزم سخن کی طرف سے ایک
ر منعقد کیا گیا۔ اس میں چیدہ احباب اور مخصوص شعراء کے علاوہ ثاقب لکھنوی بھی شریک تھے۔ انھوں نے بھی ایک غزل پڑھی جس
یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

محبت ہو گئی تھی عشق کو اتنی مرے دل سے ؛ کہ نکلا قاتل و مقتول میں کچھ فرق مشکل سے
خموشی پر مری، کیوں بدگمانی ہے مرے دل سے ؛ وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے
فروغِ حسن ان کا، ہیں تو ہیں پتھر بھی کہہ دے گا ؛ وہ عالم ہے کہ آئینہ نہیں ہٹتا مقابل سے
یہ بے تابی کا عالم ہے کہ کوئی تھم نہیں سکتا ؛ لہو فریاد بن کر اڑ رہا ہے دامنِ دل سے
کنارے بحرِ ہستی کے پہنچ کر غرق ہوتا ہوں ؛ مجھے کشتی ڈبونے کی نہ تھی امید ساحل سے
دیا کرتے ہیں لو ہر وقت جن کے قبر کے پتھر ؛ یہ شمعیں گل ہوئیں، کیوں کر ہوائے تیغِ قاتل سے
مرے چھوڑے ہوئے صحرا کی گرد اب تک نہیں بیٹھی ؛ ندا دیتا ہے ہر ذرہ کہ میں گزرا ہوں منزل سے

وہی مطلب سمجھتے ہیں مری فریاد کا ثاقب
جو آسانی سے مرتے ہیں مگر جیتے ہیں مشکل سے

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ پوری غزل لکھنؤ میں ۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو اس بزم مشاعرہ میں
ھی گئی جو حامد علی حامد بیرسٹر کی کاوشوں سے منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ عہد شاہی کے بعد انگریزی عمل داری
۔ اس دور تک ایسا عظیم الشان مشاعرہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ یہ ایسا معرکہ تھا جس کے سر کرنے کے بعد ارباب سخن ثاقب کو غزل گوئی
یکتائے روزگار تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لکھنؤ کی آخری بزم سخن کے ٹمٹماتے ہوئے ان چراغوں کا تذکرہ برسوں تک زبان زد خاص و عام
ہا۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا یا نہیں اس کی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔ ملاحظہ ہو ؎

کسی کا رخ دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے ؛ نظر صیاد کی چھپکے، تو کچھ کہہ دوں عنادل سے
چھری ہے ہر نفس، ہر رہ ہر قدم ہے کامِ قاتل سے ؛ عدم کی شاہ راہیں مل گئی ہیں، اک رگِ دل سے
ہوا خواہِ محبت ہے، تو پہلے ہاتھ دھو دل سے ؛ سہولت عشق کی منزل میں پیدا ہو گی مشکل سے
تعجب خیز ہے معجز نمائی، عشقِ صادق کی ؛ تمنائے دلِ مجنوں، نکل آئی ہے محمل سے
چل اے ہمدم، ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں ؛ اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے
امید و ناامیدی کا بھرم ہونا وہی جانے ؛ کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے
فریبِ عشق نے حد سے بڑھایا پائے الفت کو ؛ تعلق ہو گیا آخر، دلِ مجنوں کو محمل سے
نہ سمجھا معنیٔ گور و کفن، سمجھا تو یہ سمجھا ؛ تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے

ع وہ جس دن آ گئے شمعیں چڑھانے قبر پہ ثاقب
اسی دن روشنی داغوں کی پھوٹی پردۂ دل سے

نواب سید عبداللہ خان رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے زیرِ اہتمام ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے چیدہ چیدہ شعراء نے شرکت فرمائی۔ اس بزم کے صدر خود ثاقب لکھنوی اور سیکرٹری مشاعرہ سید حسن علی خان تھے۔ اس محفل میں جو غزل ثاقب نے پڑھی اس کے چند شعر درج ذیل ہیں :

اٹھا دی شمع کو کیا حسرتِ وارماں کی محفل سے ❊ ترے ناوک کو پہلو سے نکالو بھی تو کس دل سے
کہیں کشتیٔ دل ڈوبی ہے، مرجیں کیا بتائیں گی ❊ زباں ہوتی تو میں کچھ پوچھتا لبہائے ساحل سے
فشارِ غم بس اب تو، ضبط میں بھی آگ لگتی ہے ❊ لہو جلتا ہوا رِسنے لگا ہر گوشۂ دل سے
ہوئی عمرِ دو روزہ ختم ارمانوں کے جھرمٹ میں ❊ اٹھایا آسماں نے لاکھ میں اٹھا نہ محفل سے
فقط اک اہلِ زنداں کیا، انھوں نے بھی سنے ہونگے ❊ مرے نالے بہت اونچے ہوئے شورِ سلاسل سے
مری آنکھیں لہو روتی نہیں تو اس کی پرسش کیا ❊ یہ پوچھو خون کیوں برسا کیا، ابروئے قاتل سے

غموں کے آسرے پر ہجر میں تھی زندگی ثاقب
خلش بڑھتی جو یہ کانٹے نکلتے دامنِ دل سے

اُن دنوں، جب کا یہ ذکر ہے امین آباد پارک لکھنؤ میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی، اس کے بانی کون حضرات تھے اس کی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔ اس محفل میں ثاقب نے بھی ایک غزل پڑھی جو کہیں تلف ہو گئی۔ اب اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ صرف ایک مطلع دستیاب ہو سکا ہے وہ درج ذیل ہے ؎

گوشۂ لحد کا ڈھونڈھیں، اب کیا کریں گے جی کے
جب موت سے ہیں بدتر، اوقاتِ زندگی کے

یہاں یہ تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ ثاقب ان دنوں ایک آفتِ ناگہانی سے دوچار ہو کر مصائب کے دور سے گزر رہے تھے جس نے انھیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات انھیں اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ انھیں دنوں متذکرہ بالا مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور انھیں احباب کے اصرار پر کشاں کشاں مشاعرہ میں شرکت کرنا پڑی تھی۔ اس وقت کے قلبی و دماغی تاثرات کی یقیناً غزل نغماتی کی ہوگی جیسا کہ مطلع سے ظاہر ہے۔

اسی دورِ آلام میں ایک ادبی محفل پنڈت رادھے بہاری مصرا ایڈوکیٹ پرتاب گڈھ نے منعقد کی۔ اس میں بھی ثاقب کو بہ اصرار بلیغ شریک ہونا پڑا۔ غزل جو انھوں نے لکھنؤ تا پرتاب گڈھ دورانِ راہ میں کہی اور بعد میں مشاعرہ میں پڑھی اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

دل کہتا ہے غم کا کوئی ساماں نہیں دیکھا ⁂ ہاں سچ ہے، ابھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا
محرومیِ ناقہم پہ غمزہ نہیں زیبا ⁂ کس چہرہ پہ آئینہ کو حیراں نہیں دیکھا
ٹھہرو ابھی تو کیا، قافلۂ غم کو لٹے ہوں ⁂ جس میں وہ سماتے، وہ بیاباں نہیں دیکھا
پھولا ہے محبت دیکھ کے سامانِ جراحت ⁂ اس دل نے مرا چاک گریباں نہیں دیکھا
پہلے خلشِ دل کے کماں پاس تھی ان کے ⁂ ہاں، خون میں ڈوبا ہوا پیکاں نہیں دیکھا
کیوں رشکِ مسرت کو نہ ہو مجلسِ غم پر ⁂ اس بزم کو عالم میں پریشاں نہیں دیکھا
ہاتھوں کی خطا ہو کہ مقدر کی جفا ہو ⁂ جو خاک نہ ہوتا وہ گریباں نہیں دیکھا
ہم نے تو کبھی مردمکِ چشم سے پہلے ⁂ اشکوں میں جو ڈوبا ہو وہ انساں نہیں دیکھا
جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی ⁂ بے سوئے ہوئے خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

ثاقب انھیں کیا یاد کریں اہلِ کرم جنھوں نے
بھولے سے سوئے گورِ غریباں نہیں دیکھا

یوں تو پوری غزل تاثراتِ قلبی کی آئینہ دار ہے۔ شاعر پر جو گزر رہی ہے اس کی وہ من وعن عکاسی کر رہا ہے۔ بھرپور اعادہ جو اس شعر سے جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی ⁂ بے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا میں کیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔

ابھی ثاقب پر سے افکار و حوادث کے بادل نہیں چھٹے تھے اور وہ غم و اندوہ کے بحرِ ناپید کنار میں ہنوز تھپیڑے کھا رہے تھے کہ ایک ادبی محفل کا انعقاد معیار پارٹی لکھنؤ کی طرف سے ہوا جس کے سکریٹری محمد صاحب بہار تھے۔ اس میں بھی ثاقب نے احباب کی خاطر شکنی گوارا نہ کرتے ہوئے شرکت کی اور اپنی ایک طویل غزل پڑھی جس کا مطلع اور دو شعر اس وقت کے مصائب کا صحیح مرقع کھینچتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

شامِ فراق کچھ نہیں آتا نظر مجھے ⁂ چھپ کر جلا ہیں کیوں مرے داغِ جگر مجھے
چپ رہتا قیدِ غم مگر میرے ہم صفیر ⁂ کرتے ہیں محوِ نالہ کشی چھیڑ کر مجھے
قائل ہوں میں کہ محفلِ تقدیر بھی جواد ⁂ حصہ ملا سبھوں کو خوشی کا مگر مجھے

مطلع میں حسنِ طلب کا انداز بڑا پُر کیف ہے۔ غزل طویل ہے۔ چند منتخب شعر درج ہیں ؎

تم دور ہو تو کس لیے دل میں مقام ہے ⁂ میں پاس ہوں تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے
نقشِ قدم میں نقشِ وفا دیکھ دیکھ کر ⁂ کرتی ہے یاد کھو کے مری رہ گذر مجھے
شوقِ بہار باغ میں تنکے چنے تو ہیں ⁂ دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے

دربان کی نظر میں ہوں میں اجنبی تو کیا　؎　مدت سے جانتا ہے ترا سنگِ در مجھے

کیا جانے کوئی کند چھری تھی کہ اور کچھ　؎　اک چیز ذبح کرتی رہی رات بھر مجھے

ثاقب گیلے ہاؤس نینی تال میں شیخ حبیب اللہ منیجر ریاست محمود آباد کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے مقیم تھے۔ حسن اتفاق شیخ متین الزماں جو اس زمانہ میں نائب مہتمم بندوبست علاقہ بھارس نینی تال میں مامور اس کوٹھی کے ایک حصہ میں قیام فرما تھے۔ ان کے قاضی علی حیدر عباسی پولیٹیکل ممبر ریاست بھوپال اور اشتیاق احمد عباسی بیرسٹر لکھنو بھی قیام پذیر تھے ان دلدادگانِ شعر و سخن کی موجودگی میں ہمہ وقت شعر و شاعری کا مشغلہ رہتا۔ ایک شب ابر و باد کا سخت طوفان آیا اور شدید بارش ہوئی۔ سردی کی وجہ سے تمام شب کسی کو نیند نہ آئی سب نے سکڑے ہوئے بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں رات کاٹ دی۔ صبح کو ثاقب نے شبِ گزشتہ کا مرقع ذیل کے قطعہ میں کھینچا ہے

غضب کا رات کو طوفانِ ژالہ باری تھا
کہ مثلِ برف کے ٹھنڈے تھے عضوِ تن سارے
نہ نیند آئی گھڑی بھر نہ پاؤں پھیل سکے
پڑا رہا یوں ہی بستر پہ منہ کری مارے

نینی تال ہی میں ثاقب نے شیخ حبیب اللہ کے کسی وعدہ کی یاددہانی میں مندرجہ ذیل قطعہ نظم کیا جو احوالِ واقعی کا عکاسی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جنگ ہے احتیاج و غیرت میں　　کل سے دونوں میں بول چال نہیں
لب ہلاؤں تو بات جاتی ہے　　خامشی بھی مفید حال نہیں
مطلبِ دل کہا نہیں جاتا　　گو دہن میں زبان لال نہیں
ہاتھ پھیلیں بتائیے کیوں کر　　کہ مجھے عادتِ سوال نہیں
منتظر ہے وفا کا وعدۂ عید　　خود بدولت کو کچھ خیال نہیں
لطفِ منعم کا ہے جو مل جائیں　　نہ ملیں تو مجھے ملال نہیں
دو از پئے سرخ کی حقیقت کیا　　دل غنی ہو تو کوئی مال نہیں
اپنے حق کا ہے آپ سے اظہار　　بے ضرورت یہ قیل و قال نہیں
تند ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں　　اور مجھ ناتواں میں حال نہیں
بارہا طے ہے باد سردِ جبل　　کہ طبیعت میں اعتدال نہیں
شدتیں ہیں یہی جو سردی کی　　جان جانے میں احتمال نہیں
ہو میسر اگر لحاف کہیں　　احتیاجِ سمور و شال نہیں

بہر سر ما ہے فکر تن پوشی
ورنہ ثاقب حریص مال نہیں

بہرحال اس منظوم عرضِ مدعا کا جس میں حسن و خوبصورتی طلب اپنے پورے جذبۂ خودداری کے ساتھ کارفرما ہے کیا نتیجہ برآمد ہوا، اس سے یہاں غرض نہیں۔

ثاقب اپنے دیرینہ کرم فرما شیخ متین الزماں کے جو ان دنوں وزیر مال ریاست بھوپال تھے، مہمان ہوئے۔ سید لیاقت علی خان مشیر المہام مدبکاری خاص، عرصہ سے ثاقب کے کلام کے دلدادہ تھے، چنانچہ اکثر شام کے وقت قیصر بنگلہ میں تشریف لا کر ثاقب کے کلام سے لطف اندوز ہوتے۔ نواب صمد یار جنگ محمد ریاست حیدرآباد ان دنوں بھوپال کے پولیٹیکل سکریٹری تھے، وہ کلام ثاقب کے اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ پہروں کلام سننے پر بھی جی نہ بھرتا۔ انھوں نے ایک دن ثاقب کے اعزاز میں ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا جس میں اعیانِ ریاست شریک تھے۔ قبل طعام نواب صاحب ممدوح کی چھوٹی بچی انا کی گود میں ثاقب کو سلام عرض کرنے باہر بھیجی گئی اور ساتھ ہی تاریخ ولادت کی فرمائش بھی اندرون خانہ سے ہوئی۔ دورانِ طعام میں ہی تاریخی مصرع کہہ کر حاضرین کو سنا دیا گیا۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ تاریخ ولادت ہے زبانِ کلکِ ثاقب پر
وہی قسمت کی ہو اور نیک "الٰہی آپ کی لڑکی"

۱۳۳۶ ہجری

ایک قطعہ دوسرے دن صبح مرتب کر کے جس میں صاحبزادی کا نام بھی آگیا پیش کر دیا گیا۔ وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

یہ دخترِ نیک خو صمد صاحب کی ٹکڑا ہے جگر کا دل کا اک پارہ ہے
میلاد کا سال ہے مبارک ثاقب؛ فرخ سلطان یہ جہاں آرا ہے

اردو کے فاضل ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مؤلف دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ، بھوپال میں قیام فرما تھے۔ ثاقب لکھنوی کے بھوپال پہنچتے ہی دن رات شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے شام کی ملاقاتیں زیادہ تر بزمِ سخن میں بدل جائیں جس کے روحِ رواں اکثر صاحب موصوف ہوتے۔ ثاقب کے کلام کا بیشتر حصہ جو ان نشستوں میں تخلیق ہوا وہ دستیاب نہ ہو سکا صرف ایک نظم بعنوان "صفت الربیع" حاصل ہو سکی۔ ناظرین کی تفنن طبع کے لیے درج ہے ؎

سبزۂ گردوں سے اونچا ہے خیابانِ بہار　　برق بھی ہے اک چراغِ زیرِ دامانِ بہار
غازۂ رنگ شفق میں ہے مہ ماہِ ربیع　　مژدہ اے گلشن کہ رنگیں ہے گریبانِ بہار
ڈال دے تخمِ تلون اے سپہرِ سبزہ رنگ　　پھوٹ نکلیں خاک سے گلشن میں ایوانِ بہار
مائدۂ نعمتِ الوان کا ابرِ تیرہ میں　　اک دن اس سرپوش سے ہوگا عیاں خوانِ بہار
زرد ہے رنگِ خزاں، گھر کے سوادِ ابر میں　　اک حصارِ آہنی ہے، فوج سلطانِ بہار

صیقلی تیروں کی شکل آتی ہے بارش میں نظر　　سر سے پانک آب میں ڈوبے ہیں پیکان بہار

کام اپنا کر چکی تیغ مہ اُردی بہشت

سر خزاں کا ہو گیا ہے گوئے چوگان بہار

نواب حیدر یار جنگ مولانا سید علی حیدر طباطبائی کی تشریف آوری پر کلکتہ کے سفارت خانۂ ایران میں ایک بزم سخن منعقد ہوئی۔ کے میر مشاعرہ نواب نصیر الممالک تھے۔ دیگر شعراء امراء اور دانشوروں کے اس محفل میں ان کے خویش نواب مونس الدولہ بھی رونق افروز تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا اور طرح تھی۔

دورِ ساغر نے کیا بزم میں بے ہوش مجھے

ثاقب لکھنوی اس بزم میں مدعو تھے۔ انھوں نے بھی غزل کہی جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں

مے کدہ میں ہیں سنبھالے ہوئے مے نوش مجھے　٭　آج کیا پی ہے کہ آتا ہی نہیں ہوش مجھے

دل کہاں آئے جو دریا کی طرح جوش مجھے　٭　کر دیا خاطرِ افسردہ نے خاموش مجھے

داد و بیداد کا قصہ ہوا فیصل یعنی　٭　ہو گیا سب ترے آتے ہی فراموش مجھے

سرِ شوریدہ کو خنجر کے حوالے کر دوں　٭　آج اس بار سے ہونا ہے سبکدوش مجھے

جان حاضر ہے لئے جاؤ امانت اپنی　٭　پھر خدا جانے رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

دورانِ قیامِ کلکتہ، ثاقب لکھنوی کو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی طرف سے ایک مخصوص دعوتِ بزم میں مدعو کیا گیا۔ یہ بزم محض کلامِ ثاقب سننے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ ثاقب نے اس بزم میں ہنگامِ غزل خوانی کے بعد سخنورانِ کلکتہ کی مدح و توصیف میں ایک قطعہ پڑھا جو خالی از دلچسپی نہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

دل محو تماشائے شانِ کلکتہ ہے　　ممنونِ سخنورانِ کلکتہ ہے

وحشت، حافظ، نشاط، رعب در بخور　　خمسہ ہی روح و جانِ کلکتہ ہے

متذکرہ بالا ادبی محفلوں میں جس کا آغاز ثاقب نے شہزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دہلوی کے دولت کدے کیا تھا بھی اور اس کے بعد بھی ایسے متعدد مواقع آئے کہ انھیں غزل یا نظم فی البدیہہ کہنا پڑی۔ بدیہہ گوئی جیسا کہ ظاہر ہے کہنہ مشقی سے نہیں آتی مشقی سے زود گوئی حاصل ہوتی ہے۔ بدیہہ گوئی کا تعلق قوت متخیلہ پر منحصر ہے جس قدر قوتِ متخیلہ متصورہ پر حاوی ہو کر شاعرانہ تخیل کے لئے مصروفِ کار رہے گا اتنا ہی بدیہہ گوئی پر دسترس حاصل کرتا جائے گا۔ ثاقب قوتِ متخیلہ و متصورہ پر اس درجہ حاوی ان کی کامیابی جگہ جگہ پر ضامن رہی

حمد رفاعی

ذوق کی قصیدہ نگاری

فکر و خیال کی ان ریزہ کاریوں کے ساتھ ساتھ ذوق کی مرصّع کاریوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے، ذوق کا کلام جہاں تشبیہ و استعارہ
زبہا شگفتہ کاریوں سے مہکا ہوا ہے وہاں اس کی تزئین و آرائش میں صنائع لفظی و معنوی کی نقشہ طرازیوں کو بھی خاصا دخل ہے، ذوق نے صنائع
ستعال یقیناً شعوری طور پر روا رکھا ہے، قصیدے کا معنوی آہنگ شاعر سے اس کاریگرانہ تراش خراش کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ شاعر کی مشاقی
صب ہے کہ وہ اس معاملے میں کس حد تک استادانہ مہارت کا ثبوت دیتا ہے کہ شعر میں تصنع کی جھلک نہ آنے پائے۔ ذوق کے اشعار کا جائزہ لینے
سوس ہوتا ہے کہ انھوں نے صنعتوں کو بے تکلفی کے ساتھ برتا ہے۔ اور اپنے کلام کی افزائش حسن میں ان سے خاص طور پر مدد لی ہے،
یں صنائع لفظی کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

ت تجنیس تام مماثل

اثر نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا ؛ سوا راگ کے سمجھے ہے کوئی اور بھی سم

ت تجنیس تام مستوفی

ہے ابرِ درفشاں وہ چمن میں کمال کے ؛ عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے

ت تجنیس زائد و ناقص

لاتا نیرنگ نئے رنگ سے ہے چرخِ محیل ؛ واہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے تیل
جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام ؛ وجد میں آئیں سنیں آج اگر آہوئے حرام
تارِ طنبور بنے آج رگِ سنگِ وفا ؛ بے زباں زمزمہ سازی کرے موجۂ زمزم

ت اشتقاق

دیا اللہ نے وہ قلبِ مصفّا تجھ کو ؛ اے شہنشاہ صفا دین و سراپا صفوت
غمِ عصیاں ہے تو ہے رحمتِ غفّار وسیع ؛ فکر روزی ہے تو ہے رزق کا رزاق کفیل

جو ضلالت سے ہوں گمراہ وہ اُسے ظلِ خدا ؛ ذلِ اقدام سے ہوں خاک مذلت پہ ذلیل
نعرے سے تیرے ہوئے ہیبت کا چاک سینہ ؛ دل پہ دلاوری کے وہ تیغ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں کون آج ہے توانا ؛ جو دل کو ناتواں کے دیتا تونگری ہو

صنعتِ شبہ اشتقاق ۔

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ ؛ دیکھ کر بھاگے جسے رنج ہزاروں فرسنگ
دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی ؛ درباں جو تیرے در کا کرتا سکندری ہو
بیٹھے ہیں معدلت کے وہ شبر ہے تو شاہا ؛ نوشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو

صنعتِ تنسیق الصفات

وہ شہنشاہ بہادر شہ کسریٰ الفاف ؛ خسرو جم خدم و داور دارا حشمت
قوتِ ملت ودیں قامع کفر و الحاد ؛ حامئ شرع نبی، ماحئ شرک و بدعت
وہ نکو روئے و نکو خوئے خجستہ منظر ؛ وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال

صنعتِ تلمیع

رشئے نیکو پہ ہے مائل تری خوئے نیکو ؛ کیوں کہوں کر نہ کہ الحسن الی الحسن یمیل

صنائع معنوی کے بیان میں ذیل کے اشعار قابل لحاظ ہیں ۔

صنعتِ مراعات النظیر ۔

ہے اٹھا عیش کا طوفان بسر ساحل یم ؛ زمزمہ موج کا بربط سے ہوا ہے ہمدم
رقم میں گر ترے اوصاف کی قصور کرے ؛ زبانِ خامہ عطارد کی ناک میں دے نیر

یہ صنعت شعرا کے یہاں بہت عام ہے ذوق کے قصائد میں بیسیوں اشعار اس پر مشتمل ہیں ۔

صنعتِ تلمیح

در میں توحید سے لی ایک شفا کا نسخہ ؛ بحث میں علت و معلول کے ہے عقیل قلیل

صنعتِ تجرید

ماہ تو چشم زدن میں مہ کامل ہو جاتے ؛ نظر مہر میں تیرے ہے وہ نورِ تکمیل

صنعتِ تاکید المدح بما یشبہ الذم

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظے میں تو یہ ؛ نہ پایا دے احساں نہ اور کی تقصیر
تیرے عشرت کدے میں یار کسے غیر نشاط ؛ تیرے خلوت کدے میں دخل کسے جز طاعت

صنعتِ مشاکلہ

جاروب کش ہے نیر اعظم کوئے خسروی کا ؛ زیبا ہے ماہ کو گر فرمان بہ تری ہو

ذوقؔ موقوف کراندازِ غزل خوانی کو ؛ ڈھونڈ اس بحر میں تو آب کوئی اچھا گوہر

صنعتِ تجاہلِ عارف۔

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگ شفق - پر تو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگ شفق

صنعتِ جمع

مفسد و حاسد و غماز و عدوئے سرکش زیر شمشیر غضب تیرے ہوں چاروں چورنگ

تابع معنوی میں ذوقؔ نے صنعتِ حسنِ تعلیل سے زیادہ سروکار رکھا ہے، اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ

مبالغے کی ایک بہت ہی حسین و جمیل شکل ہے، معنی آفرین طبائع کو اس بنا پر اس سے خاص طور پر شغف رہا ہے، دوسرے یہ کہ اس صنعت کے

استعمال سے مصوری و محاکات کا جادو بڑے ہی مستحسن و موثر انداز سے جگایا جا سکتا ہے، ذوقؔ نے اس صنعت کو تشبیب اور مدح دونوں

میں برتا ہے لیکن مدح میں کچھ زیادہ، لہٰذا پہلے ہم مدح ہی کے اشعار پیش کرتے ہیں :-

نہ برق کو تپِ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام ؛ نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تجخیر

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر ؛ نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہِ منیر

ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ ؛ تو چٹکیاں دلِ آتش میں لے ہے آتش گیر

جہاں میں چشم سیہ مست یار کا ہو یہ رنگ ؛ جو میکشوں کو ترا اجتناب و سے تعزیر

پڑے گلے میں رسن خط سرمہ سے اس کے ؛ رہے مدام وہ گردش میں از پئے تشہیر

ذکرِ حق سے کوئی خالی نہیں تیرے آج دوار ؛ کرتا میخانہ میں ہے شیشۂ مے بھی حق حق

حرف ہیبت کا تری کوئی زباں پر آیا ؛ ہو گئی وقت کتابت جو زباں خامے کی شق

کرتا ادنیٰ کو جو اعلیٰ نہ ترا منصوبہ ؛ پاتا شطرنج میں فرزیں کا نہ رتبہ بیدق

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن ؛ مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں

تری عدالت میں ہے یہ قدغن، کتاں کو دیکھے نہ ماہِ روشن ؛ وگرنہ ہالہ ہو طوقِ گردن، کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں

پہنچے ہے نیرِ مہر کے گردوں پہ سحر ؛ کھل جاتی ہے ستاروں کی لا انتہا گرہ،

بے بسکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دل میں شوق ⁂ دیکھا جو نیشکر میں کہ ہیں جا بجا گرہ

کرتا ہے آشنائے دندان سے وہ فقط ⁂ اس واسطے کہ اس کی بھی ہو دل کی واہ گرہ

گھوڑے کی تعریف میں ملاحظہ فرماتے چلئے

آ سیا وار پھرے کیوں یہ فلک گرد زمیں ⁂ تیرے توسن کی جو کاوے کی اُٹھائے پھرت

طوالت کے خیال سے مزید مثالوں سے احتراز کیا جاتا ہے صرف دو شعر تشبیب کے اور درج کئے جاتے ہیں ۔

زمانہ دشمن عشرت کا اس قدر ہے کہ تل ⁂ جو صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز ⁂ جنبشِ دست مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ذوق نے اس صنعت کو کم و بیش آٹھ دس مقاصد میں برتا ہے اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے زیادہ تر مدح کے اشعار میں برتا ہے۔ تشابیب میں حسن تخیل اور تشبیہات و استعارات کی گل تراشیاں زیادہ ہیں گزشتہ اوراق میں موقع و محل کی مناسبت سے ، ذوق کے قصائد کا ایک خاصا تفصیلی انتخاب پیش کیا جا چکا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ تشنہ نہ رہنے پائے ، اُن کی صناعانہ صورت گری ، پیکر تراشی اور فکر و خیال کی وقت پسندی کا حتی الوسع بھرپور جائزہ لیا گیا ہے جس کی روشنی میں قصیدہ نگاری کی تاریخ میں ذوق کے معیار قصیدہ گوئی اور ان کے مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے ۔ ذوق کے عزیز شاگرد مولانا آزاد کی رائے اس باب میں پیش کی جا چکی ہے ، مولانا آزاد کے علاوہ کم و بیش ہر وہ نا قد جس نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس بات پر متفق ہے کہ سودا کے بعد کوئی دوسرا قصیدہ گو ذوق کی ہم سری کا استحقاق نہیں رکھتا ، سودا سے پہلے قابلِ ذکر قصیدہ گو ولی ہیں لیکن ان کے موضوعات محدود ہیں ، وہ کچھ صوفی منش انسان تھے ، ان کے ممدوح تین ہیں ، عظیم الشان مذہبی شخصیتیں ہیں لہٰذا ان کے قصائد مذہب و اخلاق کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہیں جن میں ان کے خلوص اور عقیدت کی جھلکیاں صاف دیکھی جا سکتی ہیں ، ولی کے بعد اساتذۂ طبقۂ متقدمین دہلی میں سے کسی نے اس فن کو پروان چڑھانے کی طرف توجہ نہیں دی ، ولی کے بعد اس سلسلے کی دوسری اہم تدوین کڑی سودا ہی ہیں جنہیں مصحفی نے "نقاشِ اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ" کہا ہے ۔ سودا کے معاصرین میں میر نے کچھ قصیدے کہے ہیں ، لیکن ان میں سودا کی سی دھوم دھام نہیں ہے ، البتہ سودا کے مقابلہ میں ان کے قصائد کی فضاء زیادہ نیچرل ہے ۔ میر کے علاوہ قائم ، ظہور ، نور اور منت وغیرہ نے بھی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ قصیدہ گوئی کی جانب توجہ کی ہے اور اس صنف میں بعض قابلِ قدر تخلیقات فراہم کی ہیں لیکن بحیثیت فن یہ تمام تخلیقات سودا کے مقابلے میں فروتر ہیں ۔ سودا کے بعد انشا ، مصحفی ، اور ممنون نے اس کوچے میں قدم رکھا ، ان تمام اساتذہ میں سے مصحفی کا انداز سنبھلا ہوا ہے ، انشا نے اپنی ہمہ دانی کے جوہر دکھانے پر سارا زور صرف کیا ہے جس کے سبب ان کے قصائد حقیقت نگاری سے دور جا پڑے ہیں ، انشا کا زعم زباں دانی ، علمیت اور جابجا ان کی ذہانت و طباعی کے نقوش ہمیں مرعوب تو ضرور کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتے ، انشا کے بعد ذوق اس میدان میں اترتے ہیں اور صحیح معنوں میں قصیدہ گوئی کا بحیثیت فن انہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے ، ان کے عہد میں غالب نے قصائد کہے ہیں اور جوش مذہبی نے

رتن سے بھی قصائد لکھوائے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ذوق کو نہیں پہنچا۔ ذوق کے بعد جو قصائد لکھے گئے وہ معیارِ قصیدہ گوئی کے اعتبار سے اور بھی فروتر ہیں، لہٰذا ذوق کو اس روایت کا آخری نقیب سمجھنا چاہیے۔

سودا اور ذوق میں بہت کچھ ذہنی و فکری مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں کے موضوعات کم و بیش یکساں ہیں، البتہ سودا کے ہاں ذوق کے مقابلے میں تنوع کسی قدر زیادہ ہے، سودا کا تخیل بھی مقابلۃً رسا ہے جہاں تک قصیدے کے فنی لوازمات کے اہتمام و التزام کا تعلق ہے سودا اور ذوق میں سے کسی کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، مدح و تشبیب کے موضوعات دونوں کے یہاں قریب قریب یکساں ہیں یہاں اس معاملے میں یہ ماننا ہوگا کہ سودا کو وسعتِ موضوعات کے اعتبار سے ذوق پر کسی قدر فوقیت ضرور حاصل ہے، سودا کے زورِ تخیل کی بھی ہر ایک نے داد دی ہے وہ اپنے تخیل کی مدد سے موضوعات میں تنوع پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ واقعہ ہے کہ وہ بیشتر جگہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں، ان کی تشبیہوں میں تخیل کا رنگ اتنا شوخ و شنگ واقع ہوا ہے کہ ان کے پیش کردہ مناظر کی محاکاتی شان دھندلا کر رہ گئی ہے، یہ رسا تخیل کہیں کہیں گستاخ و بے لگام بھی ہو گیا ہے، ان کی سراپا نگاری تخیل کی اسی بے لگامی کے سبب جا بجا داغدار ہو گئی ہے، جب کہ ایسے مواقع پر ذوق کی فطری متانت و وقار اس کا معیار رکھے اور بلند تر کر دیتی ہے، ذوق کے یہاں جمالیاتی احساس کا بھرپور نکھار موجود ہے، لیکن سودا کے یہاں جمالیاتی اٹھان لمساتی شوق و شعور کی دخل اندازی کے سبب سے بیشتر جگہ اپنی جگمگاہٹ کھو بیٹھتی ہے۔

سودا اور ذوق نے تشبیہات کی تراش خراش میں تخیل سے کام لیا ہے جس کے سبب ان کے قصائد کی فضا عام طور سے مصنوعی اور غیر فطری سی ہو گئی ہے یہاں اس معاملے میں ذوق کو ایک خصوصیت بہر حال حاصل ہے، انھوں نے سودا کے مقابلے میں زبان و بیان کی صفائی کا زیادہ خیال رکھا ہے، ان کی تشبیہات اپنے مفہوم کے اعتبار سے زیادہ صاف شفاف اور روشن ہیں یہاں اس کے برخلاف سودا نے بعض جگہ بہت ہی مکروہ قسم کی تشبیہات استعمال کی ہیں جن کو پڑھ کر ابکائی سی آنے لگتی ہے، اس چیز کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے تو دونوں شاعروں کی طبائع کا فرق واضح ہو جائے گا۔ ذوق فطرۃً بہت ہی نستعلیق، اور منجھی ہوئی طبیعت لے کر آئے تھے، سودا کے بطون میں احساس و فکر کی ناہمواریاں موجود ہیں جو موقع بے موقع اظہار کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہیں، یہ کہنا کہ سودا کے وقت میں زبان اتنی منجھی ہوئی نہ تھی، سودا کے ساتھ ایک قسم کی بے جا رعایت کے مصداق ہے، سودا کے قصائد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا زورِ طبع دکھانے کی غرض سے دیدہ و دانستہ ایسی سنگلاخ زمینیں اور کھردرے قسم کے ردیف و قافیے اختیار کیے ہیں جو قدم اندازہوتے وقت فکر و خیال کی لطافتوں کو ٹھوکریں سی لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، ذوق نے اس تنوع کی بے اعتدالی کو روا نہیں رکھا۔

سودا کا تخیل اپنی جولانیوں کے لئے ہر لحظہ نئی فضا کا طالب نظر آتا ہے، اس کے قدم کسی مقام پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سودا کے قصائد میں تفصیل و اطناب بہت زیادہ ہے، اس کے برخلاف ذوق کے یہاں ایجاز و اختصار ہے، سودا جذبات کو قلم بند کرتے چلے جاتے ہیں، ذوق تمثیلی اور کسی قدر ڈرامائی اسلوب کو اپنا کر براہِ راست جذبے کو تحرک عطا کرتے ہیں،

یا اسلوب یقیناً زیادہ سحر کار ہے بمقابلۂ سوداؔ کے جن کی طول بیانیاں تھکا ڈالنے والی حد تک آزمائشی ہیں، سوداؔ کے قصائد کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تخیل کے زور میں حفظ مراتب کو بھول جاتے ہیں، ان کے مذہبی عقائد میں شدت بھی ہے اور جھول بھی، ذوقؔ کے برخلاف جن کے قصائد بیشتر سلاطین کی مدح میں ہیں سوداؔ نے مذہبی شخصیتوں کو بھی اپنی مدح کا محور و مرکز قرار دیا ہے اس لحاظ سے سوداؔ کو ذوقؔ پر یک گونہ ترجیح ضرور حاصل ہے لیکن یہ ترجیحی مقام اتنا بلند نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ سوداؔ جوشِ عقیدت میں کچھ ایسے خیالات ظاہر کر جاتے ہیں کہ بغیر کسی جھجک کے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت علی کی مدح میں سوداؔ نے اس قدر غلو کیا ہے کہ الاماں والحفیظ ذوقؔ نے صرف مذہبی شخصیت سید عاشق نہال کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ان کے تدین و تقوے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ چیز ان کے صحیح دینی شعور کی عکاسی کرتی ہے، سوداؔ کے دینی شعور میں شدت و درماندگی کا ایک افسوسناک امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دینی و دنیوی ممدوحین کے اوصاف و خصائص کے امتیازی خطوط کی نشاندہی بمشکل تمام ہی کی جا سکتی ہے۔

سوداؔ کے قصائد میں ان کی فطری اپج کا احساس ضرور ہوتا ہے، ان کی ایک اپج یہ ہے کہ وہ اپنے قصائد کی تشابیب میں بالعموم غزل بھی داخل کر دیتے ہیں بغیر اس بات کا لحاظ کئے کہ قصیدہ کسی دینی شخصیت کی مدح میں ہے یا دنیوی شخصیت کی اس بے اعتدالی کے سبب سوداؔ کی یہ غزل سرائی بعض وقت بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے، ذوقؔ نے اس بدعت کو اختیار نہیں کیا، انھوں نے اس کے برخلاف اپنی توجہات زبان و بیان کی صحت و صفائی کی جانب مرکوز کیں اور مضمون میں معنیٰ آفرینی کی اہمیت کو مدنظر رکھا۔ سوداؔ کے مقابلے میں ان کے تخیل کا دائرہ کسی قدر محدود ہی سہی لیکن اس محدود دائرے میں رہ کر بھی انھوں نے اختراعِ مضامین کے باب میں جو باریکیاں پیدا کی ہیں وہ سوداؔ کے ہاں بڑی حد تک مفقود ہیں، ان کا مشہور قصیدہ جس کی ردیف "گرہ" ہے اس دعوے کے جواز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ذوقؔ نے اپنی غزل میں جس روایت کو پروان چڑھایا تھا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی وقعت کم ہوتی گئی خاص طور پر دورِ جدید کے ناقدین نے اُسے بہت ہی سخت قسم کی تنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن جہاں تک ان کی قصیدہ گوئی کا تعلق ہے قریب قریب ہر ایک نے اسے سراہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاصرین کے مقابلے میں ذوقؔ کے شخصی معیار کی عظمت و برتری کو بھی ہر ایک نے تسلیم کیا ہے لیکن کچھ عرصہ ہوا میری نظر سے ایک ایسا مضمون گزرا جس میں ذوقؔ کی نجی زندگی اور ان کی ذاتِ خاص سے متعلق کچھ ایسی باتیں دیکھنے میں آئیں جو پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں، صاحبِ نقد فرماتے ہیں۔

"سوداؔ اور ذوقؔ کے قصائد میں فرق کا ایک سبب اور بھی ہے، سوداؔ شاہ عالم بادشاہ کے استاد تھے مگر غلام نہ تھے، جب سوداؔ شاہِ عالم سے ناخوش ہو گئے تو انھوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا، بادشاہ نے سوداؔ کو ملک الشعرا بنانے کا لالچ دیا مگر سودا نے کہا "حضور کے ملک الشعرا ہونے سے کیا ہوتا ہے کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔ اسی بے نیازی کا مظاہرہ سوداؔ نے شاہ شجاع الدولہ کے ..... [illegible] ..... کیا، اس کے برخلاف ذوقؔ بعض وقت بہادر شاہ سے کبیدہ خاطر ہوتے تھے مگر ان کی جرأت نہ تھی کہ دربار سے

قطع تعلق بھی کر لینے، دراصل ذوق کے عہد میں معاشی حالات اور بھی ابتر ہو گئے تھے اور مغل دربار چراغ سحری سے زیادہ نہ تھا، اس صورت میں ذوق نے بادشاہ کی چار روپیہ کی ماہوار تنخواہ کو غنیمت سمجھا اور آزاد کو خوش فہمی کی بنا پر یہ چار روپیہ ملک الشعراء کے چار سلون نظر آئے، اگرچہ اس تنخواہ میں بعد میں اضافہ ہوتا رہا مگر تنخواہ کا اضافہ ذوق کی آزادی تخیل میں اضافہ نہ کر سکا۔"

آگے چل کر مزید ارشاد ہوتا ہے :۔

"ان حالات میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذوق کے لئے دربار سے قطع تعلق کرنا بہت مشکل تھا یہی سبب ہے کہ ذوق نے بہادر شاہ کی مدح میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، انھوں نے روسا کی تعریف میں بہت کم قصیدے کہے ہیں یہاں تک کہ مذہبی قصیدوں کی طرف بہت کم توجہ کی ہے، ذوق معاشی حالات سے مجبور تھے لہٰذا بادشاہ کی مدح کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا، اس لئے ان کے قصیدوں میں جدت اور ندرت بہت کم پائی جاتی ہے اور تصنع اور آورد کی بہتات نظر آتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات ڈاکٹر سلام سندیلوی کے ایک مضمون بعنوان "سودا اور ذوق بحیثیت قصیدہ نگار" سے لیے گئے ہیں جو ان کے تنقیدی مجموعے موسوم بہ "ادبی اشارے" میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت مجموعی سلجھے ہوئے نقاد ہیں ان کی بعض تحریریں مواد کے اعتبار سے خاصی وقیع ہوتی ہیں یہاں موصوف کی مذکورہ بالا رائے انصاف سے بعید ہی نہیں بلکہ صریح بہتان ہے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سودا نے شاہ عالم سے قطع تعلق کیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ شجاع الدولہ کے دعوت نامے کو ایک شان بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا، یہاں اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہی سودا اپنی اسی ٹھکرائی ہوئی بارگاہ میں سر نیاز خم کرتے ہوئے باریاب بھی ہوئے اور شاہ شجاع الدولہ کی کریم النفسی کے سبب خوب خوب نوازے بھی گئے، اس کے برخلاف ذوق کو مہاراجہ چندو لال نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی لیکن اس کے جواب میں انھوں نے صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور انتہائی ناساز گار سے ناساز گار حالات میں بھی اپنے ولی نعمت کی چوکھٹ سے منحرف ہو کر موعودہ مامن و مستقر کا رخ نہیں کیا، کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ چندو لال نے مکرر، سہ کرر زر کثیر بھیج کر طلب کیا یہاں ذوق نے ہر بار معذرت کر دی، لکھنؤ سے بھی چند خطوط موصول ہوئے اور بار بار وصول ہوئے، دہلی اردو اخبار ۱۸ر نومبر ۱۸۵۴ء کے بیان کے مطابق ایک خط تو ذوق کی زندگی کے بالکل آخری دنوں میں لکھنؤ سے اس بارۂ خاص آیا ہوا رکھا تھا جس کا جواب ارسال نہیں کیا جا سکا تھا کہ ذوق کی وفات ہو گئی۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ ذوق کے لئے دربار شاہی سے قطع تعلق کرنا بہت مشکل تھا، صریحاً غلط ہے، ذوق کی معاشی ابتری کا ذکر بھی بہت بڑھا چڑھا کر کیا گیا ہے، دربار شاہی سے ذوق کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ ان جیسے مستغنی المزاج شخص کے لیے بہت تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے دراصل ذوق کی ذہنی نہج کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، ذوق کے مزاج میں پیدائشی طور پر ایک خاص قسم کا استغنا تھا صوفیانہ رجحانات نے اس کو اور جلا عطا کی۔ ذوق اگر دنیا سمیٹنا چاہتے تو ان جیسے قادر الکلام شاعر کے لئے چنداں مشکل نہ تھا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ذوق کی مستغنی المزاجی پختہ تر ہوتی چلی گئی، اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب انھوں نے اپنا معرکۃ الآرا قصیدہ :

" شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت ، دربار شاہی میں نذر گزرانا تو اس کے صلے میں بادشاہ نے جہاں دیگر نوازشات کیں وہاں جاگیر میں ایک گاؤں بھی عطا کیا تھا، تتمہ دہلی اردو اخبار ۴، جلد ۱۶ مطابق ۱۰ر ستمبر ۱۸۵۴ء میں اس واقعے کی تفصیل ان الفاظ

جیسا درج ہے :-

"سنا گیا ہے کہ بعد پیش و سماعت قصیدۂ مرقومہ کے ایک گاؤں جاگیر میں استادِ ممدوح کو عطا ہوا اور
حضورِ اقدس نے بہت عذر فرمایا کہ میں صلہ شایانِ شان اس کا نہیں دے سکا جو میرا دل چاہتا تھا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ گاؤں ذوق نے اپنی زندگی ہی میں بطورِ خیرات دے دیا تھا، حالانکہ خود ان کے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل موجود تھے جن کی کفالت و پرورش کے لئے یہ عطیہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ذوق کے اس رجحان بے نیازی کے بارے میں صاحب "گلستانِ سخن" رقم طراز ہیں :-

"سایۂ تربیت ظلِ سبحانی میں شب جوانی کو صبحِ پیری تک پہنچایا اور رضائے مرشدِ آفاق میں اپنی
ہوائے نفسانی کو یک قلم مٹا دیا۔ خسروِ روزگار کی بدولت جس قدر درجۂ اعتبار کا بلند ہوا، مرتبہ
پندار کا پست اور جتنا دلستانِ کمال میں ہوشیار رہا مشاہدۂ عرفان میں مست ہا" ص ۲۱۸

ذوق کی تواضع، فروتنی، کسرِ نفسی، اور مذہبیات سے ان کے گہرے شغف کے بارے میں مولانا آزاد نے بہت کچھ لکھا ہے، فقراء اور بزرگانِ دین سے ان کی عقیدت و محبت سے متعلق "آبِ حیات" کے صفحات گواہ ہیں جن کی روشنی میں ذوق کی سیرت و مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان کے دشمن حقائق کے باوجود ذوق کو انتہا درجے کا چاپلوس قرار دیا ہے اور سودا جن کی دنیاداری اور حبِّ جاہ کسی سے پوشیدہ نہیں ان کے متعلق بڑی سادگی سے فرما دیا :-

"سودا نے جو مدحیہ قصائد کہے ان میں زورِ تخیل ہے مگر خوشامد نہیں۔"

حالانکہ یہی سودا ہیں جن کے متعلق "جلوۂ خضر" میں صاف صاف لکھا ہے :-

"یہی (آصف الدولہ) کے وقت میں میر ضاحک مع اہل و عیال فیض آباد میں آ بسے، سودا اور ضاحک
امیروں کے کھلونے بن گئے اور ان دونوں کی آپس میں ہجویں باعثِ توسیعِ رزق ٹھہریں اور امیروں
کو خوش کرنے کو ہجووں کی بھرمار شروع کر دی، سودا کی جو اس وضع کے سبب بن پڑی تو ہر ایک نے
یہی راہ اختیار کی۔"

سودا کی بے نیازیوں کا بھرم کھولنے کو صرف یہی اقتباس کافی ہے، سودا اور ذوق کی بے نیازانہ طبعی کا اندازہ کرنے کے لئے خود ان دونوں کے قصائد کا مطالعہ بھی سود مند ہو سکتا ہے، قصیدے کا ایک جزوِ ترکیبی "حسنِ طلب" بھی ہے یہ قصیدہ کا آخری جزو ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا مدعا اور آرزو بیان کرتا ہے۔ ذوق کے کسی قصیدے میں "حسنِ طلب" کا التزام نہیں ہے اس کے برخلاف سودا کا کوئی قصیدہ اس سے خالی نہیں۔ ذوق نے صرف دعائیہ کلمات پر اپنے قصیدوں کو ...... ختم کر دیا ہے، ان حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ذوق و ظفر کی وابستگی معاشی نقطۂ نظر سے ہرگز نہیں تھی بلکہ اس کی تہہ میں کسی اور جذبے کو دخل تھا جس میں اگر ایک جانب عقیدت و احترام کی لہر تھی تو دوسری طرف خلوص و محبت کا پاکیزہ سوتا قلب کے کسی گوشے سے برابر برسرِ کار رہتا۔ یہی سبب ہے کہ جس وقت ذوق کی وفات کی خبر قلعے میں

پہنچی تو بادشاہ نے دربارِ عام جو بہ تقریب آخری چہار شنبہ منعقد تھا برخاست کر دیا، اور حکم دیا کہ تمام شہزادگان و عمائدین دربار استاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں شریک ہوں۔"

دہلی اردو اخبار ۱۹ر نومبر ۱۸۵۴ء رقم طراز ہے۔

"بہ تحقیق سنا گیا کہ حضور والا و مرزا دارا بخت و مرزا شاہ رخ و مرزا فرخندہ شاہ وغیرہم شہزادگان مرحومین کے واقعات میں اس قدر نعرہ زناں و گرم شیون نہیں ہوئے جو استادِ مرحوم کے واقعہ جانکاہ سے مضطرب ہوا اور فی الحقیقت کیوں نہ ہو، جو کچھ ہو سو تھوڑا ہے کہ ایک عالم میں چالیس پچاس برس کا ساتھ بچھڑا ہے۔"

اسی اخبار کی ۲۶ر نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۷ر صفر المظفر ۱۲۷۱ھ کی اشاعت میں اس حادثہ جانکاہ سے متعلق مزید یہ بھی معلوم ہوا۔

"سنا گیا ہے کہ حضور والا وقار الدولہ خلیفہ محمد اسمٰعیل خلف الصدق شیخ مرحوم کے گلے لگ کر بہت روئے۔

اور نواب زینت محل صاحبہ بھی بہت تشفی فرماتی ہیں۔"

اس موقع پر ظفر نے ذوق کا جو قطعۂ تاریخ موزوں کیا وہ بھی بادشاہ کے جذبات ملال کی آئینہ داری کرتا ہے۔

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر ، بہ حکم خداوند جاں داد ذوق
ظفر روئے اردو بہ ناخن ز غم خراشید و فرمود استاد ذوق

اس شخصی بحث سے ہٹ کر ڈاکٹر صاحب نے ذوق کو قصیدہ نگاری سے متعلق ایک اچھوتا نظریہ قائم کیا ہے، جسے موصوف کی ذہنی اپج کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں۔ "چونکہ سودا کو فطری طور پر [illegible] تحصیل اور ذکاء رسا حاصل تھی اس لئے ان کو فارسی شعراء کی تتبع میں کامیابی حاصل ہوئی۔ سودا کے برخلاف، ذوق نے فارسی شعرا کا براہ راست تتبع کیا بلکہ انھوں نے خود سودا کی تقلید شروع کی، ذوق کے لیے یہ سہل راستہ تھا، کیوں کہ ان کے سامنے سودا کی وساطت سے فارسی قصیدہ نگاروں کے نمونے موجود تھے، اس کے علاوہ سودا قصیدہ نگاری کی وادی میں کافی دل کش اور حسین گل کھلا چکے تھے [illegible] ذوق نے ان کی خوشہ چینی پر اکتفا کی اور ایران سے براہ راست پھول لانے کی زحمت گوارا نہ کی۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ ایک ایسی بات کہی ہے جس کا کوئی منطقی جواز ہے نہ تحقیقی روایت۔ گزشتہ سطور میں ذوق کے بیسیوں اشعار پیش کئے جا چکے ہیں، جن کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ذوق نے یقیناً نہ صرف یہ کہ فارسی شعراء کے قصائد کا مطالعہ کیا بلکہ عربی قصائد پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ایک جگہ خود کو خاقانی قرار دیا ہے جس سے یاد رہتا ہے کہ اس شاعر کے قصائد کو انھوں نے خصوصیت سے پڑھا تھا، مذکورہ شعر یہ ہے :-

مدح حاضر کے لئے دربار ہو ذوق ÷ تجھ سا خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

خاقانی کی زمینوں میں ذوق کے یہاں دو قصائد ملتے ہیں، انوری کی زمینوں میں چار۔ سودا نے بھی ان زمینوں میں طبع آزمائی

کی ہے۔ ذوق کے خیالات پر سودا کی چھاپ ضرور ہے لیکن تغلبیہ ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ ذوق اور سودا کے قصیدوں کی معنوی فضا بہت حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں شاعروں کو کچھ خاص قسم کے مضامین مرغوب ہیں اور دونوں اپنی تشابیب میں بیشتر انھیں مضامین کا اعادہ کرتے رہتے ہیں، ذوق کی تشابیب مرصع ہونے کے ساتھ ساتھ عالمانہ و حکیمانہ نکات سے لبریز ہیں اس کے برخلاف سودا کے یہاں آلام حیات و آشوب روزگار کی شیون کاریاں بکھری ہوئی ہیں۔ سودا نے جا بجا تمثیل کے پھریرے اڑائے ہیں جن کے سائے میں ان کے علم و فضل کی آرائشی محرابیں دھندلا سی گئی ہیں، ذوق کے یہاں ایسا نہیں ہے، دونوں اساتذہ کے معیار قصیدہ گوئی کے اس فرق کو قدرے صراحت کے ساتھ گزشتہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے جس کا اس جگہ دہرانا تکرار بیجا کا مصداق ہوگا لہٰذا اس سے احتراز مناسب ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مضمون کی بحث مقطع میں سخن گسترانہ بات کے مصداق ہے اس بحث کا ہمارے موضوع سے براہ راست کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ جس سے خصوصیت سے ذوق کے شخصی معیار کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا لہٰذا دلائل کی روشنی میں اس کا رد ضروری سمجھا گیا، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ادب کا محقق ہونے کے باوجود پایۂ تحقیق سے گری ہوئی بات کہی جسے ایک لحاظ سے بددیانتی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، ہم ایک بار پھر اس بات کو تسلیم کر لینے میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کرتے کہ سودا ذوق کے مقابلے میں یقیناً بڑے قصیدہ گو ہیں، ان کے علوئے فکر اور شاعرانہ شگوفہ کاریاں ذوق کے بس کی بات نہیں، نیز ان کی سی سیاسی و سماجی بصیرت کا اظہار بھی ذوق کے یہاں نہیں ہو ملکی و معاشرتی امور پر ان کی گرفت مضبوط نہیں، اس بارۂ خاص میں ان کے قصائد میں کوئی اشارہ نہیں ملتا اس کے برخلاف سودا کے یہاں عام ملکی حالات اور سماجی افراتفری پر بے لاگ تبصرے موجود ہیں جو یقیناً لائقِ داد ہیں، لیکن ان امور سے قطع نظر جہاں تک ذاتیات کا تعلق ہے سودا ذوق کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچ پاتے اور صرف سودا ہی نہیں دہلی کے تمام قدیم اور جدید شعراء میں سوائے خواجہ میر درد کے اس وصف خاص میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ذوق کی قصیدہ گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے بد مذاقی ہوگی اگر اس جگہ اس کا حوالہ دیے بغیر مضمون کو ختم کر دیا جائے، فرماتے ہیں۔

"ذوق نے یک گیر د محکم گیر اصول پر عمل کیا، بہادر شاہ کا دامن مضبوطی سے پکڑا اور انھیں کی مدح میں زندگی صرف کر دی، اس لئے ذوق کے قصائد کا دائرہ بہت تنگ ہے، اور جو ہمہ گیری ہم کو سودا کے قصائد میں ملتی ہے ذوق کے قصائد میں اس کی کمی ہے"

ہم اس موضوع کے ضمن میں طول بیانی سے کام نہیں لیں گے البتہ اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر بقول ڈاکٹر صاحب قصیدے کے تنوع و ہمہ گیری ممدوحین کی قلت و کثرت ہی پر منحصر ہے تو اس پہلو کے لحاظ سے غالب کو قصیدہ گو شعراء کی صف میں سب سے مقدم جگہ دینی ہوگی جس نے شاہان مغلیہ اور دیگر رؤسا کے علاوہ ملکہ انگلستان اور اس کے معمولی سے معمولی اہلکاروں کی بھی تو

باقی صفحہ ...

عبرت الناظرین

صفیر بلگرامی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

قومی زبان ، شمارۂ دسمبر ۱۹۶۶ء میں مثنوی "عبرت الناظرین" کا بڑا حصّہ شائع کیا جا چکا ہے - بقیہ حصّہ ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں - جناب سید وصی احمد بلگرامی کے توضیحی حواشی مثنوی کے بعد درج کئے جا رہے ہیں - اس مثنوی کے دو مسودے موجود ہیں - سید وصی احمد صاحب نے ان دونوں مسودوں کے اختلافات کی تفصیل بھی پیش کی ہے - (ادارہ)

وزیر اودھ مطیع بادشاہِ دہلی

محمد امین ملک انتساب — کہ برہان ملک اوس نے پایا خطاب

محمد شہ ہند کا وقت تھا — کہ حاصل کیا اوس نے یہ مرتبا

سب احوال تاریخ میں ہے رقم — کہ ناظم اودھ کا تھا وہ ذی حشم

ہوا جب کہ ہنگامۂ نادری — تو کرنال میں اوس کی فوجیں چڑھی

ہوئی پہلے عازم برائے مصاف — ۵ چلی خوب شمشیر خارا شگاف

ہوا دونوں میں شاہوں میں پیغام صلح — اسی کے سبب سے ہوا کام صلح

مگر ناگہانی قضا آ گئی — کمی اپنی تقدیر دکھلا گئی

ہوا اوس کا جس سنہ میں ہے انتقال　　ہزار و صد و پنجہ و یک تھا سال[1]
جو تھا صفدر جنگ صاحب لوا　　محمد امین کا تھا وہ بھانجا
وہ داماد ہی تھا - ہوا جانشیں ۱۰　　ملی اوس کو آخر اودھ کی زمیں
وزیر الممالک ہوا وہ امیر　　بنا فیض آباد جائے سریر
ہوا جب کہ دہلی میں ضعف کمال　　سلاطین دہلی پہ آیا زوال
مرہٹوں کا ہنگامۂ بے محل　　ہر اک سال دُرّانیوں کا خلل
غرض رات دن زور گھٹتا گیا　　ادھر اور ادھر ملک بٹتا گیا
نظام دکن اوس طرف مستقل ۱۵　　ادھر مرشد آباد نے پھیرا دل

اودھ کا جو فرماں روا تھا وزیر
رہا اپنے دل سے مطیع سریر

دلیل اس کی پوچھے جو مجھ سے کوئی　　اطاعت بھلا ان سے کیونکر ہوئی
تو میں اس طرح دوں گا اس کا جواب　　کہ وہ صفدر جنگ والا خطاب
ہوا جس گھڑی اوس کا ہے انتقال　　پس از یازدہ صد ستھے ہفتاد سال[2]
شجاع اوس کا بیٹا بصد عز و شاں ۲۰　　اودھ میں ہوا اوس کی جا حکمراں
جو دہلی میں تھا تخت دولت کا زیب　　وہ سلطاں تھا ہم نام اورنگ زیب
سُنا صفدر جنگ کا اوس نے حال　　لکھا اوس نے شقّہ سراپا ملال

کہ افسوس مشرق کا مہرِ کلاں
بساطِ زمیں سے اوٹھا ناگہاں
اب اوس کی جگہ اوس کا والا پسر
بدستور قائم رہے بے خطر

اسی سے ہے ظاہر کہ بے اختلاف ۲۵　　وزیر اور سلطاں تھے سب سینہ صاف
دلیل دوم یہ کہ عالی گہر　　جو تھا شاہ والا کا لختِ جگر
ہوا شاہ سے اوس سے جب اختلاف　　چلا جب وہ دہلی سے راہ خلاف

---

[1] سنہ ۱۱۵۱ ہجری　[2] سنہ ۱۱۶۷ھ

کیا اوس نے پورب کا عزم سفر　　اودھ میں جو آ پہونچا وہ نامور
خبر اس کی سن کر شجاع جوان　　گیا پیشوائی کو خود تا موہان
زر و گوہر و دُرّ و اسپ و خیام　۳۰　کئے نذر اوس نے بصد اہتمام
دلیل سوم یہ کہ جب بادشاہ　　ہوا قتل دہلی میں با اشک و آہ
پسر شاہ کا شاہ عالم جو تھا　　وہ پٹنہ میں تھا کر رہا معرکہ
کہ ناظم جو تھا مرشدآباد کا　　وہ شہزادہ سے تھا دغا کر رہا
ہوا قتل سلطاں جو یوں ناگزیر　　کیا شاہزادہ نے قصد سریر
تو پٹنہ میں بے سکہ خطبہ لقب　۳۵　جلو میں ہمایوں ہوا وقت شب
کہ فرصت نہ تھی جنگ افساد سے　　وہ تھی ناظم مرشدآباد سے
سن ہجری آیا برسم شمار　　جو ہیں یازدہ صد یہ ہفتا دو چار[1]
شجاع زماں حکمرانِ اودھ　　بڑھی جس کے رہنے سے شان اودھ
چلا بارہویں کو بماہ صیام　　پئے خدمت شاہ عالی مقام
بنارس میں داخل ہوا وہ جری　۴۰　کہ تھی اوس جگہ کی اودسے افسری
پھر ایک بادشہ کو لکھی عرضداشت　　خلوص دلی سے وہ تھی عرضداشت

کہ یہ فدوی بارگاہِ جناب
دل و جان سے حاضر ہے بہر رکاب
حضور آئیں پٹنہ سے با فوج و کوس
کریں تخت دہلی پر آکر جلوس

یہ درخواست دیکھی تو با عزّ و جاہ　　چلا پٹنہ سے ہند کا بادشاہ
سُنا جب وزیرالممالک نے حال　۴۵　چلا پیشوائی کو فرخندہ فال
پئے شاہ ہمراہ تھا چتر و تخت　　کرم ناسہ[2] میں پہونچا جب نیکبخت
اودھر سے شہ آسماں بارگاہ　　ملاقی ہوا آکے با عزّ و جاہ
وہ تھی سولہویں ماہ ذیقعدہ کی　　ملاقات جو راستہ میں ہوئی

---

[1] سنہ ۱۱۷۴ھ　[2] کرم ناسہ دریا درمیان صوبہ بہار و صوبہ اودھ

جلو میں چلا بادشہ کا وزیر
سواری کو فرماں ہوا ناگزیر ۴۹

مولوی عبدالعزیز آروی

سناؤں تمہیں نقل اک چشم دید — جسے سن کے ہو سب کو شوق مزید
اسی آرہ میں ایک صاحب تمیز — تھے [1] ملکی محلہ میں عبدالعزیز
پڑھاتے تھے لڑکوں کو وہ روز و شب — وہی اون کی روزی کا تھا بس سبب
مرے دوست تھے اور ہوا خواہ تھے — فقط علم مکتب سے آگاہ تھے
کریما گلستاں ہو یا بوستاں ۵ — پڑھاتے تھے لڑکوں کو وہ جاوداں
مگر نیک طینت تھے پاک اعتقاد — طبیعت میں فتنہ نہ دل میں فساد
غنی تھے نہ کچھ صاحب زر تھے وہ — اگروالوں [2] کے گھر میں نوکر تھے وہ
نہ کچھ اون کو تصنیف کا شوق تھا — نہ کچھ اون کو تالیف سے ذوق تھا
رواں جب کہ آرہ میں مطبع ہوا — ہوا اون کو بھی شوق تصنیف کا
لکھی پہلے تعلیمیہ اک کتاب ۱۰ — کہ جس میں ہے بالکل سوال و جواب
مدد اس کے چھپنے میں لڑکوں نے کی — مگر نیک نیت مصنف کی تھی
اسے اپنے مکتب میں جاری کیا — بکا جو مددگاروں کو دے دیا
لکھی بحر تعلیم پھر اک کتاب — اوسی طرح اس کا بھی ٹھہرا حساب
غرض، پھر تو ان کا بڑھا حوصلہ — رسالے پہ لکھا رسالہ نیا
خدا نے اثر اون میں ایسا دیا ۱۵ — کہ کل ہند میں ان کو پھیلا دیا
ہر اک مطبع ہند میں ہر کتاب — ہزاروں چھپی - بک گئی بس شتاب
یہ چھپواتے اک بار بس - بعد ازاں — خود اہل مطابع ہیں جتنے وہاں
چھپیں دہلی و لکھنؤ میں بھی وہ — پھریں بکتی پھر کو بکو میں بھی وہ

---

[1] قصبہ آرہ کا ایک مشہور محلہ۔ [2] اگروالہ - اس سے مراد آگرہ والا - صوبہ بہار ضلع شاہ آباد آرہ میں مہاجن ٹولی نمبر ایک اور دو میں آگرہ کے مہاجن صدیوں سے مقیم ہیں - یہ جین مذہب کی قوم مہاجنی اور تجارت کرتی ہے اور بہت مالدار ہے۔

زمانہ یہ برکت کا قایل ہوا | یہاں تک ہراک شخص مایل ہوا
کہ کامل تھے جو اور عالم تھے جو ۲۰ | پڑھانے لگے اپنے اطفال کو
غرض بعد چندے کے وہ مرگئے | مگر نام اس طرح کا کرگئے
کہ مقبول ہے اون کی ہراک کتاب | ہزاروں ہی چھپتی ہیں باآب وتاب
گلستان سعدی کی تاثیر ہے | یہی قابل رشک تدبیر ہے
نہ اولاد چھوڑی نہ کچھ چھوڑا گھر | یہی چھوڑکر مرگئے بے خطر

قیامت تک اون کا ہے نام نکو
غرض علم ہے باعث آبرو ۲۵

نقل از بیاض سید فرزند احمد صفیر بلگرامی - اوّل مسودہ مثنوی عبرت الناظرین -

حواشی

از
سید وصی احمد بلگرامی

عبرت الناظرین

خدایا بقا ہے ترے واسطے
بقایا خدا ہے ترے واسطے

یہ مطلع اس مثنوی کا ہے جو دراصل مرثیۂ حضرت واجد علی شاہ اختر تاجدار اودھ ہے - اور مرثیہ اس سال کہا گیا تھا جس سال شاہ اودھ مرحوم و مغفور نے رحلت کی تھی - چنانچہ ابیات ۳۰۰ تا ۳۰۵ یہ ہیں ؎

مگر خاتم خسروانِ اودھ | جو تھا جانِ عالم نہ جانِ اودھ
فلک قدر واجد علی بادشاہ | ہوا خاتمہ جس پہ شاہی کا آہ
وہ خود صاحب علم و تصنیف تھا | ہراک علم کا اوس میں تھا مادّہ
دریغا وہ اس سال میں مرگیا | کہ شاہی کا بھی خاتمہ کرگیا

سال رحلت واجد علی شاہ اس طرح سال تصنیف اس مثنوی کا ہے - یعنی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء ہے - تاریخ وفات چارشنبہ ۳ محرم ۱۳۰۵ھ - ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء

اس مثنوی میں کل ابیات (۳۴۶) تین سو چھیالیس ہیں - اوس کے بعد ایک مصرع یہ ہے - " اسی طرح سے

(۱) نسخۂ ہذا میں خود حضرت صغیرؔ بلگرامی کے قلم سے (۳۱۱) تین سو گیارہ ابیات ہیں اور آخر شعر یہ ہے ؎

یہ سلطاں اودھ کا تھا با عدل و داد
گیا حیف دنیا سے وہ نامراد

(۲) بقیہ ابیات ۳۱۲ - ۳۶۶ مصنفہ حضرت صغیرؔ بلگرامی ایک دوسرے مسودہ سے ہمارے بھائی صاحب مدظلہ العالی سید عنایت احمد بلگرامی نے اس نسخہ میں نقل کیں۔ وہ دوسرا مسودہ خود جدی مرحوم حضرت صغیرؔ بلگرامی کی تحریر ہے۔ اور آخر شعر یہ ہے ؎

جلو میں چلا بادشہ کا وزیر
سواری کو فرماں ہوا ناگزیر

اس مثنوی (ناتمام) کا موضوع یہ ہے:

(۱) بقا صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ باقی سب فانی۔

(۲) کہ " باقی نماند بجز نیک نام "۔ (بیت ۱۹۴)

(۳) نام نیک صرف علم و عمل سے حاصل ہوتا ہے۔" کہ بے علم نتواں خدارا شناخت " (بیت ۲۵۴)

" جو عامل نہیں مرد کامل نہیں " (بیت ۲۷۰)

(۴) اگلے زمانہ میں علم کی بڑی قدر تھی۔ سلاطین و امرا علم کی قدر دانی کرتے تھے اور اس طرح نیک نام چھوڑ جاتے تھے۔ خود آخری تاجدار اودھ حضرت جان عالم واجد علی شاہ صاحب قلم و قدر دان اہل قلم تھا

(۵) یہ غلط خیال ہے سلطنت دہلی سے سلطنت اودھ نے بغاوت کی۔ مثنوی میں چند ثبوت پیش کئے گئے ہیں کہ وزیر اودھ بادشاہ دہلی کا مطیع و فرماں بردار تھا۔

(۶) ابھی یہ بحث تمام نہیں ہوئی تھی کہ مسودہ ناتمام رہ گیا۔ ممکن ہے کہ یہ مثنوی کسی دوسرے مسودہ میں تمام و کمال ہو۔ مگر دوسرا مسودہ بھی جس سے ابیات (۳۱۲ - ۳۶۶) نقل کی گئیں ناتمام ہے۔

(۷) بیت (۳۰۶) ؎

یہ ہے داستان عبرت الناظرین
قلم کو بیان کی بھی طاقت نہیں

مثنوی عبرت الناظرین کا اصل مسودہ بقلم جدی صغیرؔ بلگرامی علیحدہ ہے۔ اسی کی نقل یہ دوسرا نسخہ بقلم صغیرؔ ہے۔ اس دوسرے نسخہ میں صاف کرتے وقت (۳۹) اشعار چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہ چھوڑنا قصداً ہوگا۔ راقم الحروف نے پوری مثنوی کو علیحدہ لکھا ہے۔ اور مسودہ کے دو شعر

شامل کر لئے ہیں۔

متعلق تیمور و بابر۔ اور مثنوی کو ختم اس شعر پر کر دیا ہے:

یہ سلطان عالم تھا عالم پناہ
نسب اور حسب میں تھا با عزّ و جاہ

دیگر اشعار مسودہ کے مثنوی سے علیحدہ نقل کئے گئے۔ کیونکہ وہ حصہ اول تو نا تمام ہے اور دوم اور صغیر بلگرامی نے صاف کرتے وقت یعنی موجودہ نسخہ میں شامل نہیں کیا تھا۔

مثنوی عبرت الناظرین کے وہ اشعار جن میں مسودہ اوّل و مسودہ دوم میں اختلاف ہے

بیت نمبر		
۵	کہ ہے ہستیٔ محض زیبا تجھے کہیں کیوں نہ سب لوگ یکتا تجھے	کہے عقل کیونکر نہ یکتا تجھے کہ ہے ہستیٔ محض زیبا تجھے
۹	بقا اپنی فانی ہے فانی بقا نہیں کچھ نہیں اور ہاں کچھ نہیں	بقا اپنی فانی ہے باقی فنا نہیں کچھ نہیں اور ہاں کچھ نہیں
۵۲	کہ سیاروں کے ساتھ یہ آفتاب ہے عالم کے عرصہ میں گرم شتاب	کہ سیاروں کے ساتھ خود آفتاب ہے عالم کے عرصہ میں گرم شتاب
۵۳	رواں ہے کسی جانب اس ڈھنگ سے کہ واقف نہیں کوئی اس رنگ سے	رواں ہے کسی جانب اس رنگ سے کہ واقف نہیں کوئی اس ڈھنگ سے
۷۱	کہ دم دار تارے بخارات ہیں وہ گردش میں ہر وقت دن رات ہیں	یہ دم دار تارے بخارات ہیں جو گردش میں ہر وقت دن رات ہیں
۸۵	لگی ایسی چالوں میں ہے برہمی	عیاں ایسی چالوں میں ہے برہمی

نہ مغرور ہو عقل پر آدمی — سمجھ پر نہ مغرور ہو آدمی

۸۷
نہیں کچھ بھی معلوم کیا ہے یہ ساز — نہیں کچھ بھی معلوم کیا ہے یہ ساز
کھلے گا کسی پر کبھی اس کا راز — کھلے گا کسی پر کہاں اس کا راز

۹۴
تو ہم ان سے قدرت میں بس ہیچ ہیں — ہم اون سے تو قدرت میں پھر ہیچ ہیں
مگر ہمکو بھی دھڑکے در پیش ہیں — مگر ہمکو بھی دھڑکے در پیش ہیں

۱۰۰
خرد کہتی ہے رہ گیا اک وجود — خرد کہتی ہے رہ گیا اک وجود
نہ ہوتا تو ہوتی نہ اس کی نمود — نہ ہوتا جو ممکن نہ ہوتی نمود

۱۰۲
جو کہتی خرد اس کا ہونا محال — جو کہتی خرد اس کا ہونا محال
نہ اس ہستی کا ہمکو بندھتا خیال — تو آتا بھی ہمکو نہ اس کا خیال

۱۳۳
وہ ہستی میں اپنی ہے بس منفرد — وہ ہستی میں اپنی ہے بس منفرد
نہ اوس کا ہے مانند نہ کوئی ضد — نہ اوس کا ہے مانند کوئی نہ ضد

۱۳۶
کہا ایک نے اے امام جلیل — کہا ایک نے اے امام جلیل
کہ ہستی پہ صانع کی کیا ہے دلیل — وجود الٰہی کی کیا ہے دلیل

۱۴۰
کہ یا ہم نے ہست آپ کو جب کیا — کہ یا ہم نے ہست آپ کو جب کیا
کہ جب ہست تھے آپ ہم مطلقا — کہ جب نیست تھے آپ ہم مطلقا

۱۴۱
محالات سے ہے یہ امر عجیب — محالات سے ہے یہ امر عجیب
کہ ہے ہست کا ہست ہونا غریب — کہ ہے ہست سے ہست ہونا غریب

۱۷۴
یہاں بھی وہ ہیں تینوں شکل وجود — یہاں بھی ہیں کُل تین شکل شہود
دلایل سے جن کی ہوئی ہے نمود — دلائل سے جس کا ہے روشن وجود

۱۸۸
گزر گاہ ہے جب یہ دارِ محن — گزر گاہ ہے جب یہ دار محن
سمجھنا بھی واجب ہے بس یہ سخن — تو واجب سمجھنا بھی ہے یہ سخن

۲۴۴
کریں غور اس میں اگر آدمی — عبث اس میں معروف ہے آدمی
نہیں اون کو حاصل بقا دایمی — نہیں اوس کو حاصل بقا دایمی

۲۴۵
اگر بعض ان کاموں کی یاد ہے — اگر بعضے کاموں کی کچھ یاد ہے
تو سمجھو وہ شہرت خداداد ہے — تو سمجھو وہ شہرت خداداد ہے

۲۴۷
کنوئیں سیکڑوں بھر کے اندھے ہوئے — نہ مسجد رہی اور نہ پُل ہی رہے
نہ مسجد رہی اور نہ پُل رہ گئے — کنوئیں سیکڑوں بھر کے اندھے ہوئے

۳۰۲
نگر خاتمِ خسروانِ اودھ — نگر خاتمِ خسروانِ اودھ
دل و جانِ عالم نہ جانِ اودھ — جو تھا جانِ عالم نہ جانِ اودھ

مثنوی عبرت الناظرین کے وہ اشعار جو مسودہ اوّل میں موجود ہیں مگر مسودۂ ثانی میں جدی مرحوم و مغفور حضرت خیرؔ بلگرامی نے قصداً چھوڑ دیئے ہیں۔ گویا یہ اشعار قلم زد ہیں ــــ تعداد (۳۹) ابیات:

ابجد بیت (۹)
جہاں میں جو تیرا نہیں اختیار — تو پھر ہستیٔ جاوداں کچھ نہیں

" " (۱۰)
جب اقوال اون کے ہیں خود مختلف — حکیموں کا وہم و گماں کچھ نہیں

بعد بیت (۱۱۰)

نقیضین یہ حالتیں ہیں تمام محال ایک میں دُو حالتیں ہیں مدام

حاشیہ بیت (۱۴۴)

وہ دُو شکلیں ضدّین باہم ہیں یوں کہ جس طرح دن رات ضدّیں ہوں
عدم میں تو ہے آپ معدومیت پر اشیا کو حاصل ہے دونوں صفت
ظہور و عدم اس میں موجود ہیں کبھی ظاہر اور گاہ مفقود ہیں
یہ دُو حالتیں ایک شے کی بہم دکھاتی ہیں دونوں کو راہِ عدم
نہ یہ دونوں ہو سکتے ہیں مجتمع نہ یہ دونوں ہونگے کبھی مرتفع
بجا اپنے عالم میں دونوں ہیں صاف خرد کو نہیں اس میں کچھ اختلاف

بعد بیت (۱۷۳)

یہ عالم جو ہے فیض اقدام پاک بقا و فنا کا رہا اشتراک
نہ ایسا کہ جیسا ہے خاص نبیؐ ہے کس کے لئے اختصاص نبیؐ
بقا و فنا یہ جو اشیا کی ہے تو شکل اس میں معدوم و پیدا کی ہے

بعد بیت (۲۸۱)

نقل

سناؤں یہاں نقل اک چشم دید جسے سن کے ہو سب کو شوق مزید
اسی آرہ میں ایک صاحب تمیز تھے ملکی محلّہ میں عبد العزیز
پڑھاتے تھے لڑکوں کو وہ روز و شب وہی ان کی روزی کا تھا بس سبب
مرے دوست تھے اور ہوا خواہ تھے فقط علم مکتب سے آگاہ تھے
کریما گلستاں ہو یا بوستاں پڑھاتے تھے لڑکوں کو وہ جاوداں
مگر نیک طینت تھے پاک اعتقاد طبیعت میں فتنہ نہ دل میں فساد
غنی تھے نہ کچھ صاحب زر تھے وہ اگروالوں کے گھر میں نوکر تھے وہ
نہ کچھ اون کو تصنیف کا شوق تھا نہ کچھ اون کو تالیف سے ذوق تھا
رواں جب کہ آرہ میں مطبع ہوا ہوا اون کو بھی شوق تصنیف کا
لکھی پہلے تعلیمیہ اک کتاب کہ جس میں ہے بالکل سوال و جواب
مدد اس کے چھپنے میں لڑکوں نے کی مگر نیک نیت مصنف کی تھی

اوسے اپنے مکتب میں جاری کیا — پکا جو مددگاروں کو دے دیا
لکھی بحر تعلیم پھر اک کتاب — اوسی طرح اس کا بھی ٹھہرا حساب
غرض پھر تو ان کا بڑھا حوصلہ — رسالہ پہ لکھا رسالہ نیا
خدا نے اثر ان کو ایسا دیا — کہ کل ہند میں اون کو پھیلا دیا
ہر اک مطبع ہند میں ہر کتاب — ہزاروں چھپی پک گئی بس شتاب
یہ چھپواتے اک بار بس بعد از آں — خود اہل مطابع ہیں جتنے وہاں
چھپیں دہلی و لکھنؤ میں بھی وہ — پھریں بکتی پھر کو بکو میں بھی وہ
زمانہ یہ برکت کا قایل ہوا — یہاں تک کہ اک شخص مایل ہوا
کہ کامل تھے جو اور عالم تھے جو — پڑھانے لگے اپنے اطفال کو
غرض بعد چندے کے وہ مر گئے — مگر نام اس طرح کا کر گئے
کہ مقبول ہے اون کی ہر اک کتاب — ہزاروں ہی چھپتی ہیں باآب و تاب
گلستان سعدی کی تاثیر ہے — یہی قابل رشک تدبیر ہے
نہ اولاد چھوڑی نہ کچھ چھوڑا گھر — یہی چھوڑ کر مر گئے بے خطر

قیامت تک اون کا ہے نام نکو
غرض علم ہے باعث آبرو

بعد بیت (۳۰۰)
کتابیں جو تیمور و بابر کی ہیں — ہمایوں شہ دادگستر کی ہیں
وہ ہیں کارنامے وہ ہیں یادگار — فوایدکی اون کے ہیں بس بے شمار

وزیر اودھ مطیع بادشاہ دہلی

(۱)
کہ افسوس مشرق کا تبرہ کلاں
بساط زمیں سے اٹھا ناگہاں

ﻪ وفات عبدالعزیز سلاطین ۰ آفتاب علم با پوشیدہ شدہ

اصل مسودہ میں اس بیت پر صغیر بلگرامی کا حاشیہ یہ ہے :-

" نقل شقہ دستخطی عالمگیر ثانی از تبصرة الناظرین

مولوی سید محمد بلگرامی خلف علامہ جلیل ص ۱۵۰ "

" افسوس ہزار افسوس کہ نیرہ کلاں مشرق زدیہ از جہان

فانی رفت - ما بدولت صوبہ و سرکارات و دیگر خدمات

بدستور سابق از راہ خانہ زاد پروری بہ شجاع الدولہ بہادر

پسرش ارزانی فرمودیم - بخاطر جمع و استقلال تمام در

بندوبست و انتظام پردازد لگ انتہی

نواب صفدر جنگ - مرزا محمد مقیم خاں ابن مرزا مسیح - نواسۂ محمد خاں ابن مرزا محمد قلی خاں ۔

وفات صفدر جنگ سنہ ۱۱۶۷ ھ ہجری مقام پر پیر گھاٹ - مدفن مدرسۂ دہلی - یہ مدرسہ صفدر جنگ نے تیس۳ لاکھ روپیہ میں تعمیر کیا تھا - وفات صفدر جنگ کی خبر سن کر عزیز الدین عالمگیر ثانی بادشاہ دہلی نے یہ شقہ بنام جلال الدین حیدر خاں نواب شجاع الدولہ بھیجا تھا ۔

عالمگیر ثانی کا جانشین مرزا عبداللہ - عالی گوہر - شاہ عالم ثانی - تخلص آفتاب - جلوس سنہ ۱۱۷۳ ھ - کور شدن سنہ ۱۲۰۲ ھ - وفات سنہ ۱۲۲۱ ھ - تاریخ وفات از سید انشا -

ہے وقت شاہ عالم فخر جہانیاں   وہ غم کہ جس سے ہر بنی آدم کو غم ہوا

دو بار سر جھکا کہا آفتاب نے   تاریخ پادشاہ کی -" عالم کو غم ہوا "

۱۲۱۹
۲ +
۱۲۲۱ ہجری   (الف آفتاب کو دو بار)

(۲) مثنوی عبرت الناظرین اصل مسودہ میں اس مصرع پر ختم ہوتی ہے " اسی طرح سے جائی مقصود تک " مسودہ میں مصرع ثانی اور باقی ابیات کی جگہ خالی ہے - اس لئے مصرع اول ناتمام کو مثنوی سے خارج کرکے بیت (۴۹) پر مثنوی کی نقل ختم کر دی گئی ۔

(۳) مثنوی عبرت الناظرین میں تقریباً چارسو ابیات ہیں ۔ راقم الحروف نے صغیر بلگرامی کی ترتیب جو مسودہ اول سے مختلف ہے اور مسودہ دوم میں رکھی گئی تھی قائم رکھی ۔ یعنی مثنوی کو تین۳ حصوں میں بانٹ دیا ۔ حصہ اول

(۳۱۶) ابیات از آغاز مثنوی تا وفات واجد علی شاہ

حصہ دوم (۲۵) ابیات متعلق مولوی عبدالعزیز آروی

حصہ سوم (۴۹) ابیات متعلق بادشاہ دہلی و وزیر اودھ

۳۴۶ ابیات جو مسودہ اول میں ہیں لیکن چھوڑ دی گئیں۔

مولوی عبدالعزیز آروی

مخزن تاریخ مصنفہ شیخ محمد اسمعیل ۔ مہر آروی ۔
شاگرد صفیر بلگرامی و رئیس ملکی محلہ آرہ ۔

۱) تاریخ طبع چراغ مکتب مولفہ مولوی عبدالعزیز آروی مصنف نسخۂ تعلیمیہ :-

ہوئی جب کتاب نصیحت تمام　　　کہا دل نے اس کا ہو سنہ لاجواب
اسی فکر میں بیٹھے تھے مہر ہم　　　کہ آئی ندا "خوب نادر کتاب" فصلی سنہ ۱۲۸۶ مطابق سنہ ۱۲۹۵ھ

۲) تاریخ رحلت مولوی عبدالعزیز صاحب ۔ عزیز آروی ۔ مصنف نسخۂ تعلیمیہ :-

رفت از دار فنا عبدالعزیز　　　دیدہ گریاں و دلم غم دیدہ شد
مہر این مصراع تاریخش نوشت　　　"آفتاب علم ما پوشیدہ شد" سنہ ۱۲۹۶ھ

اوستاد زمانہ تھا جو عزیز　　　آج جنت کو وہ روانہ ہوا
ساتھ ماتم کے مہر کیوں نہ کہوں　　　"اوٹھ گیا آج علم کا چرچا" ۸۱۵

(ماتم) ۱۲۹۶/۴۸۱ ہجری

فقرات تاریخی

" ماتم خانۂ جناب عزیز " . . . ———— سنہ ۱۲۸۷ فصلی
" آہ بس خاتمۂ علم ہو گیا " . . . ———— سنہ ۱۲۹۶ ہجری
" رحلت از دنیا کرد عبدالعزیز لطیفہ گو " ———— سنہ ۱۲۹۶ ہجری

(بقیہ ص۱۲۰)

...ں عار محسوس نہیں کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس نکتے کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ ہر صنف سخن اپنا ایک علیحدہ مزاج رکھتی ہے اس مزاج احترام صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ ان مروجہ معیاروں کو مجروح ہونے سے محفوظ رکھا جائے جو براہ راست اس مزاج تشکیل کی بنیاد دیں، تنوع ہی سب کچھ نہیں ہے فکر و خیال کی تازگی تنومندی اور مضمون جلا کاری بھی ایک چیز ہے ذوق نے اپنے ...ائد میں جس حسن کارانہ انداز بیان اور شائستگی فکر و خیال کو پروان چڑھایا ہے وہ اپنی مخصوص حدود میں کچھ کم قابل لحاظ نہیں ہے ...ہ یہ واقعہ ہے کہ بعد کے آنے والے تمام قصیدہ گو شعرا نے ذوق ہی کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا ہے ۔

سہ ماہی

اُردو

جنوری ۶۷ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مندرجات

مصحفی کا دیوان فارسی	قاضی عبدالودود
میر انظریۂ تاریخ	سیّد محمد تقی
عظیم ادب اور پُر امن دور	ڈاکٹر وزیر آغا
ولی کا غیر مطبوعہ کلام	محمد اکرام چغتائی
حالی کی اخلاقی سماجیات	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت
ہومر کی رزمیہ شاعری	ڈاکٹر احسن فاروقی

مسلسل مضامین

ڈراما کند مالا۔	تعارف	ممتاز حسن
	مقدمہ	صمدانی نقوی
لغت کبیر اُردو		بابائے اُردو
اشاریہ مضامین اُردو		ادارہ

صفحات تقریباً دوسو ○ قیمت تین روپے پچاس پیسے

سفید کاغذ پر ٹائپ کی اعلیٰ طباعت

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ، کراچی

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

بہانۂ بسیار

مغربی پاکستان اسمبلی کے گیارھویں روز جمعہ و غیر سرکاری مسوّدات قانون پیش کئے گئے تھے۔ ان میں قومی زبان کے مسودۂ قانون کو فی الفور زیر غور لانے کی تحریک پیش ہوئی۔ یہ تحریک حزب اختلاف کے قائد خواجہ محمد صفدر نے پیش کی تھی۔ بحث کے دوران پارلیمانی سیکرٹری سردار محمد اشرف نے اس بل کو پھر مجلس منتخبہ کے سپرد کرنے کی تحریک کی۔ واضح رہے اس بل کو تین مرتبہ اس سے پہلے بھی مجلس منتخبہ کے سپرد کیا جا چکا ہے۔ حزب اختلاف کی کڑی نکتہ چینی کے باوجود قومی زبان جیسے اہم مسئلے پر اجلاس کا کورم ٹوٹتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

قومی زبانیں اور ذریعۂ تعلیم

مرکزی وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے لاہور میں قومی زبانوں کے متعلق بیک وقت وہی باتیں پھر دہرائی ہیں جس پر پاکستان میں اب تک عمل ہوتا آیا ہے۔ وزیر تعلیم نے ایک طرف یہ انکشاف فرمایا ہے کہ مرکزی حکومت نے اعلیٰ اختیارات کی کمیٹی قائم کر دی ہے جو اعلیٰ سطح پر قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے امکانات کا جائزہ لے گی۔ دوسری طرف انہوں نے ان امکانات کی تشریح کر کے اس کے مفہوم کو یوں واضح کر دیا ہے کہ اعلیٰ سطح پر انگریزی کی بجائے اردو اور بنگالی کو فوری طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے سے معیار تعلیم متاثر ہوگا۔ موصوف نے پھر انگریزی کے بارے میں انہیں باتوں کو دہرایا ہے جو ہمیشہ قومی زبانوں کو اختیار کرنے کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے پیش کی جاتی رہی ہیں۔ گویا ۱۸ سال کی مدت میں یہ مسئلہ جہاں تھا۔ اب تک وہیں ہے۔

اخبارات کی تجاویز

مرکزی وزیر تعلیم کے مذکورہ بیان پر اردو کے اہم اخبارات نے جو اداریے لکھے ہیں۔ اور جو تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کے مشترک نکات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مطالبۂ پاکستان کا ایک بنیادی محرک قومی زبان کا تحفظ بھی تھا۔ لیکن آزادی کے بعد قومی زبانیں اسی طرح ثانوی حیثیت کی مالک رہیں جس طرح عہد غلامی میں تھیں۔ اب ہم آزادی کے بیسویں سال میں ہیں کیا ایک آزاد باحمیت باغیرت اور بااختیار قوم کے لئے قومی زبانوں کی موجودہ حیثیت قابلِ فخر ہو سکتی ہے۔

۲۔ انگریزی کو لازمی مضمون قرار دینے کی موجودہ پالیسی پر حقیقت پسندانہ نظر ثانی کی جائے۔ جن طلبہ کو فنی یا اعلیٰ تعلیم کے لئے اس زبان کی ضرورت محسوس ہوا نہیں انگریزی پڑھانے کا حسب ضرورت انتظام کیا جائے لیکن تمام طلبہ کے لئے اس زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دی جائے۔

۳۔ مقابلے کے امتحانوں میں بھی اردو اور بنگلہ کو ساتھ ہی ساتھ اہمیت دی جائے۔ اگر مقابلے کے امتحانات میں صرف انگریزی کا سکہ رواں رہا تو اردو اور بنگلہ کبھی اپنا اصلی مقام حاصل نہیں کر سکتیں۔

۴۔ پرائمری میں امیر بچوں اور غریب بچوں کے لئے تعلیمی اداروں کا موجودہ فرق بالکل مٹا دیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے۔

جس کا نہیں الٹا سیدھا

ملک کے دانش وروں، وکلاء اور ماہرین تعلیم کی طرف سے حکومت کے بعض فیصلوں اور ان پر بے عملی سے پیدا شدہ سنگین صورت حال کی سخت مذمت کی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک طرف جامعات اعلیٰ امتحانات کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر ہر سال ایسے ذہین اور فطین فارغ التحصیل افراد کو پیدا کر رہی ہے جو ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر ملک کی اہم ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی تیاری کرتے ہیں اور دوسری طرف مرکزی اور صوبائی ملازمت کے مقابلے کے امتحانات میں انگریزی کی بلا ان کی صلاحیتوں کو پامال کرنے کے لئے تیار بیٹھی رہتی ہے۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ اس صورت حال کا سب سے سنگین پہلو یہ ہے کہ ملک میں جو پہلے سے ہی علاقائی ذہنیتوں کا شکار رہے دو مصنوعی طبقے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ یعنی انگریزی داں تعلیم یافتہ طبقہ جو حکمرانی کے لائق ہے اور اردو داں تعلیم یافتہ طبقہ جو بے روزگاری اور عسرت کا شکار رہنے والا ہے۔ ان حلقوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ایسے دو طالب علموں کو جن کے پاس ایک ہی معیار کی ڈگری اور ایک ہی ڈویژن کے نمبر ہیں، محض انگریزی کی وجہ سے ان میں تفریق کر کے قومی اور ملی جذبات کو مجروح کیا جا رہا ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

سائنس کانفرنس کا خطبۂ صدارت

ڈاکٹر عبدالعزیز خاں پروفیسر سرجری فاطمہ جناح میڈیکل کالج نے مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی میں سائنٹیفک سوسائٹی
پاکستان کی آٹھویں سالانہ کانفرنس میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ارشاد فرمایا ہے کہ ہمارا بچہ سب سے پہلے اپنی مادری زبان میں بات کرنا سیکھتا ہے۔ مدرسہ میں اس کی تعلیم کا آغاز قومی زبان کی ابجد سے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کی قدرت حاصل کرتا ہے اور ابھی یہ صلاحیت تشنۂ تکمیل ہوتی ہے کہ ہم اسے غیر ملکی زبان سکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک پروان چڑھتی ہوئی صلاحیت کے لئے سخت خطرناک ہوتا ہے اور طالب علمی کی ساری صلاحیتیں ایک بدیسی زبان کو سیکھنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے نہ ہمارے یہاں مجتہد پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ محقق ——— ڈاکٹر عبدالعزیز نے مزید فرمایا کہ اردو علوم کے لئے ضروری ہے کہ میڈیکل کالجوں میں ترجمہ و تالیف کے شعبے قائم کئے جائیں اور ان کالجوں کے اساتذہ اپنے اسباق کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ان شعبوں سے امداد لیں۔ ڈاکٹر عبدالعزیز خان نے اردو کو علوم کی تدریس کا وسیلہ بنانے کی پرزور حمایت کی اور کہا کہ جو لوگ انگریزی زبان کو سائنسی ترقی کے ساتھ ناگزیر سمجھتے ہیں وہ اپنی نااہلی اور کوتاہی کو چھپاتے ہیں۔

عربی و فارسی کانفرنس کی قرارداد

انجمن فروغ عربی و فارسی نے مرکزی حکومت اور حکومت مغربی پاکستان سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم اور دفتری زبان کی حیثیت سے جلد از جلد نافذ کیا جائے کیونکہ موجودہ صورت حال میں ہمارے دفتروں اور تعلیمی اداروں پر غیر ملکی زبان کے تسلط سے ہمارے قومی وقار کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور ملک کی علمی حالت بھی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ انجمن کے زیر اہتمام دو روزہ عربی و فارسی کانفرنس میں مغربی پاکستان اسمبلی سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ قومی جمعیت کے پیش نظر زیر بحث اردو بل کو منظور کر کے قومی وقار کو بحال کیا جائے۔ کانفرنس میں صدر مملکت کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا ہے کہ اردو اور بنگالی کے لئے قرآنی رسم الخط کو اپنایا جائے۔ کانفرنس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس تجویز پر عمل درآمد کے لئے جمہوری سطح پر موثر پروگرام وضع کیا جائے۔ اور اس سے قبل قومی زبان کو انگریزی کی جگہ پوری طرح نافذ کیا جائے۔

سائنس کانفرنس کے نام

سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائل پور میں آٹھویں سالانہ کانفرنس کے موقع پر گورنر مغربی پاکستان جنرل محمد موسیٰ نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ صنعتی، طبی اور فنی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں سائنس کی تعلیم کا معیار بلند

کیا جائے اور اس غرض کے لئے انگریزی کتابوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا جائے۔

صدر انجمن ترقی اردو پاکستان جناب اختر حسین نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ اب سائنس کو محض کتابی و علمی حیثیت سے حاصل کرنا بے کار ہے بلکہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنسی علوم کی تحصیل کے ہر..... پر زندگی سے ہمیشہ رابطہ قائم رہے اور بدلے ہوئے حالات میں سائنس کو زندگی کا معاون و مددگار بنایا جائے۔ نیز تمام سائنسی علوم کی تعلیم و ترویج قومی زبان اردو میں ہو چاہیئے تاکہ ملک میں تعلیم کا معیار بلند ہو۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا ہے کہ اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ کہ جن کوششوں کا آغاز ایک سو تین سال پہلے کیا گیا تھا وہ آج بھی پوری نہیں ہو۔

اردو فیچر سروس

اردو فیچر سروس کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد لاہور کے ایک صحافی جناب عبدالقادر حسن نے ڈالی ہے۔ انہوں نے کارکن صحافیوں اور بالخصوص اضلاعی صدر مقامات میں مقیم صحافیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر فیچر بھیجکر سروس سے تعاون کریں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان فیچروں کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ سروس کا دفتر ۶۵۔ دی مال۔ انگل سٹریٹ لاہور پر قائم کیا گیا ہے۔

ایک روشن مثال

یوگوسلاویہ ایک آزاد اور قوم خوددار قوم کا وطن ہے جو آزاد قوموں کی عزت کرنا جانتا ہے۔ چنانچہ یوگوسلاویہ کے سفارت خانے نے اردو میں دعوتی رقعے جاری کرکے پاکستانی قوم کی آزادی اور خودداری کا احترام کیا ہے۔ یوگوسلاویہ کے قومی دن کے موقعے پر منعقد ہونے والے استقبالیہ کے جو دعوتی رقعے چھاپے گئے تھے۔ وہ اردو زبان میں تھے۔ یوگوسلاویہ نے پاکستانی قوم کے احترام میں اردو کو استعمال کرکے جو مثال قائم کی ہے۔ کاش وہ بعض خالص پاکستانی حلقوں کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہو۔

مسٹر بھٹو کی اردو تقریر

اسلامیہ کالج میں پاکستان کے سابق وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اردو میں تقریر شروع کرنے کے بعد کہا کہ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ میں اردو میں بھی تقریر کر سکتا ہوں۔ اور سندھی میں بھی انہوں نے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں بنگالی بھی سیکھ لوں گا۔

ایم بی اے کے طلبہ کا مطالبہ

انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی یونیورسٹی کے طلباء نے مطالبہ کیا ہے کہ امتحانی پرچے اردو میں بھی ہونے چاہئیں۔ اور ان کے جوابات اردو میں لکھنے کی اجازت دی جائے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ یہی وہ شعبہ ہے کراچی یونیورسٹی میں

ایسا ہے جس کے طلبہ کو اُردو ذریعہ تعلیم نہ ہونے کے باعث متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ طلبہ کی اکثریت ڈگری کلاس تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بناتی ہے۔ لیکن ان کو ایم۔ بی اے میں داخلہ لینے کے بعد انگریزی اختیار کرنے پر مجبور کر لیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی جاتی ہے کہ وہ کلاس میں اپنے اساتذہ سے کوئی سوال اردو میں نہ کریں۔ نیز طلباء کو آپس میں اُردو میں گفتگو کرنے کی بھی ممانعت ہے، یہ بات ایک ایسی یونیورسٹی کے سلسلے میں باعث حسرت ہے جس کو یہ دعویٰ ہو کہ اس نے سب سے پہلے ہر سطح پر اُردو کو اختیار کیا ہے۔

استنبول یونیورسٹی میں اُردو

ترکی، پاک، ایران انجمن کے صدر جناب پروفیسر عبدالقادر نے لاہور کی ایک خصوصی تقریب میں بتایا ہے کہ استنبول یونیورسٹی میں پاکستان سے متعلق اسی طرح کا ایک شعبہ قائم کیا جا رہا ہے۔ جس طرح کا شعبہ انقرہ یونیورسٹی میں قائم ہے۔ پروفیسر قادر نے یہ بھی بتایا کہ علامہ اقبالؒ کی چھ کتابیں ترکی میں ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ اور مزید اُردو تصانیف کو ترکی میں منتقل کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔

ایک تابندہ مثال

جامعہ کراچی کے سید نعیم الحسن نقوی نے حیوانیات کا مقالہ اُردو میں تیار کر کے اردو کی اہلیت اور صلاحیت کا ایک روشن ثبوت پیش کر دیا ہے۔ یہ مقالہ جس کا عنوان تھا ریگستانی ٹڈی کے ہضمی نظام میں ترشی و اساسی فاسفیٹوں کی کیمیائی تشخیص پی ایچ ڈی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جن ممتحنین نے اس کو جانچا ہے ان میں یونیورسٹی آف ویسٹرن اونٹاریو (کینیڈا) کے پروفیسر مشہور ماہر حشریات پروفیسر اے ڈبلیو براؤن اور اداہو یونیورسٹی (امریکہ) کے ممتاز ماہر حشری تخلیات پروفیسر فرینک ڈبلیو فسک بھی شامل تھے۔ (انہیں اس مقالے کا انگریزی ترجمہ روانہ کیا گیا تھا) ان دونوں ماہرین نے مقالے کو سراہا ہے۔ ان دو غیر ملکی ممتحنوں کے علاوہ ڈاکٹر شفقت حسین صدیقی صدر مجلس تحقیقات سائنس وصنعت پاکستان، پروفیسر افضال حسین قادری صدر کلیہ سائنس جامعہ کراچی، ڈاکٹر شاہد حسین اشرفی پرنسپل سائنٹیفک افسر، مجلس تحقیقات سائنس، وصنعت پاکستان اس مقالے کے پاکستانی ممتحن تھے۔ انہوں نے اردو کے مقالے کو ایک اعلیٰ درجے کا تحقیقی مقالہ تسلیم کیا ہے اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے اردو مقالے کو وضاحتِ بیان کے نقطۂ نظر سے بہت ہی پسندیدہ قرار دیا ہے۔

اردو کیلئے ایک کمیٹی کا قیام

اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لاہور میں بتایا ہے کہ مرکزی حکومت نے ۱۴ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی ہے جو ایک خاص مدت میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے مختلف اقدامات کا جائزہ لے گی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کمیٹی جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور ماہرین تعلیم شامل ہیں یہ بھی فیصلہ کرے گی

کہ اردو یا انگریزی کو پنجاب اور کراچی کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجوں کے لئے ذریعۂ امتحان کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

اُردو بنگلہ تعلیم کا خیر مقدم

مشرقی پاکستان کے دو علماء جناب مولانا راغب احسن اور مولانا محمد عارف کی طرف سے وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے قومی اسمبلی میں اس بیان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے کہ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں، تعلیمی اداروں، مدرسوں اور اسکولوں میں لازمی اور اختیاری مضامین کی حیثیت سے اردو اور بنگلہ کی تدریس کا اہتمام کرنے کی ہدایت جاری کر دی ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ اقدام دونوں صوبوں کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کا ایک نیا دروازہ کھولے گا انہوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ملک گیر پیمانے پر دونوں قومی زبانوں کے فروغ میں زیادہ سے زیادہ موثر اقدام کی ضرورت ہے۔ تاکہ عام لوگوں میں بھی ان زبانوں کی تعلیم و تدریس کا رجحان زیادہ سے زیادہ بڑھ سکے۔

ایک اہم مجلس مذاکرہ

گورنمنٹ کالج پشاور میں ایک مجلس مذاکرہ کے تمام مقررین اس امر پر متفق تھے کہ ہمارا نظام تعلیم، قومی، ملکی اور مسلّی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور اس کا نصاب صرف قومی زبان ہی میں مرتب کیا جانا چاہیئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عمر حیات ملک سابق سفیر برائے جاپان (جو مذاکرے کے صدر بھی تھے) نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک اپنی اپنی زبان کو فوقیت دیتے ہیں لیکن ہم اس پر مصر ہیں کہ ہماری زبان کو قومی و سرکاری حیثیت حاصل نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ساری عمر انگریزی پڑھنے میں صرف کر دیتے اور انگریزی پھر بھی نہ سیکھ سکنے کے باوجود ہم اردو کو اپنانے سے منکر ہیں۔ ڈاکٹر مظہر علی خان نے کہا ہے کہ نصب العین متعین کئے بغیر ہم سوچنے کی طرف مائل نہیں ہو سکتے۔ اور سوچنے کے لئے ہمیں تقلید اور انگریزی پرستی سے نکلنا ہوگا۔

علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ادبی خبریں

علمی خدمات کا اعتراف

شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جلسۂ تقسیم اسناد کے ایک خصوصی اجلاس میں چھ ممتاز اہل علم کو ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف کے طور پر اعزازی ڈاکٹریٹ کی اسناد عطا کیں۔ یہ علمی اسناد لینے والوں میں برطانوی طبی ماہر سر کلیمنٹ پرائس، سرجن کموڈور جلال ایم شاہ، پروفیسر اے بی حلیم۔ پروفیسر بی اے ہاشمی، چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ، جناب جسٹس انعام اللہ خاں اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس خصوصی اجلاس میں پاکستان اور برطانیہ کی متعدد میڈیکل ایسوسی ایشنوں کے نمائندے، ہائی کورٹ کے ممتاز

جج۔ سائنسدان، ماہرین تعلیم اور ممتاز شہری شامل تھے۔

"نقش" کا افسانہ نمبر

ماہنامہ نقش کراچی نے جنگ نمبر کے بعد اب ایک ضخیم افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں صرف خواتین کے افسانے شامل ہیں۔ ۳۲۶ صفحات کے اس نمبر میں ۳۷ منتخب افسانے ہیں۔

شہر نگاراں

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے اپنی مطبوعات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کی پہلی کڑی "شہر نگاراں" ہے۔ یہ کتاب سید سبط حسن کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے جدید ہندوستان کی مشہور اور منفرد سیاسی، ادبی اور علمی شخصیتوں سے اپنی ملاقاتوں کا حال لکھا ہے۔ انجمن طلبائے قدیم عثمانیہ کی یہ پہلی کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری دو کتابوں کے نام "آم رس" اور "امراؤ جان ادا بنام رسوا" ہیں۔

"سر مقتل" کی ضبطی

حکومت مغربی پاکستان نے حبیب جالب کے مجموعہ کلام "سر مقتل" کو ضبط کر لیا ہے۔ یہ کارروائی اخبارات و مطبوعات کے آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۳ء کے تحت عمل میں لائی گئی ہے۔ "سر مقتل" پر یہ الزام ہے کہ اس میں ایسا مواد موجود ہے جو قانونی طور پر موجودہ حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرتا ہے۔

ماہنامہ "داستان" کا اجراء

پشاور سے ایک ادبی ماہنامہ "داستان" شائع ہوا ہے جس کی افتتاحی تقریب میں جناب فیض احمد فیض نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ کہ ملکی جرائد کا اپنا اصول اور نقطۂ نظر ہونا چاہیئے۔ جس کے تحت وہ بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ فیض صاحب نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ پشاور جیسے تاریخی اور ثقافتی شہر سے اردو کا ماہنامہ شروع کیا جا رہا ہے۔

افریشیائی ادیبوں کا مشترکہ اعلان

افریشیائی ادیبوں کے وفد نے کراچی میں ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ ہم ہمیشہ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کریں گے کیونکہ ان کی جدوجہد حق و انصاف پر مبنی ہے۔ وفد نے ادارۂ مصنفین پاکستان کی اس تجویز کی حمایت کی ہے کہ افریشیائی ادیبوں کے ادارے کی مطبوعات میں اردو اور بنگالی کو بھی بین الاقوامی زبانوں کی حیثیت سے شامل کیا جائے وفد نے یہ یقین دلایا ہے کہ ادارے کے آئندہ اجلاس میں یہ مسئلہ پیش کر دیا جائے گا۔ وفد نے ادارۂ مصنفین پاکستان کی اس تجویز کو بھی اصولاً تسلیم کر لیا ہے کہ افریشیائی زبانوں کی ادبی تخلیقات کا مجموعہ شائع کیا جائے۔

جاپانی میں قرآن پاک کا ترجمہ

صدر انجمن مسلمانان جاپان جناب پروفیسر عبدالکریم ساتوہ نے بتایا ہے کہ جاپانی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور اس کو نظر ثانی کرنے کے لئے جامع ازہر بھیجا جا چکا ہے۔ جناب عبدالکریم ساتوہ نے فرمایا ہے کہ نظر ثانی کام جاپانی اور مصری علماء مشترکہ طور پر کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ جاپانی زبان کے اس ترجمے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب حاجی عمر میتا نے کیا ہے۔

آئینہ خانے میں

احمد ندیم قاسمی کی پچاسویں سالگرہ

پاکستان کے تمام اہم شہروں میں ملک کے ممتاز شاعر اور افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی کی پچاسویں سالگرہ بہت خلوص اور جوش سے منائی گئی۔ ان تقریبوں میں جناب قاسمی کو ان کی سالگرہ پر مبارک بادیں پیش کی گئیں۔ اُن کے فن کو سر گیا۔ انہیں خطابات سے نوازا گیا۔

شکور احسن کا اعزاز

یونیورسٹی اورینٹل کالج کی ایک خاص تقریب میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی جناب پروفیسر حمید احمد خاں نے جناب شکور احسن ریڈر شعبہ فارسی کو حکومت ایران کی طرف سے عطا کردہ اعزاز و نشان سپاس" عطا کیا۔ یہ اعزاز علمی و ادبی میں ایران کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو جناب احسن کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں دیا گیا ہے۔ اس خصوصی تقریب میں 'خانۂ فرہنگ ایران" کی ڈائرکٹر محترمہ ندیم خانم بہنام نے جناب شکور احسن کی ان خدمات پر روشنی ڈالی جو انہوں نے فارسی زبان وادب کے لئے انجام دی ہیں۔

یادوں کے چراغ

جشنِ غالب

سکھر میں صد سالہ جشنِ غالب کا آغاز تہران ثقافتی مرکز میں ہوا مرزا اسداللہ خاں غالب کی یاد میں جو مشاعرہ منعقد ہوا وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر کی خدمت میں شعرائے پاکستان کا خراج عقیدت تھا۔ اس میں ملک کے ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ اس جشن کے سلسلے کی دوسری کڑی ایک مذاکرہ تھا۔ جس کا موضوع غالب اور کلام غالب تھا۔ اس

ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے مقالات پڑھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی یاد میں

اخبار فروش یونین کے زیر اہتمام لاہور میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مقررین نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے باک صحافی، عظیم سیاستداں، بلند پایہ شاعر اور بے مثال خطیب تھے۔ اور انھوں نے اپنی صلاحیت کو اسلام کی سربلندی کے لئے استعمال کیا۔ مقررین میں وزیر اطلاعات سید احمد سعید کرمانی، مولانا کوثر نیازی، ضیا الاسلام انصاری، مرغوب صدیقی اور حمید اختر قابل ذکر ہیں۔ جلسے کے اختتام پر مولانا کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔

مولانا صلاح الدین کا مجموعہ مضامین

ادارۂ ادبی دنیا لاہور نے "تصورات اقبال" کے نام سے علامہ اقبال کے فن سے متعلق مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے مضامین کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ مولانا مرحوم کے صاحبزادے نے مرتب کیا ہے۔ اور یہ اس ادارے کے مطبوعاتی منصوبے کی طرف سے پہلی پیش کش ہے۔

پطرس کی یاد میں

پاکستان کونسل سنٹر راولپنڈی میں پروفیسر اے ایس بخاری پطرس مرحوم کی آٹھویں برسی بہت خلوص اور عقیدت سے منائی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب اتفاق علی خاں نے اجلاس کی صدارت کی اور کہا کہ پطرس کا علم کتابی نہیں تھا انہیں علم کی دولت تجربات اور زندگی کے نشیب و فراز سے حاصل ہوئی تھی۔

کیانی کو خراج عقیدت

عدالت عالیہ کے سابق چیف جسٹس ایم آر کیانی بنیادی انسانی حقوق پر غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ قانون انسان کے لئے بنا ہے۔ انسان قانون کے لئے نہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ کے جناب جسٹس انوار الحق نے جناب کیانی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کیانی مرحوم کی تیسری برسی پر یہ جلسہ لاہور ہائی کورٹ بار روم میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں جسٹس سجاد احمد خان اور جناب جمیل حسین رضوی اور جناب سید عبداللہ نے بھی مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

یوم میراجی

حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کی جانب سے یوم میراجی کی تقریب میں جناب الطاف گوہر نے میراجی کے فن ادب اور شعر میں ان کی بے پناہ صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے کہا " ناقدین کو چاہئے کہ میراجی کی شخصیت کے بجائے ان کے ادبی کارناموں پر نظر رکھیں۔ اس اجتماع میں اور بھی ممتاز اہل قلم شریک تھے۔ جنہوں نے نثر و نظم میں میراجی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر داؤد پوتا کی یاد

این جے وی اسکول کراچی میں ایک سندھی عربی مشترکہ مجلس منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر داؤد پوتا کی آٹھویں برسی پر ان کے ان شاندار علمی کارناموں اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔ جو انہوں نے سندھ میں ساری عمر انجام دی تھیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر داؤد پوتا کے عقیدت مندوں۔ طالب علموں اور نیازمندوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔

علامہ سعید نفیسی کو خراج عقیدت

آرسی ڈی ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک جلسہ ایران کے مشہور شاعر ادیب اور صحافی علامہ سعید نفیسی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ جس میں جسٹس انوارالحق۔ ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر محمد یامین نے علامہ نفیسی کی علمی اور ادبی خدمات پر معلومات بہم پہنچائیں اور پروفیسر موصوف کی پاکستان دوستی اور اہل پاکستان سے ان کے خلوص کو سراہا گیا۔

یوم خیّام الہند

۲۷ نومبر کو مکتبۂ حیدری کراچی کے زیر اہتمام برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کی آٹھویں برسی منائی گئی۔ یہ جلسہ کنٹرک ہال میں منعقد ہوا تھا اور اس کی صدارت ڈاکٹر یاور عباس نے فرمائی تھی۔ ممتاز ادیبوں نے علامہ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی علمی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ آخر میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں کراچی کے تمام ممتاز شعراء شریک تھے۔

قابل اجمیری کی یاد میں

وادیٔ مہران کے جواں مرگ شاعر قابل اجمیری کی چوتھی برسی ادارہ سماجی بہبود کی جانب سے لاہور میں منائی گئی۔ اس موقع پر مرحوم کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں مغربی پاکستان کے تمام ممتاز ادیبوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے ان پیغامات میں قابل مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کا انتقال

برصغیر کے ممتاز ادیب مولوی محمد یحییٰ تنہا نے ۹ دسمبر بروز پیر شب کو کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جناب تنہا متعدد تصانیف کے خالق تھے۔ جن میں ان کی دو تصانیف برصغیر پاک و ہند میں ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہیں۔ "سیر المصنفین" اور "مراۃ الشعراء"۔ مولانا یحییٰ نے علی گڑھ سے بی اے کیا تھا اور میرٹھ کالج سے ایل ایل بی۔ میرٹھ میں وہ وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے متعلق ہوگئے کچھ عرصہ ہوا وہ کراچی تشریف لائے تھے۔ اس سانحے پر ادارۂ قومی زبان مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کرتا ہے۔

ماتم میں ہم شریک

شکیب جلالی کی خودکشی

جواں سال اور منفرد غزل گو شکیب جلالی نے ٹرین کے سامنے آکر ۱۲ر نومبر ۱۹۶۶ء کو خودکشی کرلی۔ ان کا ایک خط ملا ہے جس میں لکھا تھا کہ وہ گھریلو مسائل سے تنگ آکر خودکشی کر رہے ہیں۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیوہ اور دو بچے ہیں جن کے غم میں ادارہ قومی زبان برابر کا شریک ہے۔ شکیب جلالی کے پسماندگان کی مدد کے لئے ایک امدادی فنڈ کھول دیا گیا ہے۔ مرحوم تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں اسسٹنٹ انفارمیشن افسر تھے۔

پروفیسر بشیر احمد ہاشمی کا انتقال

یہ خبر ملک میں بہت رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور ملک کے ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر بشیر احمد ہاشمی ۳ ر دسمبر کی شب کو کراچی میں رحلت فرما گئے۔ مرحوم کو ابھی کچھ دن ہوئے کراچی یونیورسٹی کی طرف سے ان کی تعلیمی اور علمی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔

نسیم الظفر کا انتقال

۲۳ر دسمبر کو خوش گو شاعر اور ریڈیو پاکستان کراچی کے ایک اعلیٰ عہدیدار ملک نسیم الظفر اچانک انتقال کر گئے۔ مرحوم نہایت رنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے اور اپنی بہت سی خوبیوں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔

مولوی مجید حسن کی رحلت

یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولوی مجید حسن مالک "مدینہ" بجنور کا انتقال ہوگیا ہے۔ مدینہ ۱۹۱۴ء سے نکل رہا ہے۔ اس اخبار نے برصغیر میں صحافت کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

آئینہ ہند

ہریانہ میں اُردو

بھارتی اخبارات کی اطلاعات کے مطابق انجمن ترقی اردو کے کنوینر نے وزیراعلیٰ ہریانہ کو ایک یادداشت پیش کی ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ریاست میں اُردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ اس یادداشت میں کہا گیا ہے کہ اردو ہریانہ میں ہمیشہ سے مقبول ہے اور اس کو اختیار کرنے میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوگی۔ وزیراعلیٰ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ ہریانہ میں کسی شخص کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔

ونوبھاوے کی تجویز

اچاریہ ونوبھاوے نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ ہندوستا
میں اردو بولنے والوں کی کوئی ایسی ریاست نہیں جہاں ارد
بولنے والوں کی اکثریت ہو۔ ریاستی زبان کے طور پر ہندی اور اردو دونوں کو کا ایک ریاست میں چلنا آئین کے مطاب
نہیں۔ لہٰذا اردو کو علاقائی زبان کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھا
جانا چاہئے۔ تاکہ اردو برقرار رہے۔ یہ واضح رہے کہ ونوبھاوے گاندھی جی کے مشہور چیلے اور بہت غیر متعصب ہونے کے بڑ
نما دعوے دار ہیں۔

اردو کے ساتھ بے انصافی

اردو کے مشہور مصنف اور صحافی میلا رام نے مشرقی پنجاب
میں اردو کے خلاف مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی بے
انصافیوں پر شدید احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ بھارت کے آئین میں جو چودہ زبانیں تسلیم کی گئی ہیں۔ ان میں ار
اور ہندی کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ کشمیر سے راس کماری تک اور گجرات سے آسام تک ہر علاقے میں بو
اور سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مصادر اور حروف دونوں میں اردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں۔ اور یہ
کیسا افسوس کا مقام ہے کہ ایک بہن نوراج کرے اور دوسری کو بھیک بھی نہ میسر آئے۔

اردو کے حلف پر اصرار

ہریانہ کی کابینہ کے واحد مسلمان وزیر عبدالغفار خاں نے ہ
انگریزی یا پنجابی میں اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے ا
کر دیا اور اردو میں حلف لینے پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو میری مادری زبان ہے اور آئین کی رو
سے ایک زبان تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا میں اردو میں حلف اٹھاؤں گا۔ آخر کار مجبور ہو کر گورنر کو حلف نامے کا
اردو میں ترجمہ کرانا پڑا۔

اردو کا مطالبہ

بھارت کے ۳۸ لیڈروں نے حکومت سے اردو کو علاقا
زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ اخبارات کی اطلاع کے
مطابق انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے صدر پنڈت سندر لال۔ پارلیمنٹ کے رکن ڈاکٹر تارا چند۔ بیگم انیس قدوا
جناب عبدالغنی اور بہت سے دوسرے لیڈروں نے بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ دہلی۔ اتر پردیش
بہار، پنجاب، راجستھان۔ آندھرا اور مہاراشٹر میں اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ انہوں نے
پر زور مطالبہ کیا کہ بھارت میں اردو کو صحیح مقام دیا جائے۔

کمیونسٹ پارٹی اردو کے حق میں

بہار کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی اردو کو ثانوی زبان کا
درجہ دینے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ تمام دفا

...لتوں اور درس گاہوں میں اردو کو ثانوی درجہ دے دیا جائے۔ پارٹی نے اپنی تمام شاخوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ انجمن ترقی اردو سے اس مقصد کے حصول میں تعاون کریں۔

ترقی پسند تحریک کا جائزہ

پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے شعبہ اردو میں ایک سیمینار ترقی پسند تحریک پر ہوا جس میں جناب علی جواد زیدی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ مقالہ امیر اللہ خان شاہین نے پڑھا۔ علامہ علی جواد زیدی کا تعارف سیمینار کے صدر جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کرایا۔ انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ علی جواد زیدی صاحب نے ترقی پسند تحریک کا مفصل جائزہ لیکر اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور اس سے اختلاف کا ذکر بھی کیا۔ سیمینار میں نذیر بنارسی صاحب نے بھی شرکت کی۔ ان کا تعارف بھی نارنگ صاحب نے کرایا۔ نذیر صاحب نے نہایت خوبصورت نظم گنگا کے تین روپ سنائی۔

مجلۂ سیفیہ بھوپال

سیفیہ کالج بھوپال کے اردو میگزین "مجلہ سیفیہ" کے مشترکہ شمارہ برائے ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور عنقریب شائع ہو جائے گا۔ زیر ترتیب مجلہ میں مختلف موضوعات پر انفرادی مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے چند عنوانات حسب ذیل ہیں:-

جدید افسانہ نگاری۔ راجندر سنگھ بیدی۔ دبیر کی مرثیہ نگاری — ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ جدید عربی شاعری کا بانی۔ مولانا حبیب ریحان ندوی جامعہ اسلامیہ لیبیا، خاکہ نگاری کا فن — ڈاکٹر سید حامد حسین۔ انگریزی ادب میں مضمون نگاری — ذکی الرحمٰن خان، دربائے عشق — انصاری، مرثیہ کیا ہے؟ — سید حیدر عباس رضوی، ہندوستان میں تخفیف زر — محمد شریف خان، ریڈیائی ڈرامہ اور اس کا فن۔ ...ن آثر، جدید عربی شاعری — احسن علی خان ندوی، عمرو بن کلثوم — سید ظہور الاسلام، جواب میں میرے چند سوالوں کے — محمد کمال پاشا اور اقبال بھوپال میں — عبدالقوی دسنوی۔

ان کے علاوہ مجلہ میں دیگر مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ　مولانا سعید احمد اکبرآبادی　میاں بشیر احمد　خواجہ غلام السیدین　رئیس احمد جعفری
ماہر القادری　فرقت کاکوروی　نواب مشتاق احمد خاں　ڈاکٹر محشر عابدی　ڈاکٹر احسن فاروقی
سید شبیر علی کاظمی　ڈاکٹر وزیر آغا　سید قدرت نقوی　رئیس امروہوی　اور دیگر اہل قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

"مرقع عبدالحق" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد نادر و نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

"بزم عبدالحق" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کا تذکرہ

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

آفسٹ کی چھپائی　عمدہ سفید کاغذ　صفحات ساڑھے تین سو　قیمت چھ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

پیش نظر اشاریہ مندرجۂ ذیل موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اردو ادب، تنقید اور تحقیق
اردو زبان اور اس کے مسائل
آپ بیتی
تاریخ
تعلیمات
ثقافت و تمدن
سیر و سیاحت
سیاسیات
شخصیات
اقبال
غالب
دیگر شخصیات
صحافت
فلسفہ و عمرانیات
فنون لطیفہ
کتابیات اور کتب خانے
لسانیات و لغات
مذہبیات
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قرآنیات
افکار و مسائل
مکاتیب
نفسیات
مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

پیش نظر اشاریے کی ترتیب میں ماہ جون ۱۹۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	ادب لطیف	لاہور	جون ۱۹۶۶ء	ماہنامہ	صبح امید	بمبئی	جولائی ۱۹۶۶ء
"	ادبی دنیا (کشمیر نمبر)	لاہور	مارچ و اپریل "	"	عارف	لاہور	" "
"	ادیب	علی گڑھ	جنوری فروری "	"	فاران	کراچی	" "
سہ ماہی	اردو نامہ	کراچی	جون "	"	فروغ اردو	لکھنؤ	" "
ماہنامہ	افکار (غالب نمبر)	"	فروری مارچ و جون "	"	فکر و خیال	کراچی	مئی "
"	البلاغ	بمبئی	جون "	"	قومی زبان	"	جون "
"	الرحیم	حیدرآباد	" "	"	کتاب	لکھنؤ	" "
"	الشجاع	کراچی	" "	"	کتابی دنیا	کراچی	" "
"	انجمن اسلامیہ میگزین	"	نومبر دسمبر ۶۵ء	"	ماہ نو	"	" "
"	برہان	دہلی	جون ۶۶ء	"	منشور	"	" "
"	تحریک	"	" "	"	نصرت	لاہور	مئی جون "
"	ترجمان القرآن	لاہور	" "	"	نیرنگ خیال	"	جون "
"	تہذیب الاخلاق	"	مئی "	ہفت روزہ	آئین	"	" "
"	جامعہ	دہلی	جون "	"	المنبر	لائل پور	" "
"	جام نو	کراچی	" "	"	چٹان	لاہور	" "
"	چراغ راہ	"	" "	"	خدام الدین	"	" "
"	خاتون دکن	حیدرآباد دکن	" "	"	ساغر	کراچی	" "
"	رہنمائے تعلیم	دہلی	" "	"	صدق جدید	لکھنؤ	" "
"	زندگی	رام پور	" "	"	قندیل	لاہور	" "
"	سب رس	حیدرآباد دکن	" "	"	لاہور	"	" "
"	سیارہ	لاہور	" "	"	ہماری زبان	علی گڑھ	" "
"	سیارہ ڈائجسٹ	"	" "	روزنامہ	انجام	کراچی (اشاعت جمعہ اتوار)	"
"	سیپ	کراچی	نومبر ۶۶ء	"	جنگ	"	" " "
	صبا	حیدرآباد دکن	فروری ۶۷ء	— —			

اردو ادب، تنقید و تحقیق

مصنف	عنوان	ماخذ
ابن فرید	ماحول کی جبریت اور ادیب	ادیب، ص ۱۰ تا ۱۵، جنوری فروری ۶۶ء
ابو اللیث صدیقی	اردو کی چند نئی کتابیں	نصرت، ص ۲۳ تا ۴۴، مئی جون
احتشام حسین، سید	بحران اور ادب	سیپ ۱۲، ص ۱۹۲ تا ۱۹۹،
احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد	جدید ادب اور اشاریت	ادیب، ص ۴ تا ۸، جنوری فروری ۶۶ء
احمد جلیس	سردار جعفری سے باتیں	صبا، ص ۱۰ تا ۲۵، فروری مارچ
اسد اللہ قریشی و دیگر حضرات*	علم و ادب	ادبی دنیا، ص ۲۰۲ تا ۳۰۴، مارچ اپریل
اسلوب احمد انصاری، پروفیسر	مرقع نگاری	ادیب، ص ۹ تا ۱۱، جنوری فروری ۶۶ء
اشتیاق طالب	آزاد نظم	انجام، ص ۳ جون
اطہر، غلام حسین	اردو کی جدید کہانی	چراغ راہ، ص ۲۵ تا ۴۰، جون
"	ادبیات پر نفسیات کے اثرات	تہذیب الاخلاق، ص ۲۱ تا ۳۰، مئی
اکرام الدین صدیقی، محمد	میٹھے بچن سناؤں (مرزا، امانی، علی اور غلامی کے مرثیے)	سب رس، ص ۴۰، جون
امجد کندیانی	اردو میں خاکہ نگاری	سیپ ۱۲، ص ۲۳۰ تا ۲۴۸ + ۲۵۸،
انجم اعظمی	شبلی کا نصب العین	افکار، ص ۱۳ تا ۱۵، جون
بادرا، سی ایم محسن انصاری (مترجم)	اشاریت کا ورثہ	ادیب، ص ۱۲ تا ۴۲، جنوری فروری ۶۶ء
بدوی، لطف اللہ	دیوان اوحدی	الرحیم، ص ۳۷ تا ۴۷، جون
پروین عالم	تخلیق فن و ادب کی بنیادی منزلیں	تحریک، ص ۶ تا ۱۸، "
پاشی، کبیر احمد	ادب اور نفسیات	ادیب، ص ۵۰ تا ۵۶، جنوری فروری ۶۶ء
جمیل جالبی	شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے کلام کا اردو ترجمہ از شیخ ایاز	ماہ نو، ص ۷ تا ۹، جون

* اس عنوان کے تحت میر غلام احمد کشفی، محمد عبد اللہ قریشی، منشی محمد الدین فوق اور حبیب کیفوی کے مضامین شامل ہیں ۔

جوگندر پال	نیا اردو افسانہ	کتاب، ص ۹ تا ۱۶، جون
خالدی، ابوالنصر محمد	چند دکنی مثنویاں	سب رس، ص ۳۴ تا ۴۴، جون
خورشید، عبدالسلام	اردو ادب پر سانحۂ کربلا کا اثر	چٹان، ص ۹ + ۱۸، ۲ر جون
دیوندر اسر	تصور اور حقیقت ڈرامے میں	سیپ، ص ۲۰۴ تا ۲۲۹
رفیق خاور	اردو شاعری کا مزاج	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۳۸، جون
زیب النساء	آب حیات پر ایک طائرانہ نظر	قندیل، ص ۱۲ + ۱۸، ۱۹ر "
سرور، آل احمد	نظم کی زبان نمبر ۱ ۲۰	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، ۱۵ اور ۲۲ جون
" "	شاعری کا تجرباتی دور	خاتون دکن، ص ۸ تا ۱۰، جون
" "	اردو ادب میں تنقید	الشجاع، ص ۹۳ تا ۴۱، "
سرور اکبرآبادی	نظیر اکبرآبادی اور جدید شاعری	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۸، نومبر ۷۵ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر	داستان کی غایت	سیپ، ص ۱۱۳ تا ۱۴۲
طالب دہلوی	دلی کی شاعری (قسط ۵)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۴ تا ۱۷، جون
طیب انصاری، ملک زادہ	سب رس ملا وجہی	سب رس، ص ۲۴ تا ۲۸، "
ظفر الرحمٰن، مولوی	ہماری کہاوتیں	قومی زبان، ص ۶۱ تا ۶۷، "
ظہیر احمد صدیقی	قومی یکجہتی اور اردو شاعری	جامعہ، ص ۳۱۳ تا ۳۲۵، "
عبدالسلام	ادب اور اخلاق	سیپ، ص ۲۱۵ تا ۲۲۱
علی جواد زیدی	اردو ادب کی تاریخ	جامعہ، ص ۱۹۶ تا ۲۱۳، جون
غلام حسین	سندھی ادب میں جدید رجحانات	انجام، ص ۲، ۲۷ر "
قدرت نقوی	ادب میں حقیقت کی انشا آفرینی	قومی زبان، ص ۷ تا ۲۴، "
کریم الدین احمد، ڈاکٹر	تشکیل پذیر معاشرہ میں ادب کا کردار	سیپ، ص ۲۲۲ تا ۲۲۶
مائل ملیح آبادی	اردو میں تنقید	فروغ اردو، ص ۲۲ تا ۲۸، جون
مصطفائی بیگم	تنقید و تبصرہ	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۹ تا ۳۰، نومبر ۷۵ء
مظفر علی سید	قوم، ادیب اور انسانیت	نصرت، ص ۱۳ تا ۲۶، مئی جون
مفتون کوٹوی	اخلاقیات اور ثاقب لکھنوی	ادیب، ص ۳۳ تا ۳۸، جنوری فروری ۷۵ء
منشی، محمد صدیق	شاہ لطیف کی شاعری	سیارہ، ص ۴۹ تا ۵۲، جون

نظامی بدایونی	راس مسعود اور اردو ادب	قومی زبان/ص ۲۵ تا ۳۲/ جولائی
نعیم صدیقی	سید عبداللہ اور اسلامی ادب (۲)	سیارہ/ص ۵۲ تا ۶۳/ ״
نورالحسن انصاری	دیوان غنی کشمیری	برہان/ص ۳۰۱ تا ۳۲۸/ ״
نورانی/امیرحسن	حالی کے کلام پر ان کے ہم عصر کی منظوم تنقید	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴ + ۶/ ۸ جولائی
وصی الحسن	سوغات غزل میر کا حصہ	فروغ اردو/ص ۸ تا ۲۲/ جون
״ ״	کچھ داغ کی غزل کے بارے میں	ہماری زبان/ص ۳ + ۱۱/ ۲۲ جون
حامد حسن قادری	تبرکات	سیپ/ص ۲۴۹ تا ۲۵۲/

اردو زبان اور اس کے مسائل

افتخار حسین/آغا	روس میں اردو	افکار/ص ۱۲ تا ۱۷/ جون
مسعود حسین خاں/ ڈاکٹر	سرزمین دکن میں قدیم وجدید اردو کی کشمکش	صبا/ص ۹ تا ۱۷/ فروری مارچ
منور بن صادق	اردو کی ترویج ایک تہذیبی مسئلہ	چٹان/ص ۸ تا ۹/ ۲۷ جون
نورالصباح بیگم	روہیل کھنڈ کی اردو	انجام/ص ۴/ ۱۳ ״
	بھاشائی قانون بننے کے بعد اردو کی حیثیت	ہماری زبان/ص ۳ + ۱۲/ یکم جون

آپ بیتی

سوئیکارنو (صدر جمہوریہ انڈونیشیا)	سوئیکارنو کی کہانی خود ان کی زبانی قسط نمبر ۵	حریت/ص ۲/ ۱۱ جون
ملا واحدی	خود نوشت سوانح عمری کا ایک باب	قومی زبان/ص ۷ تا ۱۲/ جون

تاریخ

احتشام احمد ندوی/ سید	دلی آئینہ شاعری میں	سب رس/ص ۱۷ تا ۳۲/ جون
اطہر مبارک پوری/ قاضی	تاریخ قصبہ مبارک پور	البلاغ/ص ۱۴ تا ۲۶/ ״
تصدق حسین/ شیخ	۱۸۵۷ء کے سیاسی اسیر	انجمن اسلامیہ میگزین/ص ۴ تا ۱۸/ نومبر
جمیل احمد/ خواجہ	سراج الدولہ	انجام/ص ۵/ ۱۱ جون
رئیس احمد جعفری	خلافت اسلامیہ کا نظم ونسق	تہذیب الاخلاق/ص ۲ تا ۳/ مئی

مصنف	عنوان	ماخذ
رئیس احمد جعفری	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں قسط نمبر ۱۵[1]	انجام، ص ۱۲، ۴ جون
علی، ڈاکٹر		
نثار احمد فاروقی (مترجم)	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۳۴۴ تا ۳۶۰، جون
سالک، محمد علیم	کشمیر مسلمانوں کے عہد میں	ادبی دنیا، ص ۹۹ تا ۱۴۴، مارچ اپریل
سیدہ اشرف بخاری و عبداللہ قریشی محمد	اہل فضل و کمال (کشمیر کے)	" " ص ۳۰۵ تا ۳۵۰، " "
شہابی، انتظام اللہ	مسلمانان اندلس کی علمی خدمات کا جائزہ	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷ تا ۱۸، نومبر ۶۶ء
"	" " " "	" " ۵ تا ۲۳، دسمبر
"	بیاجان عالم کے عہد کی آخری جھلک	" " " ۲۴ تا ۳۲، "
عبداللہ قریشی، محمد	کشمیر کی بیٹیاں	ادبی دنیا، ص ۳۲۵ تا ۳۴۰، مارچ اپریل
" "	کشمیر کے باشندے	" " " ۷۱ تا ۹۸، " "
قدوسی، ارشاد الحق	جنگ یرموک	انجام، ص ۲، ۱۱ جون
قیصر سرمست	عالمگیر خطوط اور فرامین کی روشنی میں	کتاب، ص ۴ تا ۸، جون
محمد موسیٰ، حکیم	مورخین کشمیر	ادبی دنیا، ص ۷۵۴ تا ۸۶۴، مارچ اپریل
محمد سلیم، شیخ - عبداللہ قریشی، ثاقب زیردی اور عبدالرحیم افغانی	طبعی اور جغرافیائی حالات	ادبی دنیا، ص ۷۱ تا ۹۹، مارچ اپریل
نعمانی، مولانا عبدالرشید	آج سے پونے دو سو برس پہلے کا ہندوستان۔ اس کے عہد کے ایک سندھی عالم کے قلم سے	الرحیم، ص ۴۸ تا ۶۵، جون
نیاز فتح پوری	مسلم حکومتوں کے علوم و فنون پر ایک نظر	اردو نامہ، ص ۱۲ تا ۲۳، جون
" "	عہد عباسی کی ایک داستان عفو و انتقام	صبح امید، ص ۱۵ تا ۱۶، "
کشفی، میر غلام احمد و دیگر حضرات[2]	تہذیب و ثقافت	ادبی دنیا، ص ۱۵۳ تا ۱۹۶، مارچ اپریل

تعلیمات

مصنف	عنوان	ماخذ
اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو	جامعہ عثمانیہ کی خدمات	قومی زبان، ص ۵ تا ۶، جون

[1] دیگر اقساط کے لیے ملاحظہ ہو انجام ۱۱ جون، ۱۸ جون، ۲۵ جون ۱۹۶۶ء۔ [2] محمد اسد اللہ قریشی، محمد علیم الدین سالک پروفیسر محمود ہاشمی اور سید محمد شفیع اس بزم کے شرکا رہیں۔

اسرار الحق، ڈاکٹر	طبی تعلیم انسان کی خدمت میں	فکر و خیال، ص ۱۸ تا ۱۹، مئی
حنیف رامے	ہماری درسی کتابیں	نصرت، ص ۱ تا ۸، مئی جون
سجاد حیدر، پروفیسر	غیر نصابی مشاغل کی اہمیت تعلیم میں	فکر و خیال، ص ۴۲ تا ۴۳، مئی
عبداللہ، ڈاکٹر سید	ہمارا نظام تعلیم ..... (ایک تقریر)	چٹان، ص ۵ تا ۰، جون
ناز، ایس ایم	پاکستان میں معلمہ کا منصب	قندیل، ص ۰ ۵ر جون
نجمہ نسرین، مسز	تعلیم میں پیشہ ورانہ رہنمائی کی تحریکیں	فکر و خیال، ص ۲۰ تا ۲۳، مئی
وقار حسین	مرکزی طبیعات اور تصورات فطرت	" " " ۲۴ تا ۲۷، "
ــــــــ	نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۵، جون
حفیظ الرحمان صدیقی	حمود الرحمان تعلیمی کمیشن رپورٹ [1]	جنگ، ص ۷، ۴ر جون

ثقافت و تمدن

افضال حسین قادری، محمد	سائنس اور مسلمانوں کا نیا معاشرہ	فکر و خیال، ص ۵ تا ۱۷، مئی
ریحانہ سمیع	بلوچستان کے قبائل	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۸۹ تا ۹۱، جون
عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد	ہماری ثقافت کیا ہے ؟	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴ + ۱۸، ۲۰ر "
یوسف حسن	ثقافت کے عناصر ترکیبی	نیرنگ خیال، ص ۴ تا ۸، جون

سیر و سیاحت

ابن انشا	ہانگ کانگ [2]	انجام، ص ۳، ۱۳ر جون
ابراہیم جلیس	واشنگٹن کی پہلی صبح [3]	" " ۳، ۱۳ر "
شفیع عقیل	پاکستان سے ایران تک [4]	جنگ، ص ۲، ۴ر "

---

[1] دیگر اقساط کے لیے دیکھئے جنگ ۱۰ر جون ۱۱ر جون اور ۱۸ر جون کے شمارے

[2] سفرنامہ کی دوسری قسط کے لئے دیکھئے انجام ۱۴ر جون۔ [3] سفرنامے کی دوسری قسط کے لیے دیکھئے انجام ۲۰ر جون

[4] اس سلسلے میں دیگر اقساط ۱۳ر جون، ۲۰ر جون اور ۲۷ر جون کے جنگ میں ملاحظہ فرمائیں۔

سیاسیات

بزاز، پریم ناتھ - عبدالصمد دانی -

عبدالعزیز، میر	جنگ آزادی (کشمیر)	ادبی دنیا، ص ۴۰۹ تا ۴۲۵، مارچ اپریل
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب [1]	جنگ، ص ۱۲، ۴ر جون
سبط حسن، سید	دیس پردیس [2]	حریت، ص ۱۲، ۲۰ر "
سلطان احمد	آزاد خارجہ پالیسی کی طرف ایران کا بڑھتا ہوا قدم	حریت، ص ۱۲، ۱۳ر "
سلطان بخش	جمہوری نظام یا اسلامی نظام	چٹان، ص ۳ تا ۴، ۲۷ر "
عتیق الرحمان سنبھلی، مولانا	آج کی سیاست	صدق جدید، ص ۶ تا ۷، ۲۴ر جون
نعیم صدیقی	عالم اسلامی	آئین، ص ۴، ۱۰ر ربیع الاول
ہمایوں بیگ، مرزا	امیر تیمور کے سیاسی نظریات	ماہ نو، ص ۵۴ تا ۹۴ + ۶۳، جون

شخصیات

اقبالیات

طفیل احمد چودھری	عورت کا مقام علامہ اقبال کی نظر میں	عارف، ص ۱۴ تا ۴۴، جون
محمد مسعود، پروفیسر	اقبال اور نظریۂ پاکستان	ساغر، ص ۳، ۲۸ر جون
وزیر آغا	کلام اقبال میں ڈرامہ کا عنصر	ادیب، ص ۴۰ تا ۴۶، جنوری فروری
محمد یوسف، ڈاکٹر سید	جمالیات اور اقبال	چراغ راہ، ص ۱۳ تا ۲۱، جون
اقبال احمد صدیقی	بابا علی بخش	جنگ، ص ۱۲، ۱۸ر جون

غالبیات

احمد علی، پروفیسر	غالب ایک مابعد الطبیعاتی شاعر	افکار، ص ۷۵ تا ۷۹، فروری مارچ

---

[1] ملکی اور بین الاقوامی حالات و مسائل پر تبصرے کا مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں دیکھئے -

[2] ملکی اور بین الاقوامی حالات و مسائل پر تبصرے کا مستقل سلسلہ ہر اتوار کی اشاعت میں دیکھئے -

اسلم قریشی، پروفیسر محمد	غالب کی فارسی شاعری	افکار، ص ۱۲۴ تا ۱۳۹، فروری مارچ
افتخار حسین، آغا	یورپ میں غالب کا مطالعہ	" " ۱۰۰ تا ۱۰۴، " "
افروز، عبدالحق	بلائے جاں ہے غالب	" " ۱۱۷ تا ۱۲۳، " "
اقرار احمد عباسی	غالب — خطوں کے آئینے میں	" " ۲۸۰ تا ۲۸۸، " "
انجم اعظمی	مغل تہذیب اور غالب	" " ۸۵ تا ۸۷، " "
تحسین سروری	غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر	" " ۵۹ تا ۶۲، " "
جوش ملیح آبادی	غالب نام آورم	" " ۱۴، " "
چغتائی، عبدالرحمان	الہامی کتاب	" " ۳۳۳ تا ۳۵۲، " "
رضا، ڈاکٹر راہی معصوم	غالب کی عشقیہ شاعری	" " ۲۶۳ تا ۲۶۸، " "
رضیہ سجاد ظہیر	غالب	" " ۲۲۹ تا ۲۴۰، " "
سحر انصاری	واقعات غالب (ماہ و سال کے آئینے میں)	" " ۱۹ تا ۳۰، " "
" "	غالب معلوم سے محسوس تک	" " ۸۸ تا ۸۹، " "
سرور آل احمد	غالب کی عظمت	" " ۱۹۰ تا ۱۹۵، " "
شاد، نریش کمار	غالب پر میر کا اثر	" " ۱۱۲ تا ۱۱۹، " "
شعلہ، عطا محمد	غزل پر غالب کے احسانات	" " ۱۴۲ تا ۱۴۴، " "
صابر علی خاں، ڈاکٹر	غالب کا انداز	" " ۲۵۱ تا ۲۵۳، " "
" "	اشاریہ (غالب نمبر)	" " ۱۷ تا ۱۸، " "
ظفر ادیب	غالب اور ابوالکلام آزاد	لاہور، ص ۷۲ تا ۷۷ + ۱۲، ۹ جون
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	غالب کا ایک نادر خط	افکار، ص ۷۵ تا ۸۵، فروری مارچ
" "	غالب — حیات و شاعری کے چند پہلو	" " ۱۹۸ تا ۲۲۳، " "
" "	غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت	" " ۲۷۵ تا ۲۷۹، " "
عبدالحق، مولوی	روئداد مقدمہ مرزا غالب	" " ۳۹ تا ۵۶، " "
" "	غالب — خود نوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق	" " ۳۳ تا ۴۳، " "
عبدالستار، ڈاکٹر قاضی	غالب کا غم	" " ۲۵۷ تا ۲۶۲، " "

دیگر شخصیات

---

[1] مندرجہ ذیل شعراء نے نظموں میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے :- آرزو اکبرآبادی، جوہر سعیدی، حزیں لدھیانوی، رفیق خاور، شبنم رومانی، عبدالرؤف عروج، محشر بدایونی۔

الطاف الٰہی انصاری	نسیم لکھنوی بحیثیت غزل گو	ادیب، ص ۳۷ تا ۴۹، جنوری فروری ۱۹۷۱ء
الفت، ہنس راج	علامہ کیفی دہلوی	رہنمائے تعلیم، ص ۱۹ تا ۲۲، جون
آزاد، جگن ناتھ	تلوک چند محروم کے ۱۵ دن نرسنگ ہوم میں	نیرنگ خیال، ص ۲۱ تا ۳۷، ،،
آفاق احمد	چند ہم عصر واسطے عبدالحق	ادیب، ص ۳۹ تا ۴۱، جنوری فروری ۱۹۷۱ء
آفاق، ضیاء الحق	قائد اعظم	انجام، ص ۱۱، ۴ر جون
بشارت اللہ بیگ، مرزا	مرزا فرحت اللہ بیگ	جنگ، ص ۷، ۲۰ر ،،
ثمینہ شوکت، ڈاکٹر	محروم اور ان کا شعور غم	صبا، ص ۳۳ تا ۴۰، فروری مارچ
جاوید قریشی	نیاز ایک شخصیت	چٹان، ص ۲۱ تا ۲۴ + ۱۸، ۱۴ر جون
حسن عسکری بلکھنوی، محمد	قاضی عبدالغفار اور جمہوریت	ادیب، ص ۳۶ تا ۴۸، جنوری فروری ۱۹۷۱ء
حسنین کاظمی	نکر صاحب	ماہ نو، ص ۱۵ تا ۴۲ + ۶۰، جون
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	صلاح الدین احمد	چٹان، ص ۹ + ۱۸، ۲۰ر ،،
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر	ج۔ نقوی	صبا، ص ۴۴ تا ۴۶، فروری مارچ
ر۔ ج	قائد اعظم کی اصول پسندی اور سیاسی فراست	انجام، ص ۵، ۴ر جون
ریاض صدیقی، محمد	بنگال کا شاعر نبا دت	منشور، ص ۱۵ تا ۲۰، ،،
سعید احمد، محمد	خواجہ الطاف حسین حالی	ادیب، ص ۳۴ تا ۴۴، جنوری فروری ۱۹۷۱ء
سکندر النساء	رتن ناتھ سرشار	سب رس، ص ۳ تا ۹، جون
سلام مچھلی شہری	بنگلہ کا ایک آتش نوا شاعر۔ نذر ل	جامعہ، ص ۲۲۳ تا ۲۳۱، ،،
سدا سیوا، ایس	تروپتی ونکٹ کولو	ادیب، ص ۳۰ تا ۳۲، جنوری فروری ۱۹۷۱ء
سراج نظامی	شیر بنگال ۔ مولوی فضل الحق	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۳۱ تا ۴۱، جون
سرفراز فاروقی	سعادت حسن منٹو اپنی تحریروں میں	ادب لطیف، ص ۷۶ تا ۷۷، ،،
سرور، آل احمد	سمرسٹ ماہم	صبا، ص ۶۲ تا ۷۲، فروری مارچ
شاہد عشقی	نذیر احمد	الشجاع، ص ۵۳ تا ۸۳، جون
شمیم احمد	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	قومی زبان، ص ۳ تا ۱۲، ،،
شہابی، مفتی انتظام اللہ	ہیروک بن رائق	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۱، دسمبر ۱۹۶۸ء
،،	مشاہیر اکبرآباد	،، ،، ،، ۱۲۹ تا ۱۳۱، ،،

ص۔ ل	غلام عباس	افکار، ص ۹۸تا ۱۰۹، جون
صمدانی نقوی	نواب بہادر یار جنگ بہادر	انجام، ص ۲، ۲۵ر جون
عبدالحمید صدیقی، پروفیسر	پروفیسر وحیدالدین سلیم جامعہ عثمانیہ میں	اردو نامہ، ص ۷تا ۱۵، "
عبداللہ قریشی، محمد	مولانا صلاح الدین احمد	قندیل، ص ۹، ۱۲ر جون
عزیز وارثی	پنڈت زار زتشی	صبا، ص ۸۲تا ۹۳، فروری مارچ
فضل حق قریشی دہلوی	نیاز فتح پوری مرحوم[1]	جنگ، ص ۴، ۴ر جون
کشفی، ابوالخیر	ڈاکٹر سجاد مرحوم	سیپ، ص ۲۷۷تا ۲۸۰،
" "	بی اے ہاشمی	" " ۲۸۱تا ۲۸۳،
مجتبیٰ حسین	نظیر اکبر آبادی	" " ۲۰۶تا ۲۱۰،
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	حکمت استاد۔ اسمٰعیل میرٹھی	جنگ، ۹ر جون
مسعود، پروفیسر خواجہ	قاضی نذرالاسلام	" ۹، ۱۳ر "
مفتوں کوٹوی	اعجاز صدیقی	فروغ اردو، ص ۴تا ۱۲، "
منظر، شہزاد	حبیب اللہ بہار مرحوم	ماہ نو، ص ۲۶تا ۲۸، "
نسیم احمد، مولانا	شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی	الرحیم، ص ۱۶تا ۳۰، "
نورالحسن	غلام پنجتن صاحب	صبا، ص ۴۱تا ۴۳، فروری مارچ
نور محمد سجادلی	الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجادلی	الرحیم، ص ۶۶تا ۸۷، جون
وفا راشدی	ناشط صدیقی بریلوی	ادیب، ص ۵۷تا ۵۹، جنوری فروری
یوسف بخاری دہلوی، سید	باقر علی داستان گو	نیرنگ خیال، ص ۴۳تا ۴۹، جون
———	جہاں گرد کا آخری سفر[2]	سیپ، ص ۲۵۹تا ۲۶۲،
———	ست الملک — ایک حوصلہ مند فاطمی شہزادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۲تا ۱۴، دسمبر

صحافت

امداد صابری، مولانا	اخبار "ہمدرد" کی ابتدائی حالت	قومی زبان، ص ۹۳تا ۱۰۸، جون

---

[1] بعد کی قسط کے لیے دیکھئے جنگ ۱۸ر جون۔ [2] سر مرک ایم کے متعلق

بدری، لطف اللہ	پچھلی صدی کی ادبی صحافت - ۲	ماہ نو، ص ۱۰ تا ۱۴، جون
فضل المتین، سید	ماہنامہ آگ اجمیر	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵/ جون
کلیم اختر	کشمیر کی صحافت کا تاریخی ارتقا	ادبی دنیا، ص ۳۳۴ تا ۳۴۳، مارچ اپریل

فلسفہ و عمرانیات

بشارت علی، ڈاکٹر	شاہ ولی اللہ کی انضمامی عمرانیات	تہذیب الاخلاق، ص ۳ تا ۱۴، مئی
عبدالواحد ہالی پوتا، ڈاکٹر		
سید محمد سعید (مترجم)	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ـــ مبادیات اخلاقیات	الرحیم، ص ۵ تا ۱۵، جون
بائیکل بولان ای		
شیخ صلاح الدین (مترجم)	مطالعہ انسان	نصرت، ص ۹ تا ۲۹، مئی جون
نورنبی، محمد	فلسفہ انسانیت کا ایک تنقیدی جائزہ	برہان، ص ۳۲۷ تا ۳۴۵، جون

فنون لطیفہ

بلدیو مرزا	موسیقی اور جذبات	سیپ، ص ۲۶۷ تا ۲۷۱
راشد علی، قاضی	ہماری موسیقی	" " ۲۷۲ تا ۲۷۳
نسیم نیشو فوز	تجریدی آرٹ	" " ۹۴

کتابیات اور کتب خانہ

ابو سلمان شاہجہاں پوری	نئے خزانے (دسمبر ۱۹۷۵ء کے اردو اخبارات و رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۷۳ تا ۸۲، جون
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی انسائیکلوپیڈیا (برہان کا اشاریہ)	برہان، ص ۳۶۹ تا ۳۷۹، "
ریاض الدین احمد	عوامی کتب خانے	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۹ تا ۱۰، ۱۹۶۴، دسمبر ۱۹۶۳
قاسمی، مولانا غلام مصطفیٰ	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۳۱ تا ۳۴، جون

لسانیات ولغات

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر	لسانی مطالعہ میں شمارياتی امدادی طریقوں کا استعمال	سبپ، ص ۲۰۰ تا ۲۰۶،
ادارہ	اردو لغت (قسط نمبر ۱۸)	اردو نامہ، ص ۳۳۹ تا ۳۵۸، جون
حامد حسن قادری	تحقیق الفاظ	" " ۵۶ تا ۵۸، "
خواجہ حسین، سید	دکھنی کا پہلا منظوم لغت	سب رس، ص ۱۷ تا ۲۳، "
شوکت سبزواری، ڈاکٹر	اشتقاقیات	اردو نامہ، ص ۵۹ تا ۶۱، "

مذہبیات

سیرت النبی صلعم

بشیر احمد پسروری	ذکرہ فی الامم	خدام الدین، ص ۱۱+۱۶، ۱۰ر جون
ناسک، خواجہ محمد واسع	رسول اللہؐ کے عمرے اور حج	البلاغ، ص ۲۸ تا ۴۰، جون

قرانیات

احتشام الحق تھانوی، مولانا	درس قرآن — الفاتحہ[1]	جنگ، ص ۵، ۴ر جون
آردی، شمس تبریز خاں	حدیث بطور تفسیر قرآن	فاران، ص ۲۳ تا ۲۸، "
عبدالماجد دریابادی، مولانا	تفسیر اردو	صدق جدید، ص ۵ تا ۶، ۱۰ر جون
مودودی، ابو الاعلیٰ	الحجرات (۲)	ترجمان القرآن، ص ۲۳ تا ۴۶، "

مسائل ومباحث

اسحٰق موسیٰ الحسینی، ڈاکٹر		
عبدالحمید صدیقی (مترجم)	اسلام میں نظام احتساب	ترجمان القرآن، ص ۴۷ تا ۵۶، جون

---

[1] تفسیر قرآن مجید کا یہ مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں دیکھیے۔

امینی، محمد تقی الدین	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۳۲۵ تا ۳۳۶، جون
انور، مولانا عبید اللہ	ایمان و اسلام کی چند نشانیاں [1]	خدام الدین، ص ۵، ۳رجون
"	مقصد حیات	" " ۴، ۱۵، ۱۰ر"
نگٹی، فقیر بخش	مذاہب عالم پر اسلام کی فوقیت کیوں؟	نصرت، ص ۷۵ تا ۷۷، مئی جون
پوردۃ السحار، عبد الحمید عبد الصمد صارم (مترجم)	اسلام میں اشتراکیت	نصرت، ص ۸۷ تا ۱۰۱، مئی جون
سلطان مبین	تناسخ کا تحقیقی جائزہ	زندگی، ص ۳۴ تا ۴۱، جون
سلیم احمد	اسلام اور دور جدید	چراغ راہ، ص ۲۲ تا ۲۶، "
عبد الحمید صدیقی	یورپ کی تحریک اصلاح مذہب	ترجمان القرآن، ص ۲۳ تا ۴۶، جون
عبد الرحمان، ایم	سودی کاروبار — ایک لعنت	خدام الدین، ص ۱۰ تا ۱۲ + ۱۴، ۳رجون
غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر	تبلیغ اسلام اور مجدد الف ثانی	حریت، ص ۳ + ۴، ۱۰رجون
معصومی، ڈاکٹر محمد صغیر حسن	ربا اور دار الحرب	الرحیم، ص ۴۵ تا ۷۵، "
	صحابہ کرام اور مولانا مودودی — سلسلۂ خلافت سے ملوکیت تک	المنبر، ص ۷، ۳رجون
	فن قرأت اور علامہ شاطبی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۹ تا ۲۳، نومبر ۶۵ء
	زکوٰۃ کا مصرف "سبیل اللہ"	زندگی، ص ۹ تا ۱۶، جون

مکاتیب

ہاشمی فرید آبادی	یادش بخیر (مکاتیب ہاشمی فرید آبادی)	اردو نامہ، ص ۳۰ تا ۵۵، جون

نفسیات

رئیس امروہوی	سکون قلب	جنگ، ص ۷، ۲۰رجون
" "	تحلیل نفسی	" " ۷، ۲۷ر "

---

[1] نیز دیکھئے خدام الدین ۱۰رجولائی و ۱۷رجولائی

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
یُن وفا	سید صفدر حسین	—	فاران، ص ۴۵ تا ۴۶، جون
استاد بننے کا مزہ	میوریل ڈنی		
	پروفیسر محمد مجیب (مترجم)	عبداللطیف اعظمی	جامعہ، ص ۲۲۳ تا ۲۳۳، جون
اسم اعظم	شہریار	"	" ۴۳۴ تا ۴۳۶، "
اصول تنقید	لیسل ایبرکرومبی		
	عبدالسلام و جلیل احمد (مترجم)	اسلم فرخی	سیپ، ص ۷۵۳ تا ۷۵۸
افکار کراچی – غالب نمبر	—	تحسین سروری	اردونامہ، ص ۷۰ تا ۷۷، جون
اکمل البیان فی تائید			
تقویۃ الایمان	عزیز الدین	—	فاران، ص ۵۴، جون
الرسائل القشیریہ	پیر محمد حسن (مرتب و مترجم)	سعید احمد اکبرآبادی	برہان، ص ۳۸۱، "
امیر خسروؒ بحیثیت ہندی شاعر	ڈاکٹر صفدر آہ	احتشام حسین	فروغ اردو، ص ۳۱ تا ۳۲، جون
باقیات شبلی	مشتاق حسین (مرتب)	عبداللطیف اعظمی	جامعہ، ص ۳۳۳ تا ۳۳۴، "
برگ گل (مجاہد نمبر) کراچی	—	ن۔ ن	انجام، ص ۶، ۱۳ جون
بہادر شاہ ظفر	منجو قمر یداللہی	ا۔ ص	سب رس، ص ۴۰، "
پہلا وہ گھر خدا کا (سفرنامہ)	غلام سرور	—	ہماری زبان، ص ۳، ۲۲ جون
براۃ عثمان	ظفر احمد تھانوی	—	فاران، ص ۷۴ تا ۷۵، "
تماشا	لطیف فاروقی	—	چٹان، ص ۱۷، ۲ جون
تمدن یورپ [1]	احسان محمد خاں	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۶، جون
جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری	حمیدہ سلطان احمد	سعید احمد اکبرآبادی	برہان، ص ۳۸۳، "

[1] نیز دیکھئے سیپ نمبر ۔ تبصرہ از شاہد عشقی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ار ما ولٹ	ابوالفضل صدیقی	ابواللیث صدیقی	سیپ، ص ۳۵۷،
ندنی کی پتیاں (مجموعۂ کلام)	ناصر شہزاد	شبی فاروقی	" " ۳۵۰ تا ۳۵۲،
ہم تمنا	منظر امام	نظیر صدیقی	" " ۳۵۲،
م گل (نظم)	سرشار صدیقی	شاہد عشقی	" " ۳۵۳،
نکس نامہ	محشر بدایونی	م - خ	جام نو، ص ۶۵، جون
رب قلم (قومی نظمیں)	سہیل اقبال	اکرام احمد	سیپ، ص ۳۵۳،
رب آبادی کا علاج	نعیم صدیقی	فضل من اللہ	سیارہ، ص ۸۴، جون
نیر کی جنگ آزادی	سردار محمد ابراہیم خاں	ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۱۳، "
، تازہ (مجموعۂ کلام)	صلاح الدین نیر	شہر یار	ہماری زبان، ص ۱۲، ۲۲ جون
ثنوی گلزار نسیم (دیاشنکر نسیم)	امیر حسن نورانی (مرتب)	عبداللطیف اعظمی	جامعہ، ص ۳۳۳، جون
طالعہ و تنقید	اختر انصاری	ابن فرید	ادیب، ص ۷۹ تا ۸۰، جنوری فروری مشترکہ
عاہدہ عمرانی	ژاں ژاک روسو		
	محمود حسین (مترجم)	مدبر رضوی	سیپ، ص ۳۵۴،
وج صبا		ناصر زیدی	ادب لطیف، ص ۱۱۴، جون
ولانا محمد علی	محمد سرور	سعید احمد اکبرآبادی	برہان، ص ۳۸۲ تا ۳۸۳، جون
دکار جگر، نگارشات جگر،			
گر کے خطوط (تین کتابیں)	محمد اسلام (مرتب)	سعید احمد اکبرآبادی	برہان، ص ۳۸۴، جون

کامیابی

کے لئے ضروری ہے کہ

آپ جو الفاظ استعمال کریں ان کے معانی سے پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہو سکتی ہے

آپ گھر میں ہوں، دفتر میں یا سفر میں

ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی بہترین رفیق ہوگی

اساتذہ

وکلاء

اطباء

مترجمین

اور سرکاری کارکنوں کے لئے

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

ایک بہترین تحفہ ہے

خوبصورت طباعت — ڈیڑھ ہزار صفحات — اعلیٰ درجہ کا بائبل پیپر — مضبوط جلد

قیمت صرف ۲۱ روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۰ شمارہ ۲

فروری ۱۹۶۷ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

بیاد غالب

جناب اختر حسین
صدر انجمن ترقی اردو

بچوں کا ادب

محترم حاضرین! [۱]

سب سے پہلے قومی نیشنل بک سینٹر کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے بچوں کا کتاب میلہ منعقد کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی۔ مجھے خوشی ہے کہ اس میلے سے بچوں ہی نے نہیں بلکہ بڑوں نے بھی دلچسپی لی ہے۔

ہمارے ملک میں اور خصوصاً ہماری زبان اردو میں بچوں کے ادب کی جو کمی ہے اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کام کو غیر سنجیدہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اہل قلم جو بچوں کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں اس کام کو اپنے مرتبہ سے کم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر کوئی اچھا ادیب بچوں کے لئے بھی اچھا ادب پیدا کر سکے تو یہ خصوصیت اس کے مرتبے میں اضافے کا باعث ہوگی کیونکہ بچوں کے لئے لکھنا کوئی آسان یا معمولی بات نہیں۔ لکھنے والے کو نہ صرف یہ کہ بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ اسے تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کی معلومات میں اضافے کا اہتمام بھی کرنا ہوتا ہے دوگونہ مقصد کو حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہے اور جو اہل قلم اس مقصد کو انجام دیتے ہیں وہ یقیناً بڑا کام کرتے ہیں اور ہر اعتبار سے ہماری ستائش کے مستحق ہیں۔ بچوں کے ادب سے عدم توجہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مصنفین کو معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔ معاوضہ کی شرح کتاب کی ضخامت یا قیمت پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مصنف کا معاوضہ برائے نام ہوتا ہے۔ اگر ناشرین مصنفین کی حوصلہ افزائی مناسب طریقے سے کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچوں کے ادب میں اضافہ نہ ہو۔ اس ضمن میں تیسری اور اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں اور گھروں میں بچوں کو غیر نصابی کتابیں پڑھنے کی رغبت اور مناسب تربیت نہیں دی جاتی اساتذہ اور والدین دونوں ہی اس کوتاہی کے ذمہ دار ہیں۔ بچوں کی عمر، مذاق اور مزاج کے اعتبار سے اگر انھیں دلچسپ غیر نصابی کتابوں کی فر

---

[۱] قومی مرکز کتاب کی طرف سے بچوں کا کتاب میلہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت جناب اختر حسین نے فرمائی تھی۔ اس [illegible]

متوجہ کیا جائے تو یہ تربیت ان کی نصابی کتابوں کے مطالعے میں بھی مفید ہو سکتی ہے۔ نیشنل بک سنٹر کے ارباب کار اگر بچوں کا ادب لکھنے والوں، چھاپنے والوں، پڑھنے والوں، اساتذہ اور والدین کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کی کوششوں کو تیز سے تیز تر کر دیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی - اس قسم کے کتاب میلے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت مفید ہو سکتے ہیں - ان کا انعقاد صرف بڑے شہروں تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں تک یہ سلسلہ پھیلنا چاہیئے۔

محترم حاضرین! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کے بچے دیگر ممالک کے بچوں کی طرح کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں - اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تربیت میں خامی کی وجہ سے [illegible] زیادہ تر ایسی کتابیں [illegible] پڑھتے ہیں جو ان کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں جہاں ایک طرف ہمیں بچوں کے اچھے ادب کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کرنی چاہیئے وہیں دوسری طرف ایسے انتظامات بھی کرنے چاہئیں جن سے غیر اخلاقی تحریریں بچوں تک نہ پہنچ سکیں - اس سلسلے میں کتب فروش اور والدین مل کر ہی کوئی اقدام کر سکتے ہیں - کتب فروش ایسی مخرب اخلاق کتابوں کی فروخت سے ہاتھ اٹھا لیں اور والدین بچوں کی سختی سے نگرانی کریں اور دیکھیں کہ ان تک کوئی غلط کتاب نہ پہنچے -

جو لوگ بچوں کے لئے کتابیں لکھتے ہیں انھیں بچوں کی نفسیات کو پوری طرح پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بچے کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ نئی نئی چیزوں سے واقف ہونے کے لئے بے قرار رہتا ہے - اور اسی وجہ سے مافوق فطرت عناصر سے اس کو بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے - ہمیں بچے کی فطرت سے اس پہلو سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور اس کی دلچسپی کو مافوق فطرت عناصر کی طرف سے ہٹا کر سائنسی عجائبات کی طرف مبذول کرنا چاہیئے -

آج سے چالیس پچاس برس پہلے کے بچوں کا جو ادب موجود ہے اس میں زبان اور بیان کی صحت کا نہایت خیال رکھا گیا تھا تاکہ بچہ ابتدا ہی سے صحیح زبان سیکھ سکے - مگر آج کل کی کتابوں میں یہ خوبی خال خال ہی نظر آتی ہے - یہ بہت بڑی کمی ہے - اسے دور کرنا نہایت لازمی ہے - اگر بچے ایسی کتابیں پڑھیں جن میں مفید معلومات درج ہوں لیکن زبان صحیح نہ ہو تو ایسی کتابیں بھی نقصان دہ ہو سکتی ہیں - مصنفین اور اشاعتی اداروں کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے - اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر عمر کے بچوں کی لسانی استعداد کو سامنے رکھ کر ہی کتابیں لکھنی چاہئیں - اس مقصد کے لئے ہمیں پہلے بچوں کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لینا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کس عمر کے بچے کون کون سے الفاظ استعمال کرتے ہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں اس قسم کی فہرستیں موجود ہیں - ہماری زبان میں بھی ہونی چاہئیں - یہ نیشنل بک سنٹر

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

اس انجمن گل میں

گورنر مغربی پاکستان اردو کالج میں

۹ جنوری کو مغربی پاکستان کے گورنر جناب محمد موسیٰ اردو کالج کی زیر تعمیر عمارت میں تشریف لائے جہاں ان کا استقبال صدرِ انجمن ترقی اردو جناب اختر حسین نے کیا اور جنرل محمد موسیٰ کو کالج کی عمارت دکھائی گورنر مغربی پاکستان نے انجمن کی اس کارکردگی پر اظہار پسندیدگی کیا جناب اختر حسین نے گورنر کو بتایا کہ سرمائے کی کمی کی وجہ سے عمارت کے تعمیری منصوبے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ انجمن کو صوبائی حکومت کی امداد اگر مل جائے تو یہ کام بہت جلد پورا ہو سکتا ہے۔ گورنر نے اردو کالج کی تعمیر کے فنڈ میں اپنی جیب خاص سے دو ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان کیا اور صوبائی حکومت کی طرف سے امداد دینے کے سوال پر ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔

وزیر تعلیم انجمن میں

وزیرِ تعلیم جناب قاضی انوار الحق صاحب نے انجمن ترقی اردو اور زیر تعمیر اردو کالج کا معائنہ کیا صدر انجمن ترقی اردو جناب اختر حسین صاحب نے وزیر تعلیم کا خیر مقدم کیا۔ جناب قاضی انوار الحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی لائبریری دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ انجمن کے اس قیمتی کتب خانے میں کتابوں کی حفاظت کے لئے جدید ترین طریقے اختیار کئے جائیں۔ اردو کالج کی زیر تعمیر عمارت میں صدر انجمن نے انھیں کالج کے پورے منصوبے سے آگاہ کیا۔ قاضی انوار الحق صاحب نے فرمایا کہ مرکزی حکومت نے انگریزی کی جگہ قومی زبانوں اردو اور بنگالی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سوال کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے۔ جو اپنے کام میں سرگرمی سے مصروف ہے۔ انھوں نے درسی کتابوں کی تیاری پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کا مشورہ بھی دیا اور کہا میں بتدریج قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں ہوں۔

اقامتی اردو کالج کے لئے

۲۰ دسمبر کو کراچی ڈسٹرکٹ کونسل کے اجلاس میں ڈپٹی کمشنر کراچی نے جو کونسل کے چیرمین بھی ہیں منجملہ اور ترقی اسکیموں کے سماجی بہبود اور تعلیمی ترقی کے اداروں کی امداد کی رقم ساٹھ ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کر دی ہے۔ اس میں سے پچاس ہزار روپے کی رقم دو برابر قسطوں میں اردو اقامتی کالج کو دی جائے گی۔

زیرِ تعمیر اقامتی اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک اردو کالج کے لئے مبلغ ستر ہزار تین سو انچاس (۷۰،۳۴۹) روپے جمع ہو چکے ہیں۔ مبلغ اڑتالیس ہزار آٹھ سو اکیس (۴۸،۸۲۱) روپے کے ذاتی عطیات موصول ہوئے اور مبلغ اکیس ہزار پانچ سو اٹھائیس (۲۱،۵۲۸) روپے رسائد کی فروخت سے موصول ہوئے۔ جن حضرات نے رسائد کی فروخت میں تعاون فرمایا ہے ان کے اسمائے گرامی "قومی زبان" کے سابقہ شماروں میں شائع کئے جا چکے ہیں، ذیل میں ذاتی طور پر عطیہ دینے والوں کے اسمائے گرامی شائع کئے جاتے ہیں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر مملکت پاکستان	دو ہزار روپے
جناب محمد موسیٰ، گورنر مغربی پاکستان۔	دو ہزار روپے
جناب عبد المنعم خان صاحب، گورنر مشرقی پاکستان۔	ایک ہزار روپیہ
جناب چوہدری علی اکبر صاحب۔ وزیر داخلہ و امور کشمیر حکومت پاکستان۔	پانچ سو روپے
جناب ایم عقیلی صاحب۔ وزیر مالیات حکومت پاکستان۔	پانچ سو روپے
جناب شریف الدین پیرزادہ۔ وزیر خارجہ حکومت پاکستان۔	پانچ سو روپے
جناب قاضی انوار الحق صاحب۔ وزیر تعلیم، محنت و صحت حکومت پاکستان	پانچ سو روپے
ڈسٹرکٹ کونسل کراچی۔	پچیس ہزار روپے
جناب نور حسین شاہ صاحب۔	چھ ہزار روپے
جناب رفیق شاہ صاحب۔ رئیس اعظم بھاول نگر	دو ہزار روپے
جناب چوہدری ظہور الہیٰ صاحب۔	دو ہزار روپے
جناب اعجاز احمد صاحب۔ نیشنل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کراچی۔	دو ہزار روپے
علی آٹو موبائلز۔ کراچی۔	دو ہزار روپے
مسلم کمرشیل بینک۔ کراچی۔	ایک ہزار روپے
جنرل انشورنس لمیٹڈ۔ کراچی۔	پانچ سو روپے
ریاض فیبرکس۔ کراچی۔	دو سو اکیاون روپے
جناب عبد الستار حاجی داؤد صاحب۔	دو سو پچاس روپے
جعفر ابراہیم اینڈ کمپنی۔ کراچی۔	دو سو پچاس روپے
جناب اشرف ریاض صاحب۔ کراچی۔	دو سو روپے
ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب کراچی یونیورسٹی	ایک سو روپے
ایم [illegible] خان کمپنی۔ کراچی۔	ایک سو روپے
جناب سید محمد طفیل صاحب۔ پنشنر سول سرجن بھاولپور۔	نوے روپے
جناب جی معین الدین صاحب۔ چیف الکشن کمشنر راولپنڈی	پچاس روپے
[illegible]الدین صاحب۔ سلہٹ۔	تیس روپے

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ذکرِ غالب

مالک رام صاحب کی مشہور کتاب "ذکرِ غالب" جب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو بابائے اردو نے اس پر ریڈیو سے یہ تبصرہ نشر کیا۔ اس تبصرے کا نامکمل مسودہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ تبصرہ چونکہ غیر مطبوعہ ہے، اس لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

غالب پر اس وقت تک بیسیوں مضامین، اور مقالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی طرح ان کے اردو دیوان پر بیسیوں شرحیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ یہ عزت ہمارے شعرا میں کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔

سب سے پہلے غالب کی قدر مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" لکھ کر لوگوں کے دل میں پیدا کی۔ انھوں نے غالب کی زندگی کے حالات، اس کے اخلاق، عادات، روزمرّہ زندگی کے واقعات اور اس کے کلام کے محاسن کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ غالب کی زندہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ یہ غالب پر پہلی کتاب ہے اور اس کے بعد کثرت سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ اب بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

مالک رام صاحب کی تالیف (ذکرِ غالب) آخری کتاب ہے ان میں انھوں نے تمام ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور تمام حالات و واقعات تحقیق کے ساتھ لکھے ہیں اور بعض غلط فہمیوں کو بھی رفع کیا ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلے میں سوانح دوسرے میں تصنیفات اور تیسرے میں عادات و اخلاق، اس مختصر کتاب میں جو ۲۲۴ صفحوں میں صفحے پر ہے سب کچھ آگیا ہے۔

۱۸۹۵ء میں جب میں علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا، مولانا حالی بھی کچھ دنوں کے لئے کالج میں مقیم تھے، ایک دن شام کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ غالب پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، یہ وہی کتاب ہے

جو یادگار غالب کے نام سے شائع اور مقبول ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں میری زبان سے، جیسے طالب علموں کی عادت ہوتی ہے یہ نکلا کہ غالب بہت بڑا شخص ہوا ہے، فرمانے لگے "بڑا شخص ایک ہی تھا" بلاشبہ وہ ایک ہی تھا۔ اپنی سیرت میں اپنے ذوق میں، وسعت اخلاق اور آزادیٔ خیال میں، معنی آفرینی اور بلند نظری میں، جدت فکر اور لطیف شوخی و ظرافت میں وہ ماضی کا پجاری نہ تھا، چنانچہ خود کہتا ہے کہ ع

مردہ پروردن مبارک کار نیست

اور ایک دوسری جگہ لکھا ہے۔ "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں حق ہے" اس لئے وہ عامیانہ روش سے بچتا اور پامال راستوں سے کتراتا تھا۔

اس زمانے میں جب کہ اردو شاعری بے مزہ اور تقلیدی ہو گئی تھی۔ وہی مضامین و خیالات، وہی فرسودہ تشبیہیں اور استعارے جن میں کوئی جان نہ تھی بار بار دہرائے جاتے تھے۔ شعر لفظوں کا کھیل ہو گیا تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن دونوں پژمردہ اور بے کیف تھے۔ اور شمع نظم بجھنے کو تھی کہ غالب شعلۂ طور کی طرح نمودار ہوا اور اس نے زبان کا رتبہ اتنا بلند کر دیا کہ اس سے قبل اردو کو کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ اگرچہ شعر میں کسی خاص اصلاح یا انقلاب کا بانی نہ تھا لیکن اصلاح و انقلاب کا پیش رو تھا۔ اس نے اردو شاعری میں ایسی روح پھونکی جس میں جدید اردو شاعری کا ہیولا موجود تھا جو حالی و اقبال کے کلام میں صورت پذیر ہوا۔

دوسری بڑی خوبی اس کے کلام میں یہ ہے کہ وہ پستی کی طرف نہیں جاتا جس کے لئے ہماری شاعری کا اکثر حصہ بدنام ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ بلندی کی طرف رہتی ہے۔ ادنا تعصبات اور ذلیل خیالات سے اس کا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا۔ آزاد خیالی اور آزادہ روی اس کی طبیعت کا جوہر تھا۔ خود کہتا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

چنانچہ وہ اپنی رائے اور روش میں، اپنے اسلوب بیان میں اور طرز خیال میں دوسروں سے نرالا تھا۔ بقول مولانا حالی وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ اپنی وضع میں، اپنے لباس میں، طعام میں طریق ماند و بود میں یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتا تھا۔

اس کی سیرت بھی ایسی ہی بلند ہے جیسا اس کا کلام۔ دوستوں سے محبت، چھوٹوں پر شفقت، غریبوں سے سلوک اور سب سے یکساں محبت آمیز برتاؤ تھا۔ میں بعض ایسے لوگوں سے ملا ہوں کہ جن کو غالب کی صحبت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انھیں غالب سے کس درجہ محبت اور عقیدت تھی۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں میرن صاحب مرحوم جن پر غالب بہت مہربان تھے۔ چند روز کے لئے حیدرآباد آئے تھے۔ ایک دن میرے مکان میں

میرے پاس بیٹھے تھے ، اتنے میں ایک صاحب تشریف لے آئے ۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مرزا غالب کا ایک شعر پڑھا سو اتفاق سے وہ ایک لفظ غلط پڑھ گئے ۔ میرن صاحب فوراً ان کی طرف مڑے اور کہنے لگے " میاں یہ آیت یا حدیث نہیں جیسا چاہا پڑھ لیا ۔ یہ مرزا صاحب کا کلام ہے ۔ اسے غلط پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے" اللہ رے عقیدت ۔کیا یہ عقیدت یوں ہی پیدا ہوگئی تھی ؟

اس کی سیرت میں سب سے قابل قدر خوبی یہ تھی کہ جو اس کے دل میں تھا وہی زبان پر ۔ جو زبان پر تھا وہی قلم پر تھا منافقت اور ریا اس سے کوسوں دور تھی ۔ مولانا حالی نے مرزا کے مرثیہ میں سیرت کے اس پہلو کو ایک شعر میں کس خوبی سے ادا کیا ہے ۔

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا ۔ اس لئے اس کے ہم عصروں نے اس کی قدر نہ کی ۔ آزاد جیسا شخص جو غالب کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا اور جدید ادب کے بانیوں میں سے ہے اس کی خوبیوں پر عجب انداز سے الفاظ کے پردے ڈالتا چلا گیا ہے ۔ غالب اس سے بے خبر نہ تھا اور اپنے زمانے کے مذاق سے بخوبی واقف تھا ۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے اپنے کلام کی نسبت پیشین گوئی کی تھی کہ ایک وقت آئے گا لوگ میرے کلام کی قدر کریں گے ۔

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن — کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن — شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

آج یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی ۔

اردو نثر پر بھی غالب کا بہت بڑا احسان ہے ۔ اس نے اردو نثر میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ اس نے خط و کتابت میں تمام مروجہ فضول اور لایعنی تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیا اور تحریر میں ایسی بول چال کا رنگ پیدا کیا کہ سادہ نثر میں شعر کا لطف آنے لگا ۔ سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ فکر کی رنگینی ، ظرافت و شوخی کی چاشنی ، لطف و محبت ، بے ریائی و خلوص کی گرمی ۔ اظہار کے دلآویز پیرائے روزمرہ کی معمولی باتوں میں انوکھی دل کشی وغیرہ ایسی خوبیاں ہیں جو کسی دوسری تحریر میں نہیں پائی جاتیں ۔ غالب کے رقعات اردو ادب کا بے بہا اور قابل احترام ترکہ ہے ایسے خط نہ پہلے کبھی لکھے گئے اور شاید نہ آئندہ لکھے جائیں گے ۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی ہستیوں کے حالات جنھوں نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا ہے جنھوں نے قوموں کی اصلاح کی ، خیالات میں انقلاب پیدا کیا ، بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے ۔ ان کی زندگی سے ہم بہت بیش بہا سبق حاصل کر سکتے ہیں ، ان کے بلند کردار ، عزم و استقلال سے بھی ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی جو بات دوسری کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔

مطبوعاتِ انجمن

تاریخ و سیاست :-

کتاب	مصنف	قیمت
کابل و یاغستان	مولوی محمد علی قصوری	۲ - ۲۵ روپے
تذکرہ اہل دھلی	سرسید احمد خاں - مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی	۵ - ۵۰ "
جغرافیہ قرآن	مفتی انتظام اللہ	۱ - ۵۰ "
تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو	ہاشمی فرید آبادی	۳ - ۵۰ "
داس کیپٹال (جلد اول)	مارکس - مترجم سید محمد تقی	۷ - ۵۰ "
جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے	امیر شکیب ارسلان - مترجم نجم الدین شکیب	۴ - ۵۰ "

سلسلۂ اصطلاحات :-

کتاب	مصنف	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بنکاری		۴ - ۵۰ "
" " فلکیات		۱ - ۵۰ "
" " کیمیا		۲ - ۲۵ "
" " جغرافیہ		۱ - ۰۰ "
اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ	بابائے اردو	۵۰

سائنس :-

کتاب	مصنف	قیمت
اردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم سائنس	بابائے اردو	۱ - ۰۰ "
اضافیت	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۳ - ۰۰ "
طبیعیات کی داستان	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۸ - ۷۵ "
قوائے طبیعیہ	ڈاکٹر صادق حسین	۲ - ۲۵ "
جدید معلومات سائنس	میجر آفتاب حسن	۷ - ۵۰ "
جراثیمیات	محمد احمد خامی	۲ - ۰۰ "
حیوانیات	پروفیسر محشر عابدی	۲ - ۲۵ "
نباتی دباغت	سید امداد علی	۵ - ۵۰ "
سیر افلاک	مرزا محمد رشید	۳ - ۵۰ "

ملنے کا

پتہ

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی

ڈاکٹر سید عبداللہ

غالب ــــ دو زبان شاعر

غالب نے دو زبانوں میں شاعری کی ۔ فارسی اور اردو میں ـــــ ! دونوں مجموعے غالب ہی کی تخلیق ہیں ، اور ظاہر ہے کہ دونوں پر غالب کی شخصیت اور ذہن و ذوق کی چھاپ لگی ہوئی ہے ـــ مگر غالب نے یہ کہدیا کہ میرا فارسی کلام دیکھو جو " نقش ہائے رنگ رنگ " سے معمور ہے ۔ میرے مجموعۂ اردو میں کیا پڑا ہے ۔ وہ محض بے رنگ ہے ۔

پارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اپنے فارسی کلام کے حق میں یہ جانب داری اور اپنے اردو کلام کے خلاف یہ تعصب ! بڑی عجیب بات ہے غریب ہندوستان کی یہ بدقسمتی رہی کہ اس میں رہ کر بھی لوگ اس سے خوش نہ رہے ۔ ہندوستان کے ہو کر ، شراب پرتگالی اور شاہدانِ تتار کے گن گانے کی عادت ، غالب کے ہاں بھی ہے ، اور یہ ایک رسم قدیم کی پیروی ہے ۔ کلیم اور قدسی نے شکایت کی یہ روش جاری کی ، بعد میں آنے والوں نے اس کی پیروی کی ۔ غالب ، پیروی رسم و رہ عام ، سے اجتناب کے مدعی ہیں ، مگر پیروی سے کون بچ سکتا ہے ۔ غالب بھی نہیں بچے ۔

اور بات کیا ہے ؟ غالب پر ان بین الاقوامی تہذیبی اور ادبی شاہکاروں کا بڑا رعب تھا ، جن کے بڑے مرکز ہندوستان سے باہر تھے ، سمرقند و بخارا اور اصفہان ہرات و قم ! ؎

غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشم
گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

ظہوری نے دکن میں شاعری کا غلغلہ بلند کیا ، لیکن اصلاً وہ ترشیز کے رہنے والے تھے ۔ اس لئے غالب کو ان کی راتب خواری کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی بلکہ یہ ایران کی نظر میں باعث فخر تھا ؎

ما را مدد ز فیضِ ظہور لیست در سخن
چوں جام بادہ راتبہ خوار خمیم ما

ظہوری کتنا خوش قسمت انسان تھا کہ غالب اپنے آپ کو جام اور اس کو خُم کا درجہ دیتے ہیں، اسی طرح جا بجا اس کی تعریف کی ہے۔ غرض سارا قصہ یہ ہے کہ غالب، ایرانی ذہانت اور قابلیتوں کے معاملے میں طبعاً اور ذہناً جانب دار ہیں، اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں —— برہان قاطع کی ساری لڑائی میں یہ ذہن کام کرتا ہے۔ یعنی کل نزاع یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی لکھنے والا (ماسوا خسرو اور فیضی جیسے خوش نصیبوں کے) مستند نہیں سمجھا جا سکتا۔

چلئے —— ہم فارسی کے معاملے میں اسے تسلیم کئے لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ زبان اور بیان کا اصلی معیار، اہل زبان ہی مہیا کر سکتے ہیں، مگر یہ کیا قیامت ہے کہ غالب کو "مئے صافی" اور "شاہد" تک بھی بیرونی ہی پسند آئے ؎

مئے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ماندانیم کہ بغدادے و بسطامے ہست

یہاں مقابلہ بغداد و تتار کا سہی —— مگر ہندوستان کی آب و ہوا انھیں عموماً راس نہیں آئی۔ دہلی و لکھنؤ کا انکار تو خیر، بے حد مشکل تھا —— باقی ہندوستان میں سے صرف کلکتہ نظروں میں جچا ہے، کیونکہ یہاں عشوہ ہائے بتان خود آرا کی دولت بہ فراوانی میسر آئی —— اور یہ بت بھی کون لوگ تھے؟ وہی افرنگی بت —— کہ غیر ملکی تھے۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ غالب کا ذہن خارجی خصوصاً ایرانی عظمتوں سے مرعوب تھا اور اسی ذہن کے زیر اثر، وہ اپنے آپ کو عظمتوں کی صف میں دیکھنا چاہتا تھا، اور اس کے لئے لازم تھا کہ ایسی فارسی لکھتے جس کا لوہا ایرانی بھی مانیں —— یا کم از کم خود کو تسلی ہو کہ میں نے اپنے کلام میں وہ نوک پلک پیدا کی ہے جو ایرانی ادبا سے مخصوص ہے۔

غالب اپنے اس میلان میں ایک خاص حد تک حق بجانب تھے۔ مثلاً یہ ماننا ہی پڑے گا کہ فارسی کی سند ایرانی ہی ہو سکتے ہیں —— ہندوستان والوں نے بھی فارسی لکھی اور تورانیوں کے زیر اثر، ایک خاص لہجہ اور محاورہ بھی پیدا کیا، لیکن مغلوں کے زمانے میں، خالص ایرانی ادبا و فضلا کی بکثرت درآمد کی وجہ سے اور اکبری جہانگیری/ شاہجہانی ادوار میں معیاری ادبی تخلیقات کی بنا پر مغلوں کے آخری دور میں ایرانیت ہی مستند قدر سمجھی جاتی تھی۔ محمد علی حزیں اور خان آرزو کے جھگڑے میں قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ ادب میں، ہندی فارسی تخلیقات کے

مقابلے میں ایرانی فارسی تخلیقات معیاری سمجھی جاتی تھیں ۔ خانِ آرزو نے بڑی قابلیت سے ، ہندی فارسی دانوں کی حمایت کی ، لیکن استدلال کہیں نہ کہیں ڈھیلا ہو ہی گیا ۔

اس میں غالب کا نسلی شعور بھی کارفرما ہوا ہوگا ۔ "غالب از دودمان چنگزیم" ان کا نعرہ تھا ۔ مگر اصل میں ایرانی ادب کی برتری کا شعور جس کے وہ آخری وارث تھے ، ان کے اس اعلان کا محرک ہوا ہوگا کہ دیکھنا ہے ، تو میرا فارسی شاعری کو دیکھو ، اردو میں کیا رکھا ہے ، جو زیادہ سے زیادہ فارسی کی خانہ زاد یا کنیز ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم معتقدانِ غالب ، غالب کا یہ فیصلہ تسلیم کریں یا نہ کریں ، جہاں تک قبول عام کا تعلق ہے زمانے نے مجموعۂ اردو کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا ہے اور غالب کی جانبداری کی تائید نہیں کی ۔ غالب کو ایران میں کچھ قدردان ملنے چاہئیں تھے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ایران ، اپنے اتنے بڑے ہوا خواہ کی اب تک قدر نہیں کر سکا ۔ اور ہندوستان میں قدرتی طور پر ، میدان اُن کی اردو کے قبضے میں رہا ــــ فارسی کا ذوق بتدریج زوال پذیر ہوتا گیا ، اور اس کے نتیجے میں ان کا فارسی کلام ایک محدود حلقے کی چیز بن کر رہ گیا ۔ اور اب آہستہ آہستہ حال یہ ہو رہا ہے کہ فارسیت کے زوال کے باعث ، ان کی اردو شاعری سے زیادہ اُن کی اردو نثر مقبول ہو رہی ہے کیونکہ یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے ۔

اس لحاظ سے معاملہ فہم و افہام کا ہوا ــــ یعنی اس قبول و عدم قبول میں وسیلۂ اظہار (MEDIUM) اثر انداز ہو رہا ہے ۔ زبان و بیان کی مشکلات ، فیصلہ کن عنصر بن رہی ہیں ۔ اب اگرچہ یہ عنصر بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ، مگر بحث کی بنیاد نہیں بن سکتا ۔

بحث کی بنیاد یہ ہے کہ قبول و عدم قبول سے قطع نظر ، دونوں زبانوں کے صحیح ادراک کی روشنی میں ، کیا فارسی اور اردو کلام میں وہ فرق ہے یا نہیں جو غالب کو نظر آیا ۔

اصولی بنیادوں پر ، غالب کے اردو اور فارسی اشعار کی روح میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ دونوں طرح کے اشعار کا سرچشمہ ایک ہی ہے ، ہاں فرق اگر ہوگا تو ، دو طرح کا ــــ اول ، اس فضا اور ماحول کا جو فارسی کی ادبی روایت کے ساتھ مخصوص ہے ۔ دوم بیان کی ان صورتوں کا جو فارسی اور اردو میں مختلف ہو سکتی ہیں ۔ فارسی اپنے خاص محاورے میں بات کرتی ہے اور اردو اپنے خاص محاورے میں ــــ ! اور ظاہر ہے کہ ہر ایک قوم کا محاورہ اس کے اجتماعی احوال اور ذوقی اثرات میں پرورش پاتا ہے اور انھیں کے اندر سے نمودار ہوتا ہے ۔ انہی میں پروان چڑھتا اور اظہار و ابلاغ کا آئینہ بن جاتا ہے ۔ اس میں اس قوم کے خاص لہجے ، اس کے خاص اندازِ ذوق و نظر جلوہ ریز ہوتے ہیں ۔ غالب کی فارسی شاعری ، اور اردو شاعری میں یہ دونوں فرق ہونے چاہئیں ۔ غالب کو اطمینان ہے کہ اظہار و ابلاغ کی خاطر ، انھوں نے دونوں زبانوں میں کوشش کی ۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ فارسی

میں وہ کامیاب رہے اور اردو میں انھیں ناکامی ہوئی، لیکن خود یہ امر بحث طلب ہے۔

تسلیم شدہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی دوسری شاعری، اظہار و ابلاغ کی کامیابی کے اعتبار سے ان کی فارسی شاعری سے کسی طرح کم نہیں رہی۔ اردو شاعری کو دو باتوں نے تقویت دی۔ پہلی یہ کہ انھوں نے اردو میں فارسی کے اسالیب استعمال کئے، مگر اس طرح کہ ان کی فارسی شاعری کی روح ہندی قارئین کے لئے زیادہ آسانی سے گرفت میں آنے کے قابل ہوگئی ــــ دوسری وجہ یہ کہ اردو روزمرہ کی آمیزش، ملکی ذوق کے لئے زیادہ گیرائی اور کشش کا موجب بنی۔

فارسی غالب کے لئے اکتساب اور اظہار فضیلت کی زبان تھی اور اردو، جذبوں کی زبان ــــ اردو شاعری دونوں سرچشموں سے مستفید ہوئی۔ خاص و عام ہندیوں کو اس میں اپنی خوبو اور ذوق و ذہن زیادہ روشن اور حسین معلوم ہوا۔ مرزا کی نظر فارسی اسالیب کی عظمت پر جمی رہی، وہ انہی کے اندر، اپنی استعداد اور فضیلت کی اصلی جلوہ گری ڈھونڈھتے رہے، لیکن جذبوں کی زبان، اپنی خاص تاثیر کی بنا پر، بہرحال اپنے لئے مخصوص رتبہ پیدا کر گئی۔ اردو دیوان میں اس روح کی جھلک بھی ہے جو فارسی شاعری میں ہے، اور اردو ماحول کا خاص انعکاس اور اردو معاشرے کی مخصوص فضا بھی۔ اس لئے اردو کے اشعار میں سرور کی کیفیت دوچند ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بہت سے موقعوں پر مرزا کے فارسی کلام کی ذہنیت ان کے اردو کلام کی ذہنیت سے مختلف بھی ہوگئی ہے۔ اس موقعے پر ان کے فارسی اور اردو کے چند ایسے اشعار کا تجزیہ مفید رہے گا۔ جو ہم معنی ہیں، یا جن کے الفاظ بہت حد تک متحد ہیں۔

لالہ و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دلِ غالبؔ ہوسِ روئے تو بود

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

دونوں شعروں کا مفہوم تقریباً یکساں ہے لیکن لفظوں کا انتخاب، اظہار کا پیرایہ، اور فضا مختلف ہیں۔ فارسی شعر میں محض اظہار ہے، اس کے مقابلے میں اردو میں حنا "لالہ و گل" بھی خوب ہے مگر اس میں عمومیت ہے "حنا" سے ایک خاص اور معین تصور وابستہ ہے۔ لالہ و گل سے صرف یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ چہرہ خوبصورت ہوگا۔ مگر حنا سے پاؤں پر لگی ہوئی حنا کی تصویر واضح اور معین ہو جاتی ہے اور یہ تخیل کو واضح راستوں پر چلنے کی تحریک کرتی ہے۔ اس کے بالعکس گل و لالہ مبہم تصور پیدا کرتے ہیں۔

اس کے بعد "طرفِ مزار" اور "مشہدِ عاشق" کا فرق آتا ہے۔ "مزار" میں محض مرنے کا تخیل ہے۔ "مشہد" میں کسی کے ہاتھ سے شہید ہونے کا تصور اور اس کے جملہ متعلقات (خون، شمشیر، اور طشت و تیغ وغیرہ) سامنے آتے ہیں اور تخیل کو بڑے جذباتی راستوں کی طرف راجع کر دیتے ہیں۔ "مشہد سے کوسوں تک" کے مقابلے میں "طرفِ مزار" میں تنگی کا احساس ہوتا ہے اس کے علاوہ مزار کہنے سے جو بے رنگی سی ہو جاتی تھی، شعری مجبوری نے یہ اضافہ کر دیا ہے۔

دوسرے مصرعے میں ہوسِ روئے تو کے مقابلے میں ہلاکِ حسرتِ پابوس کی ترکیب کتنی شدید تمنّا اور گہرے جذبہ کا اظہار کرتی ہے۔ ہوس اور حسرت کا فرق ظاہر ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ مجھے "تیرے چہرے کی ہوس" تھی، ایک بے کیف طریقۂ اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں "ہلاکِ حسرتِ پابوس" (پابوسی کی حسرت میں مرتا ہوں) موثر پیرایۂ بیان ہے۔

اردو شعر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ عاشق کی شہادت کا خون جہاں جہاں بہہ کر گیا، وہاں ہر طرف دور دور تک حسرتِ پابوس جاگ اٹھی۔ اس حسرتِ پابوس نے حنا کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ عاشق کی شہادت گاہ سے کوسوں دور تک حنا اُگ آئی ہے۔ اس سے عاشق کی حسرتِ دل ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ محبوب کے حنائی پاؤں کا نقش عاشق کے دل میں کس طرح کھبا ہوا تھا کہ مرنے پر بھی اس کے آثار نہ صرف ابھر آئے بلکہ دور دور تک پھیل گئے۔

پابوس کی عبارت کے ساتھ مشہد کا لفظ بے حد مناسب ہے۔ بیان کے انداز نے بھی تاثیر پیدا کی ہے، کس قدر کے بعد، یارب، کا کلمۂ دعائیہ (جو یہاں کلمۂ استعجاب و حیرت ہے) فراوانی، وسعت، شدت کا اظہار کر رہا ہے "یارب" کے استعمال سے بلاغت پیدا ہو گئی ہے (جو فارسی کے "چہا" میں نہیں، اگرچہ اپنی جگہ وہ بھی خوب ہے)

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے، کہ فارسی کا شعر، شاعرانہ مفروضے کی کمزور سی صورت ہے، اس میں واقعہ یا معاملے کا موضوع خود غالب ہے، جس نے اپنی زبان سے اپنے مزار کا ذکر کر کے اس پر لالہ و گل اُگائے ہیں۔ یہ فرضی صورت کوشش کے باوجود، باور نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض خواب ہے یا آئندہ کا تصور کہ شاعر جیتے جی اپنی قبر کو خود دیکھ رہا ہے اس سے ہمارے واقعاتی اعتماد کو ذرا سا دھکا لگتا ہے۔ بخلاف اس کے اردو شعر میں کسی شہید عاشق کا واقعہ بیان ہوا ہے، جیسے ایک راوی بیان کر رہا ہے ـــــ اس سے ہمارے اعتماد کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ فارسی شعر میں صیغۂ متکلم نے شعر کی فضا بگاڑ دی ہے۔ اردو شعر میں راوی کے بیان نے یقین پیدا کر دیا ہے۔

کفِ خاکیم از ما برنخیزد جز غبار آنجا
فزوں از صرصرے نبود، قیامت خاکساراں را

بجز پرواز شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

دونوں شعر خوب ہیں ، مگر اردو شعر میں کیا باقی رہا ہوگا ؟ کا استفہامیہ انداز اور اس کا تیکھا پن ، قیامت کا اثر بہ کر گیا ہے ۔ " از ما بر نخیزد جز غبار آنجا " میں سلبیت ہے ، تیکھا پن پیدا نہیں ہوا ۔ فارسی شعر میں خاکساروں کی خاک ہے ، اردو شعر میں شہیدوں کی تڑپ اور جذبے کی گرمی (اور تندی) ہے ۔

گر بیائی مست ناگہ از درِ گلزارِ ما
گل ز بالیدن رسد تا گوشۂ دستارِ ما

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

فارسی شعر میں کہیں کہیں ابلاغ کی رکاوٹ ہے ۔ پہلا مصرع نہایت مضطرب ہے ـــ بیائی ، ناگہ ، از درِ گلزا مقصود صرف اتنا ہے کہ اگر تو کبھی باغ میں آ نکلے تو پھول اپنے جامے میں پھولے نہ سمائے اور اتنا بڑھے کہ میر گوشۂ دستار سے خود آ لگے ۔ مگر ذوقِ سلیم کہتا ہے کہ اس کے لئے تو محبوب کا محض آ جانا ہی کافی ہے ، اسے مسـ قرار دینے کی کیا ضرورت تھی ۔ پھر ، ناگہ کا لفظ بھی کھٹکتا ہے ، اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر وہ باغ میں اچا نہ آئے ۔ تو گل پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوگی ، حالانکہ شاعر کا یہ مدعا نہیں ، محبوب تو جب بھی اور جس طرح گلزار میں آئے ، اچانک ہو یا اہتمام سے اس کو دیکھا ۔ گل اترائے گا ۔ اور اپنی قسمت پر نازاں ہوگا ۔

اردو شعر میں صرف گل ہی پر نہیں ، بلکہ محبوب کے آنے کا اثر سارے باغ پر ظاہر کیا ہے ۔ اس میں گل شامل ہے ـــ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ محبوب چمن میں جائے تو گل کے سوا اور کوئی چیز متاثر نہ ہو ۔ اردو شعر میں بلاغت ہے اور بتایا ہے کہ محبوب کو دیکھ کر چمن میں ایسا ولولۂ حیات پیدا ہو جاتا ہے کہ پھول اپنی ڈنڈیوں سے بڑ خود بخود گوشۂ دستار تک (کہ ان کی منزل ہے) پہنچ جاتے ہیں ۔ اردو شعر میں " بسکہ " اور " خود بخود " ـــ ان دا نے ، اظہار کو کامیاب تر بنا دیا ہے ،

دیگر ز سازِ بے خودئی ما صدا مجو
آوازِ ے از گسستنِ تارِ خودیم ما

نہ گلِ نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

دونوں اشعار تقریباً ہم مضمون ہیں ۔ لیکن جو بات " میں ہوں اپنی شکست کی آواز " میں ہے ، وہ " آوازے ر ا

گسستنِ تارِ خودیم ما، میں نہیں۔

ازجوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نماند
غیرت ہنوز طعنہ بفرہاد می زند

عشق و مزدوریٔ عشرتگہہ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

'کیا خوب' نے کیا بات پیدا کی ہے! ـــ 'مزدوریٔ عشرت کدۂ خسرو' کا کھلا وار بھی فارسی شعر میں موجود نہیں۔

باز گشتے نبود گر ہمہ ہوشم بخشند
راہِ صحرائے خیالِ تو چو مستاں رفتم

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

فارسی شعر میں 'گر ہمہ ہوشم بخشند' زاید سا معلوم ہوتا ہے۔

دریوزۂ راحت نتواں کرد ز مرہم
غالب ہمہ تن خستۂ یار است، گدا نیست

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب! اُسے قسمت میں عدو کی

ناکس ز تنو مندیٔ ظاہر نشود کس
چوں سنگِ سرِ رہ کہ گران ست و گراں نیست

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

در آغوشِ تغافل عرضِ یکرنگی تواں دادن
تہی تا کی کنی پہلو، بما بنمودہ جا را

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے

یہ تھوڑے سے اشعار، مکمل دیوانوں کی نمائندگی تو نہیں کر سکتے، لیکن ان سے چند نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی اشعار میں، فارسی کے مشہور اسالیب کی پیروی صاف صاف معلوم ہوتی ہے۔ غالب اس پیروی کے ساتھ ساتھ اپنا انفرادی مضمون نکال لیتے ہیں۔ مگر انفرادی لہجہ نہیں پیدا کر سکتے — انفرادی لہجہ روزمرّہ کی باریکیوں کے اندر سے ابھرتا ہے — اور روزمرّہ پر کامل قدرت اہلِ زبان کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ مذکورہ بالا اشعار کے یہ جملے دیکھیے۔

شعر ۱ میں	کس قدر، یارب ……
شعر ۲ میں	کیا باقی رہا ہوگا ……
شعر ۳ میں	خود بخود پہنچے ہے ……
شعر ۴ میں	کیا خوب
شعر ۵ میں	مستانہ طے کروں ہوں ……
شعر ۶ میں	لکھ دیجیو یارب ……

ان میں روزمرّے نے تیکھا پن پیدا کیا ہے۔ اسی لئے مقابلے کے فارسی اشعار اس چبھن اور گہرائی سے محروم ہیں جو بات ان چند اشعار کے متعلق کہہ رہا ہوں، شاید یہی فارسی اردو کے مکمل دیوانوں کے بارے میں بھی غلط نہ ہو (اگرچہ ایسی رائے کے اظہار سے دل ڈر جاتا ہے) بہرحال یہ اپنا اپنا احساس ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود غالب نے، اپنی فارسی کے بارے میں جو اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ دراصل ان کے تصورِ شعر کے باعث ہے کہ وہ فارسی کلام میں وہ خوبیاں دیکھتے ہیں، جو انھیں اپنے اردو شعر میں نظر نہیں آئیں، ایک جگہ ظہوری کے متعلق فرماتے ہیں :-

"یہ لطائفِ معنوی اس بزرگ کے حصے میں آئے ہیں، میں جانتا ہوں مشتری و عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی، اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا — قالبِ معنی کی جان ظہوری، ناطقہ کی سرافرازی کا نشان ہے ظہوری"

(عودِ ہندی)

کلیات فارسی کے خاتمے میں، ظہوری کے علاوہ طالب آملی، عرفی شیرازی، اور حزیں کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہیں کہیں صائب، کلیم، جلال اسیر اور بیدل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض کی غزلیات کے جواب میں غزلیں بھی کہی ہیں۔

میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ فارسی میں ان کے یہاں ان بزرگوں میں سے خاص طور سے کسی ایک کا رنگ نہیں ملتا۔ بلکہ یہ امتزاج ہے مغلیہ دور کی ساری شاعری کا۔ تاہم خاص طور سے ظہوری کا تجمل اور نظیری کی معاملہ بندی، ان کے یہاں منعکس ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ مرزا کی ذہانت اور اکتساب ہے جس نے فارسی میں انھیں کامیاب بنایا۔ فارسی شعر میں گہرے جذبوں کی تصویر کھینچنے میں انھیں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اُردو ان کی اپنی جائیداد ہے؛ اس پر ان کا تصرف کامل ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ محض ایک لفظ کے استعمال سے اِدھر یا اُدھر کرنے سے بھی بات اور کی اور ہو جاتی ہے۔

اسی وجہ سے فارسی شاعری میں، ان کا رجحان زیادہ تر فکری و اخلاقی حقائق کے بیان کی طرف ہے۔ گہرے جذبوں کی باتیں کم ہیں۔ فارسی کلام میں دل کی واردات کے مقابلے میں خارجی باتیں جگ بیتی زیادہ ہیں۔ نظیری کی معاملہ بندی کے پیرو ہو کر محبوب کی رفتار و گفتار کی حکایتیں بھی اچھی بیان کی ہیں، ان کے دہاں ظہوری کی بلند پردازی کا جواب بھی اکثر و بیشتر ہے۔ مگر گہرے جذبے کم اُبھر سکے ہیں۔ پہلے دور کا اردو کلام، جلال اسیر اور شوکت بخاری کا ہم آواز اور بیدل کی پیچیدگی اور بلند خیالی کا حامل ہے۔ لیکن دوسرے دور میں غالب نے روزمرہ کو وسیلہ بنایا اور دل کی باتیں اپنی زبان میں کہیں، ان کی یہ باتیں اپنے ہمراہ فارسی کے بھی سب اکتسابات لئیں۔ لیکن اس مرتبہ بہرحال غالب اپنی زبان میں بول رہے تھے۔ نظیری و ظہوری اور بیدل کی نمائندگی نہیں رہے تھے۔

میرے نزدیک تو غالب کے فارسی اور اردو کلام میں روح مضمون (تجربے) کا بھی فرق ہے لیکن یہ میرا قیاس ہے، کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لئے مزید مطالعہ درکار ہے، مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے فارسی کلام میں عزم اور حوصلے کی باتیں کچھ زیادہ ہیں۔ بلاکشی اور خار اشگافی، خطر طلبی اور ہنگامۂ انقلاب کی للکار اور دعوت یاد ہے۔

این چہ شوریست کہ از شوقِ تو در سر دارم
دلِ پروانہ و تمکین سمندر دارم
آہم از پردۂ دل بے تو شرر نپذیرد
شیشہ لبریز مے و سینہ پر آذر دارم

اے متاعِ دو جہاں رنگ بعرض آوردہ
ہاں، صلائے کہ ازیں جملہ دلے بردارم

جاں درغمت فشاندن مرگ از قفا ندارد
تن در بلا فگندن بیمِ بلا ندارد

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار، نندیشم
وگر ز شاہ رسد، ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں، سخن نہ کنیم!
وگر خلیل شود، میہماں بگردانیم

صبح است، خیز تا نفسے درہم افگنم
از نالہ لرزہ در فلکِ اعظم افگنم
آتش فرو نشاند، نم دامنم، بیا!
کایں دلقِ نیم سوختہ در زمزم افگنم

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
ہنگامہ را جحیم جنوں بر جگر زنم
اندیشہ راہوائے فسوں در سر افگنم

چہ ذوقِ رہروی آنرا کہ خارخارے نیست
مرو بہ کعبہ، اگر راہ ایمنے دارد

تا بادہ تلخ ترشود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

داغیم زگلشن کہ بہارست و بقا، ہیچ
شادیم بہ گلخن کہ خزاں است و خزاں نیست

دلم اے شوق! زآشوب غمے نکشاید
فتنۂ چند زہنگامہ ستانے بمن آر

پرسد ز ذوقِ گرم رویہا د خامشم
دوزخ کجاست تا برہ ہمدم افگنم!

رَو، تن بلادہ کہ دگر بیم بلا نیست
مرغے قفسے کش مکش دام نداند

گرچہ غالب کی شخصیت اردو میں طبع آزمائی کرتے وقت بدل نہیں جاتی، پھر بھی روح مضمون کا ملاً وہ نہیں رہتی، جو فارسی شاعری میں ہے۔ اردو شاعری میں طنطنہ کہیں کہیں ہے۔ مگر عام طور سے وہ گرمی و ہنگامہ اور جوش و خروش نظر نہیں آتا جو فارسی شاعری میں ہے یہاں تک کہ اردو کی ابتدائی شاعری میں بھی کہ سنت فارسی زدہ ہے، پیچیدگی تو ہے، مگر جوش و خروش اور خطر طلبی اور ہنگامہ جوئی نہیں۔

اردو شاعری، مذکورہ استثنائی مواقع کے سوائے، زندگی کے انقلابات اور خطرات و مصائب پاش پاش کردینے کے دولوں سے تقریباً خالی ہے۔ ہاں بلند خیالی، وقار، تمکین، عزتِ نفس کے بالات موجود ہیں۔ پھر بھی یہاں ضعف، شکست، جھکاؤ، درد اور فرطِ گریہ، سیلاب اور سیلِ غمہا، صبر و شکیب، وضع احتیاط، ناامیدی کی مدھم افسردگی یا پھر محبت کے جذبات و تاثرات اور جوش سے

زیادہ درد کی مٹھاس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب پھر غالب ہے۔ اور یہ شعر غالب ہی کے ہیں۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

بندگی میں بھی وہ آزادہ وہ خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جگر تشنۂ آزارِ تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے، یارب!
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

ہرچند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے
ہرچند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں
جاں مضطرب ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں!
خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

ن غزلوں میں اور اس قسم کے اشعار میں فارسی شاعری کا طنطنہ پایا جاتا ہے۔ لیکن، اردو میں ایسی غزلیات
ور اشعار زیادہ ہیں، جن میں گھلاوٹ، درد، اذیت اور شکستگی بلکہ ضعف، حسرت اور افسردگی کی فضا ہے

مثلاً، اس پوری غزل کو دیکھئے جس کا مطلع ہے:-

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

یا یہ غزل ؎

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیوں کر ہو

یا یہ غزل ؎

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

یا یہ غزل ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا ؟

یہ تفاوت کیوں ہے؟ بہرحال یہ غالب کی شخصیت میں نہیں، بلکہ ان کے وسیلۂ اظہار اور متعلقہ زبان کے مختلف ادبی اسالیب کی وجہ سے ہے۔ فارسی شاعری پر جہانگیری اور اکبری دور کے اسالیب کا اثر ہے، جن کی پیروی پر غالب کو فخر تھا۔ ان اسالیب میں طنطنہ اور رعب و داب جزو لازم ہے۔ ان میں شگفتگی اور ضعف کے عناصر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ قصیدہ تو خیر قصیدہ تھا۔ اس دور کی فارسی غزل بھی قصیدے کی آواز و آہنگ کی نقل کرتی ہے۔ عرفی کی گرمیٔ گفتار کو کون نہیں جانتا، نظیری حالانکہ محبت کی میٹھی میٹھی باتوں کا شاعر ہے۔ مگر اس نے بھی صاف کہدیا ؎

دلم از زمزمۂ مرغِ چمن نکشاید
گوش بر قہقہۂ دامنِ کہسار کنم

گریزد از صفِ ما، ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

اور فیضی کا تو سارا کلام خنجر و شمشیر کی نمائش گاہ ہے۔ یہ فاتح لوگوں کے شاعر تھے۔ یہ مری ہوئی اور ڈھیلی آوازوں سے بر افروختہ ہوتے تھے۔ ان کے لئے، تند و تیز اور توانا خیالات اور آواز ہی مناسب

تھی ۔ غالب اگرچہ زمانۂ انحطاط کے شاعر تھے ۔ مگر انھوں نے مغلوں کی اسی جلالی اور قاہرانہ اسپرٹ کا احیاء کرنا چاہا ۔ اسی لئے ان کی فارسی شاعری میں ایک طنطنہ ہے ۔

اردو میں غالب نے پہلے بیدل کی پیچیدگی اور دقت کو داخل کرنا چاہا ۔ پھر ناسخ کی مضمون آفرینی اور لفظی عمارت گری کو اپنانے کی کوشش کی ۔ پھر فارسی اختیار کر لی ۔ لیکن جب زمانے نے دوسری مرتبہ اردو شاعری کی طرف راغب کیا تو اب انھیں قلعۂ معلیٰ کے سامعین کے لئے شاعری کرنی تھی جس کی خصوصیت نرم نرم لہجہ ، دھیمی دھیمی آواز ـــــ طنطنے سے زیادہ ، جذبات کی سپردگی اور گداز اور گھلاوٹ تھی ۔ اسی لئے غالب نے اس نئی فضا میں جو شاعری کی ، اس کی نوا ، ان کی فارسی شاعری کی نوا سے خاص مختلف ہے ۔

اس کے علاوہ زبانوں کے اجتماعی مزاج کا فرق بھی بڑی اہم بات ہے آخر علامہ اقبال کو اردو ترک کر کے فارسی اختیار کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا تھا ۔ بے شک اسلامی بین الاقوامی مخاطبوں تک پہنچنے کا جذبہ بھی محرک ہوا ہوگا ۔ مگر فارسی زبان میں صدیوں کے اثرات کے تحت جو " جہریت " پیدا ہوگئی ہے ، اور جو اس زبان میں ہندی زبانوں کے مقابلے میں از خود بھی زیادہ ہے ۔ وہ بھی ضرور اثر انداز ہوتی ہوگی ۔ اقبال چاہتے تو ، مولانا حالی بن سکتے تھے ۔ مگر اقبال کو حالی کی مرثیت اپنی نوا کے لئے موزوں معلوم نہیں ہوئی ؛ انھیں اس سے توانا تر آواز کی ضرورت تھی ۔ اس لئے انھوں نے فارسی میں زیادہ لکھا ۔ ہندی زبانیں جن کے اختلاط سے اردو بنی ہے ، مادرانہ (نسائی) جذبات کی زبانیں ہیں ۔ حکمت کی کہانیاں ، سوز و گداز ، سپردگی ، دل شکستگی ، ہجر کی آنچ اور دھواں ، محبت کے میٹھے میٹھے معاملات ، گیت اور دوہے ، جوگیوں ، سیلانیوں کے دردمندانہ بول ان زبانوں میں خوب ادا ہوتے ہیں ۔ فارسی ، عربی سے کم مگر اردو سے زیادہ پدرانہ ، اور قاہرانہ آواز اور لہجوں کی زبان ہے ۔ اس میں کھڑے الف ، کھڑی ہوئی ی (معروف) اور لمبی و (معروف) کی آواز والے الفاظ شاید زیادہ ہیں ۔ اردو میں ٹ ، ڈ ، ٹ وغیرہ تو کرخت آوازیں ہیں ، لیکن زبان کی ترکیب میں کام آنے والے لفظوں میں ، نیم کھچے ہوئے یا بند لفظوں سے اظہار کا کام زیادہ لیا جاتا ہے ۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں ، فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شعر غالب کے ہیں اور ان میں فارسی آمیز اردو زبان استعمال کی گئی ہے، لیکن زبان کی جذباتی فطرت اور اس کی فضا کا اصلی مزاج یہ تقاضا کر رہا ہے کہ "بند لفظ" زیادہ سے زیادہ استعمال ہوں۔ "بند لفظوں" سے مراد یہ ہے کہ ان کے تلفظ کے لئے منہ کو زیادہ کھولنا نہ پڑے (ان کے مقابلے میں "آ" "تمنا"، "تقاضا" بند نہیں بلکہ کشیدہ الفاظ ہیں۔ ان میں الف کشیدہ ہے اور اس کے ادا کرنے کے لئے منہ کو خاصا کھولنے کی ضرورت ہے) پہلے شعر میں دیکھئے۔

پر بند

تو بند

خور بند

سے کشیدہ ہے، لیکن پڑھنے میں نیم کشیدہ

ہے کشیدہ ہے

شب بند

نم بند

کو کشیدہ ہے، مگر پڑھنے میں نیم کشیدہ ہے۔

فنا اس میں نا کشیدہ ہے —— کی کشیدہ ہے

تیغ بند —— لی کشیدہ —— م بند

اسی طرح تجزیہ کرتے جائیے، تو محسوس ہوگا کہ "بند الفاظ" خاصا حصہ لے رہے ہیں۔ کشیدہ کم ہیں، جو ہیں وہ بھی کھل کر کشیدہ نہیں۔ اس سے قدرتی طور پر رکاوٹ اور ضبط کا احساس ہوتا ہے؛ اور تجربات کے اظہار کی لہر اور پیمانے کا پتہ دیتا ہے۔ بہرحال فارسی شاعری کی پرخروش نوا، اس میں منعکس نہیں ہوتی۔

ممکن ہے، میرا یہ تجزیہ بعض احباب کی نظر میں مضحکہ خیز ہوگا۔ اس طرح زبان کی اجزائی تشریح سے، اظہار کی صورت کے سمجھنے میں مدد مل سکنے کی کم از کم مجھے توقع ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غالب کے فارسی اور اردو کلام میں زبان اور اس کی ساخت کا فرق کا بھی بڑا حصہ ہے۔ فارسی میں عالی خیالات اور ہنگامہ آفریں احساسات نے جگہ پائی ہے، تو اردو میں جذبات زیادہ کامیابی سے ظاہر ہوئے ہیں، اور انھوں نے ان میں قدرت دکھائی ہے۔ روزمرہ کی چاشنی کے علاوہ مانوس جذبوں کے بیان نے ان کے اردو کلام کو زیادہ مقبول بنایا ہے۔ اور ان کا یہ احساس کہ ان کی فارسی ہی سب کچھ ہے، کاملاً غلط نہیں — کسی حد تک ضرور غلط نکلا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان کی فارسی کو حقائق فکری کے بیان میں بجا طور سے بلند مقام حاصل ہے۔ (نذر عرشی۔ باجازت مصنف)

سیّد قدرت نقوی

جہانِ غالبؔ

مشہور افسانہ نگار کوثر چاند پوری نے "جہان غالب" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ ظاہر ہے کہ افسانے اور ناول کا میدان اور ہے، تحقیق و تنقید کا میدان اور۔ تحقیق و تنقید میں جس ژرف نگاہی اور محنت کی ضرورت ہے، وہ ایک افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے اس کتاب کے ابتدائیہ میں جن امور کا ذکر کیا ہے۔ پوری کتاب میں ان کی تردید موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر قباحت کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اپنے خیالات و اعتبارات کی خود ہی تغلیط کر دی جائے۔ کتاب کا پیش لفظ اس طرح شروع کیا ہے۔

"اگر شاعری کو ایک کہکشاں تسلیم کر لیا جائے تو اس کا سب سے زیادہ شوخ اور حسین رنگ "غالب" کو ماننا پڑے گا۔

غالب شعر و ادب کے افق پر ابھرتا ہوا ایک ایسا آفتاب ہے جس کی روشنی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے، آئندہ بھی اس کی تنویریں بکھرتی رہیں گی، اور رنگ ابھرتے جائیں گے، عشق و محبت کا سوز، ظرافت اور زندہ دلی کی دل کشی، غم واندوہ کی عکاسی، اسلوب بیان اور پیرایہ اظہار کی ندرت، نئی ترکیبیں، نادر تشبیہیں، قدیم اور فرسودہ طرز گفتار سے اجتناب، یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کر کے بہت اونچی جگہ کھڑا کر دیتی ہے ..... درحقیقت غالب اردو شاعری کا ایسا ستون ہے جس کی رفعت آسمان پر طنز کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" (ص۵) پورا پیش لفظ پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف میزان عدل کو قائم رکھے گا مگر مصنف نے اس "رفعت" اور "اونچی جگہ" کا انجام یہ دکھایا ہے:

"اگر رجائیت کو روشنی اور قنوطیت کو تاریکی فرض کر لیا جائے اور اس سے انکار ممکن بھی نہیں کہ ان دونوں میں یہی نسبت پائی جاتی ہے تو اس حقیقت کا تجسس ایک ادبی فریضہ بن جاتا ہے کہ غالب ہمیں روشنی زیادہ دیتے ہیں یا ذہن میں جلتے ہوئے چراغ بجھا کر تاریکی میں اضافہ کر دیتے ہیں" (ص۲۵)

اور نتیجہ تجسس کتاب کے آخر میں یہ پیش کیا ہے۔

"ایسا ادب جو غم اور مسرت کے باہمی امتیاز کو مٹا ڈالے اور آلام کے ساتھ مسرتوں کو بھی ناقابل التفات قرار دے وہ زندگی کا ادب نہیں اور جس ادب کو زندگی سے رابطہ نہ ہو اس کی کوئی اہمیت نہیں، غالب کا یہ نظریہ حیات کسی وقت بھی قابل تسلیم نہیں، تاریکی اور روشنی کے درمیان فرق ہمیشہ باقی رہے گا جو شاعر اسے فنا کرنا چاہے وہ بصارت و بصیرت دونوں سے خالی سمجھا جائے گا۔" ص۲۱۳

اور یہ نتیجہ ان شعروں سے اخذ کیا ہے:

بروزِ شادی وانده دل منه که قضا — چو قرعه بر نمط امتحاں بگرداند
یزید را به بساط خلیفه بنشاند — حکیم را به لباسِ شباں بگرداند

در حقیقت ان شعروں کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ غالب ان شعروں میں خوشی اور غم کا منکر نہیں اور نہ ان کا امتیاز ختم کر رہا ہے بلکہ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ شادی و غم دونوں سے امتحان لیا جاتا ہے۔ اور انسان کی فطرت ظاہر کی جاتی ہے۔ یزید کو مسندِ خلافت ملی، آپے سے باہر ہو گیا اس کے ظرف کی کوتاہی تھی کہ متحمل نہ ہو سکا مردود درگاہ ہوا۔ جنابِ موسیٰ کا امتحان گلہ بانی سے لیا گیا۔ انھوں نے اپنا فرض بطریقِ احسن ادا کیا محبوب ہوئے اور مراتب اعلیٰ کو پہنچے۔ ان دونوں کو حقیقت یا زندگی کے اصل اصول کا مرتبہ نہیں دینا چاہیے۔ ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ان کے نتائج کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

پوری کتاب میں اسی طرح کی تاویلات ملتی ہیں جن سے غلط مطلب نکالا گیا ہے۔ اور غلط انداز میں اس لئے سوچا گیا ہے کہ غالب کے حالات اور اس کی تصنیفات پر مصنف کو عبور نہیں۔ چنانچہ حالات کے سلسلہ میں متن کا دوسرا ہی ورق (صلا) قاری کو حیرت میں مبتلا کر دے گا:

"ان کے اسلاف فوج سے تعلق رکھتے تھے جو شمشیر وسناں اور گرز و تبر سے اپنی مردانہ صفات کا ثبوت دیتے رہے۔ اس خاندان کے مختلف افراد، ایک صدی تک خاک و خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ غالب نے بڑے فخر سے اس کا ذکر کیا ہے ذاتی طور پر انھیں 'شاعری' کے ذریعے امتیاز حاصل ہوا تھا مگر انھیں اپنے اجداد کی سو سالہ سپہ گری پہ ناز تھا۔ جو انھیں معاصرین سے ممتاز کرتی تھی ہے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری ؛ کچھ شاعری ہی باعثِ عزت نہیں مجھے

اسی شمشیر پسند اور جنگ آزما ماحول ہی کا اثر ہے کہ غالب نے قلم کی عظمت کو ابھارنے کے لیے دشنہ و خنجر کی چمک دمک کو بھی شامل کر لیا حالانکہ ان کے اسلاف کی تیغ اصفہانی خود ان کے غلاف میں آکر بالکل کند ہو گئی تھی"

پیش لفظ پڑھنے سے جو احساس ہوا تھا کہ مصنف میزانِ عدل کو قائم رکھے گا، کتاب کا مطالعہ اس احساس کو صحیح ثابت نہیں کرتا مندرجہ بالا اقتباسات مصنف کی علمیت، سخن فہمی، تاریخ دانی کی قلعی کھول دیتا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ غالب کا یہ مشہور شعر بھی صحیح نقل نہ ہو سکا مصرعِ ثانی میں "ہی باعث" نہیں ہے بلکہ "ذریعہ" ہے۔ تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ "سو پشت" کے معنی "سو سال" لیے گئے ہیں جو پشت کے معنی سے نابلدی کی دلیل ہے۔ "ایک صدی تک خاک و خون کی ہولی کھیلتے رہے" اور "اسی شمشیر پسند و جنگ آزما ماحول ہی کا اثر ہے" یہ جملے ان کی معلومات اور رزم باندانی کے آئینہ دار ہیں۔ اور اسلاف کی تیغ اصفہانی کو کند بتانا تاریخ سے عدم واقفیت کی دلیل اس لئے ہے کہ باپ اور چچا دونوں آخری عمر تک فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ باپ میدانِ کارزار ہی میں کام آئے اور چچا بھی کسی مہم کے دوران میں ہاتھی سے گر کر وفات پا گئے۔ تاریخی واقفیت کی ایک اور مثال:

"غالب کی شراب نوشی ان کے امیرانہ ماحول ہی کی خصوصیت تھی انہیں بزرگوں نے اس طرح تو نہ پلائی ہو گی۔ پھر بھی انہوں نے دوسروں کو پیتے دیکھا ہو گا ان کے خاندان میں یہ کوئی اہم بات ہو یا نہ ہو، ان کے خسر غلام حسین خان کے کنبہ کی روایات قطعی مختلف تھیں۔ ان ہی کا عکس

"امراؤ بیگم کی مذہبیت میں آخر تک موجود رہا۔" (ص۱۹)

غلام حسین خان کو غالب کا خسر بتانا انتہائی عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ غلام حسین خان غالب کے نانا تھے اور غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف تھے۔ اسی لئے تو احساس ہوتا ہے کہ ایک افسانہ نگار تحقیق و تنقید کے میدان میں انتہائی ناکام ثابت ہوتا ہے۔ یہ چند مثالیں اس لئے پیش کر دی گئی ہیں کہ کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اس قسم کی باتیں اس میں بکثرت موجود ہیں کہاں تک مثالیں دی جائیں کوئی صفحہ لغزش سے خالی نہیں ہے۔ مصنف سے جو قدم قدم پر لغزشیں ہوئی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ دوسروں کی کتاب سے مستعار ہے خود ان مباحث کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی لئے اقتباسات کی بہتات ہے اور وہ بھی اس قسم کے ہیں جن سے منفیانہ رجحان کو تقویت حاصل ہو۔ چنانچہ ہر باب میں ان کی کثرت کھٹکتی ہے۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مصنف نے دوسروں کے اخذ کردہ نتائج کو بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔ خود تحقیق کی زحمت اس لئے گوارا نہیں کی کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا۔ اسے صرف ایک دھن رہی ہے کہ غالب کے سر زیادہ سے زیادہ الزامات لگائے خواہ وہ کسی نے غلط ہی عاید کر دیئے ہوں مثلاً غالب کے خط کا یہ اقتباس ہے:

"آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے تجہیز و تکفین کے واسطے رامپور سے بھیجے ہیں فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا۔"

پورے خط کا اقتباس اور اس پر اظہار خیال کلاسکی ادب سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے اپنی سمجھ سے مباحث کو حل کرنے کا کام نہیں لیا فاروقی صاحب نے اس خط کو مفتی جی کی زوجہ کے کام میں رکاوٹ خیال کرنے میں غلطی کی ہے۔ سب سے پہلے یہ خط آج کل فروری ۵۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے حاشیہ نگار (غالباً مختار الدین آرزو) نے ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہیں سے فاروقی صاحب نے لیا۔ یہ نقل در نقل والی بات کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے تھا۔ مولانا مہر نے اس کی تردید خطوط غالب (طبع ثانی) میں کی ہے۔ مصنف نے اس کو نہیں دیکھا ورنہ حقیقت واضح ہو جاتی۔ اگر یہ خود بھی غور کرتے تو بات بالکل واضح تھی کہ رکاوٹ اس وقت ہوتی کہ روپے بھیجے نہ گئے ہوتے روپے پہلے آ چکے ہیں اس امر کو بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے بطور مثال پیش کرنا رکاوٹ کا سبب نہیں ہوتا۔ اگر آئندہ عبارت کو رکاوٹ پر محمول کیا گیا ہے تو بھی غلط ہے کیونکہ وہاں بھی یہی امر کہ مفتی صاحب کی بیوہ کی کفالت کے لئے ابھی تک امداد موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ نے مدد فرمائی ہے تو آپ مجھ سے نادار اور بے وسیلہ کی بھی مدد فرمائیں گے یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مفتی جی کی بیوہ کی مدد نہ کیجئے۔ مگر جب ذم کا پہلو نکالا جائے تو اسی قسم کی باتیں فرض کر لی جاتی ہیں۔

غالب کی تحریروں کے اقتباسات کا صحیح ماخذ مصنف کی نظر میں نہیں: (ص۱۲۱، ۱۲۲)

"اسی طرح مسٹر اسٹوارٹ ریڈ نے غالب سے اردو قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تھی انھوں نے شیو نرائن کو خط میں لکھا:

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے،

پھر انہی کو لکھتے ہیں:

"میاں اردو کیا لکھوں میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو،

تیسری مرتبہ تحریر فرماتے ہیں۔

"بھائی تم غور کرو۔ اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا"

اس کے ماخذ کی نشاندہی میں کتاب کا نام "غالب از قتیل" لکھا ہے۔ حالانکہ غالب کے متعلق قتیل نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ دراصل کتاب کا نام "غالب اور قتیل" ہے۔ اسی کتاب کے نام سے مولانا نیاز (مرحوم) بھی التباس کا شکار ہوئے تھے، انھوں نے بھی لکھ دیا تھا کہ قتیل نے غالب کی غلطیاں نکالی ہیں۔ کوثر چاند پوری نے جس عبارت کے لئے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ درحقیقت اردوئے معلیٰ کی ہے اگر اردوئے معلیٰ یا خطوط غالب پیش نظر ہوتے تو لفظ "قصیدہ" استعمال نہ کرتے کیونکہ ریڈ صاحب نے قصیدہ لکھنے کے متعلق نہیں لکھا تھا بلکہ نثر کی فرمائش کی تھی جس کا ذکر اس خط سے پہلے کے خط ۱۳ میں موجود ہے (خطوطِ غالب ص۲۳۲) نیز انھیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ جس عبارت کو "پھر تیسری مرتبہ تحریر فرماتے ہیں" کہ عنوان سے پیش کر رہے ہیں پہلی عبارت ہے۔ اور اسی خط کی ہے جس میں نثر کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو شخص مصنف کی اصل تحریر کو دیکھے بغیر محاکمہ کرنے بیٹھ جاتا ہے وہ ایسی ہی لغزشوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور جا و بے جا تہلم تراشی سے کام نکالنا ہی تحقیق سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح کی لغزشیں غا[لب] کی وطن پرستی والے عنوان میں ہیں مثلاً: (ص۱۳۵)

"انھوں نے اس وطنی لڑائی کے جانباز سپاہیوں کو "روسیاہ کالوں" کا خطاب دیا۔۔۔ ایک جگہ نثر میں لکھتے ہیں۔

"کوئی یہ نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں انگریز قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے کوئی میرا امیگر تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"

اس بیان کو وطن دوستی کے منافی قرار دیا گیا کہ اس سے انگریزوں سے والہانہ عقیدت کا اظہار ثابت ہوتا ہے، لیکن کتنی بڑی ناانصافی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہندوستانیوں کی محبت میں لکھا گیا ہے اس کو عمداً چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ وہ بیان غالب کو الزام سے بری قرار دیتا ہے۔ دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کو بھی پیش کرتے اور صحیح نتیجہ نکالتے وہ یہ ہے:

"ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا" (اردوئے معلیٰ لاہور ص۹۱)

"جہان غالب" میں انگریزوں سے متعلق عبارت مولانا مہر کی تصنیف "غالب" سے لی گئی ہے مولانا مہر نے پوری عبارت یعنی "کوئی نہ سمجھے" سے "رونے والا بھی نہ ہوگا" تک نقل کی ہے مگر مصنف نے عمداً ہندوستان سے متعلق حصہ کو نظر انداز کیا ہے مولانا مہر نے "دوستوں کی مفارقت" کے زیر عنوان اور بھی اقتباسات دیئے ہیں جن سے وطن دوستی اور ہندوستانیوں کی موت یا جدائی پر اظہار افسوس ملتا ہے دیانت مقتضا تھا کہ ہر پہلو پر نظر رکھی جاتی آن کو صرف نظر کرنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ مصنف نے انصاف سے کام نہیں لیا بلکہ کسی خاص جذبہ کے تحت یہ کتاب [لکھی]

لہ مولانا مہر کی تصنیف "غالب" کے حوالے میں ص۲۶۷ لکھا ہے مگر دوسرا اور تیسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جن کے صفحات ص۲۶۰ پر یہ عبارت ہو ایڈیشن کی نشاندہی کرنا مصنف کا فرض تھا۔

ہے جو سراسر منفیانہ اور مخلصانہ معلوم ہوتا ہے۔

غالب کے بعض اشعار کو قدیم شعرا سے ماخوذ و مستعار بتایا ہے۔ اس باب میں سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ صرف اشعار لکھدیئے ہیں ان پر
ماکمہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ مقابلہ میں پیش کئے جانے والے اشعار بلحاظ مضمون جداگانہ نوعیت کے حامل ہیں صرف ایک دو الفاظ کے اشتراک کو بنیاد نہیں
قرار دیا جاسکتا مولانا مہر کے دو تین مضمون اسی موضوع پر ماہِ نو میں چھپ چکے ہیں جن میں بوضاحت دکھایا گیا ہے کہ غالب کے اشعار اور متقدمین کے
اشعار میں کیا فرق ہے وہ ایک نہیں ہیں ایک سمجھنا خود نا قد کی فہم کا قصور ہے۔ جہاں غالب کا یہ باب کلیتہً مستعار ہے جو مختلف کتابوں سے اخذ کیا گیا
ہے اور ان کی نشاندہی نہیں کی گئی جن شعراء کے اشعار مقابلہ میں پیش کئے ہیں ان کی دواوین سے براہ راست استفادہ نہیں کیا گیا بلکہ کسی ایک کا بھی
دیوان پیش نظر نہیں رہا ہے اس لئے اشعار کے انتخاب میں غلطی واقع ہوئی ہے مثلاً: ؎

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغ محفل　　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کے اس شعر کا ماخذ مرزا بیدل کا یہ شعر قرار دیا ہے: ؎ (ص ۱۵۸)

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغ محفل　　　ہر کہ برخاست ز بزم تو پریشاں برخاست

حالانکہ یہ شعر بیدل کا نہیں ہے بلکہ غالب کے شعر کا ترجمہ ہے۔ جو مختلف حضرات کرتے رہے ہیں۔ کسی صاحب نے ایسے ہی کسی ترجمہ کو کہیں دیکھا
اور بیدل سے منسوب کر دیا۔ ہی طالب علمی کے زمانے میں، میں نے بھی ترجمہ کیا تھا جس میں مصرع ثانی اس طرح ہے " ہر چہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست"
نہ چاندپوری نے یہ بھی نہ سوچا کہ بیدل جیسا دیدہ ور زبان داں بے جان اشیا کے لئے " ہر کہ " استعمال نہیں کر سکتا اور " برخاست ز بزم تو "
جو نقص روانی ہے وہ بھی بیدل جیسا قادر الکلام روا نہ رکھتا جب کہ " از بزم تو برخاست " بالکل سامنے کی بات تھی۔ بیدل کا شعر نہ ہونے
ان داخلی شہادتوں کے علاوہ شاید مصنف کے لئے یہ حقیقت باعث تعجب و تحیر ہوگی کہ غالب نے مصرع اول ابتدا میں یہ لکھا تھا " عشرتِ
پا رچہ بوئے گل و کو دودِ چراغ " نظر ثانی میں تبدیلی کی گئی یہ امر بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مضمون غالب کے ذہن کی پیداوار ہے مستعار نہیں۔

المختصر، کتاب مذکور مبتدیوں کے لئے گمراہی کا سبب ہے۔ صاحبان بصیرت اس کی خامیوں اور کوتاہیوں پر اظہار حیرت کریں گے۔ بہتر
تھا کہ اس کے ہر باب پر تفصیلی بحث کی جاتی اور مصنف کی ایک ایک غلطی کی نشاندہی کی جاتی مگر اس وقت بطور نمونہ اتنا ہی کافی ہے
آئندہ تفصیلی جائزے کا ارادہ ہے۔ قارئین کرام اس کتاب کے مطالعہ کے وقت اس کے بیانات کی خود تحقیق فرمائیں تو ان پر بھی یہ حقیقت
واضح ہو جائے گی کہ مصنف نے غلط روش اختیار کی ہے، منفیانہ و مخالفانہ جذبہ سے کام لیا ہے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اقتباسات
سے مفید مطلب باتیں لے لی ہیں اور جن سے اس کے خیالات کی تردید و تکذیب ہوتی تھی ان کو چھوڑ دیا ہے۔ اس قسم کی باتیں ایک صحیح
نقاد کسی حالت میں بھی جائز نہیں سمجھتا۔ یہ تمام لغزشیں اس وجہ سے سرزد ہوئیں کہ مصنف بنیادی طور پر ایک معمولی افسانہ نگار ہے
تحقیق و تنقید کے کڑے اصول و ضوابط کی پابندیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)

غالب اور فقہ

(۱)

کیا عجب ہے کہ بعض احباب اس مضمون کی سُرخی دیکھ کر قہقہے لگائیں "دیوانہ ہوا ہے، بھلا غالب کو
سے کیا سروکار، ایک رند کو زہد سے کیا علاقہ؟"

اچھا! خوب ہنسئے میری دیوانگی پر، مجھے اس میں بہت لطف آتا ہے لیکن یہ سرخی تو عاقلانہ ہے
ی تعریف متقدمین کے نزدیک یہ ہے الفقہ معرفة النفس مع ما لہا وما علیہا یعنی نفس کی معرفت
اس کے منافع ومضار کے علم کو فقہ کہتے ہیں، یہ تعریف شریعت وطریقت یا فقہ متعارف اور سلوک
ت دونوں پر حاوی ہے، پس مسائل صوم وصلوٰة وحج وزکوٰة ونکاح ومعاملات جس طرح فقہ میں داخل
اسی طرح تزکیۂ اخلاق وتجلیہ اوصاف کے حصول اور وصول الی اللہ کے اصول بھی فقہ میں شامل ہے۔

غالب نے جہاں دوسرے مضامین پر قلم اٹھایا ہے وہاں اخلاق وتصوف کے بعض اہمات
ل بھی بیان کئے ہیں، میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اس چمن میں بھی
کا قلم اپنے خرام ناز سے نسیم سحری کی طرح رنگ رنگ کے گل کھلاتا ہے اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ؎

دیکھا اسدؔ کو جلوت وخلوت میں بارہا دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

اصل یہ ہے کہ مرزا تھے فارسی کے استاد اور کتب بینی کے دھنی، اولیاء اللہ اور صوفیہ کے
ید اور ان کے ملفوظات ومکتوبات کے خوشہ چیں، ذہن رسا ایسا کہ سبحان اللہ، طبع رواں ایسی
لحمد للہ، غالباً یادگار غالب میں ہے کہ ایک بار انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب کی کسی
ب کے ایک دقیق مسئلہ کو اس خوبی سے سمجھایا کہ خود حضرت شاہ صاحب بھی اس سے زیادہ بیان
کر سکتے تھے،

بالفعل میں ان مضامین کے بیان میں نہ تو فقہ وتصوف کے ابواب کی ترتیب کا اتباع کرتا ہوں

دیوانِ غالب کی ردیف وار غزلیات کا، بلکہ آزادہ روی سے جو اشعار میرا دل مجھے سُناتا جاتا ہے انھیں لکھتا جاتا ہوں، جب یہ دیوانہ گم سم ہو جائے گا تو میں خود روحِ غالب یعنی دیوان سے ذرہ کر کر کے مرزا کے اس بیان کی داد دوں گا کہ ؎

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کہنے سننے پر دنیا کے بہت سے کاموں کا دار و مدار ہے، افادہ و استفادہ، تعلیم و تعلّم، سب اسی کے رہینِ منت ہیں، اچھی باتوں کا سننا اور سمع قبول سے سننا اچھا اور بہت اچھا اور بری باتوں کا کہنا اور قصداً و عمداً کہنا بُرا اور بہت برا، بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے کہنے سننے میں جھگڑے جاتے ہیں، سینوں میں کینے جم جاتے ہیں اور نجانے کیا کیا فتنے پیدا ہو جاتے ہیں۔

مرزا نے کیسا اخلاقی، کیسا حکیمانہ اور کیسا مشفقانہ افادہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی برا کہے تو نہ سنو اور برا کرے تو نہ کہو، بات یہ ہے کہ انسان کے حرکات و سکنات کا خلاصہ یہی قول و عمل یعنی کہنا اور کرنا ہے، اور سننے کو کہنے پر مقدم کیا ہے کیونکہ سننا نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اسی طرح کہنے کو کرنے پر تقدیم دی ہے کیونکہ بُرا کہنا ایک عمل ہے متعدی اور بُرا کرنا، ایک ایسا عمل ہے جو کبھی متعدی ہے اور کبھی لازم اور کہے اور کرنے کے مفعول کے حذف کرنے میں تعمیم کا نکتہ ہے یعنی خواہ تمھیں برا کہے یا کسی غیر کو یا تمھارے ساتھ بدسلوکی کرے یا اور کہیں بدی کا مرتکب ہو، تمھیں سُنی ان سنی کر دینی چاہیئے، یہ نہیں کہ چار سنو چار کہو، یا دل میں کینہ و بغض پال لو، یا دوسروں کی بُرائی سنو تو تالیاں بجاؤ اور پیاں اُچھالو، اسی طرح دوسرے کے اعمال بد کو طشت از بام کرنا بھی برا ہے، کیونکہ اس میں نفسانیت ہے، للّٰہیت نہیں، نصیحت میں خلوص چاہیئے اور پردہ پوشی، سب کے سامنے کسی کی بُرائی کے پرت کھولنا اس کی تشہیر ہے، اور اس سے اکثر بے حیائی اور بے باکی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور تہمت کرنے والے کی بھی فضیحت ہو جاتی ہے۔

پہلے مصرع میں حلم و تحمل اور دوسرے میں عیب پوشی کی تعلیم ہے، حدیث شریف میں ہے تخلقوا باخلاق اللہ یعنی اخلاق الٰہی سے مناسبت پیدا کرو، اللہ حلیم بھی ہے اور ستار بھی، انسان کو بھی اپنی استطاعت کے مطابق حلم اور ستاریت سے آراستہ ہونا چاہیئے اور اس سے زیادہ وہ بے چارہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ ؎

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

فلاسفۂ انگلستان کے مسلم الثبوت GREAT MORALIST اور عظیم الشان معلم اخلاق حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے مرشد کامل حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت بابرکت میں ایک بار دریائی سفر کر رہا تھا کہ حضرت پیر و مرشد نے مجھے یہ نصیحتیں فرمائیں ؎

مرا پیر دانائے روشن شہاب — دو اندرز فرمود بر روئے آب

یکے آں کہ بر خویش خود بیں مباش — دوم آں کہ بر غیر بدبیں مباش

خود بینی اور بد بینی خدا بینی سے محروم کر دیتی ہیں، غالب نے انہی الفاظ دیگر یوں کہا ہے: جب انسان کسی سے اپنی برائی سنے گا اور خود بیں نہ ہوگا تو دل میں یہی کہے گا، اس شخص نے اگر مجھ کو غلط نہیں کہا، میں تو ہوں ہی ایسا اور جب مرد اپنے اعمال و احوال و اقوال کے محاسبہ میں لگا رہے گا تو دوسروں کی برائی پر اس کی نظر بھی پڑے گی تو اچٹتی ہوئی، خلاصہ یہ کہ وہ اوروں کی بدگوئی اور بدعملی پر اپنے چشم و گوش کا تخلیہ کرے گا کہ نہ انہوں نے ایسا کیا اور نہ اس نے ایسا کیا۔

بقول بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ؎

جو تو مرکو چاہیے فریدا — آنکھ کان سب کر لے شن

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس شعر میں حفظ مراتب کا لحاظ بدرجۂ کمال ہے، یہ معلوم ہے کہ جناب خضر بزرگان دین میں سے ہیں جن کی ولایت میں تو کچھ شبہ ہی نہیں اور بعض کے نزدیک تو وہ نبی ہیں۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت اختیار کرنا اور علم رشد و ہدایت کی طلب میں صاف طور سے مذکور ہے۔

مرزا صاحب جناب رسول کریم سید محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اتباع و اطاعت کے مرتبۂ عالیہ کا بیان فرماتے ہیں کہ ہم غلامانِ خاتم الرسل کو خضر علیہ السلام کی پیروی نہ شرعاً بعثت میں واجب نہ فرض میں لازم، وہ بزرگ ہیں، ہوا کریں، ہمارے لئے تو حسب فرمانِ قرآن فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اسی ذات گرامی صفات کا اتباع واجب ہے جو "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے اور جس کی محبت و پیروی رہروانِ راہ سلوک اور جاں دادگانِ عشق کو مرتبۂ محبوبیت پر فائز المرام کر دیتی ہے۔

اللہ اکبر! جل جلالہ و عم نوالہ، کیا کہنا امت مرحومہ کے بزرگوں کا کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم رسول سے حضرت خضر یہ فرما دیں هذا فراق بيني وبينك، اور جناب کلیم اللہ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں علم موسیٰ کی ہو

جن کے[1] سامنے حیرت فروش اور امت مرحومہ کے بزرگ جب میدان توکل اور بیابان غربت میں قدم رنجہ فرمائیں تو جناب خضر خود ان سے رفاقت سفر کے طالب ہوں اور وہ ٹکا سا جواب دے دیں۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اپنی مشہور آفاق کتاب احیاء العلوم جلد رابع باب توکل میں لکھتے ہیں :-

وقال الخواص بعد ان سئل عن العجیب مارأتہ فی اسفارہ " رأیت الخضر ورضی بصحبتی ولکن فارقتہ خیفۃ ان تسکن نفسی الیہ فیکون نقصًا فی توکلی "

حضرت خواص علیہ الرحمہ سے جب لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے سفر میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز کیا دیکھی تو انھوں نے فرمایا میری ملاقات خضرؑ سے ہوئی وہ میری صحبت سے خوش تھے لیکن میں نے ان سے جدائی اختیار کی اس خوف سے کہ مبادا میرا نفس ان سے وابستہ راحت ہو جائے پس میرے توکل میں کمی آجائے ،

بعض شعرا نے حضرات انبیاء علیہم السلام اور جناب خضرؑ کا ذکر کچھ ایسے پیرایہ میں کیا ہے کہ ادب آنکھیں دکھاتا ہے اور شریعت ذوق تکلم کی گریباں گیر ہوتی ہے مثلاً ؎

جاں دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ — اس سے جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

لیکن یہاں ایسا نہیں ہے ، مرزا صاحب کو خضر علیہ السلام کی بزرگی تسلیم ہے مفر ہونے سے من کل الوجوہ منافات لازم نہیں آتی اور پیروی کا عدم وجوب جس بنا پر ہے وہ فضیلت خضری میں قادح نہیں ،

اگر اس شعر کو اہل طریقت کی اصطلاح کے مطابق سمجھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ مرید کو اپنے ہی شیخ کا اتباع چاہیئے ، البتہ دوسرے بزرگوں اور دوسرے سلسلہ والوں کی بھی تنقیص نہ کرے ، ان کو بھی بزرگ مانتا رہے ۔

مطلب یہ ہے کہ راہ سلوک و طلب میں ہم چلے جا رہے تھے کہ جناب خضر سے جو اس راہ کے مرد میدان ہیں ملاقات ہوئی ، تھوڑی دور تک ہمارا ان کا ساتھ رہا ، پھر انھوں نے اپنا راستہ لیا ہم نے اپنا ، وہ تو ہماری تقلید و پیروی کیا کرتے ، ہم نے ان کی پیروی اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ ہمارے خضر راہ نہیں ، ہمارے پیر طریقت نہیں ؎

ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں — رو بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

---

[1] اقبال کے مصرع میں تصرف کیا ہے ، جس میں تیرے سامنے ہے۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا نے اس غزل میں دو ایک شعر اور بھی تصوف کے کہے ہیں، ان کی رندی پارسائی اور خود شناسی ملاحظہ ہو کہ تصوف کو سمجھنے اور شاعرانہ زبان میں اس کے بیان پر قدرت رکھنے کے باوجود یہ زعم نہیں کہ ہم بھی ولی اللہ ہیں اور نہ یہ جہل مرکب ہے کہ اولیاء الٰہی اور مقربان خدا کے لئے ناجائز کام بھی جائز ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض جہلا کا عقیدہ ہے - مولانا فرماتے ہیں ؎

حرف درویشاں بدزدد مرد دوں تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں

بعض کمینے لوگ فقیرانہ اور عارفانہ باتیں اس لئے سے کہا گئے ہیں کو کسی بھولے آدمی پر اپنا جادو چلا کر اس کو اپنا گرویدہ بنالیں -

مرزا ان شریف النفس لوگوں میں سے ہیں جن کو اپنے متعلق نہ بزرگی کا دھوکا ہے اور نہ دوسروں کو دھوکا دینا ان کا شیوہ ہے، وہ تو جاہلوں کو اور آگاہ کرتے ہیں کہ اصرار علی الکبیرہ منافی ولایت ہے، بادہ خواری گناہ کبیرہ ہے اور اس کا بار بار ارتکاب عملاً اصرار ہوا، لہٰذا ایسا شخص ہرگز ولی نہیں، ولی کی تعریف یہ ہے کہ اطاعت خدا و رسول میں منہمک اور گناہوں سے محترز ہو، سیدنا سہیل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں الولیؒ ھوالذی توالت افعالہ علی الموافقہ، ولی کے افعال پے در پے احکام الٰہی کے موافق ہوتے ہیں -

ایقاظ اللہ اکبر! ایک غالب تھے بادہ خوار جو اپنے تئیں نہ محض منکسر مزاجی سے بلکہ علم اور دلیل کی بنا پر "ولی" ہونے سے بھی انکار کرتے تھے ایک وہ لوگ ہیں کہ دو چار دفعہ اللہ کا نام لے لیا اور لگے زعم کرنے کہ ہم تو مقربان الٰہی سے ہیں بلکہ اس پر ترقی کی تو خود پرستی اور فرعونیت سے خدا ہی بن بیٹھے۔

ایک دلچسپ واقعہ لڑکپن میں مجھے بحث و مباحثہ کا بہت شوق تھا، آریہ سماجی ہو یا مسیحی اپنا ہو یا غیر، جس کو دیکھا کہ اس کشتی کے داؤں پیچ دکھا رہا ہے تو جی یہی چاہتا تھا کہ بس اسے چاروں شانے چت کر دیجئے، میرے تھے ایک بھائی پھپھیرے، عمر میں مجھ سے بڑے، وہ کشتی دیکھنے کے شوقین تھے اور میں کشتی لڑنے کا،

ایک دن کا ذکر ہے، دوپہر کا وقت تھا، میں اپنے گھر میں کتابوں سے کھیل رہا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ بھائی صاحب تشریف لائے اور کہا "باہر چلو، ایک میاں صاحب بحث کرنے آئے ہیں، میاں صاحب کا لفظ سن کر اور حیرت ہوئی عجب معلوم ہوا کہ ان کا دعوی ہے کہ ہر چیز خدا ہے، خیر، قہر درویش برجان درویش، مجھے باہر جانا پڑا، مکان کے چبوترے پر ایک درخت تھا جامن کا، بس میرے ذہن میں آیا کہ درخت کے سایے میں خاک نشیں ہو کر ان کی تواضع کروں، جس کو انھوں نے

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

گلدستہ شکوۂ یار بجنور

منشی احمد حسین قمرؔ تلمیذ بیخودؔ دہلوی بریلی کے ایک صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ وہ محکمہ تعمیرات میں نقشہ نویس تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۹ء میں ضلع بجنور میں ایک انجمن مشاعرہ قائم کی تھی جس کے جلسے باقاعدگی کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ایک سخن سنج بابو شیام نرائن برقؔ بجنور میں انگریزی دواؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ قمرؔ صاحب کی انجمن مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ برقؔ نے دسمبر ۱۹۰۹ء میں شکوۂ یار کا اجرا کیا اور قمرؔ صاحب کی اجازت سے جو انجمن مشاعرہ کے سکرٹری تھے مشاعرے کی غزلیات گلدستے میں چھاپنا شروع کیں۔ یہ گلدستہ ماہانہ تھا اور اس نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی

شکوۂ یار مطبع تحفہ ہند بجنور میں چھپتا تھا۔ اس کے مہتمم اور پرنٹر بابو جیراج سنگھ اور منیجر و پبلشر شیام نرائن برقؔ تھے گلدستہ ۲۲×۱۸ کے سائز پر چھپتا تھا۔ اس وقت کے مذاق کے مطابق اس کی کتابت و طباعت غنیمت تھی۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ شعر چھپتا تھا ؎

دھوم کس شاہدِ مضمون کی ہے بازاروں میں ؛ نام لکھواتے ہیں یوسف بھی خریداروں میں

عام خریداروں سے زرِ عطیہ دو روپیہ سالانہ تھا نوابان و راجگان سے پانچ روپیہ اور رؤسا و معززین سے تین روپیہ نمونہ کا پرچہ دو آنے کے ٹکٹ پر روانہ کیا جاتا تھا۔

گلدستے میں طرحی غزلیات چھپا کرتی تھیں۔ طریقہ کار یہ تھا کہ تین مصرعہائے طرح تین ماہانہ مشاعروں کے لئے مشتہر کر دیئے جاتے تھے۔ شعرائے غزلیں لکھ کر منشی احمد حسین قمرؔ کو بھیجا کرتے تھے۔ ان کے انتخاب کے بعد غزلیں حروف تہجی کے اعتبار سے گلدستے میں چھپ جاتی تھیں۔

ابتدا میں تعداد صفحات تیس تھی جو بعد کو بڑھا کر اڑتیس کر دی گئی تھی۔ گلدستے میں اساتذہ کے ساتھ مبتدی اور نومشق بھی جگہ پاتے تھے۔ کبھی کبھی غیر طرحی کلام بھی چھپتا تھا۔ نومشق شعرا کی ہمت افزائی یا گلدستے کی اشاعت بڑھانے کے خیال سے سب سے عمدہ غزل پر ادارے کی جانب سے انعام بھی پیش کیا جاتا تھا۔

گلدستے میں غزلیات کے علاوہ ادبی مضامین کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ عموماً یہ مضامین ہمعصر ماہناموں سے نقل کئے جاتے تھے تفصیل مندرجہ ذیل ہے :-

اصل شاعری- آغا رفیق بلند شہری- منقول از کمال دہلی

جہانگیری انعامات - منقول از عصمت دہلی

سرمد شہید - ابو السلام آزاد - سرفی پنڈی بہاؤ الدین

مارک لوتھین - " زمانہ کانپور

حسن طبع - شیام نرائن برق

ادبی مضامین کے علاوہ منظومات بھی دوسرے رسائل سے نقل کرکے چھاپی جاتی تھیں۔ مثلاً

یتیم اور جاڑے کی رت - بانکے رام شاد منقول از زمانہ کانپور

زمزمۂ توحید " عصمت دہلی

دوشیزہ اور پھول " غنچہ جاوید

نظم سبحانی بہر عبرت منکبراں - سبحان علی مشرق بجنوری

شکوۂ یار کے مطالعے سے مندرجہ ذیل گلدستوں اور ماہناموں کے نام معلوم ہوتے ہیں :-

صحیفہ بجنور - مدیر مولوی مجید حسن خاموش

زبان دہلی - مدیر خواجہ فہمید حسین اکبرآبادی

جلوۂ یار میرٹھ مدیر آزاد میرٹھی

کمال دہلی - مدیران چنڈی پرشاد شیدا و پیارے لال رونق

زبان اردو شاہجہانپور - مدیر عابد علی عابد

آفتاب سخن پونا - مدیر شیخ محمد عثمان شاد

العزیز - بٹالہ گورداسپور

شکوۂ یار میں دواؤں اور کتابوں کے اشتہارات بھی چھپتے تھے۔ کتابیں بغرض ریویو بھی موصول ہوتی تھیں۔ گلدستے میں جن کتابوں کا مذکور ہوا وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

چمنستان صفیر دیوان مولانا علی حسن صفیر لکھنوی

لطف سخن - شمس العارفین حضرت گنجور دہلوی

سرمایۂ زبان اردو - حضرت جلال لکھنوی

منتخب القواعد - "

نظم نگارین - "

خیالات بیمثال - "

بدر کمال - دیوان سید محمد مہدی کمال لکھنوی

ذوق کمال -

تنکو دبار میں تقریباً دو تین شعراء کی غزلیات چھپی ہیں - ان میں سے دو ایک کا تعلق مشرق میں وارجنگ، مغرب میں بیشا ور اور جنوب میں خاندیش جیسے دور دراز کے علاقوں سے تھا - اس امر سے ایک طرف تو گلدستے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اردو غزل کی اشاعت و ترویج کا۔ شعراء میں زیادہ تر غیر معروف ہیں۔ ممکن ہے ان میں چند با صلاحیت شاعر ہوں جو شہرت سے محروم رہ گئے - ان میں چند شاعر مقامی طور پر مشہور ہوئے مگر اپنا مقام نہیں پا سکے - میرے خیال میں وہ شعراء یہ ہیں :-

بیدم شاہ وارثی رح - ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں - ان کی غزلوں میں ایک صوفی کے مشاہدات، تصورات اور کیفیات کا اظہار ہے - کلام پر اثر ہے - ایک محدود حلقے میں معروف ہیں۔

عبد الرزاق بہار - رضوان مرادآبادی کے شاگرد اور گجرات کے مشہور لغت کو گزرے ہیں مناسب شہرت سے محروم رہے۔

طہیر دہلوی - ذوق کے شاگرد تھے - ایک شاعر کی حیثیت سے مزید تعارف کے محتاج ہیں -

محمد علی تشنہ بکسوی - علاقہ اودھ میں شہرت یافتہ ہیں - ایک شاعر کی حیثیت سے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہے -

سید محمد مہدی کمال لکھنوی - جلال لکھنوی کے خلف الصدق اور صاحب دیوان شاعر تھے - ان کی شاعرانہ حیثیت پر ہنوز تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے -

عرش گیاوی - امیر اللہ تسلیم کے معروف شاگرد ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے ہنوز محتاج ہیں۔

قمر الحسن قمر بدایونی - صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں - اصول شاعری پر بھی لکھا ہے - یہ کم نصیبی کی بات ہے کہ انھیں اہل بدایوں نے فراموش کر دیا -

حکیم مولوی محمد احمد امکن - اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے ؛ ورگلدستوں میں کلام چھپتا رہتا تھا - دس دواوین فارسی و اردو کے یادگار چھوڑے - داغ و امیر کے ہم عصر تھے ان پر بھی مطالعے کی ضرورت ہے -

عطا محمد عطا بدایونی - بدایوں کے تلامذہ داغ کی فہرست میں حبدالمی بیخود کے بعد ان کا نام لکھا جاتا تھا - افسوس کہ اب گمنام ہو گئے ہیں -

احمد حسین قمر بریلوی - بیخود دہلوی کے شاگرد تھے - ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا - ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو سنا ہے ان کے عزیزوں کے پاس لاہور میں محفوظ ہے - چند غزلیں میری نظر سے گزری ہیں - صاحب طرز شاعر معلوم ہوتے ہیں، اگر دیوان فراہم ہو جائے تو مطالعے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے -

در اصل اہل قلم کو اپنے شہر کے با صلاحیت شاعروں اور نثر نگاروں پر بھی مضامین قلمبند کرنا چاہئیں تاکہ وہ گمنامی سے بچ جائیں، نئی

نسل اپنے بزرگوں کے ادبی اکتساب سے واقف ہو جائے اور اردو کا دامن بھی موتیوں سے بھرتا رہے۔ نئی نسل اپنے شہر کے جغرافیہ، اپنے شہر کی تاریخ اور اپنے شہر کی ادبی سرگرمیوں سے ناواقف رہتی ہے۔ مثلاً روہیلکھنڈ میں بدایوں زمانہ قدیم سے ایک مردم خیز بستی ہے اور اس کی خاک میں جید صوفی، علماء، فضلاء، اور شعراء آسودہ خواب ہیں جو اپنے زمانے میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے تھے مگر آج کے تعلیم یافتہ نوجوان سے گفتگو کرنے کے بعد مایوسی ہوتی ہے کیوں کہ نوا، تولا، عطا، قمر، مذاق، کشش، راغب وغیرہ کے اسماء ان سنے روایتاً سن رکھے ہیں مگر وہ ان کی شاعرانہ حیثیت اور ان کے حاصل سے نابلد معلوم ہوتا ہے۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔ اردو کے بدایونی مورخین، ناقدین اور محققین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بدایوں کے شعراء و ادباء پر بھی تفصیل سے لکھیں۔ اسی طرح اکبر آباد، فرخ آباد اور روہیلکھنڈ کے دیگر اضلاع کے قدیم و جدید ادبی سرگرمیوں پر لکھنے کی ضرورت ہے۔

شکوہ یار میں اساتذہ اردو کے تلامذہ میں بھی کلام چھپتا تھا۔ ان میں سے چند نام غیر معروف نہیں ہیں البتہ بعض نام نئے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے معروف اساتذہ کے شاگردوں کی فہرست تیار کر لی تھی جو مندرجہ ذیل ہے:-

تلامذۂ داغ	تلامذۂ امیر مینائی	تلامذۂ غالب	تلامذۂ جلال لکھنوی
سید محمد اختر نگینوی	حضور احمد خاں آتش بریلوی	حسان الہند رضوان مرادآبادی	محمد یعقوب بخش راغب بدایونی
سید عزادار حسین افسر نگینوی	سید احمد علی منڈواری	مرزا گوہر جان گوہر	سید محمد مہدی کمال
تسلیم حسن تسلیم			
عطا محمد عطا بدایونی			
منشی حیات بخش رسا			
محمد سرفراز علی خاں رفعت بریلوی			
دیبی پرشاد مائل مین پوری			
محمد نوح ناروی			

تلامذۂ رضوان مرادآبادی	تلامذۂ ذکی دہلوی تلمیذ غالب	تلامذۂ منیر شکوہ آبادی	تلامذۂ مضطر خیرآبادی
نواب شوکت علیخاں ایرج	مولوی محمد میاں ناز بدایونی	مرزا عاشق حسین بزم	محمد عبدالرشید کرتپوری
سید حسن بیدل چاندپوری			
عبدالرزاق بہار			
عبدالحمید حمید			
محمد عبدالجبار رد آبر			
محمد حسین سلیمان			

تلامذہ قدر بلگرامی تلمیذ غالب

حکیم سرور علی سرور

تلامذہ ذوق

سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی

تلامذہ غالب میں رضوان مراد آبادی سے دنیا واقف ہے البتہ گوہر کا نام نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی غزل شکوہ یار بابتہ جون ۱۹۱۰ء میں صفحہ ۳ پر چھپی ہے۔ گلدستے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلکتہ کی ایک طوائف تھی۔ اس کی غزل مندرجہ ذیل ہے ؎

دل میں بے چین سرِ بسترِ راحت ہو گی ۔۔۔ اس قدر وصل کی مشتاق طبیعت ہو گی

لاکھ ارمان بھرے حشر میں ہوں گے پامال ۔۔۔ چھوٹے سے سن میں بھی رفتار قیامت ہو گی

وہ بھی بوسے جو مجھے نام خدا پر دو گے ۔۔۔ اس سے کچھ کم تو نہیں حسن کی دولت ہو گی

چٹکیاں لے کے جو پہونچی کبھی وہ زلف سیاہ ۔۔۔ دردِ دل اٹھنے کی ضامن شب فرقت ہو گی

قیصرِ ہند لقب بخشیگی گوہر امید

ہم کو تفویض جو ملکہ کی وزارت ہو گی

شکوۂ یار میں ہر طرح کی غزلیں چھپی ہیں۔ پست بھی اور بلند بھی۔ بحیثیت مجموعی داغ کے اثرات نمایاں ہیں۔ حق بات بھی یہ ہے کہ داغ نے اردو غزل پر دیرپا اثرات چھوڑے تھے اور ان کے مرنے کے بعد کئی دہائیوں تک شعراء ان کے رنگ میں غزلیں لکھتے رہے اور جن کو عوام سے بھرپور داد ملتی رہی۔ گلدستہ کا بالتفصیل مطالعہ کرنے کے بعد تھوڑے سے اشعار جو میرے انتخاب میں آئے مندرجہ ذیل ہیں۔ ان اشعار سے اس دور کی رفتارِ ادب کا بھی اندازہ ہوگا ؎

بزم میں ساقی نے بھی لوٹا ہوا ساغر دیا ، کس کے آگے رو دیے پھوٹی ہوئی تقدیر کو — عاجز سہوانی

غیر سے ترکِ محبت پہ قسم کی حاجت ، آپ نے مجھ سے کہا اور مجھے باور آیا — ”

خواہش سے نہیں کم ہوتی میخانے میں ، بھر دے میخانے کو ساقی مرے پیمانے میں — کمال لکھنوی

تقدیر کی گردش تھی اک لغزش مستانہ ، دل توڑ دیا اس نے پیمانے کو کیا کہئے — ”

آپ ہی چھیڑنا قصہ مری بیتابی کا ، اور پھر سن کے آپ سے خود ہی پریشان ہونا — خنجر لکھنوی

جفائے بے محل کا تھا گلہ جب دل ہی قابو میں ، نہ ہو تو کیا کرے کوئی شکایت سوزِ پنہاں کی — ”

یاد مجھ کو آ گیا اپنا دلِ آفت نصیب ، رو دیا میں محفلِ عشرت کا ساماں دیکھ کر — ”

ہمیں اک وہ ہیں جس نے دل کو دل اور سر کو سر جانا ، وگرنہ سہل سی اک بات تھی حد سے گذر جانا — ”

مرادیں مانگ کے تیری جو ہو رہیں ناکام ، وہ نامراد بھی ہوتے ہیں کامیاب کہیں — پیام مراد آبادی

خداوندا مری دیوانگی کا پردہ رہ جاتے ، چھڑی ہے آج پھر بے طرح کی دست گریباں میں — بیدم شاہ وارثی

کہاں جمعیت خاطر وہ سب حال میں سلجی ہے ، پریشانی تھی جتنی تیرے گیسوئے پریشاں میں — محمد اختر نگینوی

شبِ فراق کی ہوتی جو انتہا معلوم	سحر کے ہونے کا کچھ اعتبار ہو جاتا	فوق بدایونی
چھڑک دے شیشہ پہ ساقی نظر گذر کے لئے	بچی ہوئی مری جو ساغرِ شراب میں ہے	سحر بدایونی
نگاہِ شوخ کا صدقہ ادھر بھی ایک نظر	ہماری آرزو دیدِ اضطراب میں ہے	"
نظر نیچی کئے آنچل سنبھالے	بتا دو تم کہ آئے ہو کہاں سے	فضل حسن جان مضطر
نہ کھولو بال زلفوں کے سرِ شام	اترتی ہیں بلائیں آسماں سے	عاشق حسین بزم
چاہتے ہیں اپنے حسنِ خودنما کی وہ مثال	کاش رکھ دے آئینہ کوئی اٹھا کے سامنے	محسن بدایونی
کہیں نہ اور قیامت اٹھے قیامت میں	کہ ان کو دیکھ کے محشر میں دل مچل جائے	"
میں شیشہ گر نہیں اک بادہ خوار ہوں یارب	شکستہ جام ہوا کس لئے نصیب مجھے	راغب بدایونی

شکوہ یار کی تیرہ[13] اشاعتیں منظرِ عام پر آئیں۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں پہلا پرچہ چھپا تھا اور دسمبر ۱۹۱۰ء میں آخری۔ تیرہ ماہ کی مدت میں اس کی اشاعت صرف چار سو[400] تھی۔ پچیس[25] تیس[30] اشخاص نے زرِ سالانہ بھیجا تھا ورنہ گلدستہ مفت ہی بڑھا جاتا رہا۔ لہٰذا مالی استحکام کی عدم موجودگی میں گلدستہ بند کر دیا گیا۔

اس وقت شکوہ یار، جلوہ یار، پیام یار، مثال یار، نہال سخن وغیرہ ادبی تاریخ کا مبسوط باب ہیں۔ ان کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔ ہاں کام صبر آزما اور محنت طلب ہے۔

افسر امروہوی

وحید کڑوی

۱۹۳۹ء کے جون کا مہینہ تھا۔ میں ایک مہینے کی چھٹی میں تھا اور چونکہ وطن کا چکر لگائے ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے اس لئے اس وقت جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ شہر میں پھرنا اور دوست احباب کے لئے باعث زحمت ہونا گوارا نہ ہوا لا محالہ گھر ہی میں رہنا پڑا۔ دو چار دن تو جوں توں کر کے گزر گئے لیکن پورے ایک مہینہ کا اس طرح گزارنا ذرا دشوار نظر آنے لگا تو خیال آیا کہ ان دنوں میں تلامذۂ مصحفی کے اس مسودے کو کیوں نہ مکمل کر لیا جائے جو کئی سال سے معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ آخر کاغذات نکالے اور ان کی تکمیل کے لئے تذکروں کی اوراق گردانی شروع کی۔ کسی تذکرے میں سے کچھ ملا کسی تذکرے میں سے کچھ دستیاب ہوا۔ سات آٹھ تذکروں کے بعد گل رعنا سامنے آگیا۔ اور اُسے دیکھنا شروع کیا۔

گل رعنا بڑا اچھا تذکرہ ہے حکیم عبدالحی مرحوم اس کے مصنف ہیں اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اپنی روایتی آن بان کے ساتھ اسے شائع کیا ہے مجھے معلوم تھا کہ اس تذکرے میں ہر درجے کے شاعروں کی بھرمار نہیں ہے پچھلی چار پانچ صدی کی تاریخ ادب سے صرف ان شخصیتوں کو چن لیا گیا ہے جو کسی قدر نام و نمود کی مالک تھیں اور میں جانتا تھا کہ ان گنے چنے شعراء میں مصحفی کے چند مخصوص و معتقد تلامذہ آتش، ناسخ، امیر، خلیق، ضمیر اور شہیدی وغیرہ کے علاوہ دیگر شعرا کو مشکل سے جگہ دی گئی ہوگی لیکن شوق جستجو نے ابھارا کہ سرسری نظر ڈالنے میں کیا نقصان ہے شاید کوئی کام کی بات ہاتھ آجائے۔

سب سے پہلے فہرست کو دیکھا اس میں تو مصحفی کے کسی ایسے شاگرد کا نام نہیں نکلا جو میرے لئے نیا ہوتا لیکن پھر خیال آیا کہ بعض اوقات ضمنی طور پر کچھ ایسے اشارات بھی مل جاتے ہیں جو تدوین سوانح میں مددگار ہو جایا کرتے ہیں اس تصور کے پیش نظر ورق گردانی شروع کی یکے بعد دیگرے ورق اُلٹے جاتے رہے اور یاس و امید کی کشمکش کے درمیان انگلیاں اپنے کام میں مصروف رہیں آخرکار ایک صفحہ کی ذیلی سطور میں جب یہ

عبارت نظر پڑی تو خوشی کے مارے اچھل پڑا ۔

" مولوی وحید الدین کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے ۔ مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اور ان سے مشورۂ سخن کیا تھا "

دل نے کہا چلو محنت ٹھکانے تو لگی کم سے کم مصحفی کے ایک نئے شاگرد کا پتا مل گیا ۔
اس کے بعد یک لخت میرے ذاتی حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ساری اسکیمیں بالائے طاق ہوگئیں اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۲ء تک پورے بائیس سال میں نے بھول کر بھی نہ دیکھا کہ مصحفی اور تلامذۂ مصحفی کے بارے میں کیا کیا لکھا جا چکا ہے اور کن کن باتوں کی تکمیل کی ضرورت ہے ؟

واصل عثمانی صاحب نے جو وحید کے نواسے ہیں ، مجھ سے کہا کہ وحید مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات پر مستند حضرات کے مضامین و منظومات وصول ہو رہے ہیں جو کتابی صورت میں شائع کئے جائیں گے اور چاہا کہ میں بھی کچھ لکھوں اس لئے یہ چند سطور قلمبند کر رہا ہوں ۔ میرے مضمون کی بنیاد اس انتخاب وحید پر ہے جو جناب زیبا ردولوی کی کوششوں کا رہینِ منت ہے ۔

وحید مرحوم کا زمانہ جیسا کہ ان کے حالات میں بیان کیا گیا ہوگا اردو شاعری کے اس رنگ کا دور تھا جسے لکھنوی رنگ کہا جاتا ہے ، جس وقت ان کے شباب اور شاعری کا آغاز ہوا دہلی میں ذوق و غالب اور لکھنؤ میں آتش اور اس کے ہمنوا دادِ سخنوری دے رہے تھے ۔ غالب کی نکتہ سنجی نے سنجیدہ افراد کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا ۔ ذوق کی محاورہ بندی اپنا جواب نہ رکھتی تھی اور اکثر و بیشتر شعرائے لکھنؤ کے یہاں ناسخ کی تمثیلی شاعری کے بہتر سے بہتر نمونے موجود تھے ۔ ایک خواجہ آتش تھے کہ ان کی ڈگر الگ تھی وہ اپنے استاد مصحفی کی روح شاعری کو برقرار رکھے ہوئے تھی وحید کی اُفتادِ طبیعت نے تلامذۂ ناسخ و اسیر کے رنگ سخن کو ناپسند کیا اور آتش کے ایک کامیاب شاگرد شیخ بشیر علی بشیر کردی کے دامن عاطفت میں پناہ لی ۔ بشیر صاحب وحید کے ہموطن بھی تھے اس لئے اپنے شاگرد کی مناسب اصلاح و ترقی میں ہمدردی سے کوشاں رہے ۔

بشیر کردی نے اگرچہ صبا ، رند ، خلیل وغیرہم دیگر شاگردان آتش کی سی شہرت نہیں پائی لیکن ان کے صاحب فن ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں جن کے دامن تربیت میں رہ کر وحید نے وہ کچھ حاصل کیا جو ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے ۔ اسی کا طفیل تھا کہ وحید نے اکبر الٰہ آبادی جیسا صاحب طرز شاگرد یادگار چھوڑا ۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایک مقطع میں اس عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے جو انھیں اپنے محترم استاد کے ساتھ تھی کہتے ہیں ؎

استادیٔ وحید میں جس کو کو شک ہو کچھ تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

وحید کے ایک نامور شاگرد اور بھی تھے، لطیفہ یہ ہے کہ وہ بھی اکبر تخلص کرتے تھے۔ ان کا نام سید محمد اکبر العلائی داناپوری تھا۔ اکبر داناپوری نے ایک رباعی میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ رباعی یہ ہے

شاگرد وحید کے ہیں دونوں اکبر ہم مشق بھی ہم دونوں رہے ہیں اکثر
لیکن قسمت کا صاد ان پر ہی ہوا پتھر پتھر ہے اور جوہر جوہر

اس رباعی میں اکبر داناپوری نے اپنے خواجہ تاش اکبر الہ آبادی کی شہرت و مقبولیت کا اعتراف سچے دل سے کیا ہے اور اسے ان کی خوش نصیبی قرار دیا ہے۔

انھیں اکبر داناپوری کا ایک مقطع اور بھی ہے جس میں داغ کو صرف شاعر، امیر کو صاحب فن تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کو اہل کمال کا قبلہ ظاہر کیا ہے۔ یہ غلو نہیں ہے اعتراف حقیقت ہے۔ وحید کے قبلۂ اہل کمال ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش ذرا کم ہے مقطع یہ ہے ؎

شاعر ہے داغ اور ہے استاد فن امیر اکبر وحید قبلۂ اہل کمال ہے

وحید کی شاعری کس نہج کی تھی اس کے لئے ہمیں اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں کا کھوں نے خود بتا دیا ہے ؎

وحید شعر و سخن کا مزہ اسی سے ہے بیانِ وصل وجدائی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں

اس بیان وصل وجدائی کو وہ اپنا خاص رنگ کہتے ہیں ؎

جانے نہ پائے ہاتھ سے رنگ اپنا عمر بھر نیرنگیٔ زمانہ سے کیا کام ہے وحید

اسی رو میں وہ اپنے رنگ کلام کی تعریف بھی کر گئے ہیں ؎

حلاوتت سے مزے سے لطف وشیرینی سے معلوم ہے زبان اپنی، سخن اپنا، کلام اپنا، بیان اپنا

اس سادگی میں یہ صنعت دیکھنے کے قابل ہے کہ پہلے مصرع میں چار صفتیں جمع کرکے دوسرے مصرعے میں چار موصوف بیان کر دیئے ہیں، یہ جمع وتقسیم کی لطیف مثال ہے۔ واقعی یہ وحید کی خوش بیانی ہے جس کے وہ خود بھی قائل تھے ؎

ہے ختم وحید خوش بیانی قائل ہوں میں تیری گفتگو کا

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ وحید نے بیان وصل و ذکر جدائی کو غزل کے لئے لازم قرار دیا ہے اور ان کا یہ فیصلہ غالباً اسی وجہ سے ہے کہ وہ ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کے انسان تھے جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اُس دن سے کوئی شعر نہیں درد سے خالی جس دن سے مرے ساتھ غزل خواں ہے مرا دل

اسی قبیل کا ایک مقطع بھی ہے ؎

وحید آپ کے شعر جس رنگ کے ہیں
وہ پاتے ہیں باتیں طبیعت میں بھی ہم

اس میں شک نہیں کہ چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز اثر سے خالی نہیں ہوسکتی، اشعار کو تیر و نشتر صرف وہی چیز بناتی ہے جسے دل شکستگی اور حزن و ملال کہا جاتا ہے وحید کا یہ قول کس قدر برمحل ہے ؎

اشعار میں ہے چوٹ طبیعت کی بھی لازم
دل سب کا دکھا دیتی ہے آواز حزیں کی

وحید کی شاعری میں سب سے وقیع اور قابل قدر چیز حسنِ ردیف ہے۔ حسن ردیف سے میری مراد وہ تمام خوبیاں ہیں جو ردیف و قافیہ کے سلسلے میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ردیف کی طوالت، اس کی ندرت، قافیہ کی پیوستگی اور ان محاسن کے ساتھ سلاست و روانی سب باتیں حسن ردیف میں شامل ہیں۔ وحید کے کلام میں ان کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں۔ اسی حسن ردیف کے معنی وحید مرحوم کے الفاظ میں یہ ہیں ؎

وحید روشنیٔ فکر کے یہ معنی ہیں
چمکتا جاتا ہے حسن ردیف کیا کیا کچھ

طویل و نادر ردیفوں کا رواج قدما میں بھی تھا اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔ وحید الہ آبادی حسن دور کے شاعر تھے اس میں بھی ردیف کا استعمال کم و بیش اسی صورت میں تھا۔ البتہ انھوں نے اپنی اخاذ طبیعت سے طوالت میں ندرت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ردیفیں طویل تو ہیں مگر زبان کی سلاست و فصاحت نے شعر کو ایسے دلفریب سانچے میں ڈھالا ہے کہ قاری یا سامع کا خیال ردیف کے اشکال و طوالت کی طرف نہیں جاتا۔ ذیل کے چند مطلعے اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ؎

لب پہ کیا عذرِ گنہ لایئے آہوں کے سوا
عمر بھر ہم نے کیا کیا ہے گناہوں کے سوا

تھرا کے رہ گیا میں ادھر سر سے پاؤں تک
کی اس نے دفعتاً جو نظر سر سے پاؤں تک

میں کب سے پوچھ رہا ہوں شراب ہے کہ نہیں
کچھ اس سوال کا ساقی جواب ہے کہ نہیں

اس میکدے میں کتنے سبو پی کے مست ہیں
کتنے فقط شراب کی بو پا کے مست ہیں

لے جاتے ہیں سر میں کس کی ہوا آئے ہیں کہاں جاتے ہیں کہاں
معلوم نہیں ہم مثل صبا آئے ہیں کہاں جاتے ہیں کہاں

تم زرِ گل کا پہن لو آج توڑا پاؤں میں　　　　بلبلِ شیدا کو دکھلاؤ تماشا پاؤں میں

یہ کتنا عمدہ مطلع ہے اور کس بے ساختگی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ الفاظ کا دروبست دیکھیے زر کے ساتھ توڑا اور گل کے ساتھ بلبل پھر بلبل شیدا۔ استادی اسی کا نام ہے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مصرعوں میں سے ایک جگہ کی ردیف زائد ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ جس طرح توڑے کے پہننے کے لئے پاؤں کی ضرورت ہے اسی طرح تماشا دکھانے کے لئے بھی پاؤں بالکل ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ غزل الہ آباد کے ایک مشاعرے کی ہے۔ اسی مشاعرے کے بعد یا بروقت کسی عقلمند نے اعتراض کیا تھا کہ دوسرے مصرع میں "تماشا پاؤں میں" کے بدلے "تماشا پاؤں کا" ہونا چاہیئے۔ اس کج فہمی کا کیا علاج۔ اس ترمیم کی صورت میں تو شعر کی روح ہی فنا ہو جاتی۔ مقصود اصلی تو اس "تماشے کا دکھانا" مقصود ہے جو زرِ گل کا توڑا پاؤں میں پہن لینے سے ظاہر ہوگا یہاں تو پاؤں ظرف ہے اور تماشا مظروف، مضاف و مضاف الیہ کا اجتماع نہیں ہے جیسا کہ معترض نے خیال کیا ہوگا۔ داغ کی ایک مشہور غزل ہے؎

بھوئیں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں　　　　کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

امیر مینائی مرحوم نے اپنے ایک مقطع میں اس غزل کے لئے لکھا ہے؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے　　　　بھوئیں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

غزل کو اچھا کہہ کر ایک مصرع کا حوالہ دینا جب کہ اس مصرعے سے بہتر مصرعے غزل میں موجود ہیں دل میں کھٹکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر مرحوم غزل کی اچھائی کے ساتھ اس مصرعے کی برائی ظاہر کرنا چاہتے ہیں "جس کا یہ مصرع ہے" شاید اظہار تعجب کے لئے لکھا گیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ یہاں بھوئیں "تنتی ہیں" یہ جملہ بہت ہی بدنما ہے "بھنویں تنی ہوئی ہیں" یا "بھنویں تن رہی ہیں" کہنا زیادہ موزوں ہوتا۔ پھر دوسرا مصرع بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ بگڑنے کے بعد بن کے بیٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہاں تو "یوں بیٹھے ہیں" یا اس طرح بیٹھے ہیں کا موقع تھا "بن کے" کا اضافہ حشوِ قبیح ہو کر رہ گیا ہے۔

داغ کی یہ غزل وحید مرحوم کی غزل کی مقبولیت سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب داغ کلکتے جاتے ہوئے پٹنے میں چند روز کے لئے ٹھہر گئے تھے۔ جیسا کہ اسی غزل کے مقطعے میں کہتے ہیں؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں　　　　عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

داغ کے مطلع کے مقابلے میں وحید کا مطلع دیکھیے ماہتاب کے لئے آفتاب معلوم ہوتا ہے وہی قافیے ہیں مگر کس قدر صحت کے ساتھ نظم ہوئے ہیں سبحان اللہ؎

ادھر آئینہ رکھا ہے اُدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

بعض اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ بادی النظر میں وہ بہت معمولی نظر آتے ہیں لیکن جب غور کیا جائے تو ایسے لطیف مطالب خیال میں آتے ہیں کہ دل لطف حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو کہ سیپ بذاتِ خود اس قدر قیمت کا مالک نہیں ہوتی جو اس کے اندر پوشیدہ رہنے والے موتی کی ہوتی ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ ایک قیمتی موتی اپنی تہہ میں رکھتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی حد تک قابل قدر ہو جاتا ہے یہی حالت اس شعر کی ہوتی ہے جو بادی النظر میں بالکل معمولی ہوتا ہے لیکن جب دماغ کی رسائی اس کے عبیر النفہم مفہوم تک ہو جاتی ہے تو سبحان اللہ اور واہ وا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

میرے ایک شاگرد ہیں عبدالرحمان خاں نسیم امروہوی۔ یہ حضرت بالکل صوفی واقع ہوئے ہیں اور ہر شعر سے اپنے مذاق کا مطلب اخذ کرنے میں بڑا ملکہ رکھتے ہیں ایک مرتبہ مجھ سے یہ شعر سنا ؎

ابھر آئی ہے سطح ارض پر باطن کی رنگینی مرا مدفن نہیں اک پھول ہے صحرا کے دامن پر

بظاہر شعر میں ایک رسمی سا مضمون ہے مگر ان پر اس شعر کا بہت اثر پڑا۔ پوچھا تو کہنے لگے کہ اس شعر میں باطن کی رنگینی سے مراد قربت الٰہی ہے اور صحرا سے مراد دنیا۔ جو لوگ قرب الٰہی حاصل کر لیتے ہیں ان کی شخصیت زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی دنیا میں ایک سدا بہار پھول کے مانند ہوتی ہے۔ یہ حضرت صابر کلیریؒ۔ حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزارات مقدسہ شگفتہ پھول ہی تو ہیں جو سطح ارض پر اپنے نکہت بار وجود کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔

اسی قبیل کا ایک شعر وحید الہ آبادی کا بھی ہے ؎

معطر ہے اسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

دیکھنے میں یہ ایک سادہ سا عاشقانہ شعر معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے کہ اگر گیسوئے یار کھلنے سے داعی حق کا اعلان اسلام مراد لی جائے اور اس کے عالمگیر اثرات کو جس پر جان دینے والے دنیا کے وسیع و عریض کے دور و دراز گوشوں تک پائے جاتے ہیں اس گیسو کی خوشبو قرار دیا جائے تو شعر کا مفہوم کس قدر بلند کس قدر دل کش اور کس قدر پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

اس نوع کا یہی ایک شعر نہیں ہے بلکہ متعدد اشعار ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

پیش نظر ہے عرش سے تا فرش ایک نور روز وصال ارض و سما کا تو دیکھ رنگ

شب معراج کی تعبیر کس قدر روشن انداز میں بیان کی ہے ؎

کیا جلوے ہر مقام پہ شمس و قمر کے ہیں یارب یہ دونوں نقش قدم کس بشر کے ہیں

رضواں مراد آبادی ایک مشہور نعت گو گزرے ہیں جن کی ایک غزل کافی مشہور اور تقریباً روہیلکھنڈ کے ہر میلاد خواں کی زبان پر ہے - اس کا مطلع یہ ہے ؎

اترائیں نگاہیں جو بڑھیں سوئے محمدؐ   دل لوٹ گیا دیکھتے ہی روئے محمدؐ

اس غزل میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ہر ماہ میں گھٹ بڑھ کے فلک پر مہ انور   ابروئے محمدؐ ہے کبھی روئے محمدؐ

رضواں صاحب نے چاند کو روئے رسولؐ سے تشبیہہ دی تھی یہ تو متداول تشبیہہ تھی اس کے مقابلے میں وحید کی بلند خیالی کا تصور کیجئے کہ وہ چاند اور سورج کو اپنے محبوب کے چہرے سے تشبیہہ نہیں دیتے بلکہ نقش قدم سے تشبیہہ دیتے ہیں کیا مضمون کے اعتبار سے یہ قابلِ قدر ترقی نہیں ہے - وحید نے بھی اس زمین میں غزل لکھی ہے جس کا یہ شعر اس وقت ذہن میں ہے ؎

رنگ گل وحدت سے جو شاداب ہوا ہے   کیا گلشن اسلام میں ہے بوئے محمدؐ

ایک اور شعر ہے ؎

گلزار قدس میں نہیں مثل اس کا اے وحید   جس گل کے ہم پسینے کی بو پا کے مست ہیں

اس شعر میں حضور سرور کائنات صلعم کے بارے میں اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کے پسینے سے مشک و عنبر کی بو آتی تھی -

ایک شعر میں بیان کیا ہے کہ حضورؐ کا مزار مقدس جس ارضِ پاک میں ہے وہ دوسرے لفظوں میں جنت الفردوس ہے ؎

عمر بھر جو ترے کوچے سے نہ نکلیں باہر   میرے نزدیک وہی لوگ ہیں جنت کے لوگ

اس شعر میں یہ لطیف اشارہ بھی ہے کہ خدائے پاک جن نفوس کو جنت عطا فرمائے گا وہ اس میں ابد الآباد تک رہیں گے اور کبھی اس گہوارۂ عیش سے باہر نہ آئیں گے -

یہ شعر بھی سرور کائنات و فخر موجوداتؐ کی شان میں ہے ؎

کونین کا دل جس پہ کہ نادیدہ فدا ہو   بے پردہ جو اس دم نظر آجائے تو کیا ہو

ایک شعر اور سن لیجئے ؎

بے سبب روشن نہیں ہیں دیدۂ اہل نظر   پتلیوں میں عکس ہے اس چاند سی تصویر کا

کتنی سچی بات کہی ہے صرف وہی اہل نظر حقیقت کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں جن کی آنکھیں جلوۂ محبوب خدا کے تصور نے روشن کر رکھی ہیں -

یہ مطلع بھی خوب ہے ؎

تمھارا دل میں ہے اے جانِ جاں عکس　　　کہاں تم جلوہ فرما ہو کہاں عکس

اردو شاعری میں جہاں حسن و عشق کے معاملات نظم ہوتے ہیں شعرا نے اپنی افتادِ طبیعت کے ماتحت اخلاقیات کا درس بھی دیا ہے - وحید بھی اس کلیے سے باہر نہیں گئے - ان کے یہاں اخلاقی اشعار بھی کافی پائے جاتے ہیں - ان اشعار کے آئینے میں خود ان کے اخلاق کی دل کش تصویریں نظر آتی ہیں - مناسب ہوگا کہ مختلف عنوانات قائم کرنے کے بدلے اس نوع کے اشعار کو قارئین کرام کے مطالعے کے لئے یک جا درج کر دیا جائے ؎

انساں نہ ملے اہلِ غرض ہو کے کسی سے　　　کچھ کام کی ہوتی نہیں مطلب کی ملاقات

کل خدا جانے کیا کریں گے وہ　　　جن کو ہے فکر عمر بھر کی آج

اتنی سی زندگی پہ انساں کو　　　کس قدر ہے یہاں غرور گھمنڈ

دو دن کی بہار ہر چمن میں　　　اے موسمِ گل نہ پھول ہر دم

خاک میں وہ مل گئے لگتی نہ تھی جن کو نظر　　　چشمِ عبرت سے تماشا دیکھئے تقدیر کا

جب خدا سے شرم آتی ہی نہیں وقتِ گناہ　　　دیدۂ انساں سے انساں کو حجاب آیا تو کیا

دفعتاً چرخ نے مٹا ڈالے　　　کہنہ قبروں کے اب کہاں تعویذ

مندرجہ بالا چند اشعار نمونے کے طور پر دیئے گئے ہیں ورنہ وحید کا کلام پند و نصائح کے اشعار سے بھرا پڑا ہے -

وحید مرحوم کے خیال میں عبادت الٰہی کے لئے عجز و انکسار اسی طرح لازم ہے جس طرح حیاتِ انسانی کے قیام کے لئے جسم میں روح کا وجود - بصورت دیگر طاعت و عبادت کا اصل مفہوم فنا ہو کر جاتا ہے یہ اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں ؎

بے عاجزی، حریمِ خدا تک گزر نہیں سر خاک پر نہیں، تو قدم عرش پر نہیں

کس قدر ہے عاجزی درگاہ میں اُس کی پسند سنتے ہیں ٹوٹا ہوا دل ہے مقام اللہ کا

یہ دل شکستگی دراصل قربت الٰہی کا موجب بنتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

وحید نے دل شکستگی کو شاعری کے لئے بھی لازمی قرار دیا ہے ؎

اشعار میں ہے چوٹ طبیعت کی بھی لازم دل سب کا دُکھا دیتی ہے آواز حزیں کی

دعا کے لئے سوز و گداز درکار ہے اس مفہوم کو ایک شعر میں یوں ادا کرتے ہیں ؎

طالب نورِ اثر ہو جو وحید چاہیئے وقتِ دعا سوز و گداز

اردو شعرا میں بہت کم ایسے ہیں جن کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ موجود نہ ہو، خصوصاً وہ بزرگ جن کو مبداء فیاض سے چشم بینا و دل بیدار عطا ہوا ہے۔ ہر ذرے میں آفتاب اور ہر قطرے میں دریا کا تماشا دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں تمام مظاہر عالم جو صورتاً مختلف و متبائن نظر آتے ہیں درحقیقت ان کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ وحید نے اس مسئلے کو کس قدر سلیس انداز میں بیان کیا ہے ؎

پاتا ہوں اسی کا میں نشاں دل میں بھی اپنے جس نور سے دیر و حرم آباد ہوئے ہیں

وحید صوفی منش اور مولوی خاندان کے ایک فرد اور خود صاحب نظر و صاحب باطن بھی تھے اس لئے ان کے کلام میں تصوف کے تمام مسائل واشگاف نظر آتے ہیں۔

اس قبیل کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

وہ رُخِ یار ہی کا جلوہ ہے کرتے ہیں جس پہ سنگِ طور گھمنڈ

گل و خار اس چمن میں جس قدر ہیں نظر آتا ہے سب میں یار کا رنگ

کوئی مثلِ گل ہے نکہت سے جو ہم بغل بھی تو کیا کہ خودی کی بو ہے جب تک ہے وصالِ ذات مشکل

نصیب میں ہے تو دکھلائی دیگا جلوۂ یار یہ لوحِ دل سے تو نقشِ دوئی مٹانے دو

کیا کیا ترے انوار نے دکھلائے ہیں اسرار　　　جو کچھ مری آنکھوں سے نہاں ہے وہ عیاں ہے

پروانہ اپنے دل کا جو روشن کرے چراغ　　　جائے نہ اس طرح کبھی اُڑ کر چراغ میں

وحید کے یہاں ایسی غزلیں بھی متعدد ہیں جن میں تسلسل مضمون پایا جاتا ہے ان میں سے بعض محض تصوف کے رنگ میں ہیں مثلاً ایک غزل ہے ؎

یہ دل بھی ہمیں دلربا بھی ہمیں ہیں　　　نگہ بھی ہمیں ہیں ادا بھی ہمیں ہیں

ترا طرۂ مشک سا بھی ہمیں ہیں　　　تری نکہت جانفزا بھی ہمیں ہیں

ہمیں بادہ و جام و ساقی و میکش　　　ہوا بھی ہمیں ہیں گھٹا بھی ہمیں ہیں

یہ چشم حقیقت سے ہوتا ہے روشن　　　کہ بت بھی ہمیں ہیں خدا بھی ہمیں ہیں

ہمیں دیکھتے ہیں وحید اپنا جلوہ　　　خود آرا بھی ہیں خود نما بھی ہمیں ہیں

غالب نے تجمل حسین خاں کی تعریف کے سلسلے میں لکھا تھا ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　　سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

یہاں نہ ورق کے ختم ہو جانے کی شکایت ہے اور نہ وحید کے داد طلب اشعار کے بحر بیکراں سے پار اترنے کے لئے سفینہ طلب کرنے کی کوئی ضرورت مگر

اس قدر فرصتِ اوقات کہاں سے لاؤں

جس باکمال شاعر نے ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا　　　دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ایسا بے پناہ شعر لکھا ہو اس کے کلام کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اور اپنی کوتاہی کو جس قدر زیادہ سمجھا جائے زیادہ نہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تی رنجن بھٹاچاریہ

بنگال میں اردو

انیسویں صدی کی مذہبی مطبوعات

ںمعے کے مراکز سے دور ہوتے ہوئے بھی بنگال نے اردو زبان و ادب کی کیا اور کیسی خدمت انجام دی ہے اس کی تفصیل نہ صرف دلچسپ ہے
بان وادب کے سلسلے میں تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک اہم موضوع ہے۔ بنگال میں اردو پر میں نے اب تک کئی مضامین لکھے ہیں
ت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان نے سرزمین بنگال میں کیسے نشو ونما پائی۔ یہاں کیسے کیسے خادمانِ اردو پیدا ہوئے اور ان
ے کیا ہیں۔ میری تصنیف " بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات " کو اردو داں حلقے نے جس گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا ہے اس نے اس سلسلے میں میری
ئی کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ایک ایسی کتاب لکھ جاؤں جو بنگال میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کی جامع و مکمل تاریخ ہو۔ یہ کام کب
انجام پائے گا یا نہیں ۔ ابھی کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں نے بنگال کے مختلف کتب خانوں کی خاک چھانی ہے اور اپنی کوشش
گا ہوا ہوں۔ شاید ابھی میرا یہ کام پورا ہو جائے۔ لیکن زندگی کا کیا بھروسہ اس لئے اکثر مضامین کے طور پر مختلف عنوانات کے تحت
اردو کے سلسلے میں اپنی معلومات اور خیالات کو گاہے گاہے پیش کرتا رہتا ہوں۔ اس بار مختلف مذاہب کے سلسلے میں جو کتابیں میں نے
جن کے سلسلے میں علم ہوا ہے ان کی ایک فہرست پیش کر رہا ہوں۔ میں اس فہرست کو مکمل قرار تو نہیں دے سکتا لیکن جتنی کتابوں کے نام
ج ہیں اس سے ایک اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ بنگال کے اہل علم و اہل قلم حضرات نے اس موضوع پر اردو میں کم نہیں لکھا۔

اسلام اور مسلم سماج

سنہ ۱۸۰۳ء

ہدایت اسلام " مصنف مولوی امانت اللہ۔ اس کتاب کے دو حصے تھے لیکن غالباً دوسرا حصہ چھپا نہیں۔ پہلا حصہ ڈاکٹر جان
گلکرسٹ کی نگرانی میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

سنہ ۱۸۱۲ء

گلِ مغفرت " مصنف میر حیدر بخش حیدری۔ صفحات ۲۸۴۔ مطبع ہندوستانی کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس تصنیف میں شہدائے
کربلا کے حالات مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

سنہ ۱۸۲۵ء

قیامت نامہ " کو فارسی سے محمد عبداللہ نے بنام قیامت نامہ کے ترجمہ کیا۔ (اس کے کئی ایڈیشن بھی بعد میں کلکتہ سے چھپے ہیں :
پہلے ایڈیشن کے صفحات ۹۸ تھے۔

سنہ ۱۸۲۶ء

"مفتاح الجنت" مصنف کرامت علی جونپوری۔ اس کے اور بھی چند اڈیشن کلکتہ سے شائع ہوئے مثلاً ۱۸۴۹ء کا اڈیشن۔ اس کے پہلے ۷ صفحات عربی میں اور بعد کے ۲۲۲ صفحات اردو کے ہیں۔

سنہ ۱۸۲۹ء

"قرآن مجید" بنگال سے شائع شدہ غالباً پہلا قرآن یہی ہے۔ جس میں عربی کے ساتھ اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ مترجم شاہ عبدالقادر ہیں مولوی عبداللہ نے ہگلی سے اسے چھپوا کر شائع کیا۔ مترجم شاہ عبدالقادر نے اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز کی تفسیر قرآن شریف موسوم بہ تفسیر عزیزی "کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ صفحات تقریباً نوسو (۹۰۰) سنہ اشاعت ۱۲۰۵ ہجری درج ہے۔

سنہ ۱۸۳۰ء

"تنبیہ الغافلین" یہ مولوی سید احمد شہید کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مولوی صاحب ہگلی کے باشندے تھے اور آپ نے اسے کلکتہ سے چھپا کر ہگلی سے شائع کیا۔

سنہ ۱۸۳۴ء

"خدا کی نعمت با تفسیر مُرادیا" مصنف شاہ مُراد اللہ انصاری۔ صفحات ۹۰۰۔ پہلا اڈیشن کلکتہ سے شائع ہوا نیز ایک اور اڈیشن بھی کلکتہ سے ۱۸۶۸ء میں چھپا ہے۔

سنہ ۱۸۳۶ء

"کوکب دری" مصنف کرامت علی جونپوری۔ صفحات ۲۲۳۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس میں قرآن شریف کے چند الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔

(۲) "النور محمدی شرح شمائل ترمذی" مصنف کرامت علی جونپوری۔ یہ حدیث کی شرح ہے اور ایک جلد میری نظر سے گزری ہے۔ صفحات ۸۴ ہیں۔ سنہ ۱۲۵۲ ہجری میں مطبع محمدی کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا۔

سنہ ۱۸۳۷ء

"حقیقتِ اسلام" مصنف مولوی عبداللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس میں اسلامی طریقۂ عبادت کا بیان ہے۔

سنہ ۱۸۳۸ء

"بائی توبہ" مصنف کرامت علی جونپوری۔ اس کتابچہ میں مصنف نے توبہ کرنے کی ضرورت اور توبہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مقامِ اشاعت کلکتہ ہے۔

سنہ ۱۸۳۹ء

"ارکان الحج" مصنف عبدالغنی۔ صفحات ۳۲۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ حج کرنے کے سلسلے میں ضروری فوائد کا بیان ہے۔

سنہ ۱۸۴۲ء

"زینت المصالح" مصنف کرامت علی جونپوری۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس کتاب میں مصنف نے عبادت کو فرض قرار دیا ہے۔

سنہ ۱۸۴۳ء

"جواب فتح الایمان کا" مصنف عبدالجبّار حنیفی۔ صفحات ۳۰۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۴۶ء

(۱) "میلاد شریف" مصنف محمد سلامت اللہ کاشفی۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ لیکن اس پر یہ درج نہیں ہے کہ پہلا اڈیشن کب شائع ہوا۔ صفحات ۱۴۸ ہیں۔

(۲) "زینت القادری" مصنف کرامت علی جونپوری۔ صفحات ۴۰، مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس کے کئی اور اڈیشن چھپے ہیں مثلاً ۱۸۷۰ء کا اڈیشن۔

(۳) "دقائق الحقائق" مصنف محمد نقی۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۴۷ء

"احیاء القلب" مصنف عبدالجلیل ابن عبدالمجید۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ ایک اور اڈیشن ۱۸۷۷ء میں چھپا۔ اس تصنیف میں پیغمبر اسلام کی پیدائش اور زندگی نیز وفات کا مفصل حال درج ہے۔

سنہ ۱۸۴۸ء

(۱) "نازو نیاز" مصنف محمد غلام علی خان، صفحات ۱۶۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس کتابچہ میں نبی محمدؐ کی تعریف نظم میں کی گئی ہے۔

(۲) "ہزار مسائل" عربی سے مولوی محمد عبداللہ نے ترجمہ کیا ہے، صفحات ۸۸، مقامِ اشاعت کلکتہ۔

(۳) "قرأت الحیوم" مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۴۴ ہیں۔

(۴) "نصیحت المسلمین" مصنف کرامت علی جونپوری۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۶۰ ہیں۔ یہ تصنیف قرآن کا مختصر ترجمہ گویا رُوح القرآن ہے۔

سنہ ۱۸۴۹ء

(۱) "خطبات جماعت" مصنف محمد اسمٰعیل دہلوی کے چند خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف جماعتوں میں پڑھے تھے۔ مقامِ اشاعت کلکتہ، صفحات ۴۴ ہیں۔

(۲) "صالح المومنین" مصنف لطف الحق۔ صفحات ۱۴۴، مقامِ اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۵۰ء

(۳) "نظام الاسلام" مصنف محمد راجی الدین مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۹۲۔

سنہ ۱۸۵۵ء

"رسالہ ملخص العقائد" یہ تکمیل الایمان کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم حاجی سعید بخت ہیں مقام اشاعت کلکتہ صفحات ۱۳۶ سنہ طبع ۱۲۷۱ ہجری درج ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء

"قصیدہ در لغت سرورِ کائنات" مصنف منشی رحمت علی طپش۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۲۵۔

سنہ ۱۸۵۹ء

"راہ نجات" مصنف حافظ محمد علی۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۶۸ء

(۱) "خلاصات الانابیا" مصنف شیخ غلام نبی۔ صفحات ۴۰۸۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

(۲) "لباب الاکبر" مترجم مولوی عبدالکریم۔ احمد بن عبداللہ کی عربی تصنیف جس میں عرب کے روایات ہیں اردو ترجمہ ہے۔ صفحات؟ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۶۹ء

(۱) "اظہار الحق" مصنف مولوی خلیل الرحمٰن۔ یہ تصنیف واجبیوں پر تنقید ہے جو فارسی کتاب فاطع خیر کا ترجمہ ہے مطبع احمدی سیالدہ کلکتہ سے اکتوبر میں چھپی ہے۔ صفحات ۴۶ ہیں۔

(۲) "زینت القادری" مصنفہ مولوی محمد کامل۔ یہ کتاب قرآن مجید کو درست طور پر پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مطبع سلطانیہ کلکتہ میں چھپی ہے۔

(۳) "ضمیمہ رسالہ مبادر الحلوم" مصنف کرامت علی جونپوری۔ صفحات ۱۸۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

(۴) "ضمیمہ جلد اوّل مفتاح الادب" مصنف عابداللہ عابدی۔ ان کی اصل تصنیف یعنی مفتاح الادب دو حصوں میں ہے پہلا حصہ ۱۸۶۵ء اور دوسرا ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ضمیمہ حصہ اول کے لئے ہے۔ ضمیمہ کے صفحات ۴۲ ہیں۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۷۰ء

(۱) "خلاصۃ المسائل" مصنف مولوی عبدالقادر۔ لبشیر پریس کلکتہ میں چھپی۔ صفحات ۴۱۶ ہیں۔

(۲) "نورالہدیٰ" مصنف مولوی کرامت علی جونپوری۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۸۸۔

(۳) "راہ نجات" مصنف محمد اسمٰعیل دہلوی مطبع سلطانیہ کلکتہ۔ صفحات ۶۲۔

(۴) "تحفۂ حنفیہ" مصنف مولوی مجیب علی۔ صفحات ۴۰۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ مصنف اور مولوی ابراہیم کے درمیان چند مذہبی مسائل پر بحث و مباحثہ ہوا تھا اس کتابچہ میں اُسی کا خلاصہ ہے۔

(۵) "زاد التقواۃ" مصنف کرامت علی جونپوری۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۷۳ء

(۱) "تکریم العلماء و رسالہ چہل حدیث" یہ تصنیف بزبان عربی، بنگلہ اور اردو میں ہے۔ مصنف نعمت اللہ صفحات ۸۰۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اصل کتاب عربی کی ہے بعد میں بنگلہ اور اس کے بعد اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ کتاب کے صفحہ پچاس میں کہا گیا ہے کہ جب کسی ملک پر عورت حکومت کرے گی تب اس ملک پر آفت ضرور آئے گی حتیٰ کہ اس ملک کا نام و نشان تک مٹ جا سکتا ہے۔

(۲) "تلقیس المسائل" مصنف مولوی تفضل حسین۔ یہ فارسی سے ترجمہ ہے۔ مرزا پور کلکتہ میں چھپی ہے۔ صفحات ۸۲ ہیں اور قیمت ۱۲ آنے درج ہیں۔

(۳) "یادداشتِ اسلام" مصنف دُراب اللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ صفحات ۱۲۰ ہیں۔

سنہ ۱۸۷۶ء

(۱) "قول البشر" مصنف مولوی کرامت علی جونپوری۔ مطبع محمدی سے چھپا کر منشی عبدالعزیز نے اسے جونپور سے شائع کیا۔ منشی عبدالعزیز محلہ مفت گنج ڈھاکہ کے باشندے تھے۔ صفحات ۴۲ ہیں۔ مصنف کتاب لکھنے کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں "اس خاکسار نے اس سنہ ۱۲۸۹ ہجری میں بنگالے کے شمالی ملک میں جب سیر کیا تو بہ نسبت اور ملکوں کے اس طرف دین کے کام میں بڑا فتور اور سستی اور غفلت دیکھا اور اس کے سوائے ہندوستان اور بنگالے کے لوگوں کو دیکھا کہ دین کے بعض بعض مسئلوں پر شبہ کرتے ہیں اور شک میں گرفتار رہتے ہیں اور اکثر مسئلوں کو الٹا پلٹا کرتے ہیں۔ تب ارادہ کیا کہ اُن چند مسئلوں کی حقیقت مختصر کر کے چند ورقوں میں کھول دیں تاکہ ہر کوئی اُن چند ورقوں کو اوّل سے آخر تک دیکھ کے ہوشیار ہو جاوے۔"

(۲) "آیت تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" مصنف قادر علی قادری۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۸۴

سنہ ۱۸۷۷ء

(۱) "اعلیٰ القلب" مصنف عبدالجلیل۔ مقامِ اشاعت سیالدہ کلکتہ۔ صفحات ۱۹۲۔ یہ حضرت محمدؐ کی مختصر سوانح حیات ہے۔

(۲) "تقریر دلپذیر" مصنف عبدالغفار۔ مطبع محمدی ڈھاکہ ماہ دسمبر میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ صفحات صرف آٹھ ۸ ہیں کتابچہ میں ہفت آسمان کا مختصر بیان قلم بند کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۸۸۰ء

(۱) "در بابِ تائید ترمیم نہاد زوبیدہ" مرتب مولوی عبداللطیف خان بہادر۔ صفحات ۴۴۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ مسلمانوں

اس جلسے کی روداد کے علاوہ نہر زوبیدہ کی مختصر تاریخ ہے۔

(۲) "تنبیہ الموٴمنین" بزبان عربی، بنگلہ اور اردو مشترکہ کتاب ہے۔ صفحات ۵۹۔ مقامِ اشاعت ڈھاکہ۔ مصنف حاجی عمر شاہ اور پرنٹر پبلشر محمد جان۔

سنہ ۱۸۸۳ء

(۱) "تحفۃ الواعظین" مترجمین عثمان ابن حسن اور مولوی عبدالکریم۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۴۶۴۔ کتاب دو حصوں میں ہے حصہ اوّل ۱۸۸۳ء اور دوم ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں چند اہم اسلامی مسائل کا خلاصہ ہے۔

(۲) "سیف المسلمین علی فرق المرتدین" مصنف شاہ عبدالقدوس۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔

(۳) "جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد" اس نام سے دو کتابیں چھپی ہیں ایک کے پبلشر حافظ محمد حسین اور دوسرے کے پبلشر محمد عارف ہیں۔ حالانکہ دونوں کے پرنٹر محمد وزیر ہیں اس تصنیف میں یہ کہا گیا ہے کہ وہابی فرقہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مصنف نے اس بات پر زورِ قلم صرف کیا کہ وہابیوں کو ہرگز مسلمان نہ کہا جائے دونوں کتابیں کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوئیں۔

(۴) "حقیقت مذہب نیچری" جمال الدین کی تصنیف کا ترجمہ ہے اور مترجم ہیں مولوی سید عبدالغفور۔ محمد وزیر نے اسے کلکتہ سے شائع کیا۔ صفحات ۸۸ ہیں۔

(۵) "القوال المبیٰ فی مناقب ابوحنیفہ" مصنف عبدالنعیم اور عبدالعظیم ہیں۔ یہ ابوحنیفہ کا تذکرہ ہے۔ صفحات ۱۲ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

(۶) "رسالہ رد لامذہب" مصنف ابونصر فضل احمد۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ مصنف تالیف کا مقصد یہ بیان کرتا ہے —
"ملک الاخبار کلکتہ جلد نمبر ۱ مطبوعہ ۸ر دسمبر ۱۸۸۲ء نمبر ۲ میں مولوی رحیم بخش صاحب لامذہب کی ایک تحریر چھپی ہوئی میں نے دیکھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ مولوی صاحب لامذہبیت سے انکار صریح کرتے ہیں حالانکہ وہ نہایت اعلیٰ مذہب ہیں ... مولوی صاحب کی تحریر کا جواب تحریر کرتا ہوں ... تاکہ کوئی ان کے دام میں نہ آئیں۔"

سنہ ۱۸۸۴ء

(۱) "نور البشر" مصنف عبدالنعیم اور عبدالعزیز۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔ نماز پڑھنے کے قواعد ہیں۔

(۲) "مباحثہ" مصنف منشی عنایت اللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ اس میں اسلام کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔

(۳) "مسلمانوں کا حضرت محمدؐ" مصنف منشی عنایت اللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ اس کتاب میں مصنف نے اسلام پر نہایت سخت حملے کیے ہیں اور یہاں تک کہا ہے کہ قرآن مجید ہرگز اللہ کا کلام نہیں ہے۔

(۴) "ستارۂ محمدی فوائد احمدی" مصنف مولوی رحیم بخش۔ صفحے ۸۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

(۵) "کشاف القلوب" مصنف مولوی عبدالاحد شاہ بمطبع لبشیری کلکتہ سے شائع ہوا۔

(۶) "شرح مرغوب فی کشاف القلوب" مذکورہ کتاب کی شرح ہے مصنف مولوی شاہ اکرام الحق۔ صفحات ۲، مطبع احمدی کلکتہ سے شائع ہوا۔

(۷) "سوز نا بار" مصنف عبدالرحیم آبد۔ نعت ہے حضرت محمدؐ کے سلسلے میں صفحات ۶۲ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۸۵ء

"شمس الضحیٰ" مصنف منشی مولوی محمد اکبر۔ یہ ایک نعتیہ نظم ہے۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۸۶ء

(۱) "تدیہ کجال" مصنف محمد عمر فاروق۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔ اس میں واحبیوں کے خلاف سنی فرقہ کا بیان ہے۔

(۲) "تیغ فاروق" مصنف محمد عمر فاروق۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۶۔ یہ تصنیف بھی واحبیوں کے خلاف ہے مصنف کا بیان ہے کہ یہ کتاب جس طرح کہ تیغ میدانِ جنگ میں دشمنوں کی گردن اڑا دیا کرتی ہے بالکل اسی طرح یہ کتاب واحبیوں کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے۔

(۳) "نجات المسلمین" مصنف مولوی عبدالقادر۔ مقامِ اشاعت ڈھاکہ۔ صفحات ۸۴۔

(۴) "فلاح البشر بادہ آخر الظہر" مصنف محمد عبدالقادر جونپوری۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔ مصنف نے کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں بعد نماز جمعہ بھی ظہر اور دیگر نماز روزہ کی طرح ادا ہونی چاہیے۔

سنہ ۱۸۸۷ء

"تذکرہ المعصرین" مصنف حاجی مولوی سید علی نقی۔ کتاب کے صفحہ اول پر درج ہے "یہ شہر کلکتہ ملٹیا برج بتاریخ ۸ ماہ رجب المرجب ۱۳۰۳ ہجری بحُسن سعی جماعت احباب در رونق المطابع طبع شد" صفحات ۷۲ ہیں۔ ایک میں کچھ حدیثوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سنہ ۱۸۸۸ء

"العذاب الشدید فی تادیب ابلیہ" مصنف فاروق حنیفی فیض آبادی۔ صفحات ۲۰۔ مطبع غوثیہ کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ کتاب نظم میں ہے ایک شعر ملاحظہ ہو ـــ

فاروق نے لکھا ہے وہ دندان شکن جواب
لامذہبوں کے ہوگئے اوسان سب خطا

سنہ ۱۸۸۹ء

"چراغِ ایمان" مصنف مولوی عبدالکریم خان بہادر۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۲۶۔ اس تصنیف میں مصنف نے اسلامی

نقطۂ نظر سے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ روپیہ سود پر لینا یا دینا حرام ہے۔ کتاب کے آخر میں محمد وزیر نے حاجی عبدالکریم صاحب خان بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ متخلص بہ خاکی مصنف چراغِ ایمان کی مختصر تعریف لکھتے ہوئے یہ چند اشعار کہے ہیں۔

علم و فضل میں کمال میں آج — تجھ سا عالم میں کون ذیشان ہے

فتویٰ سود خوب لکھا ہے — حق میں حاسد کے تیغ براں ہے

سال تالیف اس کا لکھو وزیر — فی الحقیقت چراغِ ایمان ہے

سنہ ۱۸۹۰

" میلاد شریف خیر البشر " مصنف محمد خاطر۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۲، اس تصنیف کی زبان تو اردو ہے لیکن رسم خط بنگلہ ہے۔

سنہ ۱۸۹۴ء

(۱) " نور المومنین " مصنف اے کے۔ محمد نور عالم۔ پرنٹر پبلشر شیخ عبدالرحیم۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۹۹۔ اس کتاب میں نماز، روزہ وغیرہ کے اصول قلمبند کئے گئے ہیں۔

(۲) تبصرہ العیون رویت اسرار المکنون " مصنف مولوی سید محمد عبداللہ صالح آبادی۔ صفحات ۲۳۲۔ مطبع غوثیہ کلکتہ۔ مصنف وجہ تصنیف یوں بیان کرتے ہیں " بنیاد اس کتاب کی محبت الٰہی پر رکھی گئی ہے اور بطور بحث و جدل و تکرار کے اس مسئلہ میں دلائل عقلی اور نقلی الزامی و تحقیقی سے بدو وجہ قطع نظر کی گئی۔ اوّل یہ کہ ہم کو اس کتاب کے لکھنے سے مخصوص یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں اور ان کی اولاد جو ایک نئے طرز کی تعلیم دنیاوی کی وجہ سے عموماً اپنے اصول و فروع مذہبی سے لاعلم اور محض اور مسلم و غافل رہتے ہیں اور در اصل یہی بات بڑی خرابی اور ضلال و مُضل بن جانے کی گویا اصل وجہ ہے پس ایسی حالت میں ضرور ہوا کہ ان کے واقفیت اور اصل حقیقت دین و ملت کے معلوم ہو جاویں اور نیز اس زمانے کے بے علم ملاؤں بے علم کی فریب دہی سے بچیں۔"

سنہ ۱۸۹۵ء

(۱) " دلاور حسین احمد بانکی پوری کی تقریر " یہ تقریر دلاور حسین نے محمڈن سوسائٹی کلکتہ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود نیز فرائض کے سلسلے میں کی تھی جسے سوسائٹی مذکور نے کتابچہ کے طور پر شائع کیا

(۲) " افضل اختصار فلاکہ بہتی گوہر " مصنف عبدالرحیم۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۴۰۔ اس کتاب میں مصنف نے حضرت محمدؐ، بیٹی فاطمہؓ، حسن و حسین نیز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سوانح عمری کو قلم بند کیا ہے۔

(۳) " مضامین واسطے اصلاح مسلمین " مصنف ڈی۔ ایچ۔ احمد۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۲۴۔ مصنف کا خیال ہے کہ اس وقت تک مسلمان ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ فرسودہ روایات کو ترک نہ کردیں۔ جب تک مسلمان ہر روز نماز کے پابند رہیں گے، روزہ نہ رکھیں گے، اس وقت تک ان کی ترقی ممکن نہیں، کیونکہ مصنف کے خیال کے مطابق ان مذہبی کاموں کو ادا کرنے ہی میں مسلمانوں

کا زیادہ تر وقت صرف ہو جاتا ہے اور انھیں وقت میسر نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ترقی کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر و قابلِ قدر قدم اٹھائیں۔ مذہب کے سخت پابند ہونے کی وجہ سے وہ کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ نیز مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ محمدی قانون جس کے تحت مسلمانوں کی جائداد کی تقسیم عمل میں آتی ہے میں تبدیلی ضروری ہے چونکہ وہ کہتے ہیں کہ جائداد کے بہت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے مسلمان روز بروز غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف ہندو لا کو بہتر قرار دیتا ہے۔

۴) "رکن الاعظم" مصنف ایچ۔ رحیم اللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ حالانکہ مصنف ڈھاکہ کا باشندہ تھا۔ صفحات ۲۰۔ اس کتاب میں نماز ادا کرنے سے قبل کیونکر پاک صاف ہونا چاہیئے کا مختصر ذکر ہے۔

۵) "وظیفۂ بے چین" مصنف مولوی امام الدین۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۲۸۔ مصنف سہارنپور کے باشندے تھے۔ یہ کتاب حضرت محمد کی مختصر سوانح ہے۔

۶) "راحتی الانوار" مصنف حاجی محمد بشیر پھلواری شریف آبادی ——— مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۴۴ حضرت محمد کی پیدائش کا حال ہے۔

سنہ ۱۸۹۶ء

"ایک فقیر کی صدا" مصنف سعید الدین احمد۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۵۔ اس کتاب میں مصنف نے چند ایسے حقایق پر روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے مصنف کے مطابق مسلمانوں کی حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی ہے۔ مصنف نے ان خاندانوں کی سخت مخالفت کی ہے جو بیوہ کی شادی کے مخالف ہیں۔

سنہ ۱۸۹۸ء

"واعظ حلیم" مصنف عبدالحلیم۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔ اس کتاب میں شیعہ و سنی کے درمیان چند اہم اختلافات کا ذکر ہے۔

سنہ ۱۸۹۹ء

۱) "چراغِ ظلمت" مصنف محمد اسحاق۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۹۲۔ حضرت محمد کی تعریف میں کہی گئی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے۔

۲) "دیوان برہان" مصنف برہان اللہ۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۹۲۔ یہ بھی حضرت محمد کی تعریف میں کہی گئی ہے چند نظموں کا مجموعہ ہے۔

سائی مذہب و سماج

سنہ ۱۸۰۵ء

"عہد جدید" THE NEW TESTAMENT مترجم مرزا محمد فطرت مسٹر ڈبلیو ہنٹر نے اس ترجمہ کو اصل گریک زبان کی کتاب سے ملا کر پرکھا۔ صفحات ۴۸۱۔ مطبع ہندوستانی کلکتہ۔

سنہ ۱۸۱۴ء

۱) انجیل مقدس ... مقام اشاعت ... مترجم مرزا محمد فطرت صفحات ۵۳۸۔

(۲) "دعائے عام کی کتاب" مصنفہ ایچ ۔ مارش ۔ صفحات ۱۰۶۔ مقام اشاعت کلکتہ چرچ میں پڑھے جانے کے گیت ۔

سنہ ۱۸۱۹ء

"متی کی انجیل" بائبل سوسائٹی کلکتہ کے لئے فلپ سپریل نے مطبع ہندوستانی کلکتہ سے شائع کیا۔ صفحات ۱۹۶۔

سنہ ۱۸۲۲ء

"کتاب مقدس کا مختصر احوال" مصنفہ ریورنٹ سلام۔ صفحات ۳۵۳۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔

سنہ ۱۸۲۳ء

"پیدائش کی کتاب" THE BOOK OF GENESIS صفحات ۱۸۵۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

سنہ ۱۸۲۵ء

"اشیعا کی کتاب" صفحات ۱۸۵۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔

سنہ ۱۸۳۶ء

(۱) "انجیل مقدس" بنارس کمیٹی کا ترجمہ کیا ہوا ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ صفحات ۱۲۱۔

(۲) "دین عیسوی کی سچائی کا ثبوت" صفحات ۱۱۴۔ بائبل سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا۔

سنہ ۱۸۳۹ء

"خداوند یسوع مسیح کی انجیل" یونانی زبان سے اردو میں ترجمہ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۔ صفحات ۸۲۲

سنہ ۱۸۴۱ء

"کتاب مقدس المسیح" بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۔ گریک زبان سے ترجمہ ۔ صفحات ۵۲۴

سنہ ۱۸۴۲ء

"کتاب المقدس، پیدائش سے آخر تک، جلد اول" بائبل سوسائٹی پریس کلکتہ ۔

سنہ ۱۸۴۳ء

(۱) "کتاب المقدس، ایوب سے ملاکی تک" جلد دوم ۔ بائبل پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔

(۲) "میزان الحق" مصنفہ پادری فانڈر ۔ کلکتہ ٹراکٹ سوسائٹی کے لئے آرفن اسکول پریس کلکتہ سے چھاپ کر شائع کیا گیا ۔ صفحات ۳۲۸۔ یہ اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے ۔ اس تصنیف میں پادری نے مسلمانوں کو عیسائی مذہب کے مطابق نصیحتیں کی ہیں ۔ کتاب ان اشعار پر ختم ہوتی ہے ۔

"غرض جو میری نصیحت تھی سو کیا میں نے
خدا کو سونپ کے تجھکو میں کوچ کرتا ہوں

گراس کو شوق سے نونے سُنا، سُنا، سنا
ہے قاصد کا فقط کام صرف پہنچانا"

سنہ ۱۸۶۰ء

• سرچشمۂ محبت" مصنف ایس۔ سلاٹر۔ آپ بشپ کالج کلکتہ کے پروفیسر تھے۔ صفحات ۱۰۰۔

سنہ ۱۸۷۸ء

• خداداد رتن ہار" بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ بائبل کے چند منتخب حصوں کا ترجمہ۔ صفحات ۸۱۔

سنہ ۱۸۸۱ء

• مسیحوں کے گیت" مصنف شجاعت علی۔ ریورنٹ ڈبلیو تھامس نے بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے شائع کیا۔ صفحات ۴۸ ہیں۔

سنہ ۱۸۸۴ء

(۱) " صلیب اصلی" مصنف منشی عنایت اللہ۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ صفحات ۳۶۔

(۲) " کا فرسیحی بہ جواب بیا رمحمد" مصنف ریورنٹ ڈاکٹر سی باڈمن صفحات ۱۶۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ اخبار یار محمدی میں عیسائی مذہب کے خلاف جو مضمون چھپا تھا یہ کتابچہ اُسی کا جواب ہے۔

(۳) " مباحثہ" مصنف منشی عنایت اللہ۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ صفحات ۴۸ ہیں۔

(۴) " مسلمانوں کا حضرت محمدؐ" مصنف عنایت اللہ۔ . . . . . . مصنف نے اسلام پر سخت حملے کے ہیں اور یہاں تک کہا کہ قرآن مجید خدا کی کتاب ہرگز نہیں ہے۔

(۵) " منشی نواب علی کی خوش بیانی کا جواب طرف سے لارنس صاحب کے" مصنف ٹی۔ لارنس۔ مقام اشاعت کلکتہ۔ صفحات ۴۸ ہیں۔

سنہ ۱۸۸۶ء

" واقعۂ بہتانی باطل" مصنف ریورنٹ مولوی امام حسین۔ بپٹسٹ پریس کلکتہ والوں نے شائع کیا۔ صفحات ۲۰ ہیں۔

سنہ ۱۸۸۸ء

" مشکلات المسلمین" مصنف ریورنٹ حسن علی بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ صفحات ۴۰۔ اس کتابچہ میں حسن علی نے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو چند مسلم عالموں نے "عصر جدید" پر کئے تھے۔

سنہ ۱۸۸۹ء

• جاتی جانی اسلام" مصنف ریورنٹ جانی علی۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ صفحات ۳۲۔ مصنف نے قرآن شریف سے مختلف کلمے لے کر اُن میں اغلاط بنانے ہوئے اعتراضات کئے ہیں۔

سنہ ۱۸۹۲ء

" یسوع مسیح کی تعریف" مصنف مولوی حسن علی۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ۔ صفحات ۱۶۔

ہندو مذہب اور سماج

سنہ ۱۸۷۸ء

" بیوستھا چندریکا " مصنف شاما چرن سرکار ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ کتاب دو جلدوں میں ہے اور جلد صفحات ۸۴۸ ۱۲ ہیں ۔ یہ ہندولا کے سلسلے میں پہلی اردو تصنیف ہے جو عرصہ تک سوپریم کورٹ کے علاوہ دیگر عدالتوں میں کام آتی رہی ہے ۔ مصنف کے سلسلے میں میں " بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات " میں لکھ چکا ہوں ۔

سنہ ۱۸۸۶ء

" قانون شادی کائست " مصنف تارینی پرشاد ۔ کلکتہ سے چھاپ کر مصنف نے اسے بھاگلپور سے شائع کیا ۔ کتاب کے تین حصے ہیں ۔ ہر حصے کے صفحات ۲۳ ہیں ۔ اس تصنیف میں کائستوں کی شادی کے سلسلے میں وہ فیصلے درج کئے گئے ہیں جو ریاست بہار کے کائستوں کے ایک جلسے میں شادی بیاہ میں فضول اخراجات کی روک تھام کے لئے مرتب کئے گئے تھے اور ان فیصلوں کو صرف ریاست بہار کے کائستوں پر ہی لازم قرار دیا گیا ہے ۔

سنہ ۱۸۹۱ء

" اصول دھرم شاستر " مصنف بخشی نرسنگ نرائن ۔ صفحات ۱۰۸ ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ یہ انگریزی تصنیف ہندولا جو کہ گوپال چندر سرکار کی تصنیف ہے ۔ کا اردو ترجمہ ہے بخشی نرسنگ نرائن نے اس کا ترجمہ سنسکرت میں بھی کیا ۔

سنہ ۱۸۹۶ء

" مہا مدگر " مصنف دینا ناتھ دیب ۔ یہ تصنیف مشترکہ طور پر انگریزی سنسکرت اور اردو کی ہے ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ صفحات ۴۱ ۔ یہ سنسکرت کے نامور مصنف شنکر آچاریہ کی ایک اخلاقی نظم کا منظوم اردو نیز انگریزی ترجمہ ہے ۔

تصوف

سنہ ۱۸۸۴ء

(۱) " کشاف القلوب " مصنفہ محمد عبدالاحد شاہ فرفراری ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔

(۲) " شرح کشاف القلوب " مصنفہ شاہ اکرام الحق ۔ مذکورہ کتاب کی شرح ہے ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ صفحات ۷۲ ۔

سنہ ۱۸۹۶ء

" ہدایت توحید " مصنفہ محمد ولایت علی ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ صفحات ۴۸ ۔ اس میں صوفی مکتبہ فکر کا مختصر بیان ہے ۔

سنہ ۱۸۹۷ء

(۱) " کلکتہ کی سیر " مصنف ہدایت اللہ ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ یہ کتاب مصنف کے سفر کلکتہ کا نتیجہ ہے ۔ جب آپ کلکتہ آئے تو آپ کی ملاقات یہاں کے چند صوفی فقیروں سے ہوئی جن کے خیالات آپ کے خیالات سے بالکل جدا تھے ۔ لہٰذا مصنف نے اس کتابچہ میں ان پر تنقید کی ہے ۔

(۲) " اصلیت تذمزوریہ " مصنف کریم الدین ۔ مقام اشاعت کلکتہ ۔ صفحات ۔ یہ صوفی فلسفہ کا مختصر خلاصہ ہے ۔

محمد انصار اللہ نظر

دفترِ پریشاں کا ایک قلمی نسخہ

کلیاتِ ناسخ پہلی مرتبہ ۱۲۵۰ھ میں طباعت کی منزلوں سے گزرا اور ۱۲۵۹ھ میں میر علی اوسط رشک کے غلط نامے کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ بعد کے جتنے بھی ایڈیشن ہیں سب اسی مطبوعہ نسخے سے تیار کئے گئے ہیں میر رشک نے کلیاتِ ناسخ مرتب کرنے کے بعد ایک قطعہ تاریخ کہا:

"تصحیح اغلاط و تنقید الفاظ کلیات شیخ امام بخش ناسخ از میر علی اوسط متخلص بہ رشک"

مرتب ہوا جب کہ دیوان سب — مجھے قصدِ صحت کا پیدا ہوا

تلمذ میں ناسخ کی سیکھا جو تھا — وہ تحریر میں آشکارا ہوا

ہوئیں سہوِ کاتب کی لفظیں درست — بنا جو کہ نسیان املا ہوا

مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا — تبدل میں جو کچھ ہویدا ہوا

مباہات لے رشک کیوں کر نہ ہو — کہ ناسخ سا استاد میرا ہوا

خدا دے اسے حلہائے جناب — مرا نام اس سے سراپا ہوا

کہاں میں کہاں وہ فصیح و بلیغ — میں ذرہ وہ خورشید پیدا ہوا

غلط نامہ فضلِ الٰہی سے سب — مرتب بہ ترتیب اعلا ہوا

یہ مصراعِ تاریخ پایا درست
غلط نامہ دیوان کا زیبا ہوا

۱۲۵۹

میر رشک کا مرتب کردہ یہ غلط نامہ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے اور جیسا کہ قطعات تاریخ سے ظاہر ہے اس کی ترتیب میں کئی ماہ صرف ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیاتِ ناسخ کی طباعت میر رشک ہی کے اہتمام میں ہوئی تھی اور انھوں نے حسبِ ضرورت اس کی تصحیح بھی کی تھی۔ ناسخ کے دو دیوان کے ان کی زندگی میں طبع ہونے کا اب تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے بلکہ میر رشک ہی نے ۱۲۵۴ھ میں پہلی مرتبہ ان کا تیسرا دیوان

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں "ناسخ کے حالات" از راقم مطبوعہ نیا دور لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۵ء؟

بھی مرتب کیا تھا۔ ان واقعات کی بنیاد پر یہ خیال کر لینا کہ جس قلمی نسخے سے مطبوعہ کلیات کا متن تیار کیا گیا ہے وہ بھی میر رشک ہی کا کتابت کردہ تھا کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا، مطبوعہ کلیات چونکہ انھیں کے اہتمام میں چھپا تھا اس لئے کم از کم الفاظ کے املا اور رسم تحریر کی حد تک یقینی طور پر یہ میر رشک کے مسلک ہی کے مطابق ہیں۔

میر علی اوسط رشک ناسخ کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے، ناسخ نے بہت جلد اپنے کئی تلامذہ کو میر رشک سے اصلاح لینے کا مشورہ دے دیا تھا، میر صاحب کو بھی اپنے استاد سے غیر معمولی عقیدت اور موافقت تھی چنانچہ وہ ناسخ کے کلام کو ہمیشہ احترام سے سینے سے لگائے رہتے تھے، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ ناسخ کے دواوین جب بھی مکمل ہوئے ہوں گے میر رشک نے سب سے پہلے ان کی نقل حاصل کر لینے کی کوشش کی ہوگی چنانچہ مطبوعہ کلیات بھی اغلباً قدیم ترین نسخوں سے تیار ہوا ہوگا۔

کلیات ناسخ طبع اول کے "خاتمہ" کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ کہ بہ فرمایش سید صاحب ممدوح (میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل رئیس محلہ محمود نگر) کلیات مذکور (ناسخ) بطرز دل کش باحجم قلیل کہ دیوان اول مسمیٰ بہ "دیوان ناسخ" در متن و دیوان دوم مسمی بہ "دفتر پریشاں" بر حاشیہ و دیوان سوم مسمی بہ "دفتر شعر" بر حاشیہ در ھر ردیف بہ ضمیمہ دفتر پریشان و مثنوی و رباعیات و تاریخہای نیز در متن و بعضی از تاریخہا و رباعیات بر حاشیہ بتاریخ بست و یکم ذیحجہ سنہ یکہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت ہجری در مطبع محمدی بکتابت عبد الحی ولد عبد الستار سندیلی .... زیور طبع پوشید...."

صاف ظاہر ہے کہ ناسخ کے دیوان تین تھے اور مرتب (میر رشک) نے محض "حجم" کے خیال سے دوسرے اور تیسرے دیوان کو یکجا کر دیا لیکن تیسرا دیوان ناسخ کے انتقال کے بعد مرتب ہونے کے سبب شہرت نہیں پا سکا تھا چنانچہ ابھی تک اس کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے البتہ دفتر پریشاں (دیوان دوم) کے کئی قلمی نسخوں کا علم ہے جس سے اس کی شہرت کا بھی ثبوت ملتا ہے ــــ راقم سطور کے پاس بھی اس کا ایک ناقص الطرفین قلمی نسخہ موجود ہے اور سطور ذیل میں اس کا تعارف مقصود ہے۔

اس نسخے پر اوراق کے اعداد شمار درج ہیں جن سے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ شروع کے صرف آٹھ ورق ضائع ہوئے ہیں۔ آخری ورق (۱۰۲) کے ترک کے لفظ (عین) سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہے کہ غزلیات کا سلسلہ بعد کے اوراق پر بھی جاری تھا۔

نسخے کے ورق ۱۵ پر انگریزی میں بہاری لال طالبعلم گورنمنٹ کالج بریلی کے دستخط ہیں جن کے نیچے تاریخ (۰۷-۱۱-۰۰) تحریر ہے، ورق ۹۵ پر بھی انگریزی ہی میں اسی طالبعلم کے دستخط کے ساتھ تاریخ (۰۰/۱۰/۶۵) درج ہے اس دستخط سے اتنی بات اور معلوم ہوتی ہے کہ یہ "ہائی اسکول کلاس سکشن اے" کا طالبعلم تھا، بظاہر اس کا امکان نہیں کہ نسخے کا کاتب وہی ہو البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۰ء میں یہ نسخہ اس کی تحویل میں تھا۔

اس نسخے میں ایسے اشعار (جن میں مقطعے بھی شامل ہیں) کی تعداد کافی ہے جو بعد میں قلمزد کر دیئے گئے ہیں بظاہر اس کا حق مصنف، کاتب یا مصحح ہی کو پہنچتا ہے۔ اس بنا پر نسخے کے متعلق یہی باتیں قرین قیاس ہیں کہ:

۱۔ یا تو یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور وہ حسب ضرورت اس میں سے اشعار قلمزد کرتا رہا۔

۲۔ یا کاتب نے سہواً وہ اشعار کہیں سے لکھ دیئے تھے، بعد میں خیال آیا تو اس نے ان کو قلمزد کر دیا (لیکن اس کا امکان اس لئے نہیں ہے کہ بعض مقطعے بھی اسی زد میں آئے ہیں)

۳۔ یا یہ ہو کہ کاتب نے ایک نسخے سے نقل تیار کی بعد میں اسے مصنف کا نسخہ (یا اسی حد تک معتبر کوئی اور نسخہ) دستیاب ہو گیا ہو اور اس سے اس نے اپنی نقل کا مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کر لی ہو۔

چوں کہ داخلی یا خارجی کوئی شہادت ایسی موجود نہیں جس سے حقیقت معلوم ہو سکے اس لئے فی الوقت آخری صورت ہی کو تسلیم کرنا مناسب ہے لیکن اس صورت میں بھی نسخے کا معتبر ہونا لازم آتا ہے۔

مطبوعہ کلیات کے مقابلے میں اس نسخے میں اشعار کی تعداد بھی مختلف ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے:

نسخہ قلمی		کلیات مطبوعہ	
تعداد اشعار	زاید اشعار	تعداد اشعار	اشعار زاید
۲۱	.... ہوگا یونہی اپنا اگر طوفان اشک یہ گل خورشید آخر نیلوفر ہو جائے گا، سن لے ہرکاروں سے اخبار زمانہ چار روز آتے ہی پیک اجل کے بے خبر ہو جائے گا،	۲۰	طور کا شعلہ ہمارے شمع رو کے سامنے سنگ میں پنہاں ابھی مثل شرر ہو جائے گا
۱۷	سینکڑوں ڈوبیں گے — الخ۔ قلمی میں لکھا تھا بعد میں قلمزد کر دیا گیا ہے۔	۱۸	اے جنوں مجھ زار کا فربہ بدن ہو جائے گا جو لگاوے گا وہ پتھر جزو تن ہو جائے گا سینکڑوں ڈوبیں گے عاشق جاتے جاتے حسن کے خط سے خس پوش آپکا چاہ ذقن ہو جائے گا
۱	قاصدی کا کام تجھ سے اے صبا ہو جائے گا یا یونہیں حسرت میں دم اپنا ہوا ہو جائے گا (نکلا) —— لیکن قلمزد کر دیا گیا		
۱۷	(یہاں تک) رہے ہیں داغ فراق اپنے مشتعل ہم مرگئے نشان نہیں جسم زار کا	۱۶	
		۱۵	کوئی لکھتا ہوں اگر مضمون دل بیتاب کا خط میں ہو جاتا ہے عالم ماہئ بے آب کا

کرسکیں اغیار کیونکر خون مجھ بیتاب کا
ہر کسی سے کشتہ ہو سکتا ہے کب سیماب کا

ذکر کیا ہے ہجر ساقی میں شراب ناب کا
جبکہ اپنے حلق سے اترے نہ قطرہ آب کا

عشق گیسو میں یہ عالم ہے دل بیتاب کا
نالۂ بیجاں جو ہے اک سانپ ہے سیاب کا

۱۹	دیتے ہیں ۔ الخ قلمی میں درج تھا لیکن قلمزد کر دیا گیا ہے	۲۰	دیتے ہیں ساکنِ الٰہ آباد مجھ کو وحشی خطاب اے قاصد
۱۴	۔	۱۳	ابروؤں پر ہے گلال اور مژہ پر ہے عبید سرخ آتی ہیں کمانیں نظر اور تیر سفید
۱۷	میرے بختوں ۔ الخ لکھ کر قلمزد کر دیا گیا ہے	۱۸	میری بختوں نے زمانے کی سیاہی لے لی ہو نہ جائے کہیں قاتل تری اب ڈھال سفید
۱۴	اے دل ہے لقائے یار مشکل ہو کاش لقائے قاصد یار	۱۱	ــــــ
۱۸	ہوتے ہیں گلبن قلم ہوتا ہوں مرفوع القلم دوش پر لکھے نہیں جاتے ہیں عصیاں ہر برس	۱۷	ــــــ
۱۳	ننگ رکھتا ہو جو خط کے نام سے ؛ کیا لکھے مجھ کو وہ گل رخسار خط	۱۱	ــــــ
۶	کسکو ناسخ ۔ الخ لکھا تھا، پھر قلمزد کیا گیا	۷	کس کو ناسخ سناؤں یہ غزل کون سمجھے گا بھلا معنائے داغ
۱۴	میں ہی اے ناسخ ۔ الخ لکھنے بعد قلمزد کیا گیا	۱۶	دولت تقدیر کو تدبیر کی حاجت نہیں معدن زر ہے جہاں اکسیر کی حاجت نہیں

میں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالب دیوان میر
کون ہے جس کو کلام میر کی حاجت نہیں

۱۴	پلا دیا مجھے جھوٹا جو پانی ساقی نے چڑھا یہ نشاہ (کذا) کہ جسکا کبھی اتار نہیں	۱۳	ــــــ

کیوں ہیں اشک ۔ الخ لکھا تھا پھر کاٹ دیا گیا	۱۱	کیوں ہیں اشک اپنے پھلجھڑی کی طرح شب فرقت شب برات نہیں
یہ دو شعر لکھے ہوئے تھے، بعد میں کاٹ دیئے گئے، میر صاحب کا یہ مطلع ہے مجھے وردِ زباں اور ناسخ کوئی اب اس کے سوا کام نہیں دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں	۱۰	میر صاحب ۔ الخ اور دن نہیں ۔ الخ دونوں شعر مطبوعہ میں بھی غیر موجود۔
یہ چار شعر لکھے تھے بعد میں قلمزد کئے گئے ہیں: کہنے لگا جو وہ بہت کم سن مجھے شہید سر پر لگائی تو لگی تلوار پاؤں میں پہنے نہ ڈال ضعف میں اے طفلِ برہمن کافی ہے مجھ کو رشتۂ زنار پاؤں میں دوڑا میں گال چھونے کو قاتل تو اب لگا دو چار تیغ ہاتھ میں دو چار پاؤں میں سودائے زلفِ یار میں ہم جس طرف چلے ہر گام پر لپٹنے لگا مار مار پاؤں میں اور یہ ایک شعر زائد تحریر ہے جو مطبوعہ میں نہیں ہے: اک عرش پر قدم ہے زمیں پر ہے دوسرا لغزش اسی سے رکھتے ہیں مجذوب پاؤں میں	۱۷	مطبوعہ میں پانچواں شعر غیر موجود
یہ شعر لکھا تھا مگر پھر کاٹ دیا گیا: دونوں ہاتھوں میں جو ہو ایک تو ہو جائے بنا اس کے چھو سکتے ہیں ہم یا اسے کر سکتے ہیں	۱۰	مطبوعہ میں "دونوں ہاتھوں ۔ الخ" غیر موجود
یہ دو اشعار بھی ہیں رات دن سوئے در و بام نظر رکھتے ہیں نظر آجاؤ کہیں ہم بھی بصر رکھتے ہیں		مطبوعہ میں یہی اشعار اس طرح تحریر ہیں: نظر آجاؤ کہیں ہم بھی بصر رکھتے ہیں بار جاتا ہے جدھر سانہ نظر رکھتے ہیں

	یار جاتا ہے جدھر ساتھ نظر رکھتے ہیں گھر میں ہم رہتے ہیں پر اس کی خبر رکھتے ہیں		رات دن سوے در و بام نظر رکھتے ہیں گھر میں ہم رہتے ہیں پر اس کی خبر رکھتے ہیں
۱۹	ہے ناخن بریدہ ترا تیغ سے زیاد ٹوٹا تراشنے میں تو خنجر سے کم نہیں	۱۸	—
۲۲	—	۲۳	صیاد یہ تیرے دم خنجر کے ہیں مشتاق دم رکھتے ہیں صحراؤں کے نخچیر گلے میں
۶	نا اہل کے ... الخ لکھا تھا، پھر کاٹ دیا گیا	۶	نا اہل کے رمضاں میں ہیں پڑھوں خاک نماز سوے قبلہ تو خدا زیر کھڑے رہتے ہیں
۱۴	—	۱۶	وہ بھی قدرت جہاں تا تیغ مہجور نہیں صرد ہے قمری نہیں دار ہے منصور نہیں
			ہم دم غش میں ہیں ہلیں دوڑ کے تم لے آؤ ابھی نزدیک وہ نظام ہے کہیں دم نہیں
۹	—	۱۰	بے طرح آج مری نیند اڑی جاتی ہے دیکھو تکیوں میں تو کوئی پر سرخاب نہیں
۱۰	—	۱۱	ہے مجھے گور اس کے گھر سے قبول کیا رقیبوں کے درمیاں جاؤں
۱۷	—	۱۸	ہائے کیا وحشت ہے اس صیاد کو مجھ صید سے حلقہ ہائے چشم آہو جانتا ہے دام کو
؟	دیکھتا ہوں دیدۂ باطن سے عکس روئے یار ہے بجائے دل ازل سے میرے بر میں آئینہ	۱۴	—
؟	کر دیا زرد ایسا رنگ فرقت نے سبھے ا میرے پر تو سے ہوا ہے چشم بیمار آئینہ	۴۲	
۱۸	بہیں جاتی ہیں تصور سے نگاہیں تیری مثل مژگاں مری آنکھوں میں ترے تیر رہے	۱۹	لے جنوں ہے یہ ہوس پاؤں میں زنجیر رہے ہاتھوں میں سلسلۂ زلف گرہ گیر رہے
	یہ شعر لکھا تھا، قلم زد کر دیا گیا : کہتے قاتل کو نکل جاؤں نہ مدفن سے کہیں بعد مردن بھی مرے پاؤں میں زنجیر رہے	۷	

عندلیبیں کہتی ہیں وہ دست رنگیں دیکھ کر شاخ مرجاں میں اب اپنا آشیانا کیجیے	۱۱	—
جس طرح وہ ہے مکاں یہ بھی تو ہے تیرا مکاں دل میں بھی اب تیری دیواروں سے روزن چاہیے	۲۲	—
پیچھے پیچھے ہم بھی سوئے کوچۂ دلبر چلے بعد مردن دوست جب ہم کو لحد میں دھر چلے	۱۹	بعد مردن دوست جب ہم کو لحد میں دھر چلے پیچھے پیچھے ہم بھی سوئے کوچۂ دلبر چلے
شب مہ جام میں پرتو جو پڑے ساقی کا ہوئے نور سے جام مہ کامل خالی		—
—	۷	نہ ہوئے دیدۂ تر اشکوں سے اک پل خالی کبھی ہوتے نہیں پانی سے یہ بادل خالی
اس پری رخسار — الخ لکھ کر قلمزد کیا گیا	۳۶	اس پری رخسار پر پھبتی کہی ہے حور کی سچ تو یہ ہے سوجھتی ہے کیا ہی مجھ کو دور کی
یاں صبح دم ہے طول شب ہجر کی ہوس گویا کہ پیری میں ہے تمنا شراب کی	۲۵	—
غش آگیا ہے مجھے رند و فراق ساقی میں شراب مجھ پہ چھڑک دو گلاب کے بدلے لیکن کاٹ دیا گیا ہے۔	۲۳	—
آتش رنگ حنا سے ہو گیا بریاں بٹیر ہاتھ میں تیرے صنم کوئی سمندر چاہیے	۱۸	—
یار کے دروازے سے کیونکر اٹھوں میں ناتواں بازو اس کا قوت بازو نظر آیا مجھے	۲۰	—
محتسب سے دختر رز کو چھپائیں کیوں نہ ہم چاہیے پیر مغاں حرمت تری ناموس کی	۱۰	—
شمع کو میسر یہ خانے سے ہے ایسی گریز شعلے میں پرواد دیکھی کرمک شب تاب کی	۱۴	—

۱۱	زندہ ہوں دیدہ سے بھی چاہیے نسبت ضرور تا کجا گوروں کے مردوں کو پکارا چاہیے	۱۰	—
۱۷	آگ میں پڑ جاتی ہے جو چیز ہو جاتی ہے پاک پاک ہے اپنی نگاہ اس سے آتشناک سے	۱۶	—
۹	—	۱۰	ہجر میں میرے دہاں (کذا) سے آشنا جا سے ساغر ساقیا اب بادہ ہے
۳۱	بڑی ہی خاردار نہیں جیسے خار دشت الفت نیچے جنوں مرے پا دل سے خار کی	۲۰	—
۹	غیر یار کوئی نہیں اپنے سوا دال اس پر لا تسبوا الدھر ہے	۸	—
۱۴	—	۱۵	دیکھتا ہے قاصد نامہ نہ سنتا ہے پیام کس طرح ہو اطلاع اس کو ہمارے حال کی

اس میں وہ اشعار شامل نہیں ہیں جو قلمی نسخے میں حاشیہ پر جا بجا لکھ دیے گئے تھے، وجہ یہ ہے کہ جز بندی میں اوراق کی تراش میں ان میں سے تقریباً سب ہی اس حد تک مجروح ہو گئے ہیں کہ اب ان کا پڑھ لینا بھی ممکن نہیں مثال کے طور پر خدارا آئینہ ہمارا آئینہ کی غزل میں ایک شعر کا مصرعہ اولیٰ یہ ہے۔

دولت سردار سے پائے ہیں شہرت صاف دل

مصرعہ ثانی تراش میں ضایع ہو گیا، مطبوعہ کلیات میں بھی یہ شعر درج نہیں ہے۔ اشعار کے معاملے میں اس فرق پر غور کریں تو بطور مجموعی ذہن میں یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ قلمی نسخے میں مطبوعہ کلیات کے بیشتر وہی اشعار محذوف ہیں جن میں قباحت کی کوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ یہ قباحت محض مضمون ہی کی حد تک نہیں ہے بلکہ تشبیہوں کے نقص یا بیان میں کسی کوتاہی کو بھی دخل ہے مثال کے طور پر آخر الذکر شعر میں موقع سے اس کے استعمال کے علاوہ یہ مضمون قاصد کے مقابلے میں کسی ساقی، یار رفیق یا خود اپنے دل سے تخاطب کا مقتضی ہے اسی طرح سے

نہ ہوئے دیدہ تر اشکوں سے اک پل خالی
کبھی ہوتے نہیں پانی سے یہ بادل خالی

اس شعر میں دیدۂ تر کو بادل کہنے میں غرابت کا عیب ظاہر ہے معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخے کی ترتیب کے وقت ایسے تمام اشعار نکال دینے کی کوشش کی گئی ہے جن پر کسی نوعیت کا اعتراض متوقع تھا۔ نظر ثانی میں جو کتابت کے بعد کی گئی باقی ماندہ قابل گرفت اشعار کو بھی قلمزد کر دیا گیا، یہ کام ظاہر اخود شاعر کے سوا دوسرے سے متوقع نہیں (ناسخ کے متعلق کوئی روایت ایسی سننے میں نہیں آئی کہ انھوں نے کسی دوسر

〃 قمیص ہو جائے مری رد بھی یوسف کی طرح — دھجیاں آئے جو تیرے سب زنداں کی طرف

جائے مرا

〃 گورا گورا بدن سفید لباس — یہ لطافت تو نسترن میں نہیں

یاسمن

〃 لے گیا جذب جانب سگِ یار — ہڈیاں بھی مرے کفن میں نہیں

بدن

〃 جب وہ خورشید درخشاں نظر آجائیگا — صدقے ہوویں گے وہیں شمس و قمر آنکھوں میں

صدقے ہوں گے وہیں قرص و قمر

〃 اور آفتاب رد سے کتابی دکھا ہمیں — ہر شمس بازغہ میں ہمارا سبق نہیں

ادھر

〃 آنکھوں کے ڈورے ہیں رگ یاقوت ہیروں میں — موتی جڑے ہیں لال ہیں منھ پر ورق نہیں

لعل — عرق

〃 یاس ہیں ذست ہے مثل یاسمیں منہ کے سفید — وصل جو مجھ کو میسر اس برہمن کا نہیں

سمن بر

〃 ہوں جاں بہ لب مگر نہیں آ سکتی ہے اجل — ظلمت کب سے آپ سے ڈھلتی ہے، ہجر میں

ایسی ڈھلتی

〃 چھوڑ کر اپنی نقل کر لو اضح اختیار — رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے

رتبہ مینار مسجد پست ہے

لیکن قلمی میں مصرعۂ ثانی پر مزید اصلاح کر کے اسے اس طرح بنا دیا گیا ہے ؎ قدر مسجد کے منارے سے ہے کم محراب سے

〃 آ پڑ جائے الٰہی تجھ پہ مجھ مخمور کی — محتسب تو نے مراتی کیا ہی چکا چور کی

یہی تجھ پر کسی

روتے ہیں یاد لب شیریں میں ہم — دیکھ زاہد یہ علی کی نہر ہے

عشق — عمل

ایسی ہے کس ساز کی آواز خوش — یار کے دروازے کی کیا پوا ہے

چول

آسماں پر کیوں نہ ہو تجھ سے مشابہہ آفتاب　　　کلک قدرت سے کھنچے تصویر اس کے تام کی
　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　کھنچی　　　　تیرے بام

یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ سطور بالا میں تمام اشعار کا مقابلہ کر دیا گیا ہے۔ صرف ضروری اختلافات کی نشاندہی کی گئی ہے۔
پر نگاہ کریں تو یہ بات بخوبی ذہن میں آجاتی ہے کہ متن میں اکثر اختلافات یا تو کتابت کی غلطی کے سبب ہیں یا مطبوعہ کلیات کا متن
کرتے ہوئے اشعار کو صحیح طور پر پڑھنے میں غلطی ہوئی (اس میں بے احتیاطی کو بھی دخل ہو سکتا ہے) بہرحال مطبوعہ کلیات کا مرتب
کا دعویٰ اس کی کتابت اور ترتیب کے متعلق پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ بعض مقامات پر میر رشک کے رسم تحریر نے بھی اختلاف
کو راہ دی ہے مثلاً لال کو لعل اور بازغے کو بازغہ لکھا گیا ہے ۔ لیکن زیادہ اہم وہ مقامات ہیں جہاں شعر کی معنوی یا صوری خوبی
میں اضافہ ہو گیا ہے، یہ اختلافات یقینی طور پر نہ محض اتفاقی ہو سکتے ہیں اور نہ کاتب کے سہو کا نتیجہ ان کو قرار دیا جا سکتا ہے انھیں قطعی
طور پر خود شاعر کی اصلاح قرار دینا پڑے گا۔ اور ایسی صورت میں ناسخ کے اندازِ فکر اور طرز بیان میں ارتقا کا بھی پتا چلتا ہے مثال کے
پہلے وہ رواج زمانہ کے مطابق طفل برہمن یا صرف برہمن کو بھی معشوق کی حیثیت سے جائز رکھتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے ا
ترک کیا اور اپنے اشعار میں نظر ثانی کے وقت ان الفاظ کو ہٹا دیا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا اُردو عربی فارسی الفاظ کا تلفظ اہل
کے مطابق کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ لغت کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے اور ایسے الفاظ کا املا اور تلفظ ان کی اصل کے مطابق
ہی چاہتے تھے، مثلاً صدقے کو بہ سکون ثانی کے بجائے بہ فتحہ ثانی نظم کرنے لگے تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے اہل دہلی کے قدیم محاورات
اور افعال کو بھی ترک کر دیا تھا۔ ان دونوں نسخوں کے اشعار میں ایک ایک لفظ کی جو تبدیلی ملتی ہے وہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم
کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ ناسخ ایک ایک لفظ کی بندش پر کتنی توجہ صرف کرتے تھے اور ہر لفظ کے مختلف پہلوؤں پر کس کس طرح غور و فکر کر
بہرحال ناسخ کے دوسرے دیوان کا یہ قلمی نسخہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر جتنا اہم ہے اتنا ہی ناسخ کے کلام کی خصوصیات
مطالعے کے سلسلے میں اہم بھی ہے۔ ابھی تک چونکہ ناسخ کے تیسرے دیوان کا کوئی نسخہ دریافت نہیں ہو سکا ہے اس کے سوا صورت
کہ مطبوعہ کلیات کی جلد دوم میں سے اس دیوان دوم کی غزلوں کو گھٹا دیا جائے باقی غزلیں من حیثیت الاکثر تیسرے دیوان ہی کی
جا سکتی ہیں۔ دیوان دوم کے اس قلمی نسخے کے متعلق اس پر تعجب ضرور ہے کہ اس میں غزلیات کی تحریر میں کسی ترتیب کا لحاظ
نہیں رکھا گیا۔

حکیم شفائی

زرعی یونیورسٹی اور اردو

قیام پاکستان کے بعد ملک کے ارباب حل وعقد کو اس امر کی فکر دامن گیر ہوئی کہ قوم کو سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی بھی حاصل ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جہاں نصاب تعلیم کو قومی تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی وہاں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ تعلیم کو غیر ملکی زبان کے بندھنوں سے آزاد کیا جائے۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر اس مطالبے کو ایک عرصہ تک تقویت حاصل نہ ہوسکی۔ بعض اصحاب نے اپنی کم مائیگی کو اردو کے سر منڈھ کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ موجودہ علوم کا بار اٹھاسکے مگر مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ ملک اور قوم کے وسیع تر مقاصد کے پیش نظر زرعی علوم کو اردو میں منتقل کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور ملک کی زرعی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے لیکن ہمارے ہاں شرح پیداوار بہت کم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ملک میں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے کاشتکاروں کی اکثریت ناخواندہ ہے اور جو لوگ اردو لکھے پڑھے ہیں ان کے لئے اردو زبان میں ان کی ضروریات کے مطابق زرعی لٹریچر موجود نہیں ان نیک مقاصد کے حصول کے لیے زرعی یونیورسٹی نے اپنی پانچ سالہ مختصر مدت قیام میں جو کوششیں کی ہیں۔ انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) لغات کی تالیف (۲) کتب ورسائل کی اشاعت (۳) اردو کے ذریعہ تعلیم اور توسیع۔

زرعی علوم کی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے زرعی یونیورسٹی نے شعبہ اردو قائم کیا شعبۂ اردو نے ایک ایسا جامع زرعی لغت مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے ذریعے تمام زرعی علوم کو اردو میں منتقل کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے پہلے مرحلے میں اصطلاحات کو یکجا کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ یونیورسٹی نے اپنے تمام تدریسی اور تحقیقی شعبوں کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ شعبہ اردو کو اپنے اپنے مضمون کی اصطلاحات

یا کریں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی نے ملک کے تمام سائنسی اور فنی اداروں سے اصطلاحات جمع کیں۔ ملک
ہر حصہ کی لائبریریوں سے سائنسی اور فنی کتابیں مستعار لے کر ان سے الفاظ اخذ کئے اور ان موضوعات
ہر قسم کے رسائل و جرائد اور کتابوں کا مطالعہ کیا اور مختلف زبانوں کے وہ تمام لغت چھان مارے جن سے
طلوبہ اصطلاحات دستیاب ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ شعبۂ اردو کے پاس ایک بہت بڑا ذخیرہ الفاظ جمع ہوگیا۔
میں وہ تمام الفاظ شامل تھے جو زراعت کے تمام شعبوں مثلاً فلاحت۔ حشریات۔ موسمیات۔ امراض نباتات۔
فظ نباتات۔ معاشیات۔ نسلیات۔ نباتیاتی کیمیا۔ طبیعیات۔ زرعی صنعت و حرفت۔ زرعی اقتصادیات۔ دیہی
بنیات۔ پرورش حیوانات۔ علاج حیوانات۔ دیہی ماحول اور دیہی زندگی میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔

زرعی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے سائنسی اور فنی الفاظ اور محاورات کے ترجمے اور اصطلاح سازی کا
کام بڑی تحقیق اور جانفشانی سے شروع کیا۔ سب سے پہلے تمام الفاظ کو حروف ابجد کے لحاظ سے ترتیب
گیا اور اس کے بعد ان الفاظ کو اردو زبان میں ڈھالنے کے لئے نہایت چھان بین اور گہری تحقیق کے بعد
یزی الفاظ کے وہ مترادف اردو الفاظ تلاش کئے گئے جو اردو زبان کے مختلف لغتوں، کتابوں اور
ائد و رسائل سے مل سکے۔ اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی نادر کتب اور تراجم سے بھی استفادہ کیا
۔ عربی، فارسی لغتوں اور کتابوں سے بھی ایسے الفاظ تلاش کئے گئے جو انگریزی زبان کے تراجم کی حیثیت
ے اردو میں جذب ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس ساری علمی کاوش میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ تراجم اور
متبادل الفاظ کی صورت میں جتنے بھی زیادہ سے زیادہ الفاظ مل سکیں وہ اس زرعی لغت میں شامل کرلئے
ئیں۔ تاکہ اردو زبان کا دامن سائنسی اصطلاحات سے مالامال ہوجائے۔ دوسری سطح پر شعبہ اردو نے ترجمہ اور
طلاح سازی کا کام کیا جن انگریزی الفاظ کے تراجم اردو، عربی اور فارسی سے نہ مل سکے ان کا خود ترجمہ کیا
الفاظ کا بھی اردو ترجمہ کیا گیا جن کے متبادل الفاظ عربی اور فارسی زبان میں تو موجود تھے۔ لیکن وہ مشکل اور دقیق تھے اس لیے ان
بی اور فارسی الفاظ کے ساتھ اردو الفاظ کا اضافہ کیا گیا۔ اس زرعی لغت میں اس بات کا خاص طور پر
ال رکھا گیا کہ یہ لغت بیک وقت ایک استاد، ایک طالب علم، ایک محقق، ایک سائنس داں، ایک کاشتکار
ر ایک عام پڑھے لکھے شخص کے لیے مفید ثابت ہوسکے۔ اس لغت کی تیاری کے لیے شعبۂ اردو کی کوششوں کا
ازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف انگریزی کے حرف "اے" سے شروع ہونے والے تین ہزار سائنسی
رفنی الفاظ کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے اور اب تک زرعی علوم کی چالیس ہزار اصطلاحات کو اردو کے قالب
، ڈھالا جا چکا ہے۔

زرعی یونیورسٹی نے زرعی علوم کے تمام مضامین پر مشتمل اس ضخیم لغت کی ترتیب کے علاوہ عمرانیات،

زراعیات اور علاج حیوانات پر بھی الگ الگ لغات مرتب کئے ہیں جو مذکورہ بالا لغت کی ترتیب کے طریق کار کے عین مطابق تیار کئے گئے ہیں۔ بہر طور شعبہ اردو نہایت خاموشی سے یہ اہم قومی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ زرعی اصطلاحات کے تراجم کو مستند حیثیت دینے کے لئے مغربی پاکستان اردو اکادمی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ چنانچہ شعبہ اردو تمام الفاظ کے ترجمے اردو اکادمی کو بھیجتا رہا ہے اور اردو زبان کے جید عالم ڈاکٹر سید عبداللہ ان پر نظر ثانی کرتے رہے ہیں۔

یونیورسٹی نے ناخواندہ اور نیم خواندہ افراد کو زرعی علوم سے آگاہ کرنے کے لئے اردو زبان کے ایسے پندرہ سو بنیادی الفاظ بھی جمع کئے ہیں۔ جن کی مدد سے زرعی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے کتابچے تحریر کئے جاتے ہیں یونیورسٹی اس قسم کے ایک سو کتابچے شائع کر چکی ہے ان کتابچوں کی مدد سے کم پڑھے لکھے لوگوں کو بھی زرعی علوم سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ زرعی یونیورسٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ صرف اردو زبان کے ذریعے ہی زرعی علوم اور زرعی تحقیق کو کاشتکاروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی نے قومی سطح پر زرعی سائنس کے شعور کو اجاگر کرنے کے لئے ایک سہ ماہی جریدہ "زرعی ڈائجسٹ" جاری کیا ہے۔ یہ رسالہ دلچسپ کہانیوں، افسانوں، مضامین، فیچرز، نظموں اور گیتوں کا حسین مرقع ہوتا ہے اس کی زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے اس رسالے کے دو شمارے چھپ چکے ہیں۔ جنھوں نے ہر طبقے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ زرعی ڈائجسٹ کو ملک کے نامور سائنس داں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے۔

زرعی یونیورسٹی میں درمیانہ درجہ اور مختصر مدت کے کورسوں کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ میٹرک پاس طلبا کے لئے زرعی یونیورسٹی میں تین کورس ہیں جن کا نصاب تعلیم اردو میں ہے ان میں جدید طریق کاشتکاری کی تربیت کا دو سالہ "اسٹیٹ منیجر کورس" پرورش حیوانات اور علاج حیوانات کا دو سالہ "لائیو سٹاک اسسٹنٹ کورس" اور مشینی کاشت کا ایک سالہ کورس شامل ہے یونیورسٹی نے ایگریکلچرل ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ رکھ غلاماں میانوالی نصاب تعلیم مرتب کیا ہے اور اس کے مطابق اردو میں کتابیں شائع کی ہیں۔ علاوہ ازیں لیبارٹری اسسٹنٹ اور لیبارٹری اٹنڈنٹ کے کورسوں کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی ہے یونیورسٹی نے دیہی رضا کاروں کو زراعت کی فنی تربیت دینے کے لئے اردو میں سہ ماہی فارم گائیڈ کورس شروع کیا ہے یونیورسٹی کاشتکاروں اور زراعت سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو بھی مختصر مدت کے کورسوں کی تعلیم بھی اردو میں دیتی ہے۔ کاشتکاروں کی عام ناخواندگی کے پیش نظر یونیورسٹی نے نہایت آسان اردو زبان میں تعلیم بالغاں کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے یونیورسٹی نے بنیادی الفاظ میں کاشتکاروں کے لئے آسان قاعدے اور عام فہم زرعی کتابچے شائع کئے ہیں جن کی مدد سے کاشتکار لکھنا پڑھنا بھی سیکھ جاتے ہیں اور زرعی علوم سے بھی کسی حد تک واقف ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یونیورسٹی میں مشرقی پاکستان اور غیر ممالک کے طلبہ کو اردو پڑھانے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ (بشکریہ نوائے وقت)

گرد و پیش

تصویر کا پہلا رخ

آج کچھ درد میرے دل میں ....

پاکستان کے دانشوروں، ماہرین تعلیم، سیاست دانوں، حکام، اعلیٰ طبقوں اور حکومت کی توجہ کے لئے روزنامہ "جنگ" کی ۶ جنوری کی اشاعت سے ایک خبر نقل کی جاتی ہے۔

" دارالسلام (تنزانیہ) ۴ جنوری (اے پ) تنزانیہ کی حکومت نے فوری طور پر انگریزی کو سرکاری دفاتر سے ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اور تنزانیہ کی قومی زبان سواحلی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کر دیا گیا ہے۔ اس فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے نائب صدر رشید کوادا نے کہا کہ یہ بات ہماری قومی عزت اور وقار کے منافی ہے کہ انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزی کو جاری رکھنا بڑی نادانی ہوگی، اس لئے کہ یہ ایک غیر ملکی زبان ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

پروفیسر حمید احمد خان کے ارشادات ۔ " غلامی کی نفسیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ محکوم انسان کو حاکم قوم کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بُری اور گھٹیا معلوم ہوتی ہے۔ اس فساد کی جڑ یہ بات ہے کہ اپنی قومی زبان کو غیر زبان کے مقابلے میں حقیر سمجھا جائے۔ غلام اپنے آقا کی زبان میں بات چیت کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ یہ دور ہم پر آیا اور خدا کا شکر ہے گزر گیا۔ اب ضرورت ہے کہ اپنی قومی زبان کی محبت اور عزت کا جذبہ بچوں کے دلوں میں پیدا کیا جائے فخر کا احساس پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے استاد بچوں کو یہ سکھائیں کہ اردو کس طرح خوبصورتی سے بولی اور لکھی جا سکتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری اور بڑی شرط یہ ہے کہ اردو کو نظام تعلیم میں جگہ دی جائے جو ہر آزاد ملک میں قومی زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر خود ہمارے گھر میں ایک غیر زبان گھر کی رانی بن کر بیٹھ رہی تو کون بے وقوف ہوگا جو ایسی قومی زبان پر فخر کرے گا جس کی اپنے گھر میں بھی کوئی عزت نہ ہو۔۔۔۔۔"

ادبی۔ تعلیمی تہذیبی اور علمی خبریں

جمیل الدین عالی، ادارۂ مصنفین پاکستان کے سکریٹری جنرل منتخب ہو گئے۔

کراچی ۲۲ر جنوری پاکستان رائٹرز گلڈ نے شمالی ویت نام پر امریکی بمباری کی شدید مذمت کی ہے گلڈ کی مرکزی جنرل باڈی کا اجلاس آج کراچی میں مسٹر عبداللہ ظہیر الدین لال میاں کی صدارت میں ہوا۔ جنرل باڈی نے مرکزی اور علاقائی انجمنوں کی رپورٹوں کا جائزہ لیا اور اس اجلاس میں گلڈ کے انتخاب عمل میں آئے اور مسٹر جمیل الدین عالی کو متفقہ طور پر گلڈ کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا ہے مرکزی کمیٹی میں ۲۳ ادیبوں کو منتخب کیا گیا۔ سکریٹری جنرل کے عہدے کے لئے پانچ امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کئے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ مسٹر عبداللہ ظہیر الدین۔ لال میاں۔ پرنسپل ابراہیم خان۔ مسٹر جی الانہ۔ مسٹر منیر چودھری۔ اور قاضی محمد دین۔ ان پانچوں امیدواروں نے مسٹر جمیل الدین عالی کے حق میں دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح مسٹر جمیل الدین عالی بلا مقابلہ سکریٹری جنرل منتخب کر لئے گئے اس سے قبل مسٹر جمیل الدین عالی گلڈ کے قائم مقام سکریٹری جنرل اور مرکزی معتمد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یونائیٹڈ بینک نے بیس ہزار روپے کے ادبی انعام کا اعلان کیا ہے۔ یہ ادبی انعام منتقل ہے اور اردو اور بنگلہ ادب اور بچوں کے ادب میں برابر تقسیم کیا جائے گا۔ جلسہ میں آٹھ قرار دادیں منظور کی گئی ہیں پہلی قرار داد میں شمالی ویت نام پر امریکہ کی بمباری کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے انسانیت کے منافی قرار دیا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ شمالی ویت نام سے تمام غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں دوسری قرارداد کے ذریعہ یہ طے کیا گیا کہ کولمبو کے افریقی ایشیائی رائٹرز بیورو سے ہر قسم کا تعاون کیا جائے یہ بیورو کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کے اصول کی مسلسل حمایت کر رہا ہے۔ تیسری قرار داد کے ذریعہ فحش اور پاکستان دشمن لٹریچر پر مکمل پابندی لگانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ چوتھی قرارداد کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ کھینور بھرے آکاش اور سر منتقل پر پابندی لگانے کے فیصلے کا نئے سرے سے جائزہ لے اور اس سلسلہ میں گلڈ کی ماہرین کمیٹی سے مشورہ کرے۔ پانچویں قرار داد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ نصابی کتابوں پر نظر ثانی کے بارے میں گلڈ کو بھی شامل کیا جائے گلڈ کو فلم سنسر بورڈ میں شامل کیا جائے۔ ساتویں قرار داد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ گلڈ کو مزید امداد دی جائے ادیبوں کو گلڈ کے اشاعت گھر سے کتابوں پر ۳۰ فیصد رعایت ملے گی۔

افریشیائی ادیبوں کی تیسری کانفرنس۔ قاہرہ ۸ر جنوری۔ افریشیائی اتحاد کے معتمد یوسف صباعی نے کہا ہے کہ افریشیائی ادیبوں کی تیسری کانفرنس میں چینی ادیبوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ کانفرنس ۲۵ر مارچ سے بیروت میں شروع ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ افریشیائی ادیبوں کی تنظیم کے حالیہ اجلاس میں کیا گیا ہے جو قاہرہ میں ہوا تھا۔ جناب یوسف صباعی نے یہ بھی بتایا کہ قاہرہ کے اجلاس میں افریشیائی ادیبوں کے بیورو کا مرکزی دفتر کولمبو سے قاہرہ تبدیل کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہے۔

فنکاروں سے صدر کی اپیل۔ حیدر آباد ۱۳ر جنوری۔ صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے شاعروں اور موسیقاروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسی نظموں، گیتوں اور موسیقی کی تخلیق کریں جو عوام کو ملکی ترقی سے متعلق

اہم مسائل کی طرف متوجہ کریں۔ صدر مملکت نے گورنر مغربی پاکستان کے نام ایک مکتوب میں کہا ہے کہ یہ وقت کی اولین ضرورت ہے کہ شعراء اور موسیقار اپنی نظمیں پیش کریں جو قومی اتحاد کے فروغ، غذائی پیداوار میں اضافے اور اسلامی اقدار کو مقبول بنانے میں معاون ثابت ہوں۔ نیز خاندانی منصوبہ بندی کو عام کرنے اور مستحکم مرکز کے قیام کی ضرورت سے عوام کو پوری طرح آگاہ کر سکیں۔

ایسی تخلیقات کے لئے انعامات بھی رکھے گئے ہیں۔

نئی قدریں کا شاعر نمبر

نئی قدریں۔ حیدرآباد (مغربی پاکستان) کا فکر جدید نمبر کے بعد پانچ سو صفحات پر مشتمل شاعر نمبر اواخر فروری میں شائع ہو رہا ہے جس میں پاک و ہند کے نمائندہ شاعروں پر مضامین اور خوش فکر شعراء کا کلام شامل ہے۔ یہ نمبر فروری کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔

"اکبرنامہ" کا نادر نسخہ

حال ہی میں برٹش میوزیم نے "اکبرنامہ" کا ایک اہم اور نادر نسخہ حاصل کیا ہے۔ لندن ٹائمز نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اکبر نے ایران، بخارا، مغربی ہندوستان کے ہندو اسکولوں اور شمالی اور دکن کے اسلامی مرکزوں کے مختلف مصوروں کی خدمات حاصل کر کے ایک نیا اسلوب مصوری پیدا کیا تھا۔ اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا کہ ان تصویروں میں یوروپی اثرات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ جو اکبر کی خدمات میں پیش ہونے والے عیسائی مشنریوں کے ہمراہ آنے والی تصویروں اور نقاشی کے نمونوں کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

"اکبرنامہ سے ہندوستانی مصوری کے اس دور کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک ایران کے نفیس اثرات اور دوسرے مناظر اور واقعات کی حقیقت پسندانہ پیشکش۔

ادارہ مصنفین کی رابطہ کمیٹی

لاہور ۳۰ دسمبر۔ پاکستان ادارہ مصنفین (رائٹرز گلڈ) نے افریشیائی امور کے لئے سات ارکان پر مشتمل ایک رابطہ کمیٹی کی تشکیل کی ہے جس کے صدر احمد ندیم قاسمی ہیں کمیٹی افریشیائی ادیبوں کے ادارے کی درخواست پر قائم کی گئی ہے جس کے ارکان حسب ذیل ہیں۔

جناب جمیل ملک، سید محمد تقی، صفدر میر، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین۔ رابطہ کمیٹی صوبے کے مختلف علاقوں میں ذیلی کمیٹیاں بھی قائم کرے گی۔ مشرقی پاکستان کے لئے الگ کمیٹی کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

سندھ یونیورسٹی کے لئے کتابیں

انگلش سنگیپ بک سوسائٹی کے زیر اہتمام ۲۵۰ کم قیمت کی کتابوں کی ایک نمائش سندھ یونیورسٹی میں کی گئی۔ اس کا افتتاح وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی جناب پروفیسر حسن علی اے رحمٰن نے کیا۔ نمائش کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ برٹش کونسل نے یہ کتابیں سندھ یونیورسٹی کو تحفتاً دی ہیں۔

ادیبوں کے لئے پلاٹ

کراچی۔ ۵ جنوری۔ صوبائی وزیر بلدیات اور بنیادی جمہوریت جناب محمد یاسین خاں وٹو نے کے ڈی اے کے ڈائرکٹر جنرل جناب مسعود نبی نور کو ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی کے عامل صحافیوں اور اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے متعلق رپورٹ ہفتہ بھر میں پیش کر دیں تاکہ انکی درخواستوں پر فیصلے جلد کئے جاسکیں۔

مصنفین اور ناشرین کتب کی خصوصی توجہ کے لئے

اردو زبان میں مختلف موضوعات پر ہر سال ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ دیگر ممالک میں تو ماہ بماہ نئی کتابوں کی فہرستیں شائع ہوتی ہیں، لیکن ہمارے یہاں اس قسم کا کوئی سلسلہ نہ ہونے کی وجہ سے صاحب ذوق حضرات کو نئی کتابوں کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں ہوتی اور خصوصاً لائبریری و اساتذہ جب نئی کتابیں خریدنے کے لئے فہرستیں مرتب کرتے ہیں تو ان کو سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے، ان دشواریوں کے پیش نظر اب ہم نے پاکستان کے دو کثیر الاشاعت ادبی رسائل ماہنامہ "قومی زبان" اور کتابی دنیا" کراچی میں "۱۹۶۷ء کی نئی مطبوعات" کے عنوان سے ہر ماہ ایک فہرست تیار کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے لیکن یہ مفید سلسلہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ہمارے مصنفین اور ناشرین ہم سے تعاون کریں۔ اس لئے تمام مصنفین و ناشرین سے اور بالخصوص ناشرین سے گزارش ہے کہ ۱۹۶۷ء میں جب بھی کوئی نئی کتاب شائع کی جائے تو مندرجہ ذیل معلومات سے مطلع فرمائیں۔

(۱) کتاب کا نام (۲) مصنف کا نام (۳) اگر ترجمہ ہے تو مترجم کا نام نیز کس کتاب کا ترجمہ اور کس زبان سے ترجمہ کیا گیا (۴) موضوع (۵) ایڈیشن (۶) سائز (۷)، تعداد صفحات (۸) قسم طباعت (۹) قسم جلد (۱۰) قیمت (۱۱) ناشر کا نام و پتہ۔ تفصیلات بھیجنے کا پتہ۔ شیخ اکرام احمد۔ کاشانۂ اکرام، ۳۶۳/۱، سعود آباد ملا۔ کراچی ۲۷

ایک اہم قرارداد۔ ۱۸ دسمبر نصیر آباد۔ ادارۂ ادبیات کا ایک خصوصی اجلاس صدر ادارہ رانا بھگوان داس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ایک قرارداد بہ اتفاق رائے منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ خصوصی اجلاس حکومت مغربی پاکستان اور اراکین صوبائی اسمبلی سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ بلا تاخیر اردو کو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دے کر مغربی پاکستان میں نافذ کر دیا جائے۔ قرارداد میں صوبائی اسمبلی کے اراکین سے توقع کی گئی ہے کہ وہ عوام کے صحیح نمائندے ہونے کے سبب اس عوامی خواہش کو پورا کرانے میں ہر ممکن مدد دیں گے۔

ایک اہم اعلان۔ منشی عبدالرحمان خاں نے اعلان کیا ہے کہ ان کی تالیفات اور تصنیفات ہر ناشر شائع کر سکتا ہے۔ جناب عبدالرحمان نے دینی تبلیغ کی وجہ سے اپنے حقوق سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے منشی عبدالرحمان صاحب نے ملتان سے یہ اعلان کرتے ہوئے اپنی ۲۵ کتابوں کی فہرست بھی شائع کی ہے۔

ذہنی امراض کی جڑ۔ انگریزی۔ ڈاکٹر فرخ ہاشمی ریسرچ فیلو شعبۂ نفسیات برمنگھم یونیورسٹی نے اپنی ایک کتاب "نسلی تعصبات" میں کہا ہے کہ جو لوگ نسلی امتیاز کو برقرار رکھنے میں تشدد سے کام لیتے ہیں وہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ اور انہیں اپنا علاج کرانا چاہئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تعصب اور لاعلمی احساس جرم کی پیداوار ہے اور ان تعصبات میں انگریزی پر اصرار بھی شامل ہے۔

عطیہ فیضی کے مضامین کی اشاعت مدیر خاتون پاکستان نے ۱۷ جنوری کو کراچی میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ

بہت جلد مرحومہ بیگم عطیہ فیضی کے علمی۔ ادبی اور ثقافتی موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق بیگم عطیہ فیضی نے اپنی حیات میں ان کو اپنا بیش قیمت سرمایہ عطا کیا تھا۔ جناب شفیق بریلوی نے عطیہ فیضی کے مداحین اور فنون لطیفہ کے پرستاروں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مشوروں سے خاتون پاکستان۔ ۵۔ گارڈن روڈ پر خط و کتابت کریں۔

شبلی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ حیدرآباد ۱۹ر جنوری۔ سندھ یونیورسٹی نے شعبۂ اردو جامعہ سندھ کے استاد سید سخی احمد ہاشمی کو ان کے مقالے "شبلی کا ذہنی ارتقا" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ سید سخی احمد ہاشمی اردو کے لیکچرار ہیں اور انہوں نے یہ مقالہ پچھلے سال یونیورسٹی کو پیش کیا ہے۔

شہر نگاراں کا پہلا نسخہ۔ مشہور ادیب سید سبط حسن کی کتاب "شہر نگاراں" کا پہلا نسخہ اردو جاپانی کمیٹی کے صدر جناب میاٹو نے ایک ہزار روپے میں خریدا ہے۔ یہ کتاب انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے شائع کی ہے۔

اس آئینہ خانے میں

شیریں مجروح پاکستان میں۔ افغانستان کی مشہور شاعرہ محترمہ شیریں مجروح گزشتہ سال پاکستان تشریف لائیں انہوں نے راولپنڈی۔ لاہور۔ سوات اور پشاور کی سیر کی۔ اباسین آرٹ سینٹر پشاور نے موصوفہ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے محترمہ شیریں مجروح نے کہا کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان اسلام کا لازوال رشتہ موجود ہے۔ انہوں نے کہا۔ علامہ اقبال نے جو پیغام دیا ہے وہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے ہے۔ اور علامہ اقبال کا درس حیات زندہ جاوید ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم اپنی ان تمام مشکلات پر قابو نہ پالے جو آج عالم اسلام کو درپیش ہیں۔ محترمہ شیریں مجروح نے طالبات کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش بھی دیکھی۔

زیڈ اے بخاری ٹیلی ویژن میں۔ مشہور شاعر اور ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل جناب زیڈ۔ اے بخاری کو کراچی ٹیلی ویژن اسٹیشن کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا ہے۔ کراچی میں ٹیلی ویژن اسٹیشن امسال اپنی سرگرمیاں شروع کر دے گا۔ یہ اسٹیشن کنٹری کلب روڈ پر لیاقت میموریل ہسپتال کے قریب قائم ہو رہا ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ بخاری صاحب کی نگرانی میں کراچی ٹیلی ویژن بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔

یادوں کے چراغ

مولانا محمد علی جوہر کی یاد۔ ۴ر جنوری کو لاہور میں مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں دو جلسے منعقد ہوئے۔ دونوں جلسوں میں مولانا کی قومی اور دینی خدمت کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسوں میں متفقہ طور پر حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مولانا کی تقریروں اور تحریروں کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل کو اسلام کے اس عظیم مجاہد کی زندگی اور اس کے مشن کے

متعلق سیر حاصل معلومات حاصل ہوسکیں۔ دوسرے جلسے میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔ لاہور میں مولانا کی یاد میں ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی جائے۔ کراچی میں یوم مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں خالق دینا ہال میں جمعیت العلمائے پاکستان کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ کراچی میونسپل کارپوریشن سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ خالق دینا ہال کی تعمیر نو کے وقت عمارت کے اس حصہ کو جوں کا توں رکھ جائے جہاں علی برادران پر تاریخی مقدمہ چلا تھا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین نے کی۔ اور کراچی کی ممتاز شخصیتوں، ادیبوں، صحافیوں اور طالب علموں نے شرکت کی۔

کپلنگ کی پانچ لافانی کتابیں۔ لارڈ ریڈ کلف نے رڈیارڈ کپلنگ کی پانچ کتابوں کی ایک فہرست پیش کرتے ہوئے لندن میں کپلنگ سوسائٹی کے ایک جلسے میں ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں یہ پانچ کتابیں آئندہ دو سو برسوں تک بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی رہیں گی۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ "دی جنگل بکس" - "کم" "پک آف پکس ہل" اور "ریوارڈز اینڈ فیریز"۔ یہ واضح رہے کہ کپلنگ بمبئی میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے برصغیر میں ایک صحافی کی حیثیت سے ممتاز خدمات انجام دیں۔

یوم الطاف حسین حالی۔ لاہور میں یکم جنوری کو مولانا الطاف حسین حالی کا ۵۲ واں یوم رحلت منایا گیا۔ تعلیمی سماعت گاہ میں ایک جلسے میں مولانا کی ملی اور ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ جلسے کی صدارت سپریم کورٹ کے جج جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا حالی ان دانشوروں میں سے تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھا اور اسلامیان ہند کو اس کے لئے ایک جدوجہد شروع کرنے کی ترغیب دی تھی۔ میاں بشیر احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ حالی قومی شاعری کے پیشوا تھے۔ انہوں نے شعر کو قوم کی تنقید اور تعمیر نو کے لئے مؤثر طور پر استعمال کیا اور مسلمانوں میں فکر و عمل کی روح پھونک دی۔ جناب احمد دین اظہر نے کہا کہ مولانا نے تن تنہا اردو شاعری کا مزاج بدل کر رکھ دیا اور اس سے قوم کی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنے کا کام لیا۔

ماتم میں ہم شریک

عطیہ فیضی کا انتقال پُرملال۔ بیگم عطیہ فیضی ۴ جنوری کو رات کے دس بجکر ۵ منٹ پر کراچی میں انتقال کر گئیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ مرحومہ گزشتہ کئی روز سے شدید علیل اور سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔ مرحومہ عطیہ فیضی کی عمر ۸۶ سال تھی۔ ان کے ساتھ فن و ثقافت کی ایک پوری تاریخ پاکستان کی سرزمین میں دفن ہوگئی۔ بیگم فیضی کی رحلت پر پورے پاکستان میں نہایت رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا۔ انجمن مصنفین پاکستان کے معتمد جناب جمیل الدین عالی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا گیا ہے کہ مرحومہ کی وفات سے علم و ثقافت کی دنیا سونی ہوگئی۔ افسوس کہ چند لوگوں کی ناقدری کے باعث مرحومہ کو بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ادارۂ قومی زبان اس قومی سانحہ پر انتہائی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

روسی ناول نویس کی وفات۔ ۱۸ جنوری کو لینن گراڈ میں روس کے مشہور ناول نویس نوگی پی کے ہرمن کا انتقال ہوگیا۔ ان کے حلق میں کینسر تھا۔ نوگی پی کے ہرمن روس کے مشہور ترین ناول نویسوں

شمار ہوتے تھے۔ ان کا پہلا ناول ۱۶ سال کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کے بعد ان کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ رحلت کے
ت وہ روس کے بہت بڑے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔

آئینۂ ہند

اردو کے لئے سرد خانہ۔ ہندوستان میں اردو زبان کے لئے ایک سرد خانہ تعمیر کر دیا گیا ہے، جہاں کوئی حرارت نہیں
رہی ہے۔ ہماری آواز کانپور نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں لکھا ہے کہ گزشتہ دنوں صدر جمہوریہ نے اردو کی طرف ایک اچھا اشارہ کیا
اور امید کی ایک لہر پیدا ہوئی تھی کہ اردو کا واجبی حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد پھر مرکزی وزیر برق و آب پاشی جناب فخر الدین علی احمد
اردو کے مسئلہ پر ذرا سرگرمی دکھائی۔ مگر افسوس کہ اس کا حشر بھی وہی ہوا جو اس سرد خانے میں پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔

ایک ادبی ماہنامہ کا اجراء۔ بھوپال سے بہت جلد ایک ادبی ماہنامہ "جوئبار" شائع ہو رہا ہے جس میں نامور اہل قلم
حصہ لے رہے ہیں۔ ادارت میں سید اقبال احمد، عشرت قادری، مظفر حنفی، اطہر راہی
مسعود قمر تاباں کے نام شامل ہیں۔

مجلس سیفیہ کا افتتاح۔ مجلس اردو سیفیہ کالج بھوپال کا شاندار افتتاح اردو کے مشہور ترقی پسند افسانہ نگار جناب
راجندر سنگھ بیدی کے ہاتھوں ۲۴ر دسمبر کو بھوپال میں ہوا۔ جس میں شہر کی تمام
ل ذکر ہستیوں نے شرکت کی۔ سب سے پہلے راجندر سنگھ بیدی کا تعارف کرایا گیا اور پھر بیدی صاحب نے فن افسانہ نگاری پر ایک
ت ہی پُر مغز مقالہ پڑھا اور دو مزاحیہ مضامین بھی پڑھ کر سنائے۔ یہ پروگرام نہایت کامیابی سے کئی گھنٹے جاری رہا۔

(بقیہ ص۸۷)

شورہ دوں گا کہ وہ ماہرین کی ایک ایسی کمیٹی بنائے جو بچوں کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لے کر مناسب فہرستیں
یار کرے اور یہ فہرستیں مصنفین کے سامنے ہوں تاکہ وہ کتابیں لکھتے وقت ان الفاظ کو استعمال کریں جو بچوں
احاطہ ذہن سے باہر نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر صرف وہی الفاظ استعمال کئے جائیں جو
پہلے سے جانتے ہیں تو پھر بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیسے ہوگا۔ میری رائے میں یہ ضرورت نصابی کتب
پوری ہونی چاہیئے۔ نصابی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں۔ جو معلومات کے ساتھ ساتھ بچوں کو نئے نئے الفاظ
سکھائیں۔ مجھے امید ہے کہ اس تجویز پر غور کیا جائے گا۔

آخر میں میں ان تمام بچوں کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس میلے سے متعلق تقریری و تحریری مقابلوں
انعامات حاصل کئے ہیں۔ جن بچوں کو انعام نہیں ملا انھیں بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ آئندہ بھی ایسے مقابلے
تے رہیں گے اور مجھے امید ہے کہ بچے ان مقابلوں میں پہلے سے زیادہ ذوق و شوق سے حصہ لیں گے۔

سہ ماہی

اردو

جنوری ۶۷ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مندرجات

مصحفی کا دیوان فارسی	قاضی عبدالودود
میرا نظریۂ تاریخ	سید محمد تقی
عظیم ادب اور پُر امن دور	ڈاکٹر وزیر آغا
ولی کا غیر مطبوعہ کلام	محمد اکرام چغتائی
حالی کی اخلاقی سماجیات	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت
ہومر کی رزمیہ شاعری	ڈاکٹر احسن فاروقی

مسلسل مضامین

ڈراما کندمالا	تعارف	ممتاز حسن
	مقدمہ	صمدانی نقوی
لغت کبیر اردو		بابائے اردو
اشاریہ مضامین اردو		ادارہ

صفحات تقریباً دوسو ○ قیمت تین روپے پچاس پیسے

سفید کاغذ پر ٹائپ کی اعلیٰ طباعت

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی

ابو سلمان شاہجہاں پوری

نئے خزانے

جولائی ۱۹۶۶ء کے رسائل و اخبارات کا اشاریہ[1]

[1] اس اشاریے میں بعض ایسے مضامین کے حوالے بھی شامل ہیں جو سابقہ مہینوں میں شائع ہوئے تھے اور بروقت دستیاب نہ ہو سکے تھے۔

پیشِ نظر اشاریے کی ترتیب میں جولائی ۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	آجکل	دہلی	جون، جولائی ۶۶ء
〃	ادبی دنیا	لاہور	〃 〃
سہ ماہی	اردو	کراچی	〃 〃
〃	اردو ادب	علی گڑھ	۶۶ء نمبر ۱
ماہنامہ	افکار	کراچی	جولائی ۶۶ء
〃	البلاغ	بمبئی	〃
〃	الرحیم	حیدرآباد	〃
〃	الشجاع	کراچی	〃
〃	انوارِ اسلام	رام نگر	جون، جولائی ۶۶ء
〃	انجمن اسلامیہ میگزین	کراچی	〃 〃
〃	برہان	دہلی	جولائی ۶۶ء
〃	پونم	حیدرآباد دکن	〃
〃	تہذیب الاخلاق	لاہور	جون، جولائی
〃	ثقافت	〃	〃
〃	جامعہ	دہلی	جولائی
〃	جام نو	کراچی	〃
〃	زندگی	رام پور	〃
〃	ساقی	کراچی	جون، جولائی
〃	سیارہ	لاہور	جولائی
〃	شانِ ہند	دہلی	مئی و جولائی
〃	صحیفہ	لاہور	جولائی
〃	طلوعِ اسلام	〃	〃
〃	عارف	〃	〃

ماہنامہ	فاران	کراچی	جولائی ۶۶ء
〃	فروغ اردو	لکھنؤ	〃
〃	قومی زبان	کراچی	〃
سہ ماہی	کاروان سائنس	〃	جلد دوم شمارہ ۱
ماہنامہ	کتابی دنیا	〃	جولائی
〃	ماہ نو	〃	〃
〃	معارف	اعظم گڑھ	〃
〃	میثاق	لاہور	〃
〃	نقش	کراچی	نمبر ۶، ۷
سہ ماہی	نوائے ادب	بمبئی	جنوری ۶۶ء
ماہنامہ	نئی قدریں	حیدرآباد دکن	نمبر ۴، ۵
〃	ہمایوں	دہلی	جولائی ۶۶ء
ہفت روزہ	آئین	لاہور	〃
〃	المنبر	لائل پور	〃
〃	چٹان	لاہور	〃
〃	خدام الدین	〃	〃
〃	شہاب	〃	〃
〃	صدقِ جدید	لکھنؤ	〃
〃	قندیل	لاہور	〃
〃	لاہور	〃	〃
〃	ہماری زبان	علی گڑھ	〃
روزنامہ	انجام	کراچی	اشاعت ہائے جمعہ اتوار
〃	جنگ	〃	〃 〃
〃	حریت	〃	〃 〃

آپ بیتی

سوئیکارنو	سوئیکارنو کی کہانی خود ان کی زبانی[1]	حریت، ص ۷، ۹ر جولائی
ناظم ندوی، مولانا محمد	میرا مطالعہ	سیارہ، ص ۴۴ تا ۴۸، "

اخلاق و تصوف

ابوالحسن ندوی، سید	انسان کی تلاش	تہذیب الاخلاق، ص ۲ تا ۱۴، جون
عبدالواحد ہالی پوتہ، ڈاکٹر		
سید محمد سعید (مترجم)	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ۔ مبادیات ۔ اخلاقیات	الرحیم، ص ۱۲۲ تا ۱۴۱، جولائی
فضل حمید	ہماری چند بنیادی قومی خامیاں	" " ۱۵۳ تا ۱۶۰، "
کبیر احمد	حافظ اور تصوف	ادبی دنیا، ص ۱۷ تا ۳۲، "

ادبیات

ابراحسنی، علامہ	اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن اور سرور تونسوی	شان ہند، ص ۲ تا ۸، جولائی
احراز نقوی، ڈاکٹر	اردو تنقیدات کے میلانات	نئی قدریں، ص ۵۹ تا ۷۵،
احسن فاروقی، ڈاکٹر	ادب اور علوم	ثقافت، ص　جولائی
"	جدید شاعری	نئی قدریں، ص ۷۸ تا ۸۹،
احمد، کلیم الدین	تنقید اور دماغی صحت	ساقی، ص ۴ تا ۷، جولائی
اسد نذیر	ناول کا دور جدید	نئی قدریں، ص ۲۲۳ تا ۲۳۹،
اسلم انصاری	آدمی نامہ (ظہیر کاشمیری) ایک مطالعہ	" " ۳۰۷ تا ۳۱۱،
"	اردو میں منظوم ڈرامے کے امکانات	" " ۳۴۹ تا ۳۷۶،
اشتیاق طالب	انتشار ادب	نقش، ص ۱۲۰ تا ۱۲۴، جولائی
اشرف، اے بی	جدید اردو ڈرامے کے مسائل	نئی قدریں، ص ۱۸۱ تا ۱۸۴،

---

[1] قسط نمبر ۵۷ تا ۸۹ جولائی کے شماروں میں شائع ہوئی ہے۔

رشک، سلطان	باغ و بہار	جام نو، ص ۴۲ تا ۶۲، جولائی
اظہر علی	فن تاریخ گوئی کو ڈپٹی مسعود حسن کی دین	فروغ اردو، ص ۱۰ تا ۱۲، "
اظہر غلام حسین	مخدوم کی المیہ شاعری	ادبی دنیا، ص ۷۱ تا ۷۸، "
اعجاز الرحمان	اردو میں علامتی شاعری	نئی قدریں، ص ۶۲ تا ۴۴،
اعجاز صدیقی	اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن	شان ہند، ص ۵۲ تا ۶۱، مئی
افتخار جالب	نئی شاعری کے فکری مباحث	نئی قدریں، ص ۱۲۰ تا ۱۳۳،
اقتدا حسن، ڈاکٹر	حیدری کا تذکرہ گلشن ہند	اردو، ص ۷۶ تا ۸۷، جولائی
اکرام چغتائی، محمد	دیوان دلی کے قلمی نسخے	" " ۹۷ تا ۱۰۸، "
المجاہد، شیخ احمد نصیب	حضرت عمرؓ کا ادبی پہلو	تہذیب الاخلاق، ص ۱۵ تا ۲۲، جون
انجم اعظمی	تخلیقی ادب	افکار، ص ۱۳ تا ۴۲ + ۵۲، جولائی
انیس ناگی	نئی شاعری کیا ہے؟	نئی قدریں، ص ۱۲۴ تا ۱۲۷،
باسط سلیم	ڈرامے میں نیا انداز فکر	" " ۲۷۳ تا ۲۸۰،
بھرتیہ ایم اے، کانتی کشور	کالی داس کا زمانہ	ہمایوں، ص ۲۰۲ تا ۲۰۸، جولائی
پیار محمد	ادب سے زندگی کا تعلق	آئین، ص ۱۲، ۴۴ر جولائی
ثاقب زیروی	وہ جس کی یاد دل سے ..... (مولانا صلاح الدین)	ادبی دنیا، ص ۹۱ تا ۹۵، "
جارجیس یشک	سعودی عرب میں جرم و سزا	البلاغ، ص ۷۲ تا ۷۴، "
جاوید، عبداللہ	ادب اور امن عالم	نئی قدریں، ص ۵۴ تا ۹۴،
جمیل ملک رومی، کوکب الصباح	احمد ندیم قاسمی کی نظم نگاری اور [illegible]	" " ۱۳۷ تا ۱۴۵،
جوہر، نرسجے لام	جدید شاعری	" " ۹۷ تا ۱۱۹،
"	سرور کا ذوق جنوں (آل احمد)	" " ۱۷۹ تا ۱۸۶،
"	سرور کے انشائیے	قومی زبان، ص ۲۲ تا ۲۶، جولائی
جیلانی کامران	نئی شاعری کے ضمنی مسائل	نئی قدریں، ص ۹۰ تا ۹۶،
حامد حسن قادری، مولانا	داغ کے کلام میں نظریہ حسن و عشق	ماہ نو، ص ۸۳ تا ۹۴، جولائی
حامد حسن قادری، مولانا	شاعری میں چوری	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۸۳ تا ۹۴، جون جولائی
"	شعر کی تاثیر	حریت، ص ۳، ۲۲ر جولائی

حامد حسن قادری	ملا عبدالقادر بدایونی اور آزاد دہلوی	اردو، ص ۷۱ تا ۸۲، جولائی
حنیف نقوی	گلشن بے خار — ایک تنقیدی مطالعہ	اردو ادب، ص ۳۲ تا ۵۴،
خالد وہاب	جدید افسانے میں فن و ہیئت کے تجربے	نئی قدریں، ص ۳۴۳ تا ۳۶۸،
خیال امروہوی	نیا ادب ہے کہ سعی فروغ بے ادبی	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۷، ۲۵ جولائی
رفیعہ سلطانہ	آگ کا دریا — ایک جائزہ	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸، ۱۵، ۲۲ جولائی
رئیس امروہوی	سوویت یونین اور اشتراق	جنگ، ص ۷، ۱۷ جولائی
سحر انصاری	دشت امکاں کا ایک سفر	افکار، ص ۴۸ تا ۵۲، "
سعادت مرزا	قصہ کفن چور منظوم	نیا ادب، ص ۴۹ تا ۵۸، جنوری
سروش طبا طبائی	فارسی کی ایک بیش بہا غیر مطبوعہ مثنوی قسط نمبر ۱[1]	آجکل، ص ۳ تا ۹، جون
"	" " " "	" " ۳۷ تا ۴۰، جولائی
سید انصاری، ابو رفاعہ	امراؤ مرزا انور دہلوی	نوائے ادب، ص ۱۷ تا ۳۵، جنوری
سلیم اختر	مرزا رسوا کا نظریۂ ناول نگاری	ادبی دنیا، ص ۲۵ تا ۴۳، جولائی
سہیل بخاری	جدید اردو ناول	نئی قدریں، ص ۲۲۳ تا ۲۴۳،
شاد، نریش کمار	مالک رام سے ایک ملاقات	آجکل، ص ۱۳ تا ۲۵، جون
شانتی رنجن بھٹا چاریہ	بنگلہ ادب میں مسلمانوں کا حصہ (از ابتدا تا انیسویں صدی)	" " ۱۱ تا ۱۷، "
شرافت حسین مرزا	سر سید احمد بجنور میں	اردو ادب، ص ۷۹ تا ۱۱۱،
صابر، مرزا صابر بیگ	زبان اور لسانی تغیر و تبدل	قندیل، ص ۱۹، ۱۰ جولائی
صہبا اختر	اردو ادب میں مشرقی پاکستان کی جھلکیاں	ماہ نو، ص ۱۳ تا ۱۷، ۳۰، جولائی
ظہیر احمد صدیقی	تحقیق و تنقید	ہمایوں، ص ۲۱۳ تا ۲۲۲، "
عائشہ بیگم	اردو تذکرے	ساقی، ص ۳۳ تا ۴۳، جون
عبدالحلیم چشتی، مولانا	تذکرہ شاہ ولی اللہ	الرحیم، ص ۵۸ تا ۷۹، جولائی
عبداللہ، پروفیسر محمد	مشرقی پاکستان کے لوک گیت	ساقی، ص ۲۴ تا ۳۰، "

---

[1] مثنوی لیلیٰ مجنوں موسوم بہ خلق حسن از میر محمد ناصر خاں طبا طبائی

عبداللہ، پروفیسر محمد	منشی محمد خیر اللہ کی ادبی و ملی خدمات	سیارہ، ص ۵۳ تا ۱۴، جولائی
عرش ملسیانی	اردو غزل میں رمزیت	ہمایوں، ص ۲۰۸ تا ۲۱۳، "
عشرت، امرت لال	لالہ سری رام کے فارسی مخطوطات	آجکل، ص ۷ا تا ۲۰، "
عطاء الرحیم	ناول کا فن	نئی قدریں، ص ۴۳ تا ۵۳،
غلام الثقلین نقوی	جدید افسانہ	" " ۵۹ تا ۶۳،
فارغ بخاری	آج کا شعری ادب	" " ۱۲۸ تا ۱۳۱،
فراق گورکھپوری	اردو شاعر اور ادیب آج بھی ہندی الفاظ کے اصل سرمایہ دار	ہماری زبان، ص ۲، ۸ جولائی
قطبی، وحید احمد مسعود	عقل و دانش	ادبی دنیا، ص ۹ تا ۱۷، "
کرار حسین، پروفیسر	شیفتہ کی تذکرہ نگاری	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷ تا ۱۷، جون جولائی
کمال کبریا	مثنوی سحر البیان	کتابی دنیا، ص ۲ تا ۵، جولائی
کوثر چاند پوری	اکبر الہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ ارشادات	شان ہند، ص ۱۵ تا ۱۸، "
محمد اسلام، ڈاکٹر	جگر کا تصوف	فاران، ص ۲۷ تا ۳۲، "
محمد باقر، آغا	رشتہ ناتہ از محمد حسین آزاد[1]	صحیفہ، ص ۶۰ تا ۶۷، "
محمد عظیم	کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری	نئی قدریں، ص ۸۰ تا ۸۲،
محمود الہٰی، ڈاکٹر	اردو میں عربی شعراء کا پہلا تذکرہ	اردو ادب، ص ۳۶ تا ۹۲،
مشفق خواجہ	خطاطی کے چند نادر نمونے (نوادر انجمن)	اردو، ص ۹۹ تا ۱۰۴، جولائی
مصطفیٰ زیدی	جوش اور اس کا فن	نئی قدریں، ص ۵۰ تا ۵۷،
منظر علی سید	اردو افسانے میں نفسیات	" " ۲۵۵ تا ۲۵۸،
نارنگ، گوپی چند	رفتار ادب	سب رس، ص ۱۱ تا ۱۴، جولائی
نامی، ڈاکٹر عبد العلیم	اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ	نوائے ادب، ص ۱ تا ۱۴، جنوری
نصیر الدین ہاشمی	فتح نامہ ٹیپو سلطان	اردو، ص ۴۵ تا ۵۷، جولائی
نظر، محمد انصار اللہ	فائق کی ایک فارسی تصنیف	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم جولائی

---

[1] آزاد کا ایک غیر مطبوعہ نامکمل مضمون

میراحمد، حکیم	نقش ناز[لہ]	ادبی دنیا، ص ۳۱تا ۴۹، جولائی
یم الدین، ڈاکٹر سید	سکھی نامہ کا تعارف	نوائے ادب، ص ۲۳تا ۴۸، جنوری
یم صدیقی	مجلہ اوراق" کی نظریاتی اساس	سیارہ، ص ۲۳تا ۲۸، جولائی
رالحسن ہاشمی، ڈاکٹر سید	محمد غوث ندیپ اور ان سے منسوب نوطرز مرصع	نوائے ادب، ص ۵۹ تا ۶۵، جنوری
ریر آغا، ڈاکٹر	آج کی اردو تنقید	نئی قدریں، ص ۶۶تا ۷۹،
〃 〃	عرش صدیقی کی نظمیں	〃 〃 ۲۱۳تا ۲۱۷،

اردو زبان اور اس کے مسائل

افتخار حسین آغا	فرانس میں اردو	افکار، ص ۶۵تا ۷۰، جولائی
تبسم، مغنی	قدیم اردو — ایک مطالعہ	پونم، ص ۵ تا ۱۰، 〃
عبدالحق ڈاکٹر مولوی	لغت کبیر اردو (قسط ۲۷)	اردو جولائی
غلام احمد پنڈت، خواجہ	کشمیر میں اردو	انجام، ص ۷، ۱۵ر جولائی
کالا سنگھ بیدی	پنجابی اور اردو مختلف نظریوں کے آئینہ میں	نوائے ادب، ص ۶۶تا ۷۷، جنوری
معین الرحمان، سید	انجمن تقسیم ہند تک (۱)	قومی زبان، ص ۳۶تا ۴۴، جولائی
نیاز فتح پوری	اردو کے بعض الفاظ کا فارسی ماخذ	چٹان، ص ۷+۱۴، ۲۵ر 〃
واصف عثمانی، حسن	تمباکو اور شکر کے جزائر میں اردو زبان	تہذیب الاخلاق، ص ۴۰تا ۴۴، جون

تاریخ

ابوسلمان شاہجہانپوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات	الرحیم، ص ۱۳۵تا ۱۵۲، جولائی
ادارہ اجمل باغ	صحابہ کرام .... اور مولانا مودودی	المنبر، ص ۹تا ۱۱، یکم 〃
〃 〃	صحابہ کرام اور مولانا مودودی — بسلسلہ خلافت سے ملوکیت تک ۲۰	〃 〃 ۵تا ۶۴ ۸ر 〃
جمیل احمد خواجہ	دمشق	الشجاع، ص ۱۱تا ۱۳، جولائی
حفیظ اللہ پھلواروی، محمد	بنی امیہ کی علمی خدمات	انجام، ص ۳، ۱۱ر جولائی

لہ نقش ناز، اردو شاعری میں

جوادعلی، ڈاکٹر

نثار احمد فاروقی (مترجم)	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان/ص ۷۳تا ۸۴/ جولائی
اتمن گیسو دراز پاکستانی		
محمد مرزا منور علی بیگ	دفاع عرب	صحیفہ اہل حدیث، ص ۷۳تا ۱۴۳، جون جولائی
حفیظ اللہ، محمد	مسلمانوں کے علمی کارنامے	انجام/ص ۲، ۱۶ر جولائی
رئیس احمد جعفری	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں[1]	" " ۲،۱۲/ ۲ر "
صلاح الدین، محمد (مترجم)	ایران کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب	حریت/ص ۱۲/ ۹ر "
عبدالرحمان خاں، مولانا محمد	تاریخ اندلس پر طائرانہ نظر	انجمن اسلامیہ میگزین/ص ۹تا ۱۰/ جون جولائی
عبدالشکور، شیخ	مبارک حویلی (قزلباش خاندان کی یادگار)	ادبی دنیا/ص ۵۱تا ۵۶/ جولائی
نعیم صدیقی، محمد	خلافت راشدہ کی ایک جھلک	تہذیب الاخلاق/ص ۶تا ۲۲/ "
رئیس احمد جعفری	جلیا نوالہ باغ	ثقافت/ص ۱۴تا ۴۲/ "
محمد اسلام شاہ ایم اے، سید	دارا کے عقائد	چٹان/ص ۹، ۱۲/ ۴ر "

تعلیمات

آغا، ڈاکٹر اے ایس	دیکنسر یونیورسٹی	قندیل/ص ۱۸/ ۱۰ر جولائی
احمد انس	تعلیمی مسائل	چراغ راہ/ص ۳تا ۱۱/ "
سبط حسن	اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ	حریت/ص ۱۲/ ۲۵ر "
عبداللہ، ڈاکٹر سید	استاد کی ذمہ داری	قومی زبان/ص ۳تا ۷/ "
"	" "	چٹان/ص ۷تا ۱۳، ۹/ ۱۸ر جولائی

تعلیمی علمی ادارے

جیب ریحان خاں	امریکن یونیورسٹی بیروت ـ ۲	صدق جدید/ص ۹تا ۷/ ۸ر جولائی
ولی الحق انصاری، محمد	شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز	معارف/ص ۵۶تا ۷۶/ "

---

[1] اس ماہ کی دیگر اقساط ۱۱ر جولائی، ۱۶ر جولائی اور ۳۰ر جولائی کے انجام میں دیکھیے۔

سائنس

حسن، اظہرالدین	برقیاتی تخدیر یا بیہوشی	کارواں سائنس، ص ۶۵ تا ۷۲،
خلیل اللہ صدیقی	ٹڈیوں پر موسم کے اثرات	، ، ، ۵ تا ۱۰،
سبحانی، میا عطاء الحق	آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت	، ، ، ۵۹ تا ۶۵،
طارق محمود	رہبران سائنس — لنگڑا دیوتا	، ، ، ۷۹ تا ۸۴،
عازم، حفیظ الرحمان	اعضائے رئیسہ کی پیوند کاری	، ، ، ۱۱ تا ۱۶،
عبدالحق، ڈاکٹر	کیمیاگری سے کچھ آگے	، ، ، ۳۱ تا ۴۱،
کیے کیولے	نامیاتی کیمیا کے ساختی نظریات کی پیدائش	، ، ، ۸۵ تا ۹۴،
نجیب الدین، سید	کیا جنگلی جانور خطرناک ہوتے ہیں	، ، ، ۲۵ تا ۳۰،
محمد احمد، سید	جڑواں بچے	، ، ، ۴۳ تا ۵۰،
محمد عمر	لمبائی کا نیا معیار	، ، ، ۵۱ تا ۵۶،
مہدی حسن، ڈاکٹر	الکیمی نظریات کا تجزیہ	، ، ، ۱۷ تا ۲۴،

سیاحت وسفر

ابن انشاء	سفرنامہ چین[1]	جنگ، ص ۲، ۱۱ جولائی
شفیع عقیل	خیابان پہلوی (سفرنامۂ ایران[2])	، ، ، ۲، ۹، ،
ضیاء الحسن موسوی	دیار رسول — جدہ سے مدینہ تک ایک یادگار سفر	، ، ، ۴، ۱۳، ،
ظہیر، حافظ احسان الٰہی	چار دن بغداد میں	چٹان، ص ۷ تا ۸ + ۱۶، ۱۱ جولائی
معین الدین احمد ندوی، شاہ	میرا سفر حج	معارف، ص ۴۵ تا ۴۶، جولائی
وجاہت علی، سید	۷۰ روپے میں سیر جہاں	انجام، ص ۱۵، ۱۸ و ۲۵، ،

---

[1] اس سفرنامہ کی دوسری قسط کے لئے دیکھئے جنگ ۱۸ جولائی

[2] سفرنامہ کی دیگر اقساط کے لئے دیکھئے جنگ ۱۱ جولائی ص۴ ۱۶ جولائی ص۲، ۱۳ جولائی ص۲ اور ۲۵ جولائی ص۲

سیاسیات

اشرف، حکیم عبدالرحیم	تحریک جماعت اسلامی — ایک تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے	المنبر، ص ۴ / ۱۵ تا ۲۹ جولائی
امام الدین رام نگری، مولانا ابو محمد	معیاری اسلامی حکومت "خلافت راشدہ" (چوتھی اور آخری قسط)	انوار اسلام، ص ۱۴۱ تا ۱۸۴، جون
خورشید عالم	امریکہ کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۱۴ تا ۵۰، جولائی
رئیس احمد جعفری	البرٹ انگ کی تاریخی کہانی	ثقافت، ص ۳ تا ۶، جون
سبط حسن	دیس پردیس	حریت، ص ۱۲، ۲۴ جولائی
"	عالم اسلام کا اتحاد	" " ۱۲، ۳۱ "
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب[1]	جنگ، ص ۱۲، ۲ "

شخصیات

اقبالیات

اسلم فرخی	نثر اقبال	اردو، ص ۵۹ تا ۶۶، جولائی
جعفر پھلواروی، محمد	فلسفہ خودی کا جذبہ محرکہ	تہذیب الاخلاق، ص ۵ تا ۱۵، "
شبیر احمد خاں غوری	علامہ اقبال اور فلسفہ دہریت کی تجوید	اردو ادب، ص ۵ تا ۲۲،
صغیرہ نسیم	شاعر مشرق	سیارہ، ص ۲۹ تا ۳۴، جولائی
عبدالقوی دسنوی	اقبالیات	جامعہ، ص ۱۴ تا ۲۶، "
محمود حسین، میر	علامہ اقبال کی داستان دکن	سب رس، ص ۳ تا ۱۰، "
ممتاز حسن		
حسن ریاض (مترجم)	اقبال اور پاکستان	ماہ نو، ص ۱۶ تا ۳۷، "
مناظر عاشق	اقبال کا فلسفہ خودی	فروغ اردو، ص ۶۳ تا ۷۲، "

---

[1] سیاسی حالات و واقعات پر تبصرے کا سلسلہ ۹، ۱۶، ۲۳، اور ۳۰ جولائی میں دیکھیے۔

غالبیات

سجاد باقر رضوی	غالب اور جدید ذہن	نئی قدریں، ص ۱۲ تا ۲۷،
غالب	مثنوی ابر گہربار (قسط نمبر ۳)	اردو، ص ۱۰۹ تا ۱۱۹، جولائی
وفا راشدی	غالب کا انداز بیان	ساقی، ص ۱۵ تا ۱۶، جون

دیگر شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام	شہید (فاطمہ)	عارف، ص ۳۴ تا ۳۸، جولائی
" "	شہید (غزوہ طرابلس میں فاطمہ کی شہادت)	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۵ر "
آفاق صدیقی	عالی جی اک کوی رسیلے (جمیل الدین)	نئی قدریں، ص ۲۸۲ تا ۲۸۶،
ابن انشاء - امجد مجید - فیض،		
فیض احمد	مصطفیٰ زیدی	" " ۱۵۸ تا ۱۷۱،
احمد ندیم قاسمی	دو صاف گو شاعر — ظہور نظر اور مصطفیٰ زیدی	" " ۱۷۴ تا ۱۷۹،
ادارہ "اردو"	نیاز فتح پوری	اردو، ص ۳ تا ۴، جولائی
ارشاد، سید نقی احمد	نواب اشرف علی خاں فغاں	صحیفہ، ص ۴۳ تا ۵۱، "
اسمٰعیل حسن خاں، ملک	حیدرآباد سے جوش کی علیحدگی	ساقی، ص ۱۷ تا ۲۷، جون
اطہر مبارک پوری، قاضی	مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاع مشرق سے	البلاغ، ص ۱۳ تا ۲۶، جولائی
اظہر، غلام حسین	۱۸۵۷ سے پہلے کے زندانی شعراء	تہذیب الاخلاق، ص ۵۱ تا ۵۹، جون
الیاس عشقی و سلیم احمد	عزیز حامد مدنی	نئی قدریں، ص ۱۸۷ تا ۲۳۳،
امین ہاشمی	حضرت ابوذر غفاری	عارف، ص ۱۱ تا ۱۳، جولائی
برنی، ضیاء الدین احمد	مولانا نیاز فتح پوری	کتابی دنیا، ص ۱، "
ثمر، عبدالکریم	فاروق اعظمؓ — عہد آفریں شخصیت	ثقافت، ص ۱۰ تا ۲۰، جون
چندن، گوربچن	منشی دوارکا پرشاد افق	اردو ادب، ص ۴۴ تا ۵۲
راشد، رشید احمد	شیخ عبدالوہاب شعرانی	البلاغ، ص ۵۳ تا ۶۴، جولائی
راشدی، پیر علی محمد	ابوالکلام آزاد — (برصغیر مشرق و مغرب)	جنگ، ص ۱۲، ۱۲ر جولائی

رئیس احمد جعفری	عربی ادب کا لعل شب چراغ	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶۲ تا ۶۶، جون جولائی
سجاد حارث ـ نگہت بریلوی	حمایت علی شاعر	نئی قدریں، ص ۲۵۶ تا ۲۷۱،
سمیع حسن نقوی	سید صغیر احمد — اردو کا ایک غیر معروف انشائیہ نگار	آجکل، ص ۲۸ تا ۳۹، جون
سرفراز احمد، سید	حافظ عبدالمجید سرشار	قندیل، ص ۲، ۱۴ر جولائی
سرفراز نیازی	میرے ابا جان (نیاز فتح پوری)	ماہ نو، ص ۱۰ تا ۱۱، جولائی
سرور آل احمد	کیا دوانے نے موت پائی ہے (ذوالنورین)	ہماری زبان، ص ۱، ۱۵ر "
" "	نیاز کی یاد	نقش، ص ۱۱۹ تا ۱۲۲، "
سرور اکبرآبادی	مولانا حامد حسن قادری کی چند خصوصیات	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷۲ تا ۷۹، جون جولائی
سرور تونسوی	مرحوم سید کاظم علی سبز پوش گورکھپوری	شان ہند، ص ۷۵ تا ۷۷، جولائی
سعید احمد، سید	سیماب اکبرآبادی	جام نو، ص ۲۲ تا ۳۳، "
شاد امرتسری د. عارف عبدالمتین	ڈاکٹر وزیر آغا	نئی قدریں، ص ۲۴۰ تا ۲۵۳،
شاہد احمد دہلوی	مولانا نیاز فتح پوری	ساقی، ص ۱۲ تا ۱۴، جون
شورش کاشمیری	مولانا غلام رسول مہر — (سلسلۂ قلمی چہرے)	چٹان، ص ۴، ۱۱ر جولائی
شہابی، مفتی انتظام اللہ	امام ابوداؤد سجستانی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳۱ تا ۳۴، جون جولائی
"	مشاہیر اولیاء ہند و پاکستان	" " ۳۳ تا ۴۸، " "
ضیاء الحسن فاروقی	نیاز فتح پوری	جامعہ، ص ۳ تا ۱۳، جولائی
طیب انصاری، ملک زادہ	امیر خسروؒ	فروغ اردو، ص ۴ تا ۹، "
"	ولی کی عظمت	سب رس، ص ۳۲ تا ۳۳، "
ظہور الحق شیخ	ڈاکٹر سید نذیر احمد	قندیل، ص ۲، ۱۰ر جولائی
عبدالباری عباسی، پروفیسر	بھلا مانس غزل گو (حالی)	ادبی دنیا، ص ۳۵ تا ۴۰، "
عبدالغفور چودھری	سترہویں صدی کا ایک مثالی مجاہد — شاہ ولی اللہ کے جد امجد شیخ وجیہہ الدین	الرحیم، ص ۱۰۸ تا ۱۲۳، جولائی
عبدالملک جامعی مرادآبادی	نقیب ہمدرد[1]	صدق جدید، ص ۷، ۱۵ر "

---

[1] دوسری قسط کے لئے دیکھئے صدق جدید ۲۴ر جولائی ص ۷

عتیق، حکیم عبدالمجید	مولانا صلاح الدین احمد	ادبی دنیا، ص ۷۸ تا ۹۰، جولائی
عطیہ خلیل عرب	وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا (نیاز فتح پوری)	ماہ نو، ص ۱۲ تا ۱۵، "
علی جواد زیدی	تلوک چند محروم	ادبی دنیا، ص ۵۷ تا ۵۹، "
"	غنی کشمیری	معارف، ص ۵ تا ۸۳، "
فضل المتین، سید	داغ کے شاگرد حکیم بہاؤ الدین خاں بہا اجمیری	ہماری زبان، ص ۳+۱۲، ۸ ر "
فضل حق قریشی دہلوی	نیاز فتح پوری	جنگ، ص ۲، ۲ ر جولائی
کمال، انتخاب علی	مہر نقوی جے پوری	قومی زبان، ص ۱۷ تا ۲۲، جولائی
کلیم اختر	سید رئیس احمد جعفری ندوی	قندیل، ص ۶+۲۲، ۱۷ ر "
مالک رام	نیاز فتح پوری	آجکل، ص ۴ تا ۱۱، "
ماہر القادری	"	
محمد ابراہیم	جلال مفتی گنجوی عظیم آبادی	نوائے ادب، ص ۵ تا ۹، جنوری
محمد اسلام، ڈاکٹر	جگر کے نقاد	سب رس، ص ۱۵ تا ۲۲، جولائی
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	جگت استاد مولوی اسمٰعیل میرٹھی	جنگ، ص ۱۲، ۹ ر جولائی
ملا واحدی	عارف ہسوی	ثقافت، ص ۵۶ تا ۶۷، "
منظر اعظمی	میرا ایک عظیم ..... شاعر	جامعہ، ص ۳۳ تا ۴۴، "
مینا زبیری، انیس مصطفیٰ	غالب کا ایک گمنام شاگرد	قومی زبان، ص ۵۶ تا ۶۳، "
نبی بخش قاضی، ڈاکٹر	شیخ الاشراق شہاب الدین السہروردی	الرحیم، ص ۱۳۱ تا ۱۴۴، "
نجمہ سمیع	کرشن چندر ــــ ایک افسانہ نگار	پونم، ص ۱۹ تا ۲۲، "
ندیم، صلاح الدین	عارف عبدالمتین اور اس کا فن	نئی قدریں، ص ۲۸۸ تا ۳۰۴،
نیر، حکم چند	سرور جہاں آبادی اور شاگرد میرٹھی	اردو ادب، ص ۳۵ تا ۶۷،
ہمایوں کبیر	ٹیگور	تہذیب الاخلاق، ص ۱۰ تا ۲۶، جون
	شہزادہ کریم آغا خاں	جنگ، ص ۸، ۱۸ ر جولائی
	ہمارے ادیب ــــ جیلانی بی اے	چراغ راہ، ص ۱۲ تا ۲۰، "

صحافت

جاوید اختر، سید	مولانا جوہر کی صحافت	قومی زبان، ص ۸ تا ۱۴، جولائی

جوہر، نرسبھے رام	دل گداز کے اداریے	ماہ نو، ص ۸۴ تا ۸۵، جولائی
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	شرر کی صحافت کا غیر نمایاں پہلو	صحیفہ، ص ۱۸ تا ۳۰، "

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (اشاریہ مضامین بابت ماہ جنوری ۱۹۷۶ء)	قومی زبان، ص ۵۷ تا ۹۵، جولائی
ابو سلمان شاہجہانپوری	نقوش امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد[2]	اردو ادب ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۸ تا ۱۴۰،
ادارہ اردو	اشاریہ مضامین "اردو"	اردو، ص ۷ تا ۲۳، "
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۲۷ تا ۳۰، "
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا[1]	برہان، ص ۴۹ تا ۵۹، "
ساحل، عبدالحلیم و دیگر معاونین	مقالہ نما	نوائے ادب، ص ۱ تا ۱۱، جنوری

مذہبیات

احادیث و سیرت نبویؐ

آزاد، مولانا ابوالکلام	ماہ ربیع الاول	فاران، ص ۴۸ تا ۵۰، جولائی
"	سیرت النبیؐ کا ماخذ حقیقی ــــ قرآن حکیم	جنگ، ص ۱۲، ۳ر جولائی
احتشام احمد ندوی، سید	تدوین احادیث کا ایک تاریخی جائزہ	جامعہ، ص ۳۴ تا ۴۶، "
تمنا عمادی، مولانا	بعثت نبویؐ کا مقصد اور تکمیل	ماہ نو، ص ۵ تا ۸، "
حسام الدین شریفی، محمد	نبی کریم اور اصلاح معاشرہ	ثقافت، ص ۷ تا ۱۵، جون
حمید اللہ، ڈاکٹر محمد	بعثت نبویؐ	جنگ، ص ۱۳ تا ۱۴، ۳ر جولائی
رفیع الزماں زبیری	ظہور قدسی سے پہلے	حریت، ص ۱۰، ۲ر جولائی

---

[1] رسالہ برہان کے مضامین کا اشاریہ قسط چہارم

[2] پاکستانی اخبارات و رسائل میں مولانا مرحوم پر مضامین کا مصنف وار اشاریہ ۔ اس مضمون کی دو قسطیں اردو ادب کے شمارہ ۱، ۲، بابت ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکی ہیں ۔

ابو طاہر فارانی	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۵، ۱۱ر جولائی
سرور شاہ گیلانی، سید	رسول اللہ صلعم کے میٹھے بول	انجام، ص ۵، ۳ر "
شہاب الدین	رسول اللہؐ کی ذات صدر بزم کائنات ۔۔۔۔ اور انجمن آرائے ممکنات	شہاب، ص ۸، ۲۴ر جولائی
عثمان اسحٰق، علامہ شیخ محبوب	رسول اکرم کا بچپن اور جوانی	حریت، ص ۴، ۳ر "
غازی اجمیری، محی الدین	سیرۃ افضل البشر ۔۔ حکمت و فلسفے کی روشنی میں	جنگ، ص ۹، ۳ر "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	حضرت محمد صلعم ۔۔ ختم نبوت دلائل کی روشنی میں	" " ۳+۴، ۳ر "
" " "	عید میلاد النبی	حریت، ص ۴، ۳ر "
ولی حسن، مفتی	اقسام حدیث	فاران، ص ۲۲تا ۳۲، "

تفسیر قرآن مجید

امام الدین رام نگری، مولانا ابو محمد	اضافات سورۂ یٰسین	انوار اسلام، ص ۵۰ تا ۵۲، جولائی
امین احسن اصلاحی، مولانا	تفسیر سورہ آل عمران	میثاق، ص ۳ تا ۳۰، "
عثمان غنی، محمد (مرتب)	درس قرآن ۔۔ مولانا محمد زاہد الحسینی	خدام الدین، ص ۷ تا ۱۰، یکم "

عبادات اور مسائل ومباحث

احمد قادری، سید	حل التضاد کا مختصر تنقیدی جائزہ	زندگی، ص ۹ تا ۱۵، ۲۵ جولائی
ارشاد الحق قدوسی	اسلام کا تمدنی ارتقاء	انجام، ص ۷، ۵ر "
ابن گیسو دراز پاکستانی، محمد مرزا منور علی بیگ مولانا	حج ایک سیاسی رمز ۔۔۔۔ (۱)	صحیفہ اہل حدیث، ص ۷ تا ۱۰، ۲۴ر مارچ
" " " "	حج ۔۔۔۔ عروج انسانیت کا اہم زینہ (۲)	" " ۲۰ تا ۲۳، ۸ر اپریل
" " " "	حضرت ہاجرہؑ کی معاشی قربانی	خاتون پاکستان، ص ۱۰ تا ۱۱، مارچ
" " " "	قربانی سے ۔۔۔۔ سبق ۔۔۔۔؟	سوداگر، ص ۱۵ تا ۱۶ + ۲۰، اپریل

[1] اس کے بعد کی قسط ۵ر جولائی کے لاہور میں دیکھئے۔

امن گیسو دراز پاکستانی / مرزا منور علی بیگ	کیا تصویر لذاتہ شرک نہیں ؟	تعلیم القرآن / ص ۳۳ تا ۳۸ / مارچ
امینی / مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان / ص ۲۴ تا ۳۲ / جولائی
انور / مولانا عبید اللہ	سچائی اور حقیقت کی راہ	خدام الدین / ص ۵ تا ۶ / یکم "
حسن احمد ضیائی	رویت ہلال	زندگی / ص ۲۲ تا ۳۲ / "
خالد مسعود	عقیدہ شفاعت — افادات مولانا حمید الدین	میثاق / ص ۳۱ تا ۳۲ / "
زاہد الحسینی / قاضی محمد	زکوٰۃ ٹیکس نہیں عبادت ہے۔	خدام الدین / ص ۱۱ تا ۱۲ / یکم "
سعید احمد اکبر آبادی / مولانا	ہندوستان کی شرعی حیثیت	برہان / ص ۵ تا ۲۳ / جولائی
سلطان مبین	تناسخ کا تحقیقی جائزہ (۳)	زندگی / ص ۴۲ تا ۴۹ / "
سومار / اے کے	اسلام کو سوشلزم کے سہارے کی ضرورت نہیں	شہاب / ص ۸ تا ۱۰ / ۱۳ / "
طاسین / مولانا محمد	کچھ زکوٰۃ کے بارے میں	" " ۸ تا ۱۰ / ۲۰ / "
عاصم نعمانی	اسلام اور عورت کا احترام	آئین / ص ۱۰ تا ۱۱ / ۹ / "
مجیب اللہ ندوی	طلاق ثلاثہ	معارف / ص ۳۹ تا ۴۳ / "
منظور احسن عباسی	مسئلہ زکوٰۃ اور ڈاکٹر فضل الرحمان	شہاب / ص ۸ تا ۱۰ / ۱۷ / "
	زکوٰۃ - قرآن کی روشنی میں	طلوع اسلام / ص ۵۵ تا ۶۴ / جولائی

مکاتیب

اسلوب احمد	مکاتیب مہدی	الشجاع / ص ۴۵ تا ۴۹ / جولائی
رشید حسن خاں	امیر مینائی کے ادبی خطوط	صحیفہ / ص ۹ تا ۱۷ / "
سلیم / ڈاکٹر سلیم واحد	مکتوبات مولانا صلاح الدین احمد	ادبی دنیا / ص ۹۷ تا ۱۰۰ / "
شمیم احمد / سید	مکتوبات مخدوم الملک	ثقافت / ص ۴۸ تا ۹۹ / جون
مشفق خواجہ	سرسید کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب بنام نواب وقار الملک	اردو / ص ۵ تا ۱۵ / جولائی
ندیم نیازی	مکاتیب محروم	ادبی دنیا / ص ۷۹ تا ۸۵ / "

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام کتاب	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آگ کی آندھی	-	ش - ز	لاہور/ ص ۱۱/ ۱۵ر جولائی
آنکھ کا نشہ اور کھنڈی آگ	آغا حشر کاشمیری	-	قندیل/ ص ۱۲/ ۲۴ر "
آئین وفا	صفدر حسین، ڈاکٹر سید	محمد اکبر الدین صدیقی	سب رس/ ص ۴۴/ "
ادب و اخلاق	فردوس رحمانی	م - ع - ق	ادبی دنیا/ ص ۱۹۵ تا ۱۹۶/ "
اردو (سہ ماہی رسالہ انجمن			
ترقی اردو پاکستان)	ایڈیٹر جمیل الدین عالی	غلام رسول	سب رس/ ص ۴۸/ جولائی
اردو/ سہ ماہی	-	ر - ا - ج	ثقافت/ ص ۱۷/ جون
اسلامی عہد میں فن تعمیر	سید معین الحق	انیس احمد	چراغ راہ/ ص ۴۴ تا ۴۵/ جولائی
اسم اعظم	شہر یار	محفوظ الرؤف	نئی قدریں/ ص ۸۸ تا ۹۰/ ۴۹/
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر	صفدر آہ	ع - م	آجکل/ ص ۴۶/ جولائی
انتخاب کامریڈ	رئیس احمد جعفری (مرتب)	سعید احمد اکبر آبادی	برہان/ ص ۶۴/ "
انتظام کتب خانہ	شیخ محبوب قریشی	ر - ا - ج	ثقافت/ ص ۶۹ تا ۷۰/ جون
انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ (مرتب)	ع - م	آجکل/ ص ۴۶/ جولائی
۲۴ نظمیں	کلیم الدین احمد	محمد اکبر الدین صدیقی	سب رس/ ص ۴۶/ "
بیسویں صدی کے چند اکابر			
غزل گو	محمد اسلام ڈاکٹر	شہر یار	ہماری زبان/ ص ۱۲/ ۲۲ر جولائی
پرچھیر	آقای محمد حجازی	سلیم اختر	ادبی دنیا/ ص ۱۸۷ تا ۱۸۸/ "
پکار	خلیل جبران		
	حبیب اشعر دہلوی (مترجم)	-	قندیل/ ص ۲۱/ ۴۲ر جولائی
پکچر — تاجور نمبر	شباب کیرانوی (ایڈیٹر)	فضل من اللہ	سیارہ/ ص ۸۳ تا ۸۴/ "
[illegible]	نسیم حجازی	[illegible]	[illegible]

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
پہلا دہ گھر خدا کا	غلام سرور	ش - ح	آجکل/ص ۷۴/ جولائی
پیراہن شرر	سردار جعفری	ع - م	" " ۴۵ تا ۴۶/ "
تاریخ ابن خلدون	ابن خلدون حکیم احمد حسین الہ آبادی (مترجم)	ادارہ شہاب	شہاب/ص ۱۳/ ۱۰ر جولائی
تحریک جماعت اسلامی — ایک تحقیقی مطالعہ	اسرار احمد	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید/ص ۶/ ۱۵ر جولائی
تحریک جماعت اسلامی	"	مصطفیٰ صادق	میثاق/ص ۵۱ تا ۵۴/ "
تذکرہ آسی مع انتخاب کلام	خواجہ عبدالرشید	علم الدین سالک	ادبی دنیا/ص ۱۸۱ تا ۱۸۳/ "
تذکرہ زنداں	خورشید احمد	ع - ق	زندگی/ص ۵۸ تا ۵۹/ "
" "	"	ماہر القادری	فاران/ص ۵۳ تا ۵۴/ "
تفسیر سورۂ والتین والعصر	مولانا محمد ایوب	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید/ص ۶/ ۱۵ر "
تہذیب و ثقافت	محمد حسام اللہ شریفی	ث - ز	لاہور/ص ۱۰ تا ۱۱/ ۱۸ر "
جگر کے خطوط	محمد اسلام (مرتب)	ش - غ - س	فروغ اردو/ص ۸۲ تا ۹۲/ "
جگر کے خطوط، نگارشات جگر، یادگار جگر	" " "	ذکیہ انجم	نوائے ادب/ص ۷۷ تا ۸۷/ جنوری
جگمگ	نور بجنوری	ابوبکر صدیقی	ادبی دنیا/ص ۱۸۳ تا ۱۸۶/ جولائی
جمالیات کے تین نظریے	میاں محمد شریف	ڈاکٹر ریاض الحسن	اردو/ص ۱۱۹ تا ۱۲۲/ "
جنون زار	سعید الظفر چغتائی	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید/ص ۶/ ۱۵ر "
جہاں ہم ہیں	غلام سرور	ع - ق	زندگی/ص ۵۹ تا ۶۰/ "
چند دن دیار غیر میں	عبداللہ عباس ندوی	" "	" " ۵۷ تا ۵۸/ "
حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم	طہ حسین ڈاکٹر شاہ حسن عطا (مترجم)	ض - ا - ب	کتابی دنیا/ص ۳۲ تا ۴۲/ جولائی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
...یقت زندگی	اسرار احمد	-	میثاق، ص ۷۳ تا ۵۰، جولائی
...ت فخر	مشتاق احمد خاں	-	انجام، ص ۱۵، ۱۱، "
"	" "	-	فاران، ص ۵۲ تا ۵۳، "
...بربادی	میاں سلطان احمد وجودی	عبدالباری عباسی	ادبی دنیا، ص ۱۹۱ تا ۱۹۲، "
...ی بستی اور اداس نسلیں			
...م جی العام یافتہ)	-	خالد وہاب	نئی قدریں، ص ۹۰ تا ۹۴،
العلوم دیوبند	مولانا محمد طیب	ضیاء الحسن فاروقی	جامعہ، ص ۵۵، جولائی
...ت تہ سنگ	فیض احمد فیض	آذر حفیظ	نئی قدریں، ص ۷۶ تا ۷۸،
...بدلیں	جی الانہ	سلیم اختر	ادبی دنیا، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷، جولائی
...نغمے	صوفی تبسم، نسیم محمود، ناظر کاظمی	م۔ش۔ن	قندیل، ص ۲۱، ۱۷، جولائی
...بیخودی	عمر انصاری		فروغ اردو، ص ۳۱ تا ۳۲، جولائی
...چشمہ	انم چند چندن	تاجور سامری	ہمایوں، ص ۷۱ تا ۷۲، "
...نار۔ لبشن نرائن درکی			
...یں	پریم پال اشک (مرتب)	ع۔م	آجکل، ص ۴۴، جولائی
...رکائنات کے ارشادات	نذیر احمد ناظر		قندیل، ص ۲۱، ۱۷، "
...باد	عمیق حنفی	ع۔م	آجکل، ص ۴۴، "
...م اور سائے	ڈاکٹر وزیر آغا	خالد وہاب	نئی قدریں، ص ۸۲ تا ۸۳،
...ہ جاں	درد سعیدی	سید عطاء الرحیم	" " ۸۳ تا ۸۶،
...رخامہ (قومی شاعری نمبر)			
...ر آباد	-	ص۔ا۔ب	کتابی دنیا، ص ۲۵ تا ۲۶، جولائی
...ی	عصمت چغتائی	-	قندیل، ص ۲۱، ۲۲، "
...یب غم	عارف عبدالمتین	-	نئی قدریں، ص ۸۴ تا ۸۸،
...ہ شناسی	ظ۔ انصاری	ع۔م	آجکل، ص ۴۴، جولائی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
فریاد و ارشاد	حکیم فخر حیدر آبادی	سلیم اختر	ادبی دنیا، ص ۱۸۸، جولائی
فن کی جانچ	سیدہ جعفر	محمد اکبر الدین صدیقی	سب رس، ص ۷۴، "
" "	" "	ع ۔ م	آجکل، ص ۴۳، "
کاشر زبان	میر غلام احمد کشفی	م ۔ ع ۔ ف	ادبی دنیا، ص ۱۹۲، "
کشمیر کی جنگ آزادی	سردار ابراہیم خاں	" " "	" " ۱۹۵، "
کشمیر ہمارا ہے	میر غلام احمد کشفی	ع ۔ م ۔ ق	" " ۱۹۴، "
کلام سودا	خورشید الاسلام	ضیا الحسن فاروقی	جامعہ، ص ۵۳ تا ۵۵، "
گریباں	مصطفی زیدی	ڈاکٹر خان رشید	نئی قدریں، ص ۳۷۳ تا ۳۷۸،
گلبانگ جہاد (قومی نظمیں)	متعدد حضرات	سید قمقام حسین جعفری	ادبی دنیا، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳، جولائی
لمحات زنداں	خرم جاہ مراد	محمد نصیر خاں	چراغ راہ، ص ۳۲ تا ۳۴، "
مثنوی قبلہ نما	کاوش بدری	ع ۔ م	آجکل، ص ۴۳، جولائی
مثنوی نل دمن ہندی	مناظر عاشق ہرگانوی	۔	ہماری زبان، ص ۳، ۸ جولائی
مختصر تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری	ض ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا، ص ۳۲، جولائی
مذہبی تحریکات ہند	۔	" " "	" " ۲۲، "
مذہبیت ولا مذہبیت کی کش مکش	صوفی نذیر احمد کاشمیری	ع ۔ ق	زندگی، ص ۶۰ تا ۶۱، جولائی
مرقع مسعود	جلیل قدوائی (مرتب)	ابو اللیث صدیقی	اردو، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲، "
مسجد سے میخانے تک	ملا ابن العرب	ع ۔ قا	زندگی، ص ۵۲ تا ۵۷، "
مضامین رشید	پروفیسر رشید احمد صدیقی	ضیا الحسن فاروقی	جامعہ، ص ۵۳ تا ۵۴، "
مقالات یوم عالمگیر	محمد ایوب قادری (مرتب)	م ۔ ج	معارف، ص ۷۹ تا ۸۰، "
مقام غالب	محمد موسیٰ خاں کلیم	سید قدرت نقوی	اردو، ص ۱۲۵ تا ۱۳۰، "
میر اور سودا کا دور	نثار الحق	محمد اکبر الدین صدیقی	سب رس، ص ۴۵، "

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
مار سیدہ	وارث کرمانی	-	آجکل، ص ۴۴، جولائی
مذر عرشی	مالک رام و مختار الدین آرزو	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید، ص ۲۲، ۲۲، جولائی
" "	" "	محمد اکبرالدین صدیقی	سب رس، ص ۳۱ تا ۳۴، "
" "		ضیاء الحسن فاروقی	جامعہ، ص ۴۷ تا ۵۳، "
قوش (سالنامہ)	محمد طفیل	ث ـ ز	لاہور، ص ۱۰، ۱۹، جولائی
ئی شاعری	افتخار جالب	ممتاز حسین	اردو، ص ۲۲ تا ۳۴، "
یا عہد نامہ	خلیل الرحمان اعظمی	ع ـ م	آجکل، ص ۵۴، جولائی
شیق احمد چودھری	داگ کے اس پار	الف الف الف	نئی قدریں، ص ۹۴،
رشاخ گل صلیب	حسن بخت	ابوبکر صدیقی	ادبی دنیا، ص ۱۸۸ تا ۱۹۱، جولائی
م سب اردو ہ	دیا نند ورما	ش ـ ح	آجکل، ص ۷۴، جولائی
ندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	سید عابد حسین	سعید احمد اکبرآبادی	برہان، ص ۱۴ تا ۳۴، "
دگار جگر، نگارشات جگر،			
ر کے خطوط	محمد اسلام	شہریار	ہماری زبان، ص ۱۲، ۱۵، جولائی

قاموس الکتب :- کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اُردو

بابائے اُردو

ان میں لکھی گئی ہے۔ ان کی یہ مکمل فہرست ہے۔ تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔ جو $\frac{30 \times 20}{8}$ سائز کے چودہ سو صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔

شروع میں بابائے اُردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔　　　قیمت :- ۴۰ روپے

کامیابی
کے لئے ضروری ہے کہ
آپ جو الفاظ استعمال کریں ان کے معانی سے پوری طرح واقف ہوں
اس سلسلے میں
اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری
آپ کی بہترین معاون ہو سکتی ہے
آپ گھر میں ہوں، دفتر میں یا سفر میں
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی بہترین رفیق ہوگی
اساتذہ
وکلاء
اطباء
مترجمین
اور سرکاری کلرکوں کے لئے
اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری
ایک بہترین تحفہ ہے
خوبصورت طباعت
ڈیڑھ ہزار صفحات ۱۵۰۰
اعلیٰ درجہ کا بائبل پیپر
مضبوط جلد
قیمت صرف ۲۱ روپے
انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۰ شمارہ ۴

اپریل سنہ ۱۹۶۷ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرستِ مضامین

دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر مرنے والا اپنے پیچھے یادوں کا ایک سلسلہ چھوڑ جاتا ہے اور انہیں یادوں سے مرنے والے کی شخصیت کو پہچانا جاتا ہے۔ شہریار دکن کی وفات پر پاکستان میں جس طرح اظہار افسوس کیا گیا اُس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آصف جاہ سابع کی شخصیت ہندوستان میں مسلم ثقافت کی آخری نشانی تھی۔ جن لوگوں نے نظام کی کتاب سیاست کا صرف غلط نامہ ہی پڑھا ہے انہیں یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ غیر منقسم ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے تحفظ کے لئے نظام اور ریاست حیدرآباد نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ نظام کی ثقافتی و قومی خدمات کو چند سطروں میں بیان کرنا ممکن نہیں، برِ صغیر کے کی شاید ہی کوئی ممتاز شخصیت ہو جس کی نظام نے حوصلہ افزائی نہ کی ہو۔ اور شاید ہی کوئی اسلامی ادارہ ہو جو اس منبع فیض کا ممنونِ کرم نہ ہو۔ اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لئے نظام کا کارنامہ اپنی نوعیت، اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے فقید المثال ہے انھوں نے حیدرآباد میں اُردُو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرکے اور جامعہ عثمانیہ قائم کرکے اس زبان کی صلاحیتوں کو جس طرح سے اُجھالا وہ اُردُو کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

نظام کے غم میں اُردُو بھی شریک ہے

انجمن ترقی اردو کا علمی ادبی اور تحقیقی مجلہ

سہ ماہی "اردو"

اپریل سنہ ۱۹۶۷ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

معناین کی ایک جھلک:

محسن کا ترجمہ مخزن نکات	مولانا امتیاز علی عرشی
اردو کی مستعار آوازیں	ڈاکٹر شوکت سبزواری
یورپ کی شاعری پر عربی شاعری کا اثر	ڈاکٹر ریاض الحسن
تعلیم اور فطرت انسانی	ڈاکٹر سلامت اللہ
تلامذہ حشر	ڈاکٹر عبد العلیم نامی
مصحفی کا فارسی دیوان (جواب دیوان ظہوری)	پروفیسر سید احتشام حسین
شبلی کی تاریخ رحلت اور اقبال	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ان کے علاوہ:

مرزا دبیر، مولانا حالی، سید احمد خاں، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے غیر مطبوعہ خطوط۔

مسلسل مضامین :-

- کند مالا - رن نگا اچاریہ کا ڈرامہ
- لغت کبیر اردو - از بابائے اردو
- اشاریہ مضامین اردو

ملنے کا پتہ:

انجمن ترقی اردو - بابائے اردو روڈ کراچی ۱

جناب جسٹس اے آر کارنیلیس

قانون کی تعلیم اور اردو

سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس،
نے ۲۵ فروری ۶۶ء کو جناح کالج حیدرآباد کے طلبہ کی یونین
کا افتتاح کرتے ہوئے ایک بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا
اس خطبے میں انہوں نے اردو زبان کا بھی ذکر کیا ہے۔
ذیل میں اردو زبان سے متعلق حصے کا ترجمہ شائع کیا
جا رہا ہے (ادارہ)

ہمارے ملک میں جو قوانین رائج ہیں ان میں سے اکثر بنیادی طور پر انگریزی طرز کے ہیں۔ ان قوانین پر عمل درآمد کے سلسلے میں ہمارے وکلا اور ججوں نے انگریزی دور حکومت میں ہمیشہ انگریزی عام قانون کے اصول کا سہارا لینے کی تربیت حاصل کی ہے۔ میں کسی طرح بھی اس قانون کے شاندار نظام کی اہمیت گھٹانا نہیں چاہتا۔ اس نظام نے تمام دنیا میں اہل قانون اور فلسفہ دانوں میں بہت بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اس کی قدریں نہایت اعلیٰ ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی عام قانون کے بہت سے اصول ابتدائی طور پر اس زمانے کے مسلمان مقننین کی تحریروں سے ماخوذ ہیں جب کہ یورپ میں ابھی تہذیب کی روشنی بھی نہیں پھیلی تھی اور بڑے بڑے تہذیبی مراکز اسپین یا شمالی افریقہ یا مشرق وسطیٰ میں واقع تھے۔ لیکن وہ تمام اصول جو انگریزی عام قانون کی بنیاد ہیں، سب کے سب اسلامی عام قانون کے قواعد کے بالکل اسی طرح مطابق نہیں ہیں جس طرح انہوں نے مسلم مقننین کی تعلیم اور اسلامی ممالک کی عدالتوں کے رواج کے ذریعہ ترقی پائی ہے۔ دونوں میں بہت سے نمایاں اختلافات ہیں اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اگر ایک آزاد قوم جس کا اپنا جدا مذہب ہو اور جس کے پاس ایک ایسا نظام ہو جس کی رو سے انسانی معاملات کے تمام مرحلوں میں اس مذہب کے اصول کے مطابق عمل درآمد ضروری ہو، اپنے پاس ایک وسیع فلسفۂ قانون اور اس کے بنیادی اصول رکھتے ہوئے باہر سے روشنی تلاش کرتی ہے تو یہ امر عجیب اس قوم کی خودداری کے منافی ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے ملک کے جج صاحبان جو صرف انگریزی زبان میں قانون کا کام کرتے ہیں اپنے سے اس سے زیادہ اعلیٰ امتیاز کی توقع نہیں کر سکتے کہ ان ملکوں کے اعلیٰ ججوں کے کمالات کے محض نقال ہو کر رہ جائیں۔ جہاں انگریزی قومی زبان ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ ہمارے سامنے جو معاملات آتے ہیں انہیں حل کرنے کے لئے فلسفہ قانون کا ضروری اصول ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود ہے آپنے فرض کی ادائیگی میں بہت زیادہ مسرت محسوس ہوگی۔ ان اصولوں کی تشریح و تفسیر کرنا اور انہیں ترقی دینا ہمارا فرض ہے اور ہمارے لئے موجب افتخار ہونا چاہئے ———— اور وکلا کے لئے بھی جو عدالت کو صحیح اصولوں کے ماتحت جائز فیصلہ کرنے میں مدد دیتے ہیں!

آپ حضرات کے لئے جو یہاں اس امر کی تربیت پا رہے ہیں کہ قانون کے مطابق کام کریں یا کسی اور طرح بہ قانون کی تعمیل کا ذریعہ بنیں یہ بہتر ہوگا کہ اپنی ان کوششوں کے قطعی نتائج اور ثمرات پر غور کریں جنہیں بروئے کار لانے کے آپ خواہش مند ہیں۔ آپ کا یہ فرض ہوگا کہ دستور کی شرائط کے مطابق پاکستان میں قانون کے ذریعہ معاشرتی انصاف رائج کیا جائے۔ آپ کو اپنا فرض سمجھنے کے لئے غیر ملکی ذرائع کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنی قابلیت اور استعداد کو پورا پورا کام میں لاتے ہوئے اس فرض کی ادائیگی کے لئے آپ کو جو کچھ کرنا ہے وہ اسلامی فلسفہ قانون میں پہلے ہی سے موجود ہے، شاید آپ خیال کریں عربی زبان کی تحصیل ایک بڑی رکاوٹ ہے، لیکن وہ اصحاب جو اردو سے واقف ہیں، ان کے لئے انگریزی میں قانونی اصطلاحات پر پورا پورا عبور حاصل کرنے کے مقابلے میں مناسب قانونی عربی حاصل کرنا زیادہ آسان ہے۔ بہ حالات موجودہ آپ کے لئے قانونی انگریزی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں یہ ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری نہیں۔ اردو زبان میں عربی اصطلاحات پہلے ہی سے پورے طور پر مستعمل ہیں اور مسلسل کوشش سے بہت ہی تھوڑے عرصے میں اسے جدید قانونی اور عدالتی کارروائیوں کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے اس امر کا اطمینان حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی کہ پاکستان کے اس حصے میں جو مسائل کا نہ صرف منصفانہ فیصلہ ہو بلکہ عوام انصاف کو دیکھیں اور سمجھیں بھی۔

میری دعا ہے کہ وہ دن جلد آئے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال کے فوراً بعد

حکیم الامت ابھی زندہ ہی تھے۔ ادھر ان کے فکر کے خلاف چند واضح ردِ عمل نمودار ہو رہے تھے ان میں سے ایک ردِ عمل ترقی پسندی کی تحریک تھی اور دوسرا ردِ عمل ہیئت پرستی اور زمین پرستی کی تحریک جس کی نمائندگی میرا جی نے کی۔

ادب و شعر کی دنیا میں ہیئت کے تجربے ہوتے رہتے ہیں اور ان تجربوں پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ لیکن ان نئے تجربوں کے ساتھ ساتھ اگر اجتماعی فکر یا قوم کے بنیادی عقیدوں پر بھی ضرب پڑتی ہے تو معاشرے کو حق پہنچتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ ان نئے عقیدوں کی چھان بین کرے اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلہ صادر کرے۔ ہاں یہ تسلیم ہے کہ اس چھان بین میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

ترقی پسندی کی تحریک ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر بہت لکھا جا چکا ہے اس لئے فکر اقبال کے اس ردِ عمل پر اس وقت گفتگو نہیں کروں گا۔ البتہ اس دوسرے ردِ عمل کے بارے میں مختصراً اضافات پیش کر رہا ہوں۔ ان کا تعلق میرا جی کی شاعری سے ہے۔ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اقبال کے فوراً بعد اقبال کے خلاف دانستہ یا نادانستہ یہ تحریکیں کیوں اٹھیں اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان کی نوعیت کیا تھی؟

میں جو کچھ کہنے والا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرا جی کی فکری تحریک اکثر صورتوں میں اقبال کے خیالات کی ضد تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ میرا جی کی شاعری لفظی موسیقی اور رمز کی شاعری تھی اور اس حد تک مجھے اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اس فکر پر ہے جو میرا جی کی شاعری میں موجود ہے۔ میں اقبال کے ساتھ میرا جی کو اس لئے معرض بحث میں لا رہا ہوں کہ اقبال کے افکار کے ساتھ ساتھ ان خودی شکن افکار کا تصور بھی سامنے آ جائے۔ جن کی خلاف حضرت علامہ نے ایک عمر صرف کی کتنے تعجب کی بات ہے کہ شاعر مشرق نے جن عقائد و رسوم پرستی پر شدید احتجاج کیا وہ اب قوم کے ادب پسند حصے میں ایک مروج رجحان کی حیثیت اختیار کر رہا ہے اس کے لئے طرح طرح کے الفاظ اور اصطلاحیں تراشی گئی ہیں۔ مثلاً اس ملک کا اصلی کلچر، اس ملک کی بو باس، پاکستان کا زمینی کلچر وغیرہ وغیرہ۔ اور اب تو اس غرض کے لیے باقاعدہ رسالے نکالے گئے ہیں جن میں ادب کے نام سے ہندو دیومالا اور زمین کی پرستش کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا میرا جی سے ہوئی۔ اسی لئے میں میرا جی کا خاص ذکر کر رہا ہوں۔

مجھے پورا پورا احساس ہے کہ حکیم مشرق اقبال کو جوگی میرا جی اور ان کے پیرو شاعروں کے سامنے لانا شاید شاعر مشرق کے ساتھ بے انصافی ہوگی پھر بھی میں یہ جرأت اس لئے کر رہا ہوں کہ اثرات اور ردِ عمل کی بحث [illegible] ناگزیر ہے۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ میرا جی کی شاعری نوجوانوں کے

ایک گروہ میں بے حد مقبول ہے اور ایک خاص گروہ تو میرا جی کو اپنا فکری امام مانتا ہے۔ اور یہ دور ادب جدید روز بروز بڑھ رہا ہے اور اگرچہ یہ لوگ وہی زبان سے اقبال کو بھی مانتے ہیں اور میرا جی کو اقبال کے مقابلہ پر نہیں لاتے پھر بھی اپنی خلوتوں میں برملا کہتے ہیں کہ اس ملک کا اصلی شاعر میرا جی ہی ہے۔ جو اس ملک کے دیوتاؤں اور اس سرزمین کے جنگلوں اور وادیوں کی تعریف کرتا ہے۔ اقبال تو روم و شام اور سمرقند و بخارا کا شاعر ہے اور یہ بات واقعی قابل غور ہے ان وجوہ سے ایک مدرس اور مورخ ادب کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان جدید الفکر فنکاروں کے اس فکری رویے کو نظر انداز نہ کرے اور عقلی قومی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے اس رویے کی صحیح نوعیت معلوم کرے اور قوم کو خود فیصلہ کرنے کا موقع دے کہ وہ رویہ قومی و اجتماعی زندگی کے حق میں کہاں تک صحت مند یا بیمار آواز ہے جو میرا جی نے یا انکے پیروؤں اور حامیوں نے پیش کیا۔

میں میرا جی کو ماننے والوں میں ہوں میرا جی کی شاعری میں جو موسیقی ہے اور اس کے نغموں میں جو اور ہیر اگ کا جو سوز ہے اس سے کم از کم میں انکار نہیں کر سکتا میں ان لوگوں سے خود کو الگ سمجھتا ہوں جو کسی شاعر کو محض اس لیے ادب کی تاریخ سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارے مانند نہ ملتا تھا۔ میں تو شیخ امام بخش ناسخ کو بھی مانتا ہوں جو بقیہ فولاد سے ہما کا بچہ پیدا کرنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ میں تو انشاء سے بھی بددل نہیں ہوا جس نے اچھی شاعری کرتے کرتے یکایک ہی بس ایک دن دیوار پھاندنے کی حرکت کر دی اور اس کا نقشہ بھی کھینچ دیا۔

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

ایسے حالات میں بہ حیثیت مدرس کسی سے بددل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کیا ہے اور یہ بھی کہ اس شاعر کی شاعری میں جو فکر ہے وہ فرد کی پاکیزہ زندگی اور اجتماع کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔؟

اس بحث کی دوسری صورتیں بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ ادب و فن کو جانچنے کے ایک نہیں بیسیوں طریقے ہیں مگر آج میں اقبال کے تصور ادب و فن کی روشنی میں اس بحث پر گفتگو کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ معاملہ قوم کی فکری تعمیر کا ہے اور ہم ایک لحظہ بھی اس سے غفلت نہیں برت سکتے کہ ہماری فکری تعمیر کے لئے کون سی چیزیں مفید ہیں اور کون سی مضر ہیں۔ لہٰذا میرا جی کی شاعری کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا ہوگا وہ اقبال کے تصور ادب کی روشنی میں کہنا ہوگا۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ میں میرا جی کی شاعری یا فکر کو اقبال کے فکر کا کم و بیش مخالف رد عمل سمجھتا ہوں اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اقبال کا تصور شعر (تصور فن) ان کے نظریہ خودی سے نکلتا ہے اور ان کا نظریہ خودی مسلمانوں کی اجتماعی قومی اور تہذیبی خود شناسی اور احیاء کا ایک پیغام، ایک دستور العمل ہے۔

اقبال کے تصور شعر کے لئے میں اقبال کے ایک نثری مضمون "حضرت رسالت مآب کا ایک ادبی تبصرہ" کا حوالہ دیتے ہوئے آنحضرت کی دو ادبی تنقیدوں کا ذکر کرتا ہوں۔ آنحضرت نے امرءالقیس کے بارے میں فرمایا۔ اشعر الشعراء و قائدہم الی النار۔ (ترجمہ: وہ شاعروں کا سردار ہے مگر جہنم کا رہنما بھی وہی ہے) ایک اور موقع پر آنحضرت نے قبیلہ بنو عبس کے ایک شاعر عنترہ کا ایک شعر سن کر فرمایا "میں کسی عرب کی ملاقات کے لئے اتنا مشتاق نہیں رہا ہوں جتنا اس شاعر کی ملاقات کا مشتاق ہوا ہوں۔

وہ قصیدہ تھا

و لقد ابیت علی الطوی واظلہ
حتی انال بہ الکریم الماکل

ترجمہ :- میں رات بھر محنت مشقت کرتا رہا تاکہ میں حلال روزی پر گزارہ کر سکوں ۔

ان دونوں حدیثوں کا ذکر کرکے اقبال نے ادب یا صحیح ادب کے بارے میں کچھ نتیجے نکالے ہیں ان کی ایک خاص فکری صورت بنتی ہے اہم سوال یہ ہے کہ امرا القیس کی شاعری کیوں ناپسند کی گئی اور عنترہ کی شعر میں کیا خاص بات تھی کہ آپ نے اسے پسند فرمایا اقبال کے نزدیک وجہ یہ تھی کہ امرا القیس کی شاعری میں صنعت گری کا کمال ہے ۔ مگر اس شاعری کے افکار پاکیزہ زندگی کے منافی ہیں اس کے برعکس عنترہ کے شعر میں زندگی کا ایک بلند نصب العین پیش کیا گیا ہے ۔

اقبال نے اپنے مذکورہ بالا ادبی تبصرے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ شاعری فنون کے لئے بھی ہو سکتی ہے مگر اس کی غایت حیات قومی کی خدمت ہے ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری زندگی کی تابع اور پاکیزہ زندگی کی رہنما ہے اور معلوم ہے کہ اقبال نے جس اجتماع کو مدِ نظر رکھا ہے وہ ہندوستان کی حدود میں مقید نہ تھا بلکہ اس کی قلمرو نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر پھیلی ہوئی تھی اقبال وطنیت کے شدید مخالفوں میں سے تھے ۔

اقبال کے نزدیک ۔شاعری کا ایک مقصد عمل اور جدوجہد کی ترغیب اور ذاتی سطح پر وجدان صحیح اور ضمیر صالح کی دریافت ہے جلال اقبال کی سب سے بڑی جمالیاتی قدر ہے ۔ ضعف ، نرمی ۔ ملائمت اور مضمحل بحروں کے اقبال بہت مخالف ہیں ۔ توحید اقبال کا سب سے بڑا عقیدہ ہے اور توحید سے مراد اس وحدہٗ لاشریک سے جو حی و قیوم ، سمیع و بصیر اور ظاہر و باطن ہے اور حیات و کائنات کا مصدر اور خالق ہے یہی توحید ہے جسے شاعری کے سارے فضائل میں موجود ہونا چاہئیے روحی نے اسے کو کر یوں ہوا اللہ کہہ کر ذہنی شاعری کی تعریف کی تھی اور اقبال بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں یہ تھا ہے اقبال کا تصور شاعری ۔ اب تھوڑی دیر کے لئے میرا جی کی طرف آجائیے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں انفرادی سطح پر میرا جی کی نظموں سے متاثر ہوتا ہوں ۔ میرا جی نے لفظوں کی موسیقی آہنگ کی دلاویزی آزاد نظم کی فنکارانہ بندی اور اس میں علامتوں کے ہنرمندانہ استعمال سے فن کاری کا ایک دلکش نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے ۔ میرا جی نے اپنے میٹھے گیتوں سے بہت سے جاگتوں کو سلا یا بھی بہت سے ہوشیاروں کو بے خود بنایا ہے ۔ بہت سے راہ ہروں کو چلتے چلتے رکنے پر مجبور کر دیا ۔ یہ ساحری ، یہ جادو گری میرا جی کو ملی اور خوب ملی کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ۔

مگر حضرات اہم سوال ان افکار اور رویوں کا ہے جن سے میرا جی کی شاعری لبریز ہے ۔ میرا جی کے افکار یہ ہیں ۔

۱ ۔ دھرتی پوجا ۔

۲ ۔ ہندو دیو مالا کا احیا ۔

۳ ۔ ادب ذکر کی ہندی روایت کی طرف رجعت ،

۴ ۔ بے جہت ، داخلیت ۔ کلبیک اور زندگی سے گریز ۔

۵ ۔ موت ، سمندر ، عورت اور جنگل کے موضوعات ۔

۶ ۔ ہیئت میں بے سمتی طرز اظہار میں علامت نگاری اور ابہام ۔

میراجی کے تنقیدی کام کی اس فہرست سے ہی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ انہوں نے اپنا شعور حیات مغرب اور مشرق کے ان سے لیا ہے کہ اقبال سے مختلف ہے۔ اقبال کے حب وطن میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر —
وطن سے وہ اس لیے محبت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے محبوب عقیدوں کا گہوارہ ہے۔ ہندو فلسفیوں اور شاعروں کی عظمت سے اقبال نے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ جاوید
نامے میں ان میں بہت سے لوگوں کو اعلیٰ مقامات میں دکھایا ہے مگر یہ اعتراف عظمت فکری رہنمائی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ان کے ذہن کی بلندی اور ان کے
حکیمانہ شغف کے اظہار کے لیے ہے۔ میراجی نے جنگلوں سے دلچسپی لی ہے مگر سب صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ اقبال جنگلوں کے شاعر نہیں، پہاڑوں کہساروں اور چٹانوں کے
شاعر ہیں۔ میراجی نے عورت کو اپنے بہت سے مبہم تصورات کی علامت بنا کر عورت کی شخصیت کو فنا بنانے کی کوشش کی ہے مگر اقبال کے یہاں مرد اور عورت بھی ہیں اور فاطمہ
بنت عبداللہ بھی ہیں ان کے نزدیک ہر وہ شخص مثالی ہے جو کردار اور عمل کا مظہر ہو۔

میراجی ابہام کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور نسوانی لہجوں میں بات کرتے ہیں۔ اقبال قطعی بیان حقائق کے شاعر اور توانا لہجے کے مالک ہیں علامت
کا استعمال اقبال بھی کرتے ہیں مگر جہاں میراجی کی علامتیں ان کی بے حد پرائیویٹ زبان کا حصہ ہیں وہاں اقبال کی علامتیں اجتماعی نوعیت کی ہیں اور ان کے انکشاف
کے لیے شاعر کے گہرے اندھیرے نفس کے اندر بہت کاوش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال زندگی کے شاعر ہیں۔ اور میراجی
زندگی کے بارے میں متشکک شاعر ہیں۔

اقبال ذات کو آفاق کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ مگر میراجی اقبال کے بعد پہلے بڑے شاعر ہیں، جو اجتماع سے ہٹ کر ذات کے اندر گم
ہوتے ہیں۔ یہ جنگل میں جا چھپے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ میراجی بڑی حد تک اقبال کی ضد ہیں یا کم از کم اقبال کے ہم رنگ نہیں یہ بات اگر تسلیم کر لی
جائے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا۔ اگر پھر بھی کوئی شخص جھگڑا اٹھائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ میراجی کی شاعری کی اصل قدر و قیمت سے بھی انکار نہیں کیا جا
کم از کم میں نہیں کرتا۔ اسی لیے میں جہاں اقبال کو اجتماع اور ملت کا شاعر سمجھتا ہوں وہاں میراجی کو غم آشنا فرد کا شاعر خیال کرتا ہوں، میں میراجی کی شاعری کو کوئی ا
مدد جینے کے حق میں نہیں ہوں یعنی میں اسے حق میں نہیں کہ میراجی کو فرد یا اجتماع کے کردار کی تعمیر پر اثر انداز ہونے دیا جائے مگر میں یہ ہر وقت تسلیم کر دوں گا۔
میراجی نے اپنے دکھ درد کی اچھی ترجمانی کی ہے، میراجی ہمارے معاشرے کا ایک روٹھا ہوا غم زدہ شخص تھا لہذا میراجی کے دکھ کا منکر ہونا سراسر زیادتی ہے۔
آخر ہم میر تقی کو بھی تو بڑا شاعر مانتے ہی ہیں، ہم یہ جانتے ہیں کہ فرد کا دکھ دونوں میں قدر مشترک ہے اب یہ بھی معلوم ہے کہ میر سے لے کر میراجی تک غ
کی ایک سیدھی لکیر ہے جو ہر انسانی دل کے پاس سے گزرتی ہے اور معلوم نہیں میر سے پہلے کتنوں کے دل کے پاس سے گزری ہو گی جب صورت یہ ہے تو یہ
ایک جوگی بیراگی میراجی ہی کو ہم زیادہ کیوں کوسیں؟ مگر ستم یہ ہی ہے کہ میراجی کو صرف اپنے دکھ کی فریاد سمجھا جانے اور اسے کسی فکری مسلک کا رہنما
بنایا جاتا ہے یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میراجی کا دانستہ یا نادانستہ خاصا تتبع ہوا ہے۔ اس میں میراجی کی شخصیت اور شاعرانہ موسیقی کی بھی کشش تھ
مگر کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے اقبال کے مقابلے پر ایک دوسرا مسلک کھڑا کرنے کا ارادہ بھی اس میں شریک رہا ہے اور باعث ہے کہ یہ مسلک دیر تک چل نہیں
مگر میراجی کو اقبال کی اسلامی بین الاقوامیت اور اسلامی اجتماعیت کا مد مقابل رہنما بنانے کی بڑی دیر تک کوشش ہوتی رہی جو خدا کا شکر ہے کہ اب ناکام ہو گئ
ہے تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ میراجی کے نغمے سننے کا شوق ہو تو ضرور سنئے مگر اجتماعی نقطۂ نظر سے ادبی اور فکری مسلک اگر کسی کا ہے تو وہ اقبال اور
فقط اقبال کا ہے

جوش ملیح آبادی

بیادِ اقبال

جناب جوش ملیح آبادی "یادوں کی برات" کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ جس کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس خود نوشت میں حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد بہ عہد افکار و نظریات پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز بہت سی اہم ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ جناب جوش نے قومی زبان کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں جوش صاحب کا تجزیہ ان کے شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ ہے اور اسی لئے بہت "دلچسپ" ہے۔　　(ادارہ)

اسی دور تصوف و تقشف میں میری سب سے پہلی مصور تصنیف "روح ادب"[1] غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں میرے بزرگ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اور میرے دوست رفیع احمد خان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ اس مجموعے کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ افریقہ و رنگون وغیرہ سے بھی اس کے آرڈر آئے تھے ——— "روح ادب" پر سب سے زیادہ تبصرہ کیا تھا۔ میرے اُس وقت کے حبیب اور اس دور کے حریف مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے، جن کی محبت کے غلو نے، میرے سے ہیچ مدان نوخیز شاعر کو، غالب و ٹیگور کی صف میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ اور "روح ادب" کی تنقیص پر سب سے پہلے قلم اٹھایا تھا سجاد انصاری[2] مرحوم نے اس وقت ماجد صاحب "کفر" سے منہ موڑ کر پھر اسلام کی جانب آ چکے اور سجاد انصاری حلقۂ اسلام سے بھاگ کر "کفر" کی جانب افتاں و خیزاں

---

[1] اس کتاب پر لاگت آئی تھی۔ چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی۔ ساڑھے تین روپے فی جلد۔

چلے جا رہے تھے۔ اور یہ ایک رسم بن چکی تھی کہ ادب کے میدان میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ممدوح پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔ اسی دوران میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر مجھ کو "روح ادب" کی بہت داد دی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ "کوئی شک نہیں کہ آپ کے ساغر تو بالکل نئے ہیں ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر ان ساغروں میں شراب بھری ہوئی ہے۔ وہی پرانی۔ آپ حافظ اور ٹیگور سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ان دونوں کی شاعری اُبھارا نہیں پیدا کرتی ہے۔ یہ انسان کو جگاتے نہیں بلکہ تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ آپ حافظ و ٹیگور سے دامن چھڑا لیجئے، فکری اور حرکی شاعری کی طرف آئیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی بے پناہ خداداد استعداد سے مجھ کو یقین ہے کہ آپ صف اول کے شعراء سے بھی سبقت لے جائیں گے۔ اس وقت میری طبیعت کا دھارا تصوف کے میدان میں بڑے زور شور سے، گونج رہا تھا، اس لئے حضرت اقبال کی نصیحت بزرگانہ کا اثر میں نے قبول نہیں کیا۔

لیکن آگے بڑھ کر، جب میرا مزاج "روح ادب" کے مزاج سے مختلف ہونے لگا۔ اور تصوف سے گزر کر میرے کلام نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اور پھر سیاسی میدان سے آگے بڑھ کر جب میری شاعری تجسس و تشکک کی طرف مڑنے لگی تو اس وقت میرے دل میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ حضرت اقبال ہی کی نصیحت کا اثر اور یہ سب کچھ انہیں کا فیضان ہے، اس لئے کہ شنیدہ اثرے دارد۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اقبال جس نے مجھ کو ٹوکا اور جس روش سے مجھے روکا تھا۔ وہی عظیم اقبال چولا بدل کر۔ حافظ کے راستے پر خود گامزن ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سست عناصر تصوف کے دائرے سے تو مردانہ نکل آیا اور سلانے کے عوض اس نے چونکانے کی بھی سعی کی۔ اپنی نانی و آبائی افتاد مزاج، ماحولی اثرات، اور ہنود[1] کو اپنے جادۂ ترقی کا سنگ راہ پاکر، اس نے ایک ایسا خیمہ نصب کر لیا۔ جس میں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی طنابیں لگی ہوئی تھیں، اور وہ اس خیمے میں بیٹھ کر "اسلام" اے عشق خوش سودائے ما"! کا راگ الاپنے لگا۔ اس میں ذہانت بھی تھی، اور حکیمانہ موشگافی بھی۔ اس لئے وہ ایک مدت تک مشرقی ملاؤں، اور مغربی متفکروں کے بین بین بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا رہا اور بہت دن تک مستی کو ہوش پر، اور جنون کو عقل پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اور ایک زمانہ دراز تک وہ خلوص کے ساتھ مشرقی ایمان اور مغربی الحاد کے مابین مصالحت کرا دینے کی فکر میں بھی سرگرداں رہا۔ لیکن وہ اپنی

---

[1] افسوس کہ میں کبھی ان سے مل نہیں سکا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ اگر وہ کچھ اور جیتے تو ہمارے ادب میں ایک قابل قدر فکری اضافہ ہو جاتا۔

[2] جن کے باب میں اس نے کہا ہے، ع، خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ :

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

کلام اکبر بنام اقبال

نقیر سید وحید الدین نے گزشتہ چار برسوں میں علامہ اقبال سے متعلق جو چند کتابیں شائع کی ہیں۔ انہیں
بجا طور پر اقبالیات میں اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً "روزگار فقیر" جلد دوم میں اقبال کا جو غیر
مطبوعہ کلام انہوں نے شائع کیا ہے، وہ ایک ناقابل فراموش علمی و ادبی خدمت ہے۔ اس سلسلے میں
سید صاحب نے سہواً اکبر الہ آبادی کی ایک نظم بھی علامہ کے نام سے شامل کر دی ہے۔ "روزگار فقیر" جلد دوم
ص ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴ پر مندرجہ ذیل نظم شائع کی گئی ہے (سات اشعار کی یہ سیاسی نظم کسی مجموعے میں نہیں پائی گئی)

ہے قوم جسم و سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

سعی شغال دگرگ سے جنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے

اللہ زندگانی شخصی کا ہے وجود
قانون ہیں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے

پیمانۂ ہائے ساختۂ شاہ وقت پر
محدود طالبین کی فکر معاش ہے

بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزو غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

اپنی یہ احتیاط کہ بس ہے پر اکتفا
اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

یہ نظم "قطعہ" کے عنوان سے کلیات اکبر حصہ اول میں (ص ۲۶۶) پر شامل ہے۔ یہ کلیات پہلی مرتبہ اکبر کی زندگی ہیں الہ آباد سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ کلیات کے بارہویں ایڈیشن میں بھی جو الہ آباد سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا یہ قطعہ شامل ہے۔ سید نقیر وحید الدین صاحب نے اقبال کا جو غیر مطبوعہ کلام شائع کیا ہے۔ وہ انہیں شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیاض سے ملا ہے شیخ صاحب نے مختلف اخباروں اور رسالوں سے علامہ اقبال کا کلام جمع کیا تھا۔ ممکن ہے اکبر کا یہ قطعہ اس زمانے میں کسی اخبار میں شائع ہوا ہو اور وہیں سے شیخ صاحب نے نقل کر کے رکھ لیا ہو اور بعد میں انہیں یہ خیال نہ رہا ہو کہ یہ اکبر کا زائدہ فکر ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ محض اس لئے کیا جا رہا ہے کہ "روزگار فقیر" کے آئندہ ایڈیشن میں اس قطعے کو شامل نہ کیا جائے۔ (م۔ رخ)

(بقیہ صلا کا)

اس کوشش میں جب وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تو اس ناکامی کے بعد اس نے نطشے کے مافوق البشر (SUPERMAN) کو مشرف بہ اسلام کر کے اس کو مرد مومن یعنی "شاہین بچہ" بنا دیا۔ اور قرآن کے مردود۔ ردمی کے محبوب لفظ "عشق" کے سر پر "تمام مصطفےٰ" کا عمامہ باندھ دیا۔ اور جب حکیم ممدوح کی عقل نے اسے تیکھے تیوروں سے دیکھا تو اس نے جھلا کر اس کی گردن میں "تمام بولہب" کا طوق ڈال دیا۔

چیست؟ یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

سید عبدالرشید فاضل
صدر شعبہ ادبیات فارسی اردو کالج کراچی

اقبال اور تصوّف

اب[1] ہم اقبال کی تصانیف کا جائزہ لیکر دیکھتے ہیں کہ تصوّف کے متعلق مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اُن کے نظریات کیا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خود ان کی تصانیف میں اُن کے قائم کردہ معیارِ تصوف کی خلاف ورزی موجود ہو۔ اس سلسلے میں اوّل ان کے اُس کلام کو دیکھنا چاہیئے جو اُن کے یورپ جانے سے پہلے کا ہے یعنی ۱۹۰۵ء تک کا کلام۔ ظاہر ہے یہ اُن کا ابتدائی کلام ہے اُس وقت کا جب اُن کا زاویۂ نظر وسعتِ مطالعہ کا محتاج تھا اس لئے اس زمانے میں ان کے ہاں ملے جلے خیالات پائے جاتے ہیں، وہ بھی جن کی انھوں نے بعد میں سختی سے تردید کی اور وہ بھی، جو بعد میں اُن کے مستقل موضوع بن گئے۔ مثلاً ۔

صیّاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ!

میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں۔؟

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں!
پھر چھڑ نہ جائے قصّۂ دار و رسن کہیں!

ان اشعار میں "وحدۃ الوجود" کا نظریہ موکد ہے۔

اسی طرح ذیل کے اشعار میں بھی یہی رنگ جھلک رہا ہے ۔

حقۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں نہ میخانہ
میں اس میخانۂ عالم میں ہر شے کی حقیقت ہوں

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانہ میں
یہ تصویریں ہیں تیری جنکو سمجھا ہے برا تو نے

---

[1] جناب فاضل "اقبال اور تصوف" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہ مقالہ اسی کتاب کا ایک باب ہے۔

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں — یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

جگنو والی نظم میں لکھتے ہیں:

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

ایک پوری غزل میں شروع سے آخر تک وحدۃ الوجود ہی کا بیان ہے۔

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں — جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں
بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی — روانی بحر میں، افتادگی تیری، کنارے میں

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل — جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے!

ستارے میں وہ، قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز کر

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے — شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

یا ایسے اشعار ہیں:-

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر — ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

حالانکہ بعد میں "گوش بند و چشم بند و لب بہ بند" والے شعر کا مذاق اڑایا ہے اور آنکھیں کھول کر کائنات کی ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کرنے کی تعلیم دی ہے اور مطالعۂ فطرت کو معرفتِ الٰہی کی بنیاد قرار دیا ہے:-

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

سوامی رام تیرتھ کے انتقال پر یہ اشعار لکھے ہیں۔

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — لا کے دریا میں ہے موتی الا اللہ کا
چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیمِ خام ہے

کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی　　　آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی

بعد میں نفیٔ ہستی دفنا اور سکون دونوں کو موت کا مترادف قرار دیا ہے اور اثباتِ خودی اور سعیٔ پیہم کو زندگی سے تعبیر کیا ہے بلکہ اقبال کی بعد کی شاعری کا بیشتر حصہ انھی دو باتوں کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔

یا ایسے خیالات ہیں۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے　　　پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

بعد میں تقدیر کے اس مفہوم کی سختی سے تردید کی ہے اور جبر کے بجائے انسانی اختیار کو ثابت کیا ہے اور اس بات کے ذہن نشین کرنے کیلئے بے شمار اسالیب اختیار کئے ہیں۔

لیکن اس دور میں ایسے خیالات بھی موجود ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اور جو واقعی صوفیانہ خیالات ہیں مثلاً۔

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر　　　مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

یہی خود شناسی کا مضمون ہے جو بعد میں انکا مستقل موضوع بن گیا۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی　　　الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل کی ہے تو خدمت کر فقیروں کی　　　نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں!
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو　　　ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو　　　وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو　　　کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا　　　یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیسا　　　کہ اک نظر میں جوانوں کو رام کرتے ہیں!

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی شان میں فرماتے ہیں۔

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم　　　نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا!

اہل اللہ کی مذکورہ بالا تعریف میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات کے فیضانِ صحبت سے ناقص کامل اور کامل رہنما بنتے رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات خود عشقِ الٰہی میں سرشار ہوتے ہیں اس لئے ان کا عشق دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ذرہ آفتاب اور قطرہ دریا بن جاتا ہے عمر بھر کے گناہوں کی کثافت دور ہو کر انسان کا دل ایک ہی نگاہِ کیمیا سے ایسا پاک ہو جاتا ہے کہ خود پاکیزگی و طہارت کو اس پر رشک آنے لگتا ہے۔ کل تک جو خرابات نشین تھا آج وہی ولیوں کا ولی ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند　　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
(حافظؒ)

ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے۔ اور تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مولانا روم ہی کو لیجئے جن کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں۔

پائے در زنجیرِ توجیہات عقل　　کشتیش طوفانیٔ ظلماتِ عقل
موسیٰ بیگانۂ سینائے عشق　　بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت　　وزِ حکم صد گوہرِ تابندہ سفت
عقدہ ہائے قول مشائیں کشود　　نور فکرش ہر خفی را وا نمود

لیکن شمس تبریزی کی نگاہِ التفات نے کیا سے کیا کر دیا! اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

یک زمانے صحبت با اولیا　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اور اقبال فرماتے ہیں ع طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے!

حضرت نظام الدین اولیائے کے فیوض و برکات کا کیا کہنا! آپ کے ارادتمندوں کا آپ کی ذات سے اس طرح اکتساب فیض کرنا جس طرح ستارے آفتاب سے کرتے ہیں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

یا ایسے اشعار ہیں۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو　　کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

جنت کی مذمت نہیں کرتے بلکہ اُس سے بھی بڑی نعمت یعنی دیدار الٰہی کی تمنا کا اظہار کر کے اپنی عاشقانہ اولالعزمی و بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ مضمون قدیم صوفیۂ اسلام کے ہاں بھی ملتا ہے کہ ہم دنیا میں خدا کی خوشنودی اور آخرت میں اُس کا دیدار چاہتے ہیں اور بس۔ ان حضرات کے نزدیک جنت عبادات و ریاضات اور زہد و تقویٰ کی جزا ہے اور دیدار الٰہی عشق و محبت کا صلہ۔

یا معرفت و خود شناسی پر مبنی ایسے اشعار ہیں جو حقیقی تصوف کی روح کہے جا سکتے ہیں مثلاً

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو　　آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

یعنے معرفت خداوندی نفس کشی سے نہیں، نفس کے پہچاننے سے حاصل ہوتی ہے۔

یا ایسے پاکیزہ خیالات ہیں جو تصوف کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے　　میں اُس کا طالب بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ وہی خیال ہے جو شیخ سعدیؒ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

نیز حضرت ابراہیم ادہمؒ کے ایک خاص واقعہ کیطرف بھی اشارہ کیا۔

یا ایسی قلبی کیفیات کے حامل اشعار:

دلِ بیتاب جا پہونچا دیارِ پیرِ سنجرؒ میں　　میسّر ہے جہاں دربانِ دورِ ناشکیبائی

دیارِ پیرِ سنجرؒ سے اجمیر شریف مراد ہے جہاں خواجہ معین الدین چشتی سنجریؒ کا مزار ہے۔ وہاں ایک مسلمان کو واقعی طمانیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے

یا ایسے اشعار :۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں　　بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را!

فقرِ اسلامی کی یہی تعریف ہے کہ گدائی ہو یا پادشاہی، دولت ہو یا افلاس، ایک مسلمان پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو۔ اور مسلمانوں میں ایسے بادشاہ بھی ہوئے ہیں اور دولت مند بھی جو شاہی دولت کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ایسے بے نوا فقیر بھی ہوئے ہیں جن کے پاس کچھ نہ تھا مگر اُن کے استغنا کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی خیال میں نہ لاتے تھے۔

فقیری ترکِ امارت و ثروت کا نام نہیں ہے بلکہ ہر حال میں خوش اور رجوع الی اللہ رہنے کو فقیری کہتے ہیں۔
حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ " میخِ زر در گلِ زدہ ام نہ کہ در دل۔!

یا ایسے اشعار ہیں :۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے　　یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!

شعر کی بنیاد قریب قریب اُس حدیثِ قدسی پر رکھی ہے جس میں فرمایا ہے کہ
" میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور پھر اُس کا کان جس سے وہ سنتا ہے اور آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ جس سے وہ چھوتا ہے اور زبان جس سے وہ بولتا ہے اور پاؤں جس سے وہ چلتا ہے سب کچھ میں ہی بن جاتا ہوں پس وہ مجھ سے ہی سنتا ہے مجھ سے ہی دیکھتا ہے اور مجھ سے ہی چھوتا ہے اور مجھ سے ہی چلتا اور بولتا ہے "۔

یا ایسے کیف آور اشعار ہیں :۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں　　کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ　　کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا　　ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

صوفی کا قول ہے " ما رأیتُ شیئاً الّا رأیتُ اللہَ قبلَہٗ = میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں تو پہلے خدا کو دیکھتا ہوں (اور بعد میں اُس چیز کو) اقبال ایسی ہی نظر چاہتے ہیں کہ جب یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو سجدوں میں لطف آتا ہے کہ آدمی اُس وقت پکار اٹھتا ہے کہ ع

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت!

ایک حدیث بھی ہے کہ فرمایا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے " تو نماز ایسی پڑھ کہ دورانِ نماز میں گویا خدا کو دیکھ رہا ہے " پہلے شعر میں اسی کیفیت کی تمنا کی ہے ۔

دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ دل کو آرام و آسائش کا خوگر نہ بنائیے۔ بلکہ صدماتِ عشق سے اس کو پارہ پارہ کر دینے کی کوشش کیجئے کہ

(اس آئینے کی قدر خدا کے نزدیک اُسی وقت ہوتی ہے کہ جب یہ اُس کی محبت کے صدمات سے شکستہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حدیث ہی کا ترجمہ ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتا ہے۔

تیسرا شعر عراقی کے اس شعر کا کامیاب ترجمہ ہے:-

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد   کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

نماز حضورِ قلب کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اِدھر نیت باندھی اور اُدھر خیالات نے زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ یا یہ کہ نمود و نمائش کے لئے پڑھی جائے۔ اولیاء اللہ کی نمازیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ جو حضورِ دل اور خلوص کا مظہر ہونے کی وجہ سے معراج المومنین کا مصداق ہو سکتی ہیں۔

اقبال کے تصوف کی وہ کیفیت، جو اوپر بیان ہوئی ۱۹۰۵ء تک رہی۔ اس کے بعد وہ تکمیل تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں مغربی اقوام کی عملی سرگرمیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی کوشش اور محنت کے نتائج کا براہِ راست مشاہدہ کیا تو مسلمانوں کی تن آسانی، بے عملی اور اس پر ان کی اس دورِ غفلت و بے حسی کے تصور سے ان کو بڑی روحانی تکلیف ہوئی۔ اس بات نے ان کو قرآن میں تدبّر اور تاریخ اسلام کا غائر مطالعہ کرنے پر مجبور کیا بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کم کوشی و بے عملی کے ذمہ دار اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ غیر اسلامی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ تصوف بھی اس کا ذمہ دار ہے جو ہندی و ایرانی تصورات کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ اُن تصورات سے جو مسلمانوں سے مغلوب ہونے والی قوموں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے بطور سازش کے ایجاد کئے تھے۔ اس تحقیق کے بعد تصوف کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ بالکل بدل گیا۔ صحیح تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا مگر اتنا یقینی ہے کہ اسرار خودی کی اشاعت کے وقت سے لے کر ان کی آخری تصنیف ارمغان حجاز تک جو کچھ انہوں نے تصوف کے بارے میں لکھا ہے اُس میں یا تصوف اور صوفیۂ اسلام کی تعریف ہے یا عجمی تصوف اور پیشہ ور صوفیوں کی مذمت۔ عجمی تصوف کے کسی نظریہ کی بھول کر بھی تعریف نہیں کی ہے۔ بلکہ اسرار خودی کے مطالعہ سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہی وہ ردّ عمل ہے جو عجمی تصوف کی مضرت رساں پہلو کے خیال سے اُنکے اندر پیدا ہوا تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:-

> "لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے فنا کی تفسیر، فلسفۂ ویدانت" اور "بدھ مت" کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے فنا کی یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں" [۱]

اسرارِ خودی

کتاب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موجودہ غیر اسلامی تصوف کے خلاف مبارزت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی لئے جہاں عجمی تصوف کے نزدیک اپنی ہستی کو مٹانا یا اس کو دھوکا اور فریب سمجھنا انسان کی روحانی ترقی کی معراج ہے۔ وہاں وہ خودی کے اثبات، اُس کی معرفت، تربیت اور استحکام کے اسباب سے بحث کرتا ہے اور ایسے مدلل اور دلنشین انداز میں کرتا ہے کہ نظریۂ فنا مضحکہ خیز بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جس کو دیکھئے یہ راگ الاپتا نظر آتا ہے کہ

---

۱ مکاتیب اقبال حصہ اوّل صفحہ ۲۰۳

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

غرضکہ اقبال نے اثبات خودی کا وہ صور پھونکا کہ مردہ دلوں کو زندہ اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔ کتاب کے آغاز ہی میں فرماتے ہیں:

چوں حیات عالم از زور خودی ست — پس بقدر استواری زندگی ست

جب کہ حیات عالم زور خودی پر موقوف ہے تو جس قدر خودی استوار ہوگی اُسی قدر زندگی بھی استوار و پائدار ہوگی۔ اس بات کو بہت سی لطیف شاعرانہ دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً:

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند — ہستی بے مایہ را گوہر کند

کوہ چو از خود رود صحرا شود — شکوہ سنج جوشش دریا شود

یہاں تک کہ:

چوں خودی آرد بہم نیروے خویش — می کشاید قلزمے از جوے خویش

ویدانت اور بدھ مت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر کے خدا میں مل جانا اور خدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے ویدانتیوں اور بدھ مت والوں کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تمناؤں اور مقاصد کی نفی کرتے ہوئے بالآخر بے مقصد بے مدعا ہو جائے۔ یہی بات عجمی تصوف کہتا ہے۔ مذکورہ بالا فلسفوں میں یہ بات اس وجہ سے بھی ضروری سمجھی گئی کہ ان کے نزدیک یہ جہان ایک نمود بے بود یا فریب ادراک یا آرزو کی پیداوار ہے۔ اور وجود ایک برائی ہونے کی وجہ سے شر اور ذکر تکلیف سے لبریز ہے۔ اس لئے نجات کا ان کے نزدیک ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان بے آرزو ہو جائے:

گر تجھ کو یقین اجابت دعا نہ مانگ — یعنے بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

اور اس اعتبار سے بے مدعا ہونا انکی آخری منزل ہے:

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دل بے مدعا دیا تو نے

اقبال فرماتے ہیں کہ زندگی اور یہ جہان آرزو کی پیداوار ہیں تو آرزو کی نفی کرنی چاہیئے یا زندگی کو تمام آلام و مصائب کے باوجود ایک نعمت سمجھتے ہوئے تولید آرزو کے ذریعہ اس کو وسعتوں سے ہمکنار اور رفعتوں سے مالا مال کرنا چاہیئے؟ فرماتے ہیں مومن کو تخلقوا باخلاق اللہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اور صفت خلاقی کا کمال پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ اس کا نائب حق اور خلیفۃ اللہ ہونا ثابت ہو جائے۔ اور تخلیق کے لئے آرزو کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ آرزو تو بنو اور تمنائیں تو تخلیق ہونی چاہئیں۔

زندگانی را بقا از مدعا ست — کاروانش را درا از مدعا ست

آرزو را در دل خود زندہ دار — تا نگردد مشت خاک تو مزار

از تمنا رقص دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا

زندہ از تخلیقِ تمنا مردہ گرد　　شعلہ از نقصانِ سوز افسردہ گرد

مقاصد و تمناؤں کا وجود انسان کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا شعلے کے لئے حرارت۔ حرارت نہیں تو شعلہ کہاں! اسی طرح انسان کی زندگی بھی بغیر تمنا اور تولیدِ مقاصد کے بغیر ممکن نہیں۔ مقاصد نو بنو ہوں۔ اور انکے حصول کے لئے سعیِ پیہم کی جائے تو خودی کا اثبات ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی استحکام بھی۔ اسلام نے آرزو شکنی اور تمنا کشی کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ اُن کے حدود کا تعین کرکے ان کے حصول اور اُن سے زندگی کو خوشگوار بنانے کا طریقہ بتلا دیا ہے۔ آرزو پاکیزہ اور مقاصد بلند ہیں تو وہ خودی کے استحکام، روحانی قوت و ترفع اور خدا کی خوشنودی کا باعث ہیں۔

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات　　غیرِ حق میرد چو او گیرد ثبات
چون ز تخلیقِ تمنا باز ماند　　شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی　　موجِ بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند　　دفترِ افعال را شیرازہ بند

اقبال نے جہاں آرزو کی تعریف کرتے ہوئے اس کو صیدِ مقاصد کے لئے کمند اور دفترِ افعال کا شیرازہ بند قرار دیا ہے وہاں یہ بھی بتلا دیا کہ آرزو کیسی ہونی چاہئے اور مقصد کیا ہونا چاہئے۔ فرماتے ہیں۔

مقصدے، مثلِ سحر تابندۂ　　ماسوی را آتشِ سوزندۂ
مقصدے، از آسمان بالا ترے　　دلربائے، دلستانے، دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارت گرے　　فتنہ در جیبے سراپا محشرے
ما ز تخلیقِ تمنا زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اسکے بعد ایک عنوان ہے "خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد"

عجمی تصوف میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے عشق کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی محبوب کی یاد میں ایسی محویت کہ دنیا و مافیہا کو طاق نسیان پر رکھ دیا جائے۔ یہ عشق، تجریدی و تنزیہی ہو کر عاشق کو کسی اور سے محبت تو کجا کسی کے خیال و تصور کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اس میں دوئی در آتی ہے۔ اسی لئے موجودہ زمانے کے صوفیوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کی تعبیر لا موجود الا اللہ سے کی ہے اور غیر اللہ کے تصور کو بھی شرک قرار دیا ہے۔

چندا ز موذن بشنوم توحیدِ شرک آمیز را　　کو عشق تا یکسو نہم شرعِ خلاف انگیز را　(نظیری)

عشق خدا، عشق رسول یا عشق شیخ کا ایک ہی مفہوم ہے کہ خدا، رسول یا شیخ کے خیال میں ایسا گم ہو جائے کہ اور کسی کا تو کیا ذکر اپنا بھی ہوش نہ رہے غرضیکہ عجمی تصوف میں عشق فعال اور خلاق نہیں ہے محویت میں خلاقی کیسی! پھر یہ محویت خلوت چاہتی ہے جس سے رہبانیت پیدا ہوتی ہے۔

عجمی تصوف میں "تنازع للبقا" کو عشق کے منافی قرار دیا ہے حالانکہ یہ مصافِ ہستی خود عشق کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے عشق ہی سے زندگی عالم وابستہ ہے اور عشق ہی سے انسان کی خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور مردہ جذبات زندہ ہوتے ہیں۔ عشق کسی انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ کمال درجہ کی فعلیت کا مالک ہے۔ کائنات کی تسخیر عشق ہی سے ہو سکتی ہے پھر عشق اپنے تاثر اور فعلیت کے ساتھ ساتھ بھی انتہا درجے کی رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان رموزِ کائنات سے آگاہ، اسرارِ خودی سے واقف اور عقلِ عیار کی حکومت سے آزاد ہوتا ہے۔ اور اعمال کی زشتی و بد نما[illegible]

کو حسن و جمال سے بدلتا ہے لیکن عجمی تصوف عشق کی ان صفات کا قائل نہیں ہے مولانا روم نے عشق کی تعریف میں بڑی وسعت پیدا کی ہے مگر اقبال نے اس میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ کی کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اقبال نے جس کیفیت کا نام عشق رکھا ہے اس کے مظاہر کی گوناگونی کی کوئی حد نہیں ہے اور جہاں اس کے مظاہر بے شمار ہیں وہاں وہ ہر جگہ ایک اور ہی رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اقبال چاہتے ہیں کہ عشق کو خلوت سے نکال کر خارجی فطرت کا رمز آشنا اور دنیائے فکر و نظر میں انقلاب برپا کرنے والا ہونا چاہئے۔

اندکے اندر حرائے دل نشیں   ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو، سوئے خود گام زن   لات و عزائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق؛   جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا

شرحِ انّی جاعلٌ سازد ترا

اقبال خلوت نشینی کو بُرا نہیں کہتے بلکہ اُن کے نزدیک تو خلوت میں رُوح اور عشق دونوں کی پرورش ہوتی ہے مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس باطنی تربیت کا نتیجہ جلوت میں ظاہر ہونا چاہئے تاکہ اُس سے شخصی اور قومی زندگی میں انقلاب آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خلوتِ حرا میں گزارا اور نبوت کے بعد بھی انتہائی کثرت مشاغل کے باوجود بھی رات کی خاموشی میں خلوت کی تنہا نشینی کو متروک نہیں کیا۔ لیکن وہ خلوت ایک زبردست قوم، ایک آئین حیات اور حکومت کے وجود میں آنے کا باعث ہوئی۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید   قوم و آئین و حکومت آفرید

لہٰذا خلوت نشینی کا مقصد نورِ ذات سے مستنیر ہو کر قوموں کی زندگی اور افراد کی سیرتوں میں انقلاب پیدا کرنا اور زندگی کے فرسودہ طریقوں کو ختم کر کے اس کی اقدار کو تقدیر نو سے آراستہ کرنا ہے۔ خالی محویت اور خلوت نشینی، روحانی لذت اندوزی میں گرفتار کر کے قوم کی عملی زندگی کو فنا کرنے کے سوا اور کس کام کی ہے! خودی کے اندر لامتناہی امکانات پوشیدہ ہیں۔ خودی کو محکم کرنے کے لئے اُن امکانات کو قوت سے فعل میں لانا ضروری ہے اور یہ بات اُسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب امکاناتِ خودی کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس کو محبوب بھی بنایا جائے کہ محبوبیت ہی ان کو ظہور میں لانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور امکاناتِ خودی کے ظہور میں آنے ہی سے افراد اور قوموں کی زندگی میں انقلاب آتا اور حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت   چشم اگر داری بیا، بنمایمت

عاشقانِ او ز خوباں خوب تر   خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد   آمد اندر وجد و بر افلاک شد

اقبال فرماتے ہیں کہ خودی ایک اور طریقے سے بھی استوار ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جن ہستیوں نے اپنی خودی کے ممکنات کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو فرشِ خاک سے افلاک پر پہنچایا ہے اُن سے عشق یعنی اُن کی صحبت میں رہ کر ان کا رنگ اختیار کیا جائے۔ تاکہ ان کی طرح اپنے ممکنات خودی سے واقفیت اور عشق پیدا ہو اور اس طرح ایک دل کو ایک زندگی بخش انقلاب لایا جا سکے جس طرح مولانا روم نے شمس تبریز

کی صحبت سے اپنی خاک کو اکسیر بنایا تھا جسکے متعلق مولانا خود فرماتے ہیں

مولوی ہرگز نشد مولائے رُم　　تا غلام شمس تبریزی نشد

اقبال فرماتے ہیں :—

عاشقی آموز و محبوبے طلب　　چشم نوحے قلب ایوبے طلب

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز　　روم را در آتش تبریز سوز

عشق کی تکمیل کے لئے ذکر اور فکر دونوں ساتھ ہونے چاہئیں جہاں نفس میں غوطہ لگانا ضروری ہے وہاں آفاق کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور خدا کی مخلوق سے بھی محبت کرنی چاہئے۔ کہ مخلوقِ خدا سے محبت بھی خدا ہی سے محبت ہے۔

عشقِ رسول سے مراد تقلید و اتباع ہے۔ مگر تقلید ایسی ہونی چاہئے جیسی حضرت بایزید بسطامیؒ نے کی، ایسی تقلید میں عشق اپنے کمال پر پہنچکر اپنے ماحول میں انقلاب برپا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق　　ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

عاشقی ؟ محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو شود یزداں شکار

" حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انھیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریم صلعم نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے" (اقبال)　　(باقی آئندہ)

نریکھ رام جوہر

حالی، اکبر اور اقبال

اپنے نظریات اور افکار کے تنوع کے لحاظ سے حالی، اکبر اور اقبال کو مختلف ناقدین نے ادوار کے خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ حالی حال کے، اکبر ماضی کے، اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں۔ ناقدین سخن کی اس رائے کو پیش نظر رکھا جائے تو اکبر کے یہاں ماضی سے قربت کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ مثلاً وہ مذہب، تعلیم اور معاشرت کے لئے سرسید تحریک کو قطعی بے سود اور ضرر رساں تصور کرتے تھے ان کا نظریہ تھا کہ مذہب اور مشرقی اقدار سے بے نیاز ہو کر ہندوستانی کسی نصب العین کو نہیں پا سکتے۔ انھیں چاہیئے کہ مذہب کو مقدم تصور کریں انگریزی تعلیم کے خطرناک نتائج اور اثرات سے بچیں اور مغربی تہذیب سے پہلو تہی کریں۔ انھیں خیالات کی تبلیغ کے لئے اکبر نے جابجا سرسید تحریک، مغربی تہذیب، بے پردگی اور تعلیم نسواں وغیرہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہی ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ مغرب سے دوری اور مشرق پرستی کے نظریات رکھتے ہوئے بھی اکبر کے یہاں فکر و عمل کا تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ خود فرنگیوں کی ملازمت میں تھے ان کے گھر میں بھی مغربیت گھر کر چکی تھی اور خود اپنے صاحب زادے عشرت حسین کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ فکر و عمل کے اس تضاد سے قطع نظر اپنے خیالات کے اعتبار سے اکبر ماضی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں حال اُن کی نظروں میں بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ ماضی میں اتنے کھوئے رہتے ہیں کہ حال کے متعلق کچھ نہ سوچا ان افکار و نظریات کی بنا پر انھیں قدامت پسند کہا جا سکتا ہے بعض ناقدین انھیں نفسیاتی طور پر بیمار سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ حال کے تقاضوں سے انکار اور ماضی کی گمشدہ جنت کی تلاش ایک قدامت پسند کی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔

کلام اکبر کی اس ماضی نمائی کے باوجود اکبر کو ایک طرح سے حال کا شاعر کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ ان کا کلام ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس زمانے کی تمدنی تحریکیں، سیاسی انقلاب، مذہبی عقیدے، معاشرت کے طور طریق اور رسوم و روایات غرض سب کچھ روشن نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ بقول ایک نقاد "قومی تاریخ نابید ہو جائے تو وہ صرف اکبر کے کلام سے حاصل کی جا سکتی ہے" اس بیان کی تائید میں ذیل میں چند سیاسی تحریکات اور واقعات پر اکبر کے شعری تبصرے درج کیے جاتے ہیں۔

دربار دہلی منعقدہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء　　محفل اُن کی ساقی اُن کا　　آنکھیں میری باقی ان کا

یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء　　دستِ فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی

جو کچھ تھی اس کی عظمت و رفعت وہ سب مٹی

اس کی رو اقناعت دنیکی ہے بس فقط

تھا مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی

مئی ۱۹۱۵ء میں محمد علی، شوکت علی، آزاد اور حسرت کی گرفتاری پر۔ ۔ ۔ ۵

بیا در پنجہ یاران نظر بند — کیا ہم پہ بھی ہو ملنے کا در بند

ہماری یہ کسی کب تک چھپے گی — خدا پر تو نہیں راہ خبر بند

پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کے جیت جانے پر ۔۔

برخلاف انگلش کے اب یورپ میں یکتا کون ہے ؟

جس سے ہم ہارے ہیں اس سے جیت سکتا کون ہے

اکبر کے بعد جب حالی کے کلام پر نظر جاتی ہے تو ایک دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے ان کے یہاں فکر و عمل پر پوری طرح سر سید تحریک چھائی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افکار و نظریات کے اعتبار سے سر سید اور حالی کو الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح سر سید کی نظر ہر وقت حال پر رہی ۔ اسی طرح حالی بھی اپنی نظریں حال پر جمائے رہے ان کا بھی نظریہ تھا کہ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو ایک مردہ قوم کے لیے تازیانہ عبرت کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا وہ مسلمانوں کو اس راہ پر لانے کے خواہاں تھے۔ جس پر چل کر وہ انگریزوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ چاہے اس راہ میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں ۔

حالی کے قومی شعور اور شاعرانہ مسلک پر تبصرہ کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں ۔

"ان کی شاعری ہم کو محض ہماری گزری ہوئی عظمتوں کی یاد دلا کر ہمارے اندر حرکت اور بیداری کی علامتیں پیدا کرنے میں تو کامیاب رہی مگر انقلاب اور ترقی کا کوئی واضح اور قطعی تصور پیدا نہ کر سکی ۔

(اقبال' طبع اول از مجنوں گورکھپوری صفحہ ۵)

اور ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :۔۔

"مستقبل کا ان کے سامنے کوئی تصور ہی نہیں تھا کیونکہ سامنے دیکھنے کے لئے جس اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں ختم ہو چکا تھا "

(حالی کی شاعری، صفحہ ۹۳)

مذہب۔ معاشرت اور تعلیم کے لیے سر سید' خطرناک حد تک جدید تصور رکھتے تھے۔ حالی نے بھی اسی تصور کو اپنایا۔ اور ہندوستانی مسلمان کو مغربی تہذیب اور تعلیم سے قریب لانے کی کوشش کی مگر اس طرح کہ وہ کلیتہً مذہب سے بیگانہ نہ ہو جائیں انھیں کیا معلوم تھا کہ اکبر کی دوربین نگاہیں تعلیم کے جو اثرات دیکھ چکی ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیں گے۔ سر سید بھی اپنی زندگی کے آخری دور میں تحریک کے غلط نتائج کے باعث بد دل ہو چکے

تھے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ وہ تمام حقائق ہیں جن سے حالی کا سابقہ پڑا۔ . . . . لیکن وہ پھر بھی اپنی بات پر قائم رہے اور مسلمانوں کو انکے ماضی کی اشاراتی جھلک دکھا کر حال پر نظر ڈالنے کی تلقین کی۔ ان کی پوری قومی شاعری ان ہی رجحانات کی آئینہ دار ہے یعنی سرسید تحریک کی حمایت، انگریز حکومت کی مداحی اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اشک باری۔ ان تمام احساسات، نظریات اور جذبات کا مرقع حالی کی شاعری ہے جو مجسم حال کی عکاس ہے، لیکن ماضی کے مدھم نقوش لیے ہوئے۔

قومی شاعری کے آئمہ ثلاثہ میں حالی اور اکبر کے بعد اقبال کا نام آتا ہے جو فکر و نظر کی شعوری عظمت کی بنا پر حالی اور اکبر سے بہت آگے ہیں، انھوں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جسے حالی اور اکبر کی نگاہیں نہ دیکھ سکیں۔ شاید اسی لیے ان کے نظریات ہمہ سمتی انداز کے حامل ہیں، انھوں نے اکبر کے ماضی کو بھی گلے لگایا۔ حالی کے حال کو بھی چاہا اور ایک خوش آیند مستقبل پر بھی نظر کی۔ . . . وہ اس اعتبار سے پہلے شاعر تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ماضی اور حال سے کڑی بیر کے لیے ہٹا کر مستقبل کی راہیں دکھائیں۔ . . . "شکوہ" میں ماضی پنہاں ہے "جواب شکوہ" حال کا آئینہ دار ہے اور "خضر راہ" مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔ اپنے ان نظریات کی بنا پر اقبال خود مصر ہیں کہ انہیں مستقبل کا شاعر کہا جائے ۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعر فردا ستم

اقبال نے مسلمانوں کو مستقبل کے لیے جس لائحہ عمل اور نصب العین کی جھلک دکھائی اس کا واضح خاکہ ان کے فلسفہ 'خودی' 'فقر اور مرد مومن' میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی ہر منزل پر یہ چاہا کہ حصولِ آزادی کے لیے سامان عظمتِ کردار کا ثبوت دیں اور کامل انسان بن کر دکھائیں۔ جس کے لیے انھوں نے مرد مومن کا حیات افزا نظریہ پیش کیا اور اس کے اوصاف کی نشان دہی کے لیے خودی، فقر اور عشق کے عظیم نظریات پیش کیے جن کے مطالعے سے اقبال کو ہم بلا شبہ مستقبل کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

حالی، اکبر اور اقبال پر مجموعی حیثیت سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اکبر ہر ترقی سے کچھ بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں حالی کے نزدیک روایات زیادہ اہم ہیں۔ کسی بغاوت کی ضرورت نہیں۔ اقبال کے یہاں فکری عنصر زیادہ ہے۔ وہ حال کا ذکر بھی مستقبل کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ ان تینوں شعرا کے نظریات کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اکبر :— لوٹ ماضی کی طرف اے گردش ایام تو۔

حالی :— زمانہ با تو نہ سازد تو بہ زمانہ بساز۔

اقبال :— زمانہ با تو نہ سازد تو بہ زمانہ ستیز —

اکبر خالص مشرقی ہیں حالی پیروی مغربی پہ ناز کرتے ہیں اور اقبال مشرق اور مغرب دونوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور دونوں کی خوبیوں کو اپنانے کا پیغام دیتے ہیں۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر　　　فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کلامِ اقبال میں مستقبل کا جلوہ چند وجوہ کا رہین منت ہے سب سے پہلے تو یہ کہ اقبال ایک مفکر اور مدبر کا ذہن لیکر پیدا ہوئے تھے جبکہ اکبر اور حالی اس خصوصیت سے محروم تھے دوسرے اکبر اور حالی کو جو دور ملا جو قوم ملی وہ اپنی بدحالی سے بے نیاز تھی جبکہ اقبال کو وہ دور ملا جب ہر فرد اپنی زبوں حالی کا احساس رکھتا تھا تیسرے اکبر اور حالی نے صرف ہندستان دیکھا تھا جب کہ اقبال نے دنیا دیکھی تھی [illegible] اقبال کی مستقبل شناسی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

انجمن کی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری	بابائے اردو	۵-۵۰ روپے
وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	۷-۰۰ ″
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ ″
کیفیہ	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	۴-۵۰ ″
سید احمد خان، حالات و افکار	از بابائے اُردُو	۴-۰۰ ″
غالب، فکر و فن	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ ″
تلخیص الاردو (رسالہ "اُردُو" کا انتخاب)		۵-۵۰ ″
مقالات گارساں دتاسی حصہ اوّل		۱۰-۰۰ ″
اُردُو تھیٹر (تین جلدوں میں)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی قیمت فی جلد	۷-۰۰ ″
سعادت یار خان رنگین (حالات و کلام)	ڈاکٹر صابر علی خاں	۵-۷۰ ″
محمد حسین آزاد (جلد اوّل۔ حالات)	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۸-۰۰ ″
محمد حسین آزاد (جلد دوم) ادبی کارنامے	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵-۰۰ ″
جلال لکھنوی۔ (حالات و انتخاب کلام)	ڈاکٹر محمد حسن	۳-۰۰ ″
سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۶-۵۰ ″
سودا۔ (حالات اور تبصرہ بر کلام)	شیخ چاند مرحوم	۷-۰۰ ″
نیا ادب	پنڈت کرشن پرشاد کول	۴-۵۰ ″
آرٹ ان اردو پوئٹری (انگریزی)	شہاب الدین رحمت اللہ	۶-۷۰ ″
فن شاعری (بوطیقا) ارسطو	مترجم پروفیسر عزیز احمد	۲-۵۰ ″

انجمن ترقی اُرْدُو - بابائے اُرْدُو روڈ - کراچی

ڈاکٹر محمود الٰہی

مقدمہ تذکرہ شورش

شعرائے اردو کے تذکروں میں "تذکرۂ شورش" کی صرف اس لحاظ سے اہمیت نہیں کہ اس کا شمار ہمارے ابتدائی تذکروں میں ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلا تذکرہ ہے جو عظیم آباد میں لکھا گیا اور اس سے وہ نقوش ظاہر ہوتے ہیں جنہیں ترتیب دے کر یہاں کے ابتدائی شعری ماحول کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔

یوں تو اس تذکرے کا حوالہ یہاں ملتا رہا ہے لیکن تحقیقی کام کرنے والے کبھی اس سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے صرف ایک قلمی نسخے کا علم تھا جو بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے، جنہیں تنقید و تحقیق سے یکساں شغف ہے۔ اس نسخے کو شائع کر کے اردو کی بڑی خدمت کی۔ لیکن اس کی اشاعت نے اس کے ثقہ اور مستند ہونے کو ایک مستقل سوال بنا دیا ہے۔ کیونکہ اس میں جہاں شورش کا ذکر ہے۔ وہاں ایسے الفاظ استعمال میں لائے گئے ہیں جنہیں بڑے سے بڑے برخود غلط لوگ بھی شاذ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

"شورش، سید غلام حسین عرف بھیکا ...... شعر بہ فصاحت و سلاست تمام می گوید۔ غزل در طرفۃ العین انجام می نماید قصیدہ و مثنوی و رباعی بہ شستگی و رفتگی رقم پذیری سازد۔ مذاق صوفیہ دارد۔ اکثر شعر ہم بمذاق صوفیہ فرماید، کلیاتش مرتب چہار ہزار شعر بہ نظر در آمدہ ......"

حال ہی میں راقم سطور کو تذکرۂ شورش کا ایک اور مخطوطہ دستیاب[1] ہوا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آکسفورڈ والے مخطوطے میں کسی نہ کسی حد تک تحریف ہوئی ہے، اس نسخے میں شورش کے ذکر میں اشعار سے پہلے صرف ان کا نام لکھا ہے آکسفورڈ والے نسخے کی عبارت اس میں نہیں ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شورش کے کسی عقیدت مند نے شورش کا ترجمہ لکھا ہے۔

---

(۱) میں خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے متولی جناب سید ہاشم علی سبز پوش رئیس گورکھپور کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس نسخے سے استفادے کا موقع مجھے دیا۔

اس نسخے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شورش کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس سے تحقیق کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں۔ اس مقدمہ کو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں شورش نے عظیم آباد میں شعری احول کا خاکہ پیش کیا ہے اور اپنی علمی و ادبی مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں انہوں نے تذکرے کے سبب تالیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے، اور تیسرے حصے میں وہ بیانات آتے ہیں جو شعر کی اہمیت و ماہیت اور اس کے اقسام پر مشتمل ہیں۔ یہ تینوں حصے اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ تذکرے کے سلسلے میں جو نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) اس کا نام رموز الشعراء ہے۔

(۲) اس کی ترتیب شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا کے ایما سے عمل میں آئی۔ وہ بالخصوص تذکرۂ میر سے مطمئن نہیں تھے اس لئے چاہتے تھے کہ ایک بہتر تذکرہ لکھا جائے۔

(۳) مرتب کا مقصد یہ تھا کہ شعرائے ہندوستان کے ساتھ شعرائے بہار کا بھی ذکر کیا جائے۔

مقدمے کے متعلقہ اقتباسات یہ ہیں۔

" بعدنا در شاہی میر باقر موصوف از شاہ جہاں آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ۔ گفتگو و شعر و شاعری بطور مرزا موصوف رواج یافتہ۔ بہ تفصیل برادر گرامی قدر میر محمد رضائے جرأت کہ فاضل بودند، و در نثر و نظم مہارت کمال داشتند و گاہے شعر فارسی بہ مشورہ نیتھہ صاحب می فرمودند۔ میلان طبیعت احقر طرف ریختہ آمدہ غزل گفتہ۔ بعد ازاں برادر منظور ایں عاصی، بہ میر باقر مذکور سپرد فرمودہ تا بیت غزل اصلاح از میر باقر موصوف گرفتہ۔

بعدہ مزاج احقر مائل طرف مثنوی شد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی شب دیجور در دو الم و باغ و بہار گفتہ۔ بعدہ میر باقر و میرزا رضائے جرأت رخصت از عالم فانی بہ عالم جاودانی نمودہ۔ صحبت شعر و شاعری برہم خوردہ و زندگی بہ حلاوت گردیدہ،

بعد یک سال مزاج درست دہی شدہ و مثنوی سوم در تالیف علی باغ مشتمل بر مدح حضرت مولوی محمد وصی باتمام رسانیدہ و گاہے غزل ہم میگفتند و دیوان خود دوی ساخت۔

درایں ضمن خمسہ مرزا محمد رفیع سودا سلمۂ تعالیٰ کہ ایں مصرع یقین غفر کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے" مصرع نجم اوبود۔ شہرت دریں یافتہ، بعدہ غزل مرزا و اشعار حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتہ طرز سخن بطور دیگر گردیدہ۔

حسب اتفاق در صوبہ داری محمد کاظم خاں بہادر احترام الدولہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محفل مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافتہ ۔ ۔ ۔ ۔ میر غلام علی اظہر گفتہ کہ شاہ رکن الدین عرف حضرت میرزا گھسیٹا صاحب مد ظلہٗ از مرشد آباد ترک روزگار نمودہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند۔ اگر دریں محفل مشاعرہ آیند احسن است۔ احقر ہمراہ میر مذکور رفتہ، ملازمت نمودہ۔ ازراہ نوازش

قبول فرمودند تا محفل مشاعرہ کم از کم یک سال نماندہ تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرلہٗ ارزاں می فرمودند۔

چوں تفصیل آں حضرت در دل ایں، جا یافتہ و محفل مشاعرہ بہ جہت ماہ مبارک رمضان برہم خوردہ، احقر بیشتر بہ خدمت حضرت مرزا صاحب می رفت، درآں وقت اکثر مردم مثنوی حضرت مولوی روم و لمعات و شرح رباعیات مولوی جامی نور مرقدہ می خواندند۔ ایں عاصی ہم از دور سماعت می نمود۔ وسوا ایں ہر چہ ارشاد می فرمودند آں را بطور ملفوظ می ساخت۔

روزے ارشاد شد کہ شخصے[1] در تذکرہ خود یک شعر آں قصیدہ مرزا رفیع سودا نوشتہ است۔

دیگر در دل خطرہ گزشت کہ دراں ایام طبیعت احقر مصروف بہ تالیف نیست۔ چنانچہ اول ارشاد العارفین تالیف نمودہ بعدہٗ احوال بادشاہان ہندوستان از...... تا وقت جلوس شاہ عالم نوشتہ۔ بعدہٗ ملفوظات حضرت پیر دستگیر قمر الحق قدس سرہٗ کہ مسمّٰی بہ گنج نیاضی است منتخب ساختہ و بعدہٗ در شرح ایں حضرت شاہ نعمت۔ ہر چہ پیدا و ہر چہ پنہاں است جملہ در یک وجود انسان است چوں ازیں فرصت یافتہ در اصلاح دیوان مصروف گشتہ چنانچہ بہ اصلاح حضرت مرزا صاحب درست ساختہ اما بہ باعث پریشانی کارے کمال دریں فن حاصل نہ کردہ۔ حسرت علم در دل ماندہ۔ روزے حضرت مرزا صاحب ارشاد فرمودند کہ مردماں کاہ را کوہ و کوہ را کاہ می نمایند، اشعار ہر یک بہ طرز ہر یک نمی نوشتند۔ اگر شما تذکرہ می نویسید بہ خوب است۔ در دل خطرہ گزشت کہ طاقت انتخاب تا حال تحریر ہم نہ رسیدہ است...... چنانچہ فرمودہ شعر گفتن گرچہ در سفتن بود۔ لیک فہمیدن بہ از گفتن بود۔ وشاید حضرت بر آں تربیت ایں عاصی می فرمایند کہ بہ سبب استقلال ایں کار ہم پیدا خواہد شد۔

امر عالی را سعادت دراں تصور نمودہ تحریر... والا ایں ہیچمداں را در ایں فن چہ شعور و چہ مقدور کہ دم زند......

" و در ہندوستان اکثر بزرگان تذکرہ نوشتہ اند و اشعار شاعران قدیم و جدید بقید قلم آوردہ اند مگر دریں شہر گاہے کسے تذکرہ فارسی ہم نہ نوشتہ چہ ہندی..... بنا بریں محنت بر خود اختیار نمودہ کہ احوال و اشعار شاعران ایں جامع اشعار شاعران ہندوستان بقید قلم آورد کہ در زمانہ حال و استقبال یادگار د۔ واگر شاید بہ سمع کسے اہل دل برسد و خوشدل او شود یک گونہ باعث نجات ایں عاصی بود و احقر دریں کلام ہرگز ارادۂ انشا نہ کردہ است۔ اگر جائے سہو و خطائے باشد معاف فرمایند کہ ہیچ بشر خالی از خطا نبود۔ و ہر تصنیف را نام لازم است لہٰذا نام ایں تذکرہ " رموز الشعراء " داشتہ و اگر تذکرہ شورش ہم گویند مضائقہ ندارد۔ و بطور حرف تہجی مرقوم ساختہ و بہ طول طویل نہ پرداختہ "

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تذکرہ نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا لیکن مصنف کے سامنے یہ مقصد ضرور تھا کہ میر کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے اور ان کے تذکرے پر اضافہ کیا جائے۔ نکات الشعراء کے مقابلہ میں رموز الشعراء نام رکھنا بھی اسی رجحان کی توثیق کرتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میر نے اپنے تذکرے کے آخر میں شعر کے اقسام بتائے ہیں، شورش نے بھی یہ راستہ

---

(۱) غالباً نکات الشعراء کی طرف اشارہ ہے جس میں " تضحیک روزگار " کا صرف ایک شعر نقل ہوا ہے۔

اپنایا ہے۔ اور میر کے بیانات پر گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ میر نے شعر کی چھ قسمیں بتائی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہیں پیش کی ہیں، شورش اس کی دس قسمیں بتاتے ہیں۔ اور فارسی اور اردو اشعار سے ان کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ انہیں غلط نہ سمجھا جائے۔ عربی و فارسی حروف و افعال ریختہ میں کس طرح استعمال کئے جائیں۔ یا ان کی بندشوں اور ترکیبوں کا طور طریقہ کیا ہو۔ ان سوالات پر شورش نے جو بحث کی ہے اسے اردو میں قواعد سازی کی ابتدائی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شورش کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعراء کے کلام پر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ اور بے باک رائے دیتے ہیں۔ تنقید کا یہ فن انہوں نے حضرت رکن الدین عشق سے سیکھا جو بلا شبہ عظیم آباد کے عالموں، صوفیوں اور شاعروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس زمانے میں خانقاہوں کو علم و ادب کے ایک مرکز کی بھی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ امکان خارج از بحث نہیں کہ انہوں نے کسی شاعر کے مقام کا تعین حضرت عشق کے مشورے سے کیا ہو۔ شورش کی عمر کا آخری بڑا حصہ تصوف کی وادیوں میں گزرا۔ وہ حضرت عشق کے ارادت مندوں اور متوسلین میں تھے۔ وہ تذکرے میں گمنام صوفی شعراء کا ذکر بھی بڑے احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب تک شورش اور ان کے تذکرے کا مطالعہ اس زمانے کی تحریک تصوف کو سامنے رکھ کر نہیں کیا گیا۔

(۲)

اس نسخے کے کم از کم دس سال بعد اوکسفورڈ والا نسخہ لکھا گیا۔ جس کے ثبوت میں دونوں نسخوں کے یہ بیانات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

قلندر، شاہ غلام قلندر (نسخۂ اوکسفورڈ): ..... قریب سی سال است کہ بہ طرف دہلی نی باشند...."

(نسخۂ جون پور) قریب بست سال است کہ طرف مغرب تشریف می دارند...."

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اوکسفورڈ والا نسخہ بعد کا ہے اور اس میں کسی حد تک تحریف ہوئی ہے اس نسخے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جہاں تک شعراء کے سلسلے میں بیانات اور انتخاب اشعار کا سوال ہے اس کے بارے میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دونوں نسخوں میں قابل لحاظ اختلاف موجود ہے۔ شورش نے اکثر مقامات پر اپنے ماخذ اور ذرائع معلومات کی صراحت کر دی ہے جس سے اس تذکرے کا زمانۂ تحریر متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اوکسفورڈ والے نسخے سے ایسے بیانات غائب ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

قدر (الف[1]) "قدر تخلص، ساکن شاہ جہاں آباد، اشعار ایشاں مدت است کہ بہ عظیم آباد رسیدہ، زوست......"

(۱) الف، نسخۂ اوکسفورڈ۔ ب، نسخۂ جون پور۔

(ب) "قدر تخلص، وارستہ از قید مذہب و ملت و پاس وضع از دوست ..... "

کلیم (الف) "میاں محمد حسین کلیم، ساکن دہلی، صاحب دیوان ریختہ، مرد لیست کامل روزگار۔ می گویند کہ ترجمہ فصوص در دہ مجلس بزبان اردوئے معلٰے کردند ..... "

(ب) "محمد حسین کلیم، ساکن دہلی، برادر نسبتی تقی میر، صاحب دیوان ریختہ، مرد لیست کامل روزگار۔ بزبان حضرت عشق مدظلہ بسمع مرا رسیدہ کہ ترجمہ فصوص در دہ مجلس بزبان ریختہ نمود ..... "

کافر (الف) میر علی نقی، کافر تخلص ..... می گویند کہ بخت خشاخت از دوست "

(ب) میر علی نقی، کافر تخلص ..... بخت شناخت ..... در تذکرۂ تقی میر مرقوم است کہ در دہلی مشاعرہ بخانہ ایشان ... آخر از وضع ..... برہم خوردہ۔ وکافر شیکہ تخلص نمود و در محفل و مجلس ہمیں تخلص ظاہر می نمود ..... "

مخلص (الف) "رائے آنند رام مخلص تخلص، ساکن دہلی، شاگرد مرزا بیدل و خان آرزو، وکیل نواب عمادالدولہ شاعر فارسی، چنانچہ احوال در تذکرۂ فارسی خان مذکور است۔ از دوست ..... "

(ب) رائے آنند رام مخلص تخلص، ساکن دہلی، وکیل نواب وزیر اعتماد الدولہ شاعر مقرر ے فارسی۔ اول از مرزا بیدل اصلاح می گرفت بعدہٗ بخدمت خان آرزو، چنانچہ احوال او در تذکرہٗ خان مرحوم مرقوم است۔ از مدت آثار نعت اسلام داشت آخر از دنیا گزشت، از دوست ..... زبان خوب نیست، مضمون خوب است "

مضمون (الف) شیخ شرف الدین مضمون ..... از دوست ..... میرے پیغام کو تو اے قاصد کہیو سب سے جدا کر کر۔

میاں محمد حسین کلیم اصلاح نمودہ اند۔ از نوشتہ تقی میر معلوم شدہ۔ میرا پیغام وصل کو تو اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کر۔

مضموں تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب | غصہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

شاعر در مصرع اول نام موزوں کردہ بود۔ اسم اصلاح آرزو ست کہ بجائے دفع بھوت اسم می توانند نہ نام، اگرچہ اسم و نام ہر دو یکے ست لیکن زبان زد اسم است "

محسن (الف) "محمد محسن سامریہ، محسن تخلص، شاگرد برادر زادۂ تقی میر از دوست ..... "

مر گیا پوچھی نہ پر تم نے میری زحمت دل | جی کی جی ہی میں رہی ہائے مری حسرت دل

دریں شعر تاملے است۔ مرگیا می باید۔ مرگیا نمی شاید۔ تقی میر در اصلاح و انتخاب تامل نکردہ باشد۔ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ اگر شعر را ..... موقوف نمودہ در تحریر نہ آوردہ شد۔

جب تخم ..... کیمیا۔

ایں رباعی بسیار خوب است ازیں جہت کہ مضمون عموماً ..... است "

ہر (الف) "میر شاعر بے نظیر ......" درتذکرہ خود شاعران ہندوستان غلط تلاش نمودہ، مرقوم ساختہ۔ اگر

بدرست نیامدہ تاہم اعتراض بے جا و اصلاح خود جانی نمودہ۔ در زندہ و مردہ کسے را سلامت نہ گذاشتہ، مگر بعضا قرہ

از و مربوط بودند، آں را محفوظ داشتہ۔ غرض عجب کسے است، و درتذکرہ خود را سید نوشتہ اند، مردماں می گویند کہ

شیخ است، چنانچہ کسے گفتہ۔

شیخ تقی نام تھا اور میر کہا دے

دیگرے می گویند۔

دلی میں ایک شیخ زادہ گنجہ کا میر ہے" سوائے ازیں فتح علی گردیزی درتذکرہ خود تقی میر را سید نہ نوشتہ است،

ایشاں را برائے استحکام سیادت کاذبہ خود میر تخلص نمودہ اند۔ از دست:۔

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

در اول مصرع قطع اضافت درست داشتہ اند، نزدیک شاعران دہر درست نیست:۔

یہ بھی ایجاد میر صاحب ہے۔

و اگر غلطی نمودہ اند شعر اصلاح طلب است لیکن درتذکرہ خود اول ہمیں شعر نوشتہ اند۔ غالب است کہ غلطی نباشد

بلکہ از روئے ایجاد باشد۔

(ب) شاعر بے نظیر محمد تقی میر تخلص ...... درتذکرہ خود ہمعصر خود را در پایۂ الزام کشیدہ و اکثر را ہجو نمودہ مگر بعضے اعزہ کہ

از و مربوط بودند، آنرا محفوظ داشتہ۔ غرض عجب کسے است۔ الحال دیوان ایشاں بہ عظیم آباد رسیدہ لیکن بسیار غلط بنظر آمدہ،

بنابریں ازاں انتخاب مذکور دہ کہ شاید غلطی کاتب باشد، البتہ شعر درتذکرہ خود کہ قریب دو صد پنجاہ نوشتہ اند، ازاں مرقوم ساختہ

خود را سید موسن ...... اند۔ مردماں می گویند کہ شیخ است۔ چنانچہ مرزا محمد رفیع سودا می فرماید:۔

دلی کا ایک شیخ زادہ گنجہ کا میر ہے

یعنی درحقیقت میر نیست۔ شاید ایں حدیث شریف بگوش ہوش ایشاں نہ رسیدہ۔ لعنۃ اللہ علی داخل النسب

و علی خارج النسب۔ و سوائے ازیں سید فتح علی تبریزی درتذکرۂ خود میر را سید نہ نوشتہ است۔ پس ایشاں برائے استحکام

سیادت کاذبہ خود میر تخلص نمودہ۔ وجہ تخلص میر الحال معلوم شد۔ بہرحال ما را ازیں چیزہا چہ کار است، دردع برگردن راوی۔

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکان تیر کا۔

در مصرع اولے اضافت طرف صد پارہ باید یعنی دلِ صد پارہ۔ ایں جا قطع اضافت داشتہ اند، و دیگر انیست کہ کاتب

نوشتہ است اس نخچیر کا، ایں درست نمی شود۔ بباید اس نخچیر کا تا از مصرع ثانی لتزام باید و معنی پیدا کند والا شعر بے معنی شود۔۔۔

نکلے گی میری قبر سے آواز میرے بعد ابھریں گے دل سے عشق تیرے راز میرے بعد

(باقی صفحہ پر)

محمد شکیل احمد صدیقی

عشقیہ شاعری اور جگر مراد آبادی

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد　　　　ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کی شاعری حسن و عشق کے نغمات سے خالی ہو اور دو شاعری تو اس سلسلہ میں بہت کچھ بدنام ہے حالانکہ یہ وہ نغمات شیریں ہیں جو ہر ساز پر گائے گئے۔

خوش قسمتی سے اردو شاعری کی تخلیق اور نشوونما ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے مبارک ہاتھوں ہوئی جو عشق و محبت میں سرشار رہتے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا عشق تھا یہ انہیں خاصانِ خدا کا فیض تھا کہ اردو زبان دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

جس زبان کی تخم ریزی طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ کے برگزیدہ ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کی ولی، مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد جیسے صوفیائے کرام نے جو آبیاری کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ان بزرگان عظام کی عاشقانہ لے نے عشق و محبت کے شعلوں کو اتنا بھڑکایا کہ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ اب باپ بھی اگر بیٹے کو کچھ نصیحت کرتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ "اے پسر عشق بورز" کیونکہ "مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلیلیت و حبیبیت برتر است" اسی نصیحت کا اثر ہے کہ ہونہار فرزند عشق و محبت میں ڈوب کر یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل　　　　محبت نہ ہو وے تو پتھر ہے دل
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ　　　　محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے ہے انتظام جہاں　　　　محبت سے گردش میں ہیں آسماں
محبت سے پروانہ آتش بجاں　　　　محبت سے بلبل ہے گرم فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز　　　　اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز

یہ وہ حقیقی عشق ہے جس کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ سارا جہاں اس کے سامنے سرنگوں ہے اسی عشق کی فرمانروائی ہر جگہ جاری و ساری ہے اسی کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ؔ عشق سلطان است و برہان مبین
ہر دو عالم عشق را زیر نگیں

اس لئے شراب عشق میں مخمور رہنا ہی ان بزرگوں کا مشغلۂ زیست تھا وہ فرماتے ہیں۔

ؔ خدا کا آسرا عشق صنم ہے
یہ دو باتیں ہیں جب تک دم میں دم ہے

بیشتر شعرائے متقدین یا تو خود صوفی اور اہل اللہ تھے یا ان کے دامن فیض سے وابستہ اور ان کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے اسی لئے جس عشق کے نغمات اس عہد کی فضا میں لہرا رہے تھے وہ بیشتر حد عشق حقیقی تھا جس میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ حقیقت سے دوری اور مجاز سے قربت ہوتی گئی نوائے عاشقانہ پہلے سے کچھ اور تیز ہو گئی۔ لیکن اب عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی اپنے پورے لوازمات کے ساتھ جلوہ گر تھا یہاں تک کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ عاشقانہ لے بوس و کنار اتنی چاچ چوٹی اور زلف و گیسو میں ایسی الجھ کر رہ گئی کہ داخلیت کا کوسوں پتہ نہ رہا ہر طرف خارجیت کی فضا نظر آنے لگی معاملہ بندی اور بوالہوسی نے پاک جذبات کی جگہ لے لی اور انہیں کو استادی کا کمال ٹھہرایا گیا۔

نیا ورق

زمانہ نے پھر ایک نیا ورق الٹا اور ایسے مصلحین کو جنم دیا جنہوں نے اردو غزل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مروجہ قوانین و اصول کو ایک قلم مسترد کر دیا۔ کچھ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ یہ مصلحین غزل ہی سے متنفر تھے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ ان کی منافرت ان مبتذل و سوقیانہ مضامین اور پست جذبات سے تھی جو غزل کی جان سمجھے جانے لگے تھے۔ اگر صنف غزل سے نفرت ہوتی تو حالی، آزاد اور اکبر کے کلام میں غزل کے اشعار کا وجود ہی نہ ہوتا حالی کو غزل کا سب سے بڑا دشمن کہا جاتا ہے۔ لیکن جب خود ان کی غزلوں کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں واردات حسن و عشق کے ایسے مرقعے ملتے ہیں کہ بے ساختہ زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے ہیں۔

بہرحال آزاد اور حالی کے دور سے دو جماعتیں بن جاتی ہیں ایک وہ جو غزل کی دلدادہ تھی اور دوسری وہ جو مروجہ مبتذل مضامین کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر کمربستہ، لیکن اسے حسن اتفاق کہئے یا خوش بختی غزل کہ اسی افراتفری کے دور میں چار ایسی ہستیاں سرزمین غزل میں رونما ہوتی ہیں۔ جنہوں نے معترضین کے جائز اعتراضات کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کی اصلاح کر کے اس کو پھر محبوب خاص و عام بنا دیا یہ چار ہیں حسرت، فانی، اصغر اور جگر ہیں۔ جن کی نوائے ساحرانہ اور صدائے عاشقانہ ایک بار پھر ہم کو اسی محفل میں لے چلتی ہے جو متقدین نے سجائی تھی ان سب میں حسرت کے بعد جگر کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

کو قدرت کی طرف سے عشق خیز دل عطا ہوا تھا اس لئے جب کسی کی پہلی نگاہ غلط انداز بجلی بن کر خرمن دل پر گری تو سارے جسم و جان میں عشق و محبت کے ایسے شعلے بھڑکا گئی جو تمام عمر بجھائے نہ بجھے۔ صبر و سکون کو تاراج کرنے والے وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ لیکن عشق کے کیف و سرور میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی ہو سکتا ہے کہ لوگ عشق حقیقی اور مجازی کی بحث چھیڑ کر یہ کہیں کہ جگر کو معشوق حقیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا کیونکہ وہاں معشوق صرف ایک ہی رہتا ہے اور وہ معشوق ازلی ہے برخلاف اس کے جگر کا معشوق اسی دنیا کا باشندہ ہے اور انسانی پیکر میں ہے اس لئے جگر کا عشق عشق مجازی ٹھہرا۔ لیکن یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا ہے کہ عشق مجازی بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی دوسرا مصنوعی۔

حقیقی عشق مجازی وہ ہے جس میں عاشق کو درحقیقت عشق ہوتا ہے وہ شاید عشق بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے

اس پر عشق کی ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ فراق میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔ عشق کرنا اس کا مشغلۂ زیست ہوتا ہے اور کیفیت عشق کے سہارے ہی جیتا ہے۔

عشق مجازی کی دوسری قسم یعنی معنوی عشق مجازی جسے بوالہوسی کہنا زیادہ موزوں ہے وہ ہے جس میں عاشق پر عشق کی وجدانی کیفیت کے بجائے ہوا و ہوس کا بھوت سوار ہوتا ہے اور اس کی لامحدود خواہشات میں سے ایک سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو محبوب کے سامنے عشق کا اظہار کر دے اور ان تمام اشعار کو سنا دے اور جملوں کو دہرا دے جو اس نے اس مقصد کے لئے بڑی محنت سے رٹے ایک لیکن زیادہ تر کوچۂ محبوب کا پہلا ہی امتحان ان عاشق صاحب کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ اس مگدل محبوب کے عشق کو اسی کے کوچہ میں دفن کر کے کسی دوسرے نرم خو محبوب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز　　　آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

ہمارے آجکل کے نوجوان زیادہ تر اسی عشق کا شکار رہتے ہیں ۔

عشق مجازی کی اول الذکر قسم یعنی حقیقی عشق مجازی کا مقام عشق حقیقی کا اتنا نہ سہی لیکن پھر بھی کافی اعلیٰ وارفع ہے بلکہ ایک غیبی عطیہ ہے جس کی سرحدیں عشق حقیقی سے ملی ہوئی ہیں اور یہ ترقی کر کے کبھی کبھی عشق حقیقی بن جاتا ہے۔ اکثر صوفیائے کرام کے واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں ۔

جگر عشق پیشہ ہیں ان کا عشق مجازی ہی ہے لیکن بہت معیاری ہے گرا ہوا نہیں۔ ان کو آبرو ئے عشق بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اسی لئے وہ عشق کو آسان نہیں سمجھتے ان کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی ہولناک راہ نہیں فرماتے ہیں ۔

؎ عشق نے پیارے کھیل نہیں ہے　　　عشق ہے کار شیشہ و آہن

ایک مشتاق صحرا کی طرح اس بحر نا پیدا کنار کی طغیانیوں اور ہولناکیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے　　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس آگ کے دریا میں قدم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہاں حقیقی عشق رکھنے والا ہی اس آگ میں کود سکتا ہے۔ جسے ہر چیز میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر صورت میں اپنے صنم کی شبیہ دکھائی دیتی ہے ۔

میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنون شوق میں　　　دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا ۔

صوفی کو فنا فی العشق ہونے کے بعد ہی معرفت الہیٰ حاصل ہوتی ہے اس کے نزدیک فنا فی العشق ہونا ہی فنا فی اللہ ہونا ہے۔ اس لئے اسے عشق سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں وہ کائنات عالم کی تخلیق کا مقصد عشق قرار دیتا ہے اور کائنات کی ساری چہل پہل اور ہنگامہ خیزی اسے عاشق کی کارگزاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کی نوائے عاشقانہ سے پہلے کائنات بزم خموشاں بنی ہوئی تھی۔ علامہ اقبال نے صوفیوں کے اس خیال کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔ ؎

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد　　　ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

زندگی کے ہر ساز میں اسے عشق کے نغمات سنائی دیتے ہیں ساری فضا عشق سے مخمور نظر آتی ہے اس کے نزدیک چمنستان حیات میں ہر طرف عشق کی خوشبو بکھری ہوئی ہے نور او منا سب میں اسی کی جلوہ گری ہے ۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

(اقبالؔ)

جو بھی اسی پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ انہیں بھی ہر دلفریب چیز عاشق کے افسانۂ شوق کا عنوان نظر آتی ہے۔

موج ہے صد رنگ شفق لالہ و گل سطوعِ صبح — چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

ان کے نزدیک زمین و آسمان چاند ستارے حکایت حسن اور فسانۂ عشق کی زندہ مثالیں ہے۔

یہ فلک یہ ماہ و انجم یہ زمین یہ زمانہ — ترے حسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

فسانۂ عشق تو وہ لامحدود فسانہ ہے جو ازل سے چھڑا ہوا ہے۔ اور شاید کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ایک سناتے سناتے جونہی رکتا ہے دوسرا اس کے آگے سے شروع کر دیتا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی — سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

عاشق کے دل میں اگر کوئی تمنا ہوتی ہے تو وہ وصل محبوب کی ہوتی ہے۔ امید وصل اس کی شام ہجراں میں ٹمٹماتے ہوئے دیے کا کام کرتی ہے۔ فراق کی تلخ گھڑیاں وہ اسی آسرے پر کاٹتا ہے کہ گوہر مقصود کو پانے کے لئے وہ برسوں کوئے ملامت میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے۔ سالہا سال نالہ و فریاد اور گریہ و بکا میں گزار دیتا ہے محبوب کے ایک جلوہ کو وہ ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ رُخ جاناں کی ایک جھلک جان و دل دے کر بھی حاصل ہو جائے تو اسے ارزاں نظر آتی ہے۔ عرفی تو اس حصول کے لئے سو سال تک گریہ و زاری کرنے پر تیار ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال — صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

غرضکہ عاشق بے نصیب کے ہجر و فراق کی طویل مدت حالت اضطراب میں گذرتی ہے۔ شادمانی اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ میرؔ نے ایسی ہی ایک شب ہجر کی تصویر کیسے پُرحسرت اور درد بھرے انداز میں کھینچی ہے۔

کبھی غش میں رہا شب وعدہ — کبھی گردن اٹھا کے دیکھ لیا

اتفاق سے یہ فراق کی وہ شب ہے جو شب وعدہ بھی ہے دوسری راتوں کی کیفیت کا کیا پوچھنا لیکن ہمارے جگرؔ صاحب جن کا ذوق محبت بہت بلند پایہ ہے فراق میں بھی ہراساں نہیں وہ ہجوم تیرہ شبی میں بھی خوشی کی ایک کرن تلاش کر لیتے ہیں خوشی کی یہ کرن محبوب کی زلف سیہ کی یاد ہے جس کی سیاہی کے سامنے ہجر کی کالی رات بھی شرماتی ہے۔

چہ خوش است ذوق مجسم چہ بلاست لذت غم — کہ بیاد زلف سیاہ تو بہ ہجوم تیرہ شبی خوشم

عاشق کی اصل شان ہی مصائب عشق پر مسکرانا اور انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبوب کا فراق ان پر شاق نہیں ہے یا اس کی جدائی انہیں بے چین نہیں رکھتی۔ جدائی محبوب میں تو ان کا یہ حال ہے۔

ان کے جاتے ہی یہ حسرت چھا گئی — جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

محبوب کے بغیر انہیں کسی چیز میں کوئی کیف نظر نہیں آتا۔ نہ صبح کی رعنائیاں ہی انہیں محظوظ کرتی ہیں۔ اور نہ شام کی رنگینیاں

چنانچہ محبوب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

تمہارے بغیر رونق دیوار و در کہاں   شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں

ان پر وارفتگیٔ عشق کا عالم طاری رہتا ہے کہ وہ عشق میں سراپا ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں نہ ان کو اپنی ہی خبر ہے اور نہ اپنے دل ناشاد کا کچھ حال معلوم ہے۔ جس نے شراب محبت سے بے انتہا مخمور ہو کر دھڑکنا بھی بند کر دیا ہے ؎

پہروں سے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز   کیا جانیے کیا ہے دل ناشاد کا عالم

ان کی یہ وارفتگی اور خود فراموشی شروع سے آخر تک ان کی زندگی کا جزو لاینفک بنی رہی ان کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ اس عالم وارفتگی سے منزل ہوش و خرد کی طرف انہیں لانے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے چارہ سازوں کا سمجھانا بجھانا ان کی خاطر نازک پر سخت گراں ہے ؎

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے دل اپنا خوشی اپنی   گریباں اپنا چاک اپنے جنوں اپنا ہنسی اپنی

وہ خوب جانتے ہیں کہ چارہ سازوں کی یہ ہمدردی زبانی اور منہ دیکھی ہے ورنہ زمانہ کا حال تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عاشق کی ہنسی اڑاتا رہتا ہے۔

؎ ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے   رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

لیکن انہیں اس کی مطلق پرواہ نہیں زمانہ ہنستا ہے ہنسا کرے یہ تو زمانہ کی کوتاہ نظری ہے۔ ورنہ صاحب دل تو راہ محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد ایسے خوش ہوتے ہیں گویا کہ دونوں جہان کی مسرتیں انہوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لی ہیں۔

؎ سب کچھ لٹا کے راہ محبت میں اہل دل   خوش ہیں کہ جیسے دولت کونین پا گئے

ایسے لوگ عشق کا زہر آلود جام بھی اس ذوق و شوق سے پیتے ہیں جس طرح آب حیات

؎ عشق و وتشنہ کام ہے کہ جسے   زہر کا گھونٹ بھی ہے آب حیات۔

ایک سچے عاشق کی شان بھی یہی ہے کہ وہ ہر تلخی کو ہنستے ہوئے برداشت کرتا ہے ہر جفا پر مسکراتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن عشق کے رخ زیبا پر توہین کی گرد پڑنے نہیں دیتا۔

جگر بھی اسی قبیل کا عاشق ہے۔ دل کا خون کر دینا گوارہ ہے لیکن آنکھوں کو تر کر کے دامن عشق کو داغدار بنانا گوارا نہیں ؎

توہین عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو   ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

عشق کا یہ وہ مقام ارفع ہے۔ جہاں مجاز و حقیقت کے درمیان ایک نازک سا فرق رہ جاتا ہے۔ ایسے مقام پر پہنچ کر دیوانگی رشک صد ہزار فرزانگی بن جاتی ہے ؎

کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے   خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے

اس مقام پر پہنچ کر عشق کو حیات جاوداں حاصل ہو جاتی ہے اور فنا کے بے درد ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

میرا مقام عشق مقام فنا نہیں دیناے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں۔

شاید یہی وہ مقام ہے جہاں مجاز و حقیقت کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ کیسا مبارک ہے ہمارے شاعر کا جذبہ عشق جو مجاز کے راستہ پر گامزن ہو کر آہستہ آہستہ ترقی کر کے حقیقت کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔

جگر کی زندگی کا جائزہ لینے پر یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جس عشق کی ابتدا مے و مینا اور مہ رخوں سے ہوئی تھی۔ اس کی انتہا محبت رسول اور عشق الٰہی پر ہوتی ہے۔ اور یہی جذبہ عشق آخر میں انہیں کشاں کشاں بیت اللہ اور دیار حبیب میں لے گیا کیونکہ انھوں نے سمجھ لیا تھا

عشق لا محدود جب تک رہنما ہوتا نہیں زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

وہاں ان پر عشق کی کیا کیا والہانہ کیفیات طاری ہوئیں؛ یہ کچھ وہی لوگ جانتے ہوں گے جنہوں نے ان کو ان مقامات پر دیکھا ہوگا گنبد خضریٰ سامنے ہے پہر پر چانے کا کھوٹا ہو اپانی گر کر آبلہ ڈالتا ہے لیکن شاعر کو احساس نہیں ہوتا احساس بھی کیوں ؛ سوز دل کے سامنے سلک سوز بیکار ہے آبلۂ عشق کے مقابلے میں کسی آبلہ کی کوئی حقیقت نہیں محبت کی ٹیس سارے دردوں پر غالب آجاتی ہے۔ اب وہ ایک ایسے حسن کے جلوہ میں ہیں۔ جسے ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔

جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں ایسا بھی حسن ہے جو بقید نظر نہیں

دیدۂ دل پر سوز سے ہی اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کو اب کبھی کبھی اس عالم خاص کا نظارہ نصیب ہوتا ہے۔ جو اپنی رفعتوں اور لطافتوں میں حسن و عشق سے بلند اور لطیف ہے۔

دیکھا ہے اک جہان خاص میں نے کبھی کبھی جگر حسن سے بھی بلند تر عشق سے بھی لطیف تر

کون کہہ سکتا ہے کہ عشق مجازی میں بھی کوئی ایسا بلند و لطیف "جہان خاص" ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق کی آخری ارتقائی منزل بھی طے ہو گئی اور عشق مقام تقرب کی اس آخری سرحد تک پہنچ گیا۔ جہاں دیدۂ دل سے بھی واسطہ نہیں پڑتا ہے

اس مقام قرب تک اب عشق پہنچا ہے جہاں دیدۂ دل کا بھی اکثر واسطہ ہوتا نہیں

یہاں تو وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہونٹ سل جاتے ہیں اور دہن پر مہر خاموشی ثبت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ماننے والا محبوب بھی نہیں بتا سکتے اور بتلانے کی ضرورت بھی کیا محبوب خود شناسائے راز ہے اس راز کے کہنے اور سننے کیلئے زبان و گوش کی منت پذیری کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس ساز خاموش کی صدا محبوب کے علاوہ کوئی سمجھ

جیسے میں بھی خود نہ بتا سکا مرا راز دل ہے وہ راز دل جسے غیر دوست سمجھ سکے مرے ساز میں وہ صدا نہیں

یہ ہے جگر کی عشقیہ شاعری کا ایک دھندلا سا خاکہ جسے اجاگر اور رواں کرنے کے لئے کسی کی سیاہی قلم کی ضرورت نہیں۔ شاعر کا خون جو خود اس کے کلام کے روپ میں ڈھل کر ان نقوش کو رنگین بنا رہا ہے بلکہ اس رنگ آمیزی میں اس کے محبوب ہی کی کارفرمائی ہے۔ جیسا کہ بقول اس کی آواز خود اس کی آواز نہیں در پردہ اس کے محبوب ہی کی آواز ہے۔

مرے درد میں یہ خلش کہاں مرے سوز میں یہ تپش کہاں کسی اور ہی کی پکار ہے مری زندگی کی صدا نہیں

راجیندر ناتھ شیدا

محروم کی نظمیں

پروفیسر تلوک چند محروم جن کے انتقال کو تقریباً ایک سال ہوا، اردو کے ان ممتاز شاعروں میں تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ادب کی خدمت میں صرف کیا۔ موجودہ صدی کے قریب قریب آغاز ہی کے ساتھ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب سے لے کر وفات سے کچھ ہی پہلے تک وہ برابر شعری ادب میں اضافہ کرتے رہے۔ کم و بیش ساٹھ سال کے اس طویل عرصے میں اردو شاعری کا کارواں کئی منزلوں سے گزرا۔ راہ میں متعدد نشیب و فراز آئے۔ نئی نئی تحریکیں ابھریں اور دب گئیں۔ شاعری ماحول کے اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹتی پھرتی۔ جدید و قدیم کی آویزشوں میں الجھتی اور آمیزشوں سے تقویت حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ محروم کی نظریں بھی زندگی اور ادب کی بدلتی قدروں پر پڑیں اور ان کے ذہن نے حسب استعداد وقت کے تقاضوں کو قبول کیا۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ اس صدی کے ابتدائی دور میں ہماری قومی زندگی پر مغربی حکومت اور تہذیب و تمدن کے گہرے اثرات پڑ رہے تھے جس سے فکر و عمل کے نئے سوتے پھوٹتے جاتے تھے۔ زندگی کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالئے۔ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ معاشی و معاشرتی ہو یا تعلیمی اور علمی۔ خود ادب ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہر طرف اصلاح کا ذوق و شوق کارفرما نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کسی "آفتاب تازہ" کی تپش سے قدامت کا برفستان پگھل کر ہمہ گیر اصلاح کا دریا بن گیا ہے۔ جو مختلف راستوں سے بہتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ راہ میں رکاوٹیں بھی ہیں۔ جن سے ٹکرا کر اس کے دھارے اپنے بہاؤ کے رخ ادلتے بدلتے بھی رہتے ہیں لیکن پھر وہ سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اپنی مخصوص سمت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ وقت کا بہاؤ، قومی زندگی میں فکر و عمل کی یہ حرکت تھی یا یوں کہئے، جدید و قدیم کی یہ کشمکش تھی جس میں محروم کی نوجوانی نے آنکھیں کھولیں۔ اور جس کے اثرات کو ان کے ذہن نے اپنے اندر جذب کیا اس لئے ان کی نظموں میں قدم قدم پر ہمیں ان اثرات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

فرانسیسی مفکر اور نقاد ٹین (۱۸۲۸ء ۱۸۹۳ء) کا خیال ہے کہ ادب ہر صورت میں ہمعصر قومی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے۔ لیکن ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت اور تاریخی روایات کو بھی بڑا دخل ہوتا

ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی ادیب کی تخلیقات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن نہیں شاعر کے شعور کو جاننے کے لئے اس کی ہمعصر تحریکات اور رجحانات کا جاننا تو ضروری ہے ہی۔ ساتھ ہی اس کے ذاتی ماحول، تعلیم و تربیت اور افتاد طبع کا علم اور قومی اور ادبی روایات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا ذہن عموماً تیس سے چالیس سال کی عمر تک بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمانے کی ذہنی کیفیت اس کی شخصیت کی بنیاد بنتی ہے۔ آئندہ زندگی کے واقعات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو اس کا نقطہ نظر وہی ہوتا ہے جو تیس سے چالیس سال کی عمر میں پختہ ہو کر ذہن میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں کسی شاعر سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ وہ بعد کے حقائق کی روشنی میں اپنے محسوسات میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرے گا۔

پروفیسر محروم کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے کچھ واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن مغربی پنجاب میں ضلع میانوالی کا ایک قصبہ عیسیٰ خیل تھا۔ جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ محروم نے ایک نظم "محروم کا وطن" میں اپنے وطن کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ جس علاقے میں واقع ہے وہ اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے پسماندہ ہے لوگوں کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ قصبے میں میٹھا پانی تک نایاب ہے جس کی وجہ سے عورتیں میلوں سے پانی کے مٹکے اپنے سروں پر رکھ کر لاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں اور درندوں کا بھی خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں مبالغہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ممکن ہے اب حالات کچھ بدل گئے ہوں لیکن محروم کے ذہن کی جس ماحول میں تربیت ہوئی وہ یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علاقہ کے لوگ عموماً سیدھے سادہ اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کے دل چھل کپٹ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان میں خلوص۔ قناعت۔ راست روی اور جرأت مندی ہوتی ہے محروم کی تعلیم اور پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی اور شعری تخلیق کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ ارد گرد کے حالات نے انہیں ایک سادہ مزاج، قانع، مخلص اور ایثار دوست انسان بننے میں مدد دی۔ ایک تو یہ ماحول یوں بھی مذہبی اور اخلاقی تھا۔ اس پر انہوں نے فارسی ادب پڑھا۔ اور تعلیم کا پیشہ اختیار کیا۔ جس سے ان کے ذہن پر مذہبی اور روحانی قدریں مسلط و مستحکم ہو گئیں۔

اب رہے ملک اور قوم کے عام حالات، ان کا بیان تفصیل چاہتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں مگر یہ حالات پروفیسر محروم کے ذہن پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لئے مختصراً یوں سمجھئے کہ اس صدی کے شروع میں جب وہ عمر کی اُس منزل سے گزر رہے تھے۔ جب ذہن سماجی ماحول کے اثرات قبول کرنا شروع کر دیتا ہے ہندوستان مضبوطی کے ساتھ حکومت برطانیہ کے چنگل میں تھا۔ یوں تو ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی سیاسی اقتدار انگریز کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اور شاہ دہلی کی حیثیت شاہ شطرنج کی سی تھی لیکن بغاوت کے فرو ہونے کے بعد تو رہا سہا اقتدار

بھی پاک ہو گیا۔ بغاوت میں سب سے اہم رول جن طبقوں نے ادا کیا تھا وہ تھے۔ والیان ریاست۔ جاگیردار اور مذہبی علماء۔ اس آخری شکست سے ان کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ والیان ریاست اور جاگیرداروں نے حکومتِ وقت کی اطاعت میں مصلحت دیکھی اور مذہبی طبقے کے وقار میں کمی ہونا شروع ہو گئی۔ غرض یہ طبقے حکومت کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے

اسی زمانے میں کچھ نئے طبقے اور نئی تحریکیں ابھریں۔ مذہبی اصلاح کی کچھ تحریکیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء سے پہلے سے موجود تھیں۔ اب اس رجحان کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ غرض دونوں مذاہب میں اصلاح کی نئی نئی تحریکیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ تحریکیں داخلی اور خارجی محرکات کے عمل اور ردعمل سے ظہور میں آئی تھیں۔ نہ تو یہ کلیتاً مغربی اثرات کا نتیجہ تھیں نہ خالص قومی ضروریات کا۔ یہ بدیہی طور پر مغرب کی ہمعصر فکری سطحوں کو نہیں چھو سکتی تھیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ جدید اور قدیم کے درمیان ایک سمجھوتہ قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا جہاں انہوں نے اپنے مذاہب کی مفروضہ قدیم صورتوں کی صداقت اور افادیت پر زور دیا ہے اور شدومد کے ساتھ انکی حمایت کی وہیں کچھ ایسے عقائد کی جو بظاہر غیر معقول اور مضر تھے۔ مخالفت بھی کی۔ کہتا یہ کہ ان باتوں کا نفسِ مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض دھانی چیزیں ہیں۔ یہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہب میں شامل ہوتی گئی تھیں۔ یہ محض توہمات کہہ کر مذہب سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی حالات کی طرح سیاسی منظر بھی بدلا۔ جاگیرداری کی شکست پر سیاسی قیادت نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگئی جس نے مغرب کی لبرل ازم، وطنیت اور قومیت کی تحریکوں سے روشنی حاصل کرکے آئینی اصلاح کے مطالبات پیش کئے۔ نوآبادیاتی نظام میں حاکم و محکوم کا امتیاز۔ عام افلاس۔ صنعتی، تجارتی اور تمدنی پس ماندگی ان اور ایسی ہی اور باتوں نے سیاسی جدوجہد کو ہوا دی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس دور میں برطانوی حکومت خود ایک عجیب و غریب تہذیبی تضاد کا شکار تھی۔ جہاں برطانیہ کے مفکر سیاسی۔ اقتصادی۔ مذہبی، سماجی غرض زندگی کے ہر شعبے میں لبرل ازم کا جھنڈا بلند کر رہے تھے۔ نوآبادیات میں انہی رجحانات کے خلاف ان کی قومی حکومتوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ جو انکی اخلاقی قوت کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اور ہندوستان میں ان رجحانات کے حامیوں کے لئے روحانی تقویت کا سرچشمہ اس کے علاوہ یورپ میں ماضی کی کھوج کا شوق ہندوستان میں کلاسیکی ادبوں کے مطالعے اور ماضی کے دھندلکوں کو روشن کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ مغرب میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے دعووں کے ردعمل میں یہاں بھی اپنے ماضی پر فخر مباہات کے جذبات ابھرے اور قومی شعور کا حصہ بن گئے۔ انہوں نے سیاسیات کو بھی متاثر کیا۔ سیاسی جدوجہد کو تقویت پہنچائی مگر اس کے رخ کو مختلف سمتوں میں موڑ دیا ہے۔ جس سے بعد کو

پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ بہرکیف اس سے قومی شعور میں مذہبی اور روحانی عناصر اور بھی بڑھ گئے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس دور میں اکثر اصلاحی تحریکوں نے، وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہوں۔ یا تو متوازی تعلیمی تحریکیں چلائیں یا اپنے فروغ کے لئے تعلیم کو استعمال کرنے کی کوشش کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں اپنے مقاصد کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے کیونکہ آخر انہی پر آئندہ ان تحریکوں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار تھا۔ اب رہا ادب، تو جن مقاصد کے لئے تعلیم استعمال میں آسکتی تھی۔ ان کے لئے ادب بھی ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہم اس دور کے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں اصلاح اور کردار سازی کی یہی روح ہر طرف سرایت کئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ادب کی کوئی صنف نہیں جو ان سے متاثر نہ ہو۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔

اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نظمیں تو اردو میں ایک مدت سے لکھی جا رہی ہیں لیکن نظم نگاری کے جدید دور کا آغاز "انجمن پنجاب" کے قیام کے ساتھ ۱۸۷۴ء میں ہوا اس انجمن کے قیام کا مقصد ہی شاعری میں اصلاح تھا۔ بقول حالی شاعری کو عشق و مبالغے سے نجات دلا کر اسے وسعت دینا احساس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھنا تھا۔ آزاد، حالی اور ان کے معاصرین جو جدید اردو نظم کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ مغربی شاعری سے ناواقفیت کی وجہ سے اپنی شاعری کو مغربی سانچوں میں تو نہیں ڈھال سکتے تھے لیکن وہ اردو شاعری کو کچھ بدعتوں سے پاک کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نظم کو خاص طور پر موزوں سمجھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریک کا باہری ڈھانچہ خارجی اثرات اور کرنل ہالرائڈ کی مساعی کا مرہون منت ہے لیکن اس کا خمیر داخلی ہے کیونکہ شاعری کی اصلاح جس صورت سے عمل میں آئی وہ خود اردو شاعروں کے ذہنوں کی پیداوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور کی اردو شاعری اپنی روایات سے بالکل منہ موڑ کر نہیں چلتی بلکہ انہی روایات میں سے نکلتی اور ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں اجنبیت اور غرابت بہت کم ہے۔

جدید اردو شاعری کے علمبرداروں کے پیش نظر دو باتیں تھیں ایک منفی اور ایک مثبت۔ وہ روایتی شاعری کی کچھ باتوں کو معیوب سمجھ کر انہیں ترک کرنے کے حامی تھے اور کچھ باتوں کو شعوری طور پر رائج کرنے کے۔ روایتی شاعری کی جن باتوں کو ترک کرنا چاہتے تھے ان میں اصلیت سے بعید باتیں اور لایعنی تخیل شامل ہیں۔ مبالغہ اور استغراق بھی اسی ضمن میں آتے ہیں اور ایسے صنائع بدائع کا استعمال بھی جو شعر کے معنی میں اضافہ یا حسن پیدا نہ کرتا ہو۔ اب رہا جدید شاعری کا مثبت پہلو تو اس میں شاعری میں واقعیت کا خیال رکھنا یا اسے حقیقت سے قریب لانا۔ سیدھے سادے اور پُر اثر طریقے سے بات کہنا۔ شاعری کو اخلاقی اور روحانی تعلیمات اور قومی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا۔ اور

ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر مناظر قدرت کی تصویریں پیش کرنا شامل ہے۔ غرض یہ تنقیدی اور افادی نقطۂ نظر تھا جس نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی یا دوسرے لفظوں میں جس کی روشنی میں مروجہ شاعری کی اصلاح عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں کیا کچھ ہوا؟۔ کس حد تک ہوا؟۔ ایسا ہونا کہاں تک درست تھا؟۔ یہ سب تفصیلات کی باتیں ہیں۔ جنہیں سردست نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

رہی بات ہیئت شعر اور اصناف سخن کی تو جس طرح اس دور میں دوسری کچھ چیزیں ابھریں کچھ دبیں۔ کچھ کی اہمیت گھٹی کچھ کی بڑھی۔ اسی طرح جاگیرداری اور روایتی مذہب کے انحطاط کے سبب سے قصیدے اور سانحات کربلا سے متعلق مرثیے کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ جدید موضوعات پر مختصر نظمیں ان کی جگہ لیتی چلی گئیں جو زیادہ تر مثنوی مسدس۔ قطعہ وغیرہ کی فارم میں لکھی جاتی تھیں۔ پہلے غزل مقبول ترین صنف سخن تھی۔ اب نظم غزل سے زیادہ اہم ہو گئی کیونکہ نظم نے نئے دور کی پیغامبری کی اور ایسا کرنے کی وہ غزل کی نسبت زیادہ صلاحیت بھی رکھتی تھی چونکہ یہ جدید شاعر اپنے فن کو قوم کے اخلاقی اور سماجی سدھار کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے' دلائل دے کر یا قصے کہانی بیان کر کے کچھ باتیں سمجھانا اور ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ اسلئے ان کے اسلوب بیان میں خطابت اور تاثر آفرینی کو اور ٹکنک میں بیانیہ، خطیبانہ اور مکالمانہ عناصر کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ویسے نئی اصناف کے اخذ و اختراع کو ان شاعروں نے بہت ضروری نہیں سمجھا۔ مروجہ اصناف میں کچھ معمولی سے تغیر و تبدل پر اکتفا کی۔

اب مخدوم کی شاعری کو ان حقائق اور واقعات کے پس منظر میں رکھ کر دیکھئے تو ان کے تمام خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ مذہب۔ روحانیت اور اخلاقیات میں ان کی دلچسپی۔ ان کے دل میں قوم و وطن کا درد۔ ان کی وسعت نظر۔ خانگی زندگی کے حادثات سے پیدا ہونے والا سوز و گداز۔ مظاہر قدرت پر ان کے مخصوص تاثرات۔ اور اہل قوم کو خصوصاً نوجوانوں کو ایثار و عمل کی تلقین کا ذوق۔ بچوں میں دلچسپی۔ غرض ان کے فکر و شعور کا کوئی گوشہ روشنی میں آئے بغیر نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی ان کے فکری محرکات کا باہمی ربط اور شاعری میں گوناں گوں صورتوں سے ان کا اظہار ایک حقیقت بن کر نظر کے سامنے آ سکے گا۔

پروفیسر مخدوم مذہب اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس زمانے میں ہر شخص کے دماغ پر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ روحانیت میں ہر شخص کا اعتقاد تھا۔ کچھ تصورات جو سینکڑوں برس سے ذہنوں میں جاگزیں تھے۔ غیر مشتبہ حقیقت اور اعتقاد کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہر آدمی کو دنیوی زندگی کے مسائل کے ساتھ آخرت کی فکر بھی رہتی تھی اور آخرت کی کھیتی دنیا تھی جسے مروجہ مذہبی تعلیمات کے ذریعہ بویا جا سکتا تھا۔ مذہب اور روح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ روحانیت کے مروجہ تصورات بھی عقیدوں کی صورت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اسی طرح روح کی طہارت اور نیکی فکر و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ مذہب کی رو سے یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو

پہلو ہیں - محروم کا توبھی اس صدی کی دوسری دہائی تک بلوغ ہو چکا تھا. اس نسل کے تقریباً تمام ہندوستانی مفکران چیزوں میں اعتقاد رکھتے تھے اور انہیں مسلّم حقیقتیں تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب سے البتہ کبھی کبھی ان حقیقتوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھا جانے لگا لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں محروم اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ذہن ایسے مطلقاً میں نئے اثرات قبول کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے. اس لئے ان کے شعور میں ان اثرات کو تلاش کرنا بے سود ہوگا۔

محروم ایک عام ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کے عقائد بھی ایک عام ہندو کے سے ہیں. لیکن ایک بات قابل توجہ ہے ان کا مشرب بہت وسیع ہے. ان کے دل میں ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام ہے اور وہ ہر مذہب کے محاسن کو پیش نظر رکھنے اور معائب کو نظر انداز کرنے کے قائل تھے. مذاہب کو پرکھنے کا یہ طریقہ خالص علمی نہ ہو کر بھی طہارت نفس کا مظہر ضرور ہے. دراصل اس کی تہہ میں عقائد کی نزاعی باتوں کو پس پشت ڈال کر مشترکہ زمین تلاش کرنے کا جذبہ ہے وہی جذبہ ہے جس کا اظہار رومی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی۔

اس کے علاوہ یہ نظریہ مختلف مذاہب میں اعلیٰ قدروں کی یک رنگی پر زور دیتا..... اور ہمہ گیر انسانی محبت کا درس دیتا ہے. ہندوستان کے کچھ سنتوں اور صوفیوں کے عقائد سے مطابقت رکھتا ہے جس کا گاندھی جی کے ذہن پر بھی بڑا گہرا اثر تھا اور ظاہر ہے کہ محروم گاندھی جی کی تعلیمات سے بھی متاثر تھے. پروفیسر محروم کی نظموں کے مجموعے۔ "نیرنگ معانی" میں چراغ راہ" کے عنوان سے ایک الگ باب ہے جس میں بانیان مذاہب اور ہادیان دین سے متعلق نظمیں شامل ہیں. اس میں پیغمبر اسلام. حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ. حضرت عیسیٰ. گورونانک، گرو گوبند سنگھ، رام، کرشن. سوامی رام تیرتھ اور مہاتما ہنسراج کی سیرت اور تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے. عام طور پر ان کی زندگیوں سے متعلق روایات سے واقعات انتخاب کر کے انہیں نظم کیا گیا ہے۔

یہ خیال کہ کسی کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو ہر انسان دوسرے انسان کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ محروم کی ایک نظم "سیرت نبوی کی ایک مثال" میں ثمہ ڈرامائی اور موثر پیرائے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے. حضرت محمدؐ ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں. سامنے سے کسی یہودی کا جنازہ آتا ہے. اس پر آنحضرت تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں. صحابہ حیران ہیں سمجھ نہیں سکتے کہ مشرک مردے کی تعظیم کیوں کی گئی؟ پوچھتے ہیں. اس پہ جواب ملتا ہے۔

یہ فرمایا مجھے معلوم ہے وہ نامسلماں تھا میسر ہو سکی اس کو نہ توفیق خدا جوئی۔
مگر اس بات سے انکار ہرگز ہو نہیں سکتا اسی جان آفریں پاک کی تخلیق تھا وہ بھی

اسی طرح کی ایک نظم اور ہے "مرہم شفا" گورو گوبند سنگھ آنند پور میں دشمن سے نبرد آزما ہیں. گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے. میدان جنگ میں ایک شخص ہے "بھائی کنھیا" یہ دوست دشمن میں تمیز کئے بغیر ہر زخمی کو پانی پلاتا ہے کسی

ں کا دشمنوں کو پانی پلانا ناگوار گزرتا ہے۔ آخر اسے گورو گوبند سنگھ کے روبرو پیش کیا جاتا ہے۔ گورو جی اس سے جواب ب کرتے ہیں تو وہ عرض کرتا ہے۔ "گر ہے خطا تو دیدۂ یک بیں کی ہے خطا" اور یہ بھی کہتا ہے۔ "کی ہے حضور ہی جسے یہ نظر عطا"۔ یہ سن کر گورو گوبند سنگھ اس کی نیک عملی کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس سے خوش ہو کر اس کے پانی رہم شفا" کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔

ایسی نظموں میں محروم کا عالم گیر انسان دوستی کا پاکیزہ جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ زندگی کی گتھیاں نیک جذبات کے ناخنوں سے نہیں سلجھتیں۔ مسائل حیات بڑے پر پیچ ہیں انہیں حل کرنے کے لئے بڑی بصیرت انتھک عمل صالح کی ضرورت پڑتی ہے۔ محروم کا مزاج "بے ہمہ شو با ہمہ شو" کا سا تھا۔ ان کی روح کو دنیا کے ات اور معاملات میں دلچسپی تھی بھی اور نہیں بھی۔ وہ دنیا میں سکون اور محبت تلاش کرتے تھے اس کے لئے جہد و کے قائل تھے لیکن جب وہ اہل دنیا کو خود غرضانہ بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھتے تھے، لوگوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں بحثیں اور آویزشیں فریب و ریا کاری اور ظلم و نا انصافی دیکھتے تھے تو ان میں اکتاہٹ پیدا ہوتی تھی اور وہ ان ہنگاموں ے دور بھاگ کر کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کی تمنا کرنے لگتے تھے اور کہتے تھے۔

دنیا میں بہت دوڑے   راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت   تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی

یہ جذبہ کبھی کبھی اتنا شدید ہوتا تھا کہ وہ انسان کو سخت و سست کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے لیکن یہ ب تصویر کا محض ایک رخ ہے اس تصویر کا دوسرا رخ ہے انسان کو ہنستے بستے دیکھنے کی تمنا ان کی زندگی میں راحت و مسرت منتے دیکھنے کی تمنا۔ زندگی سے غلامی، افلاس، نا انصافی، عداوت اور ظلم کو مٹتے دیکھنے کی تمنا اور انسانوں کو ان مقاصد کے حصول کے لئے بے خوفی سے جد و جہد کرتے اور ہر ممکن قربانی دیتے دیکھنے کی تمنا۔ محروم کا شعور جس میں بن کر اپنی مخصوص صورت اختیار کر رہا ہے۔ اس میں یہ تمنائیں روحانیت اور سیاسیات کے ڈانڈے ملا رہی ں۔ قوم آزادی کی جد و جہد میں مصروف تھی خیال تھا کہ سیاسی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے جس کو اکھاڑ پھینکنا ہر وستانی کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر محروم کو اپنے ان گنت ہم وطنوں طرح قومی سیاسیات کی شورش اور ہنگامہ خیزی میں بھی دلچسپی ہے تو یہ کوئی تعجب والی بات معلوم نہیں ہوتی اس کوئی تناقض نظر نہیں آتا۔

پروفیسر محروم نے آزادی کے لئے ہمعصر جد و جہد کو جس نظر سے دیکھا اس کی جھلکیاں ان نظموں میں نظر آئیں گی ن کے مجموعے "کاروان وطن" میں شامل ہیں۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۶ء تک کی ان نظموں میں قومی سیاسیات کے آثار

دھاؤ پر شاعر کے تاثرات ان میں موجود ہیں۔ صدیٔ حاضر کی دوسری دہائی کے آخری سالوں میں اشتراکیت کی جو آواز
ب کی فضا میں گونجنے لگی تھی وہ البتہ ان نظموں میں سنائی نہیں دیتی اور نہ ہی ان میں اس وقت کے نوجوانوں کی وہ تڑپ
ظر آتی ہے جو روایتی مذہب اور اخلاق کی حدوں کو عبور کر کے اپنے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ اس
وقت تک محروم کے محسوسات پک چکے تھے۔

اب ان نظموں کو لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے کی نظموں میں ہم زیادہ تر وطن سے جذباتی لگاؤ۔ دور
حاضر میں قوم کی زبوں حالی اور ماضی کی عظمت کا احساس نیز مستقبل میں ترقی کے لئے تحریک اور ایسے ہی جذبات
قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی نظم حالی کی "مدوجزر اسلام" اور کیفی کی "بھارت درپن" کی طرح طویل تو نہیں
ہے اور نہ ان میں قومی عروج و زوال کی ان کی ایسی تفصیلات ہیں لیکن جذبات عموماً وہی ہیں۔ اس کے بعد شاعر کی نظر
میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دل میں قومی رہنماؤں کی ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے قربانیوں کی قدر اور
ان کے لئے احترام کے جذبات امڈتے ہیں۔ وہ ظفر، گوکھلے، تلک، گاندھی اور اجمل خان وغیرہ کو خراج عقیدت پیش
کرتا ہے اور گوناں گوں ہمعصر واقعات پر ایک وطن پرست کی حیثیت سے اظہار خیال کرتا ہے۔ سودیشی کی تحریک
افریقہ میں گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستانیوں کی جدوجہد سے لے کر محروم نے گاندھی جی کے قتل اور بھوداں کی
تحریک تک نہ جانے کتنے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

افریقہ میں ہندوستانیوں کی جدوجہد پر چکبست کی نظم "فریاد قوم" بہت مشہور ہے۔ ایسے ہی کچھ جذبات کی
حامل محروم کی نظم "جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی" ہے۔ ان دونوں نظموں میں افریقہ میں ہندوستانیوں کی پریشاں
حالی پر اظہار غم۔ گاندھی جی کے ایثار اور قیادت کو خراج تحسین، اور وہاں کے مقامی حکام کے ظلم و ستم کے خلاف
حکومت برطانیہ سے فریاد موجود ہے۔ اس مفروضے کی وجہ سے کہ یہ سب کچھ انہی حکام کی شرارت اور فرعونیت کا
نتیجہ ہے جسے برطانوی حکومت کی رعایا پروری اور انصاف پسندی برداشت نہیں کر سکتی۔

محروم کہتے ہیں۔

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے — کہ اے وطن کے خداے نگاہدار وطن

یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں کیسی — اڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غبار وطن۔

محروم نے لالہ لاجپت رائے کی جلا وطنی اور ان کی اور مولانا محمد علی جوہر۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی رہائی۔ جلیان والا
باغ کا خونی واقعہ، تحریک خلافت۔ فرقہ وارانہ فسادات، سائمن کمیشن، بھگت سنگھ کو پھانسی لگنا، گاندھی جی کی بھوک
ہڑتال۔ گول میز کانفرنس۔ کیمونل اوارڈ۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کی تباہ کاریاں۔ قحط بنگال۔ آزاد ہند فوج۔ تقسیم ہند اور
اس سلسلے میں خونیں ہنگامے، جفاکاری اور سفاکی۔ گاندھی جی کی شہادت اور جشن آزادی ایسے موضوعات پر بھی متعدد

نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ چکبست کی طرح انہوں نے بھی سیاسی رہناؤں کی وفات پر مرثیے لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ ایسے رہناؤں میں گوپال کرشن گوکھلے۔ بال گنگا دھر تلک، سی آر داس لالہ لاجپت رائے۔ بشنر ناتھ داس موتی لال نہرو۔ بھگت سنگھ۔ گاندھی جی۔ تیج بہادر سپرو۔ سروجنی نائیڈو رفیع احمد قدوائی اور ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ محروم کو لالہ لاجپت رائے سے خصوصی لگاؤ معلوم ہوتا ہے لیکن ناموں کی اس فہرست ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی عقیدت مذہبی یا علاقائی حدود کی پابند نہیں تھی۔ وہ وطنیت اور قومیت کے لئے ایثار کرنے والوں کے پرستار تھے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

محروم چاہتے تھے کہ پوری ہندوستانی قوم مذہبی۔ تہذیبی اور لسانی اختلافات کو نظر انداز کر کے حصول آزادی کی تحریک میں شریک ہو اور باہمی محبت اور اخلاص کو اپنا شعار بنائے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی آرزو اور توقع کے خلاف ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ یہ ہماری قومی زندگی کا بڑا افسوسناک پہلو رہا ہے۔ اس معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قومی قیادت دقت نظر اور بصیرت سے زیادہ جذبات سے کام لینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکے اور معاملات برابر الجھتے گئے۔ بہر کیف جس بات کی توقع بڑے بڑے قومی رہناؤں سے نہیں کی جاسکتی محروم سے کرنا تو نادانی ہوگا لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان فسادات سے بہت دل برداشتہ تھے، فساد کرنے والوں کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، قوم کے دشمنوں میں شمار کرتے تھے۔ ان کی متعدد نظموں میں ایسے واقعات پر انتہائی رنج و غم اور کبھی کبھی ان سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ اس وقت کی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

قید سے جوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن — یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن
حیف ہم جن کیلئے محروم آزادی ہوئے — اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے
محفلِ حُبِّ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر — آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سر بسر

محروم کو پہلے اس بات پر فخر تھا کہ کم از کم پنجاب کی فضا اس فتنے سے محفوظ ہے لیکن مارچ ۱۹۴۷ء میں جب وہاں بھی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو انہیں کہنا پڑا۔ لہجہ کی درشتی ملاحظہ فرمائیے۔

آدمیت کے لباس بزرگی کو پھاڑ کر — شوقِ عریانی میں یہ رقصِ جنوں اے فتنہ گر
تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر — خاک میں جن سے ملی توقیرِ انساں سر بسر
آسمانوں سے صدا آنے لگی یہ شام و سحر — حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر
آج تک دیکھی سنی ہے کس نے ایسی سرزمیں — بے گناہوں، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں
چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ارباب کیں۔ — بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں

اس شقاوت کو شجاعت نام دیں از راہ شر　　حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

زندگی کی حرکت اپنے اصولوں کی پابند ہے۔ زندگی ہماری نیک خواہشات کے اشاروں پر نہیں چلتی۔ اوپر کے بند ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ چونکہ محروم اور ان کے خاندان کو بھی ۱۹۴۷ء میں دلی آکر بسنا پڑا تھا۔ یہاں کی فضا شروع شروع میں انہیں غیر مانوس محسوس ہوتی تھی اس لئے یہ قیامت صغریٰ کے بیان میں ان کے ذاتی اضطراب و خلوص بھی شامل ہے۔ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد محروم اور ان کے عزیزوں پر جو بیتی۔ فسادات نے ان کے ذہن کو جس طرح جھنجوڑا۔ وہ شکست خواب کی ایک اور قابل توجہ مثال ہے۔ یہ آپ بیتی ہے لیکن یہ جگ بیتی بھی ہے کیونکہ جو کچھ انکے ساتھ ہوا۔ وہ دونوں ملکوں کے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ اس سے متعلق ان کے جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے ان کی نظم "پاکستان کو الوداع" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

اے مرے پیارے وطن میرے بزرگوں کے وطن　　اے مری راحت کی دنیا اے مرے اچھے وطن

عمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا　　مدح تیری شعر میں زیب رقم کرتا رہا

مشغلہ میرا رہا علم و ادب، شعر و سخن　　اور سمجھا میں اسی کو خدمت اہل وطن

حرص دنیا سے رہا یکسو دل دانش پذیر　　ننگ تن میرے لئے تھا ذوق دیبا و حریر

تو نے لیکن اے وطن مجھ کو دیا انعام خوب　　زندگی کے دور آخر میں ہوا انجام خوب

اس کے بعد، فسادات کی تباہی اور غارت گری کا ذکر کر کے کہتے ہیں۔

محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے　　بے سر و ساماں دمشکلے ڈھونڈنے گھر کے نئے

ان میں شامل ہے مرا اور نظر آزاد بھی　　تجھ سے کوسوں دور دہلی میں اماں جس کو ملی

اسکے نغمے بھی ہوئے تیری فضاؤں پر گراں　　کس لئے تو ہو گیا اس درجہ ہم سے سرگراں

ہم نے یہ مانا ترے اپنے سخن ور کم نہیں　　اپنے جانے سے تری بزم سخن برہم نہیں

ہم بھی تیرے ہی نواسنج چمن تھے اے وطن　　عندلیب نغمۂ حب وطن تھے اے وطن

اتحاد ہند و مسلم کے خواہاں ہم رہے　　تیری بے انصافیوں پر بھی وفا پیماں رہے

تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی　　جذبۂ ذوق وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی۔

یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا ہے لیکن محروم کے جذبات کا اندازہ کرانے کے لئے اسے پیش کرنا ضروری تھا ار رفتہ رفتہ وقت زخموں پر مرہم رکھتا گیا۔ زخم مندمل ہونے لگے۔ محروم نے اپنے "نئے وطن" کی خوبیوں کے راگ گانے وع کر دیئے۔ حیرت یہ ہے کہ تقسیم سے بعد کی ان نظموں میں قومی حالات کی مسلمہ ابتری کی ہلکی سی بھی تنقید نہیں ملتی ں کی ہر دور کا سماج اپنے شاعر سے امید رکھتا ہے۔

محروم نے مظاہر قدرت پر بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر اردو شاعری میں پہلے بھی آتا تھا لیکن وہ اٹھارہویں صدی کی انگریزی شاعری کی طرح بہت کچھ روایتی اور کتابی ہوتا تھا شاعروں کے ذاتی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ نہیں تھا لہذا جب ہم اس طرح کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان باتوں کے بیان کرنے میں شاعر کے دلی لگاؤ کو بھی دخل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے جذبات یا خیالات کے اظہار کے لئے ان چیزوں کے رسمی تصورات سے استفادہ کر رہا ہے۔ اس بات کو شاعری میں تحریک اصلاح کے پیش رووں نے بھی محسوس کیا جس کا نتیجہ حالی کی "برکھا رت" ایسی نظمیں ہیں اس طرح یہ خیال تو تسلیم کیا جانے لگا کہ قدرت کی منظر نگاری واقعیت پر مبنی ہونی چاہئے۔ شاعر کو ذاتی تجربات کی بنا پر مناظر قدرت سے متعلق نظمیں لکھنا چاہئے لیکن جس طرح اٹھارہویں صدی کے بعد انگلستان میں رومانی تجدید کے شاعروں مثلاً ورڈزورتھ۔ شیلے اور کیٹس کو مظاہر قدرت میں انہماک تھا۔ یہ مناظر ان کے دلوں کے تاروں میں جس طرح لرزش اور آہنگ پیدا کرتے تھے۔ وہ ان اصلاح پسند شاعروں کے یہاں نہیں ملتا۔ ویسے ان انگریزی شاعروں کی ایسی نظمیں بھی پیش نظر نہیں تھیں۔ پھر فنی صلاحیت کی بات بھی ہے۔ جہاں تک محروم کا تعلق ہے انہوں نے انگریزی پڑھی تھی۔ انگریزی شاعروں کا بھی کچھ علم انہیں تھا۔ اس ضمن میں ورڈزورتھ کے تتبع کی کوشش بھی غالباً انہوں نے کی۔ لیکن ایک تو انگریزی شاعری کا ان کا مطالعہ بہت وسیع معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر ہوتا بھی تب بھی ان رومانی شاعروں کی جذباتی لطافتوں اور نزاکتوں اور تخیل کی بلندیوں تک پہنچنا ان کے لئے دشوار تھا اردو شاعروں کا تو ذکر ہی کیا خود انگریزی شاعری وکٹورین عہد میں ان خصوصیات اور معیار کو برقرار نہ رکھ سکی۔

اس کے باوجود محروم کی اس نوع کی نظموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے اکثر میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس سے شاعر کے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ بات تو ہے ہی کہ محروم کی مظاہر قدرت سے متعلق نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں جو اصلاحی دور کے شاعروں نے اپنے لئے قائم کیا تھا۔ یہ نظمیں ایسے عناصر سے قطعی پاک ہیں جنہیں واقعیت کے خلاف سمجھا جا سکے۔ پھر ان میں سے کئی میں شاعر کے ذاتی مشاہدہ کی تازگی بھی موجود ہے۔ اسلوب بیان میں خلوص کی جدت بھی ہے اور تاثیر بھی۔ مطالعے کی سہولت کے لئے ان نظموں کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے

محروم کی کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جن میں شاعری کی توجہ فطرت کے مناظر و مظاہر کے حسن پر مرکوز رہی ہے۔ ان سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو لطیف استعاروں اور تخیل کی نکتہ آفرینیوں میں رنگ کر پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کی اہمیت زیادہ تر جمالیاتی ہے اگرچہ کہیں کہیں مظاہر قدرت کی افادی خصوصیات بھی ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ ان میں بہار۔ اور بسنت پر کئی نظمیں۔ وقت سحر۔ ماہ تاباں۔ "آفتاب" دھوپ۔ کوہ مری۔ خفتگان خاک" سے شامل ہیں۔ اس کا اندازہ ان دو تین شعروں ہی سے ہو سکتا ہے جو نظم دھوپ سے نقل کئے جاتے ہیں

حسن عمل کی طرح درخشاں یہ دھوپ ہے | پاکیزہ مثل دامن پاکاں یہ دھوپ ہے

تصویرِ حسن، آب گہر سے دُھلی ہوئی یا ہے کوئی حسین حقیقت کھلی ہوئی
سرمایۂ نشاط ہے یہ دل پذیر دھوپ قوت فزائے دل ہے کہ ہے جوئے شیر دھوپ

دوسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جن میں شاعر کا مقصد منظر نگاری کے سہارے کسی فلسفیانہ یا اخلاقی تصور کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خیال جذبے پر غالب آجاتا ہے اور مظاہر قدرت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو "شاعر" "ماہتاب" ایسی نظموں میں ہیں جن کی فضا حسن و جمال کے قمقموں سے جگمگاتی دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی انسانی زندگی پر چھائی ہوئی غم کی تاریکی کا ذکر کر گزرتا ہے لیکن کچھ نظمیں تو لکھی ہی اس لئے گئی معلوم ہوتی ہیں کہ ان میں یہ بتایا جائے کہ زندگی انسانی روح پر ایک بارگراں ہے۔ زندگی حباب و سراب ہے۔ فنا ہر شے کا مقدر ہے۔ جن چیزوں کا آغاز شاندار اور مسرت آگیں ہے ان کا انجام عبرتناک ہے۔ ایک نظم ہے "انجام گل" جس کا مرکزی خیال ہی یہ ہے کہ "آغاز ہے دلنواز سب کا۔ انجام ہے دل گداز سب کا"۔ ایسی ہی ایک اور نظم "سبزۂ نو" ہے یہی خیال اس میں بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں۔

گلہائے لطف دنیا ہر چند چیدنی ہیں نظارہ ہائے عالم دلکش ہیں دیدنی ہیں
لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے افسوس دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے۔

اب ایک ایسی نظم لے لیجئے جس میں شاعر کا مقصد ایثار کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ خوبی اسے بوئے گل میں نظر آتی ہے۔ اس لئے اسے اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔

ریاض دہر میں خود ہو کے انتشار نصیب مشام خلق کو تو نے کیا بہار نصیب
اجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے۔

ظاہر ہے کہ ان نظموں کا موضوع سنجیدہ ہے جسے مظاہر قدرت کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اب بھی یقیناً ایسے ہیں جنہیں یہ تصورات اہم معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نظمیں بھی انہیں قابلِ قدر محسوس ہوں گی لیکن دوسرے لوگوں کا ان سے زیادہ لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔

مجھے ان سے زیادہ دل کش وہ نظمیں محسوس ہوتی ہیں جن میں شاعر کی طبیعت میں جاگزیں غم مظاہر قدرت میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ اس طرح یہ داخلی اور خارجی افسردگی ہم رنگ و ہم آہنگ ہو کر ایسی نظموں کی فضا کو غم آلود بنا دیتی ہے۔ مرحوم کی زندگی میں کچھ غیر معمولی سانحات پیش آئے جس سے ان کی طبیعت میں رنج و ملال رس بس گیا۔ وہ کلیتہً قنوطیت پسند تو نہیں بن گئے لیکن ان کے مزاج پر سوز و گداز کا عنصر غالب آگیا اور ان کی نظر اداسی میں ایک طرح کا سکون محسوس کرنے لگی۔ اس کی جھلک ان کی نظموں "اترا ہوا دریا" اور "وادیٔ غم" میں نظر آتی ہے۔

اترے ہوئے دریا کو دیکھ کر شاعر کو وہ زمانہ یاد آجاتا ہے، جب یہ دریا چڑھا ہوا تھا، اس کی لہریں بلند ہو کر جوش

، میں درختوں کو اکھاڑتی بچھاڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اب وہی دریا ہے کہ اتر کر جو ئے کم آب بن گیا
ں کے کنارے قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں جس پر کچھ عجیب قسم کی اداسی برس رہی ہے۔ شاعر کے لفظوں
ہو گئے' دونوں کنارے پسلیاں بیمار کی" اس المیے کو اور شدید بنانے والا خیال یہ ہے کہ وقت آنے پر یہ دریا
ن پھر اپنی کھوئی ہوئی قوت حاصل کرے گا۔ اس کی جوانی قدرت نے بطور امانت اپنے پاس رکھی ہوئی ہے جو
ت پھر اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن واپس نہیں ملے گی تو انسان کی گزری ہوئی جوانی! اسی لئے بے
بےتابی سے پوچھتا ہے

اے فلک! اے چاند تارو! اے فضاؤ! اے زمیں   کیا شباب رفتہ اپنا بھی امانت ہے کہیں۔

ایسی ہی ایک نظم "وادیٔ غم" ہے جہاں ہر وقت ماتم چھایا رہتا ہے۔ اس سے شاعر کی پژمردہ طبیعت ہم آہنگ
اعر اکثر اس کی سیر کو جایا کرتا ہے کیونکہ اس سے اس کی طبیعت کو سکون ملتا ہے۔

اک سکوت دائمی ہر شئے پہ ہے چھایا ہوا   وقت پیدائش سے ہے ہر پھول مرجھایا ہوا
سیر اس وادی کی اکثر آکے کر جاتا ہوں میں   میری نظروں میں یہ رہتی ہے جدھر جاتا ہوں میں

"گنج معانی" میں محروم کی چار نظمیں ہیں: "بلبل کی فریاد" "چڑیا کی زاری" "مچھلی کی بےتابی" اور "کولہو کا بیل" ذکران
بھی آچکا ہے۔ ان نظموں میں بھی بڑا سوز و اضطراب ہے، خصوصاً پہلی دو میں۔ لیکن ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ان
ں کمزور، معصوم اور بے زبان جانوروں کے ساتھ انسان کے ظلم و ستم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یوں تو جانوروں پر
جذبہ کسی کے بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ محروم کی مخصوص "ہندوییت" پر دلالت کرتا نظر آتا ہے۔ یہ
نظمیں مظلوم کی فریادوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ جاذب توجہ "چڑیا کی زاری" ہے کسی لڑکے
، شاعر "بدنہاد اور نابکار" قرار دیتا ہے۔ شرارتاً بیچاری چڑیا کا گھونسلا توڑ ڈالا اور اس کے بچوں کو مار ڈالا۔ اس پر
ئاں ہے۔ نظم کی عام فضا، چڑیا کے الفاظ، اس کے جذبات، اس کا لہجہ سب مل کر ہمیں حالی کی "مناجات بیوہ"
ازہ کرا دیتے ہیں۔ منظر بڑا رقت خیز ہے۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر چڑیا کہتی ہے۔

مٹی پہ وائے قسمت بیجان پڑے ہوئے ہیں   کس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوئے ہیں
افسوس نسل انساں تجھ میں وفا نہیں ہے   کہتے ہیں اُنس جس کو تجھ میں ذرا نہیں ہے
غدار! بے وفائی تیری سرشت میں ہے   تیرا بھی دیرہ دنیائے زشت میں ہے۔

اسی طرح بلبل قفس میں بے تاب ہے۔ پھر سے باغ کی کشادہ فضا میں اڑنے پھرنے اور خوشی سے چہچہانے کی
، اس کے سینے میں آگ لگا رہی ہے۔ مچھلی پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دی گئی ہے۔ جہاں وہ بڑی لاچاری سے مر
رہی ہے۔ کولہو کا بیل اپنی آزادی کھو کر تیلی کی غلامی پر مجبور ہے۔ وہ لگاتار گھومتے رہنے سے عاجز آچکا ہے اس

زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کی دعا مانگتا ہے۔

اب ہم مظاہر قدرت پر کچھ ایسی نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو محروم کے انفرادی تجربات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لئے ان میں خلوص کا عنصر اور بھی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں ہیں "سندھ کو پیغام" اور دریائے سندھ کی یاد" پہلی ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی۔ جب انہیں سندھ سے جدا ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ دوسری اس سے اکتالیس سال بعد ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی جب محروم جمنا کے کنارے آکر آباد ہو چکے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ ان کا لڑکپن ایک ایسے مقام پر گزرا تھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ انہیں سندھ کے ساحل سے خاص شغف تھا جہاں وہ سیر کو جاتے تھے۔ اور دریا کی فضا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قصبے کے غیر شاعرانہ ماحول سے نکل کر فکر شعر کے لئے بھی یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ بہرکیف یہ نظمیں شاعر کے بچپن اور جوانی کی دلکش یادوں پر مبنی ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ اُن کے بیتے ہوئے ایام کی کہانیاں گندھی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں گردشِ ایام کو لوٹانے کی بڑی آرزو بھی ہے۔ سندھ کا ساحل چھوڑے ساٹھ برس بیت گئے ہیں۔ محروم دہلی آچکے ہیں۔ لیکن سندھ کی یاد بدستور دامن گیر ہے۔ حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہیں۔

اے سندھ تیری یاد میں جمنا کے کنارے — آنکھوں سے اُبل آئے ہیں احساس کے دھارے

پھر کہتے ہیں:-

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا — وہ ماہئی رقصاں مری عمرِ گزراں کا۔۔

تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا — افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا۔

گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا — طفلی بھی، جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا۔

جن نظموں میں شاعر کی اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں جنہیں "گنج معانی" کے ایک باب میں" طوفان غم" کے عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے۔ سر عبد القادر نے بھی اس کتاب کے دیباچے میں انکی طرف توجہ دلائی ہے۔ محروم کی بیوی عین جوانی میں ایک چھوٹی سی بچی کو چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ اس سانحے سے ان کے دل پر جو گزری اس کا اظہار ان نظموں میں کیا گیا ہے۔ آپ بیتی ہونے کی وجہ سے ان میں غم کا بڑا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان میں سوز و گداز کی چنگاریاں اور شدید چوٹ کھائے ہوئے دل کی ٹیسیں ہیں۔ چھوٹی سی بچی" دریا" کی طفلانہ معصومیت اور نادانی کے پس منظر میں یہ حادثہ اور بھی جانکاہ بن جاتا ہے۔ ان میں دردناک منظر کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کا یہ مقام دیکھئے جہاں نادان بچی ماں کی میت کے پاس پہنچتی ہے۔ اس امید میں کہ ماں حسب سابق اسے پیار کرے گی اور دودھ پلائے گی

گھٹنوں پہ چل کے نکلی، بستر کے پاس پہنچی — ننھے سے آہ دل میں کچھ لے کے آس پہنچی

کیا مطلق سنبھالے ہوش و حواس پہنچی — لیکن کچھ اس سے پہلے لے دائے پاس پہنچی

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر — منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنی وہ لو لگا کر
ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے — پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے۔
اب شمع کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہے — کیسے شکار ہائے تقدیر ڈھونڈتی ہے
مردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہو — مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گزر رہی ہے؟

ان کے علاوہ مرحوم کی کچھ اور نظمیں ہیں، جو ان کی زندگی کے واقعات اور ان پر ان کے تاثرات کو نمایاں کرتی [illegible] "کنارادی" سے ان کے والد محترم کے انتقال اور ان کے ذہن پر اس کے اثر کا پتہ چلتا ہے: "باپ کے آنسو" [illegible] اسی "ددیا" کی شادی کا ذکر ہے، جو ماں کی وفات کے وقت چھوٹی سی بچی تھی۔ پھر ایک اور نظم ہے "ددیا کی خود [illegible] پر" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار بچے پیدا ہونے کے بعد ددیا نے سسرال میں کسی رنجش کے باعث خود کو آگ [illegible] کر خودکشی کر لی۔ اس سے مرحوم کے دل پر کیا گزری، اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس نظم کا پڑھنا ضروری ہے۔ ایک نظم "کم سن بچی کے مدفن پر" ہے۔ جس میں شاعر کی شیر خوار بیٹی شکنتلا کی موت کا ذکر ہے۔ بیٹی سے کہتے ہیں۔

خوش ہو کے پھر اچھل کر مگن میرے ساتھ پر — آنکھوں سے اس کے اشک ہیں جاری شکنتلا!
باپ اور بھائی دونوں تجھے لینے آئے ہیں — با آہ و اشک و گریہ و زاری شکنتلا!

ان نظموں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم کے مزاج میں جوش اصلاح، حب وطن، اور ذوق حرکت و عمل کے باوصف ایک طرح کی افسردگی، دنیا سے بے تعلقی۔ سوز و گداز اور کبھی کبھی جھنجھلاہٹ کے جزیرے دکھ نظر آتے ہیں۔ محض اردو شاعری کی روایتی الم پرستی، قنوطیت اور کچھ فلسفیانہ تصورات ہی باعث نہیں ہیں، بلکہ ان کی زندگی کے حادثات میں بھی ہیں جو ان کی شاعری کی فضا کو غم آلود بنانے میں شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر مرحوم نے بچوں کے لئے بھی بہت نظمیں کہی ہیں جن میں سے کچھ "بہار طفلی" کے نام سے ایک مجموعے [illegible] ع کر دی گئی ہیں۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ گزشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے ربع اول میں عام اصلاح کی تحریک [illegible] صورت تھی اس میں تعلیم و تدریس کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ نئی قسم کے اسکولوں کے نصاب کا سوال بھی [illegible] دا۔ شمالی ہندوستان میں اردو کا بہت رواج تھا۔ اسی مقبولیت کے سبب اردو میں، بچوں کے ادب کی ضرورت [illegible] س کی گئی۔ اس مقصد کے پیش نظر جو ادب تخلیق کیا گیا۔ اس میں جہاں بچوں کی مخصوص دلچسپی، سلاست زبان وغیرہ کا خیال رکھا گیا وہیں یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ بچوں کی خاص ضرورتوں مثلاً ان کی دینی، اخلاقی اور شہری [illegible] کی طرف دار کیا جائے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے بچوں کے لئے لکھا وہ مدارج عمر کے اعتبار کے ذہنی ارتقا اور نفسیاتی تنوع سے بخوبی واقف تھے اور ہر درجۂ عمر کے بچوں کے لئے الگ الگ طرح کا [illegible] کرنے پر قادر تھے لیکن اتنا صحیح ہے کہ بچوں کی عام ضروریات کا احساس انھیں تھا۔ جن شاعروں نے اس

غرض سے یا بچوں کو بہتر انسان بنانے کی نیت سے اچھی نظمیں لکھیں، ان میں حالیؔ، اسمٰعیلؔ، اقبالؔ اور افسرؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہی میں محرومؔ کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لئے جو نظمیں انہوں نے کہیں، اُن میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ مقبول انگریزی شاعروں کے تراجم۔ یہ نظمیں اسلوب اور ٹیکنک کے اعتبار سے کئی طرح کی ہیں مثلاً کچھ ایسی ہیں کہ بچوں سے مشفقانہ خطاب کر کے انہیں نصیحتیں کی گئی ہیں۔ کچھ میں خود بچے اپنے ولولوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک نظم "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کہانی کے پیرائے میں ہے جس میں اسکول کے بچوں کو بوڑھوں اور اپاہجوں کی مدد کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ان سب نظموں کے پڑھنے سے شاعر کی بچوں میں گہری دلچسپی اور ان سے مخلصانہ محبت کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کے دل میں انھیں ہنسی خوشی آپس میں پیار و محبت سے رہتے اور کھیلتے کھاتے دیکھنے کی تمنا موجزن ہے۔ وہ ان میں نیکی سچائی، ذوقِ علم، صحت و صفائی، محنت وطن دوستی اور خود اعتمادی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا متمنی ہے اور انہیں سستی، بدزبانی، خودغرضی، حسد، نخوت وغیرہ اخلاقی ذمائم سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کے لئے یہ نظمیں بھی شاعر کے عام اصلاحی مقاصد ہی کا ایک حصہ ہیں اور درجِ عمر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو پنڈت تلوک چند محرومؔ کا اردو شاعری کے ارتقا میں ایک اہم مقام ہے۔ ان کی نظمیں گوناں گوں محاسن کی حامل ہیں۔ جس کا اعتراف نہ کرنا غلط بھی ہوگا۔ اور احسان ناشناسی بھی۔

(بقیہ صفحہ ۳۴ کا)

معنی این شعر ہم در خاطر نمی آید۔ اگر شعر من می بود، این طور گفتم:۔

نکلے گی میری قبر سے آواز میرے بعد ایسی کہ سُن کے روئیں گے ہمراز میرے بعد

محترم (الف) "شاعر خوش بیان خواجہ محترم خان...... از سلطنت عالمگیر ثانی فردوس آشیانی تشریف بہ صوبہ بہار می دارند"

(ب) "........ دو سال است کہ در ملک صوبہ بہار تشریف می دارند، در حق این فقیر مہربانی فرمایند .....

خلیل (الف) "........ ملی ابراہیم خان......... از دست......."

(ب) "........ الحال بہ مرشد آباد قیام می دارند.......

قبل ازیں تذکرہ فارسی مرقوم فرمودہ اند۔ غالب است کہ تذکرۂ ریختہ ہم تحریر نمایند۔ از دست......"

مندرجہ بالا اقتباسات کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نسخۂ اوکسفورڈ سے ایسے بیانات حذف کر دیئے گئے ہیں، جن سے شورشؔ کی تذکرہ نگاری کا فطری جوہر کھلتا ہے۔ جھن پور والے نسخے میں شورشؔ اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس میں نہ تو ملمع کاری ہے اور نہ آورد۔ جو بات جہاں سے اور جس طرح معلوم ہوئی اس کا ذکر انہوں نے کر دیا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند متن مرتب کیا جائے تاکہ تحقیقی کام کرنیوالے صحیح تر مواد سے واقف ہو سکیں۔

ابن انشا
ڈائرکٹر قومی مرکز کتاب

مصنف، ناشر اور قاری کے مسائل

نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کے مرکزی بورڈ نے جس کا اجلاس ۱۲ر مارچ ۱۹۶۷ء کو کراچی میں زیرِ صدارت جناب قدرت اللہ شہاب سکریٹری تعلیمات حکومت پاکستان منعقد ہوا حسب ذیل امور کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کا نام "تعلقات مصنف ناشر قاری کمیٹی" ہے۔ یہ کمیٹی ملک کے اہل رائے ادیبوں، ناشروں، علمی اداروں، کتب خانوں کے منتظمین، طلبہ، والدین اور عام قارئین کی آرا جمع کر کے ایک رپورٹ پیش کرے گی جس کے اثرات دور رس ہوں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ ان امور پر اپنے خیالات اور نظریات قلمبند کر کے نیشنل بک سنٹر کے پتے پر جلد از جلد روانہ فرمائیں۔

مسئلہ اول :۔ تعلقات مابین مصنف و ناشر، عام کتابوں (غیر نصابی) کی صورت میں۔

اس بحث میں حسب ذیل امور آ سکتے ہیں۔

۱۔ رائلٹی، معاوضے اور معاہدے وغیرہ کے سلسلے میں مصنفوں کے مسائل اور مطالبات، یعنی

(ا) عام ناشرین سے مصنف کے کیا مطالبات ہیں۔

(ب) سرکاری اور نیم سرکاری علمی اداروں اور دوسری کتابیں لکھوانے چھاپنے والی انجمنوں سے مصنف کس برتاؤ کا متقاضی ہے۔

۲۔ ناشرین اور علمی اداروں کو مصنفوں سے اگر کوئی شکایت ہے تو وہ کیا ہے اور مصنف سے ان کے کیا مطالبات ہیں۔

۳۔ کوئی اور بات اس سلسلے میں۔

مسئلہ دوم :۔ نصابی کتابوں کے ضمن میں مصنف، ناشر اور حکومتی اداروں کے باہمی تعلقات

اس سلسلے میں حسب ذیل امور پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ نصابی کتابیں لکھنے والے مصنفین کے ٹیکسٹ بک بورڈوں سے کیا مطالبات ہیں اور بورڈ اپنی جگہ ان مصنفین سے کیا شکایت یا توقع رکھتے ہیں۔

۲۔ ٹیکسٹ بک بورڈوں کو ناشرین سے اور ناشرین کو ٹیکسٹ بک بورڈوں سے کیا شکایت ہے۔ باہم معاملت میں انھیں

کیا دقتیں پیش آتی ہیں ۔

مسئلہ سوم :- علمی اداروں اور مصنفین کے باہمی تعلقات اور ایسے اداروں کے خصوصی مسائل ۔

اس بحث میں حسب ذیل امور آسکتے ہیں ۔

۱۔ کتابوں کے لکھوانے مرتب کرانے، چھپوانے اور فروخت کرنے کے سلسلے میں علمی اداروں کے کیا مسائل ہیں ۔

۲۔ مصنفوں کو علمی اداروں سے معاملات میں کیا دقتیں پیش آتی ہیں ۔

۳۔ اپنی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے سلسلے میں علمی اداروں کے موجودہ طریق کار کے بارے میں پبلشروں کی کیا رائے ہے اور آئندہ دونوں فریقوں میں بہتر تعاون اور تعلقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے

مسئلہ چہارم :- کتابوں کی قیمتوں کے بارے میں ناشروں اور کتابیں خریدنے پڑھنے والوں کا نقطۂ نظر ۔

اس مسئلہ پر اظہار رائے کی حدود یہ ہو سکتی ہیں ۔

۱۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں رائلٹی، کمپوزنگ یا کتابت، کاغذ، تزئین و تصاویر، چھپائی، جلد، پبلسٹی وغیرہ پر کیا خرچ آتا ہے بک سیلر کو کتنا حصہ ملتا ہے اور ناشر کا نفع کتنے فی صدی رہتا ہے ۔

۲۔ ملک کے مختلف شہروں اور بازار سے حسب ذیل قسم کی کتابیں حاصل کرنے میں عام قارئین اور بچوں کے والدین کو کیا دقتیں پیش آتی ہیں اور وہ کیا مدد چاہتے ہیں ۔

(ا) بچوں کی عام کتابیں ۔

(ب) بڑوں کی عام کتابیں ۔

(ج) نصابی کتابیں ۔

۳۔ ان (ا) (ب) (ج) تینوں قسم کی کتابوں کے گٹ اپ، لکھائی چھپائی یا پائداری اور موجودہ قیمتوں کے سلسلے میں قارئین اور اور بچوں کے والدین کی رائیں کیا ہیں ۔

۱۔ ان سب امور پر اظہار رائے ضروری نہیں۔ وہ مسئلہ لیجئے جو آپ سے متعلق ہے۔ آپ چاہیں تو آپ کی رائے کو خفیہ رکھا جائے گا۔

۲۔ آپ کی رائیں، مشورے اور تجاویز وغیرہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء تک حسب ذیل پتے پر پہنچ جانے چاہئیں
نیشنل بک سنٹر آف پاکستان تھیوسوفیکل ہال بندر روڈ، کراچی ۔

مینا ربیدی

ظریف جبلپوری

اردو[1] شاعری کے ابتدائی دور میں ظرافت نگاری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حالانکہ عربی اور فارسی شاعری اس نوع کے ذخیروں سے بھری پڑی تھی۔ ظرافت نگاری کی صنف میں ہمیں سب سے پہلے جعفر زٹلی نظر آتے ہیں۔ اُن کی ظرافت محض تفریحِ طبع کے لئے تھی وہ اشعار صرف اس لئے کہتے تھے کہ سننے والے ہنس پڑیں اور بس۔

یہ جعفر زٹلی نے اچھا کیا
کہ مکھی کو مل مل کے بھنیسا کیا

جعفر زٹلی کے بعد ظرافت کی صنف میں ہمیں "ہجو" دکھائی دیتی ہیں جسے بطور صنفِ سخن متعارف کرنے کا سہرا سودا کے سر ہے۔ محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں —

"اُس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے، یہ طرزِ خاص کہ جس سے "ہجو" ایک مزا تھا اس باغِ شاعری کا ہو گئی۔ انھیں (سودا) کی خوبیاں ہیں۔ عالم، جاہل، فقیر، امیر، نیک، بد کسی کی داڑھی انکے ہاتھ سے نہیں بچی اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ ان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔"

سودا کے زمانے میں دوسرے ہجو گو فاخر، ضاحک اور قدوی بھی مشہور ہوئے مگر وہ سودا کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے سودا کے بعد اکثر شعراء اس راہ پر گامزن ہوئے مگر جو ہجویہ نظمیں دستیاب ہوتی ہیں انمیں صرف انشا کا کلام معیاری سمجھا جاتا ہے ہجو کے علاوہ ظرافت نگاری میں تمسخر، پھکڑ، تو تو میں میں، فواحش، ریختی اور سیدھی سادی ہزلیات مختلف زمانوں میں مختلف انداز میں تخلیق ہوئیں۔ ریختی میں جان صاحب اور ہزلیات میں جرکین وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔

ہر ملک کی سیاست کا اثر اُس ملک کی اقدار، احساسات اور شعور پر یقیناً پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس ملک کا ادب اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کا مستقبل برصغیر میں اس قدر تاریک ہو گیا تھا کہ اگر سر سید جیسا مردِ آہن

[1] یہ مقالہ یومِ ظریف (۲۴ مارچ ۶۶ء) میں پڑھا گیا۔

اپنی علی گڑھ تحریک لے کر نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو خدا معلوم یہ قوم آج کس قعرِ مذلت میں پڑی ہوتی مگر یہی وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں کی نام نہاد مذہبی کورانہ تقلید اور اُن کے ذہنوں میں اُس وقت اسلام کا تصور سرسید تحریک کو بہ آسانی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سرسید کے خلاف ایک عام بغاوت پھیل گئی۔ کفر کے فتوے جاری ہو گئے اور اُن کی تحریک کو مغربی تہذیب اور معاشرت کا ایسا زہر قرار دیا گیا جو مسلمانوں کو بے دین کر کے سوائے دوزخ کے کوئی دوسری راہ نہیں دکھا سکتا۔ سیاسی عقائد والے انھیں ایک مخصوص طبقہ دارانہ ذہنیت کا حامل سمجھنے لگے۔ عام تصور یہ تھا کہ اسلام انگریزی تعلیم کو برداشت نہیں کر سکتا اور یہ کہ انگریزی تعلیم مسلمان کو کافر بنا دیتی ہے سرسید کا کہنا تھا کہ اگر اس وقت ملک کے مسلمانوں کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تعلیم نہ دی گئی تو یہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔ اسی زمانے میں ایک شاعر منظرِ عام پر آیا جسے ہم اکبر الہ آبادی کے نام سے جانتے ہیں۔ اکبر کا ذہنی رجحان بھی عام مسلمانوں کے خیالات کے مطابق تھا۔ انھوں نے انگریزی تہذیب اور سرسید تحریک کی مخالفت میں طنز و مزاح کا سہارا لیا اور یہ کہا

ملک بر شعفس کا راج ہند تھا　　　اب خدا ہی بھائی صنو کا

غرض کہ سرسید علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کی اکبر نے اچھی طرح دھجیاں بکھیریں اور وہ اپنے رنگ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ اردو شاعری میں ایک نئی صنف کے موجد قرار دیئے گئے۔

اچھے شعرا نے طنز کا سہارا تو اپنے کلام میں ہمیشہ لیا ہے شیخ کی داڑھی انکے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی۔ مگر ظرافت کو طنز میں اور طنز کو ظرافت میں سمو دینے کے موجد صرف اکبر تھے۔ انھوں نے عوام اور حکومت دونوں کی نبض کو پہچانا اور معاشرے پر بھرپور طنز کئے۔ آخر میں اکبر بھی سرسید پر ایمان لے آئے تھے اور سرسید کی وفات پر انھیں کہنا پڑا کہ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا

اکبر الہ آبادی کی شاعری کا ادب پر یہ اثر ہوا کہ ملک نے ہر اُس مزاحیہ شاعری یا ظرافت نگاری کو ادب سے خارج کر دیا جس میں کوئی اصلاحی افادیت کارفرما ہو۔ چنانچہ جب اکبر کے بعد ظریف دہلوی، احمق پھپھوندوی، ظریف جبلپوری، سید محمد جعفری جیسے فنکار نمودار ہوئے تو ادبی دنیا نے انکی تخلیقات کو زمانہ کے تقاضوں کی کسوٹی پر پرکھا۔ ظریف لکھنوی کے متعلق غلام احمد فرقت لکھتے ہیں۔

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ مگر چونکہ ان کی زندگی نوابانہ فضاؤں میں بسر ہوئی تھی اس لئے سیاست سے انھیں دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ اُنکی شاعری محض تفریحی شاعری تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ شاعری جس کا مقصد محض تفریح ہو۔ ادب میں کسی اعلیٰ مقام کی اہل نہیں ہو سکتی "۔

ظریف دہلوی کا کلام بھی مزاح اور تفریحِ طبع کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ احمق پھپھوندوی نے البتہ کہیں کہیں حکومت اور سماج پر بھرپور طنز کئے ہیں۔ اُنکے مزاج میں بلا کی سنجیدگی تھی وہ قہقہے کے قائل نہ تھے وہ صرف مسکراتے تھے مگر خلافت اور کانگریس کی سرگرمیوں اور اقتصادی پریشانیوں نے انھیں کبھی یکسوئی سے کام نہ کرنے دیا اور وہ اردو ادب کو وہ سب کچھ نہ دے سکے جو حقیقتاً دے سکتے تھے نتیجہ پیدا ہوا کہ اُنکی تخلیقات زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں اور وہ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر وفات پا گئے۔ اور اُن کا وہ مقام متعین نہ ہو سکا

جن کے وہ حقیقتاً اہل تھے۔

ظریف جبلپوری کو سمجھنے سے قبل ہمیں اُس ماحول کا جائزہ لینا چاہیئے جس میں اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ گذرا ہے اُن کی زندگی ملک کی سیاسی بدحالی اور تقسیم کی افراتفری سے متاثر رہی۔ وہ انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور قوم کے زبردست نباض اُن کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو دیکھ لیتی تھی۔ جو قوم کے ذہن و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتی تھیں وہ جو کچھ دیکھتے اور سمجھتے تھے وہی لکھتے تھے۔ اُن کے کلام میں نرم مگر بھرپور طنز ہوتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اُن کے تمام کلام میں طنز آباد ہے اور مزاح کم وہ بدحالیوں اور بداعمالیوں کے رشتوں میں قہقہے پیدا کرتے تھے۔ قہقہے ختم ہو جاتے تھے، مگر طنز اپنا کام جاری رکھتا تھا۔ اُن کے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل اُنکے حملوں سے کبھی محفوظ نہ رہے۔

ظریف مرحوم نے دو مطبوعہ دیوان "فرمان ظرافت" اور "تلافی مافات" اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام چھوڑا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام اکثر و بیشتر ہم خود اُن کی زبان سے بھی سُن چکے ہیں اگر قوم نے توجہ نہ کی تو ممکن ہے یہ جواہر پارے ضائع ہو جائیں۔ اُن کے دونوں مطبوعہ دیوانوں میں تقریباً سو اور دو طویل اور مختصر نظمیں موجود ہیں۔ پورے کلام میں ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے اندازہ ہو کہ اُنکی شاعری محض تفریحی اور صرف مزاحیہ شاعری تھی۔ اُن کی نظم "لالوکھیت" کراچی کی آبادکاری پر ایک ایسا بھرپور طنز ہے جسے برداشت کرنا ارباب حل و عقد کے لئے دشوار ہو گیا ہوگا اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ نظم نہ لکھی گئی ہوتی تو ممکن ہے اُس وقت کا لالوکھیت آج کا بارونق اور دلکش بیافت آباد نہ ہوتا۔

جگمگائیں بلب امیدوں کے دولت خانوں میں
ٹمٹماتا ہے چراغ خانہ لالوکھیت میں

تم کو اپنی کوٹھیوں کے آٹھ کمروں کی قسم
اِک چٹائی کا مکاں بنوا نا لالوکھیت میں

ہم نشیں آبادکاری جس کو کہتے ہیں عوام
سولہ آنے میں نہیں ایک آنہ لالوکھیت میں

تم کو جو تکلیف ہے شاید انھیں احساس ہے
کچھ بڑے لوگوں کو دو عمرانہ لالوکھیت میں

اس اقتباس سے اندازہ فرمایئے کہ شاعر نے مہاجرین کی آبادکاری پر ارباب حل و عقد کی غفلت کا اپنے قلب پر کیا اثر لیا ہوگا۔ جب مزاح میں طنز کا نشتر ڈھالکر یہ نظم لکھی ہوگی۔

اصحاب اقتدار و اختیار کی سرد مہریوں کا مرثیہ حسب ذیل اشعار میں کتنا مکمل اور واضح ہے۔

ہم گئے ملنے ہوئے وہ خوش بہت تعظیم کی
اور باہر ہم کو صوفے پر بٹھا کے چل دیئے

اور مقطع فرماتے ہیں۔

جب بھی حرف مدعا نکلا زباں سے ظریف
مسکرائے اور ہمیں ٹھینگا دکھا کر چل دیئے

ظریف مرحوم کے کلام کا اگر مکمل جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر بے پایاں درکار ہوگا۔ وہ اور اُن کا کلام ہم سب کا جانا پہچانا ہے اس لئے میں کلام پر مزید تبصرے کی طوالت سے گریز کرتے ہوئے صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظریف ایک انتہائی شریف، خوددار اور ضبط و تحمل کا قائل انسان تھا۔ وہ کسی سخت سے سخت موقع پر اپنے سطح سے نیچے نہیں گرا اور برملا کہہ اٹھا۔

بیجا نخرے کبھی اٹھاتے ہی نہیں
اندازِ خوشامد ہمیں آتے ہی نہیں!
جتنے وہ ہیں اُتنی اُتنی تعریف
رائی کا پہاڑ ہم بناتے ہی نہیں

ظریف کو حوادثِ زمانہ کا بارہا سابقہ پڑا مگر بجائے قنوطیت اور آہ و زاری کے انھوں نے قہقہے لگا کر دنیا کا مقابلہ کیا اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا وہ اپنے غموں پر ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے مگر آج سے تین سال قبل اجل کے ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کردیا۔ اُن کی یادیں ہماری آنکھوں کو ہمیشہ اشک آلود رکھیں گی اور ان کا کلام غیر فانی ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آنند کی محفل میں انھیں اُسی محفل پر جگہ دے گی جہاں اکبر الٰہ آبادی اور سید محمد جعفری ہوں گے۔ میں یہ مقالہ اُس قطعۂ تاریخ پر ختم کرتا ہوں جو میں نے مرحوم کے انتقال پر کہا تھا۔

خلوص اور صدق میں تھے کتنے منفرد ظریف
نہ اُن کا تھا کوئی رقیب، نہ اُن کا تھا کوئی حریف
خدا نے جب بلالیا، قضا کو بھیج کر انھیں
نہ کوئی ساتھ دے سکا اگرچہ تھے سبھی حلیف
سُنی وفات کی خبر، تو آئی غیب سے ندا۔!
لکھو یہ مینا قبر پر کہ "خلد میں گئے ظریف"
۱۹۶۴ء

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

گلدستہ نہال سخن بریلی

حکیم فصیح الزماں اثر امروہہ ضلع مراد آباد کے ساکن اور طبیب و شاعر تھے۔ شاید امروہہ میں مطب نہیں چلا اور وہ بریلی چلے آئے انہوں نے بریلی میں حکیم نذیر علی کی گلی میں مطب کرنا شروع کیا۔ مطب خوب چلا اور وہ شہر میں مشہور ہو گئے۔ بریلی میں شعر و شاعری کا ماحول بنا ہوا تھا۔ حکیم فصیح الزماں اثر سید ابوالحسین شمیم امروہوی (متوفی نومبر ۱۹۱۴ء) کے شاعری میں شاگرد تھے۔ وہ بھی اس ماحول میں پیوست ہو گئے اور شہرت حاصل کی۔

بریلی میں اخبارات، رسائل اور گلدستہائے غزلیات کا رواج بڑھ چکا تھا۔ روہیلکھنڈ گزٹ، بہار بےخزاں اور روز افزوں نے اس صدی کی پہلی دہائی میں شہرت حاصل کی تھی۔ امروہہ سے اتحاد نکل رہا تھا۔ جلوہ یار، پیام یار، بزم سخن، خدنگ نظر کے پھریرے اڑ رہے تھے۔ حکیم اثر نے اخبار الفصیح بریلی کا اجرا کیا جو کچھ ایسا معیاری پرچہ تو نہیں تھا۔ مگر اس کی کوکھ سے نہال سخن پیدا ہوا جو حکیم اثر کا بریلی والوں پر ایک بڑا احسان ہے۔

نہال سخن کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مالک اور مہتمم حکیم فصیح الزماں اثر اور اڈیٹر محمد حسین تمنا بدایونی تھے۔ گلدستہ اخبار الفصیح کے ہمراہ ہر ماہ انگریزی کی تین تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کی طباعت منتخب العلوم بریلی میں ہوتی تھی۔ ابتدا میں تعداد صفحات ۲۴ تھی جو بڑھا کر ۳۲ کر دی گئی تھی۔ لکھائی چھپائی اوسط اور درمیانی درجے کا کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ زر سالانہ ۳ مقرر کیا گیا تھا۔ سرورق اس زمانے کے مذاق کے مطابق دیدہ زیب تھا اور اس پر یہ شعر درج کیا جاتا۔

سُن لئے ملے جو مجھ کلام کے ۔۔۔ بیٹھ جائے کلیجہ تھام کے

مئی ۱۹۱۳ء سے سرورق زیادہ دیدہ زیب بنایا گیا۔ اسی سال مفتی عمادالحسن محو بریلوی اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اب یہ شعر درج کیا جاتا۔

سرسبز کیوں نہ ہوں کہ نہال سخن ہوں میں ۔۔۔ جس کو خزاں کا خوف نہیں وہ چمن ہوں میں

ابتدائی اوراق اخبار الفصیح پر مشتمل تھے اس کے بعد گلدستہ بطور ضمیمہ شروع ہوتا تھا۔ گلدستے میں غزلیات مصرعہ طرح پر چھپا کرتی

تھیں۔ جس کا اعلان دو تین ماہ قبل کر دیا جاتا تھا۔ غزلیات کی طباعت میں حفظ مراتب کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ عام طور پر گلدستے میں پہلی غزل شمیم امروہوی یا خود حکیم اثر کی طبع ہوتی تھی۔ اساتذہ آخری صفحات پر بھی جگہ پاتے تھے۔ گلدستے کے آخری صفحے پر دستور العمل شائع ہوتا جس میں اس کے ضوابط بیان کئے جاتے جو مختصراً مندرجہ ذیل ہیں اور جن سے حکیم اثر کی سوجھ بوجھ اور نہال سخن کی متعلق واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ یہ گلدستہ ۲۴ صفحوں پر ہر ماہ انگریزی کی تیسری تاریخ ضمیمہ اخبار الفصیح ہو کر شائع ہوتا ہے۔ عام قیمت اہل شہر ایک روپیہ خریداران بیرونجات سے [illegible] مربیان سے [illegible] معاونین سے [illegible] سرپرستان سے [illegible]، والیان ملک جو کچھ عطا فرمائیں۔ اساتذہ کو مفت نذر کیا جاتا ہے۔ پرچہ نمونہ ۲ر۔

۲۔ کلام محمود اور غیر محمود دونوں منتخب شائع ہوگا لیکن خریدار کو اس قدر ترجیح ہوگی کہ اس کے ۱۶ اشعار تک درج گلدستہ کئے جا سکتے ہیں۔ غیر خریدار کے ۱۱ اشعار سے زائد درج نہیں ہو سکتے۔

۳۔ اساتذہ شہر و بیرونجات نمبر ۲ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے ۱۲ اشعار بلا انتخاب درج ہونگے۔

۴۔ معاونین طرح میں ۱۲ اشعار تک چھپوانے کے مجاز ہیں۔

۵۔ مربیان دو غزلیں ایک طرحی دوسری غیر طرحی ہر ماہ میں چھپوانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

۶۔ مشاہیر کی خدمت میں گلدستہ بلا طلب پہنچتا ہے۔ بحالت نادہندگی اگر نوبت بعدالت پہنچی تو قیمت بشرح اول دس روپے سالانہ کے حساب سے وصول کیا جائے گا۔

۷۔ غزل اجرتی خریداران گلدستہ کی فی شعر آدھ آنہ اجرت پر بلا انتخاب درج گلدستہ ہو سکتی ہے غیر خریداران سے ۱ر فی شعر لیا جائے گا۔

۸۔ غزلیں صاف خوشخط علیحدہ کاغذ پر آنی چاہئیں۔

۹۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام حکیم محمد فصیح الزماں اثر منیجر اخبار الفصیح و نہال سخن ہونا چاہئیے۔

ان ضوابط سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ حکیم اثر کی نظریں گلدستے کے ذریعہ مالی یافت بھی تھی۔ انہوں نے گلدستے میں اپنی دواؤں کے اشتہارات بھی چھاپے۔ انہوں نے ایسے شعراء کی غزلیات بھی زیادہ شائع کیں جن سے مالی منفعت متوقع تھی۔ گلدستے میں شہر بریلی کے ان تمام شعرا کا کلام پابندی سے چھپا جو رئیس یا زمیندار تھے۔ ان کے علاوہ بیرونجات کے مالدار شعرا کی غزلیات بھی شائع ہوئیں۔ ان کے اسماء معاون، مربی اور سرپرست کی حیثیت سے درج کئے جاتے تھے۔ والیان ریاست میں راجہ صاحب محمدی (ضلع کھیری۔ یوپی) اور نواب صاحب ٹونک کی غزلیات طبع ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی گلدستے کے سرپرستوں اور معاونین کی فہرست طویل تھی اور ان کا کلام بار بار چھپتا تھا۔ اس سے حکیم اثر کی کاروباری لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہال سخن پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور اس نے کم وقت میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ البتہ مالی فراغت سے ادبی فروغ متاثر ہوا۔ گلدستے میں ایسے روسا کا کلام بھی چھپا جن کی ادبی حیثیت معمولی تھی۔ اساتذہ نے اپنے تلامذہ کی غزلیں بھی چھپوائیں جو کم قیمت تھیں۔ معززین شہر کے نو عمر لڑکوں کی غزلیات بھی طبع ہوئیں جو ان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں تھیں۔ ظرافت کے نام پر لچر اور سوقیانہ کلام بھی چھپا جو بالکل نہ چھپتا تو بہتر تھا۔ چند ماہ تک قصبہ رچھا (ضلع بریلی) کے شعرا کا نہال سخن پر قبضہ رہا اور کم و بیش ۲ شاعروں کی غزلیں طبع ہوئیں حالانکہ ان رچھاوی مربیوں میں صرف دو شاعر تھے یعنی حکیم محمد بشیر خاں بشیر و مولوی نذیر خاں نذیر اور دیگر شعرائے کرام کی افراط سے نسبت نہیں تھی۔ مگر

کی بھی تشکیل کی تھی جو نصف صدی تک قائم رہی۔ اس کے مشاعروں میں حکیم آخر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ محو ایک انفرادی رنگ کے شاعر تھے۔ انہوں نے ا غزل کو داغ و امیر کے اثرات سے بچائے رکھا انھوں نے مضمون طرازی اور قافیہ پیمائی سے بھی اجتناب کیا۔ ان کی غزل جذبات کی نازک مشاہدات کی ترتیب اور خیا کی تطہیر سے عبارت ہے ان کے ماحول کی اعلیٰ روایات اور دبستانِ غالب کی انمٹ اقدار کو ان کی فکر اور شخصیت نے یکجا کر دیا ہے ان کی غزل کے جیت اشعار میں ایسا تقدس اور کچھ ایسا داخلی نور ملتا ہے جو ان کی غزل کو ہماری ہم عصر ادب کا آئینہ بنا دیتا ہے۔ نہالِ سخن کی ہم طرح غزلیات جن تینوں رنگ واضح اور اجاگر ہیں : حسن، قیصر، اور محو کی غزلیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا اندازِ تکلم واضح اور ممتاز۔ نہالِ سخن کے اوراق میں بریلی کی شعری تاریخ کا یہ دور بلاشبہ محفوظ ہے۔

۳۔ عوام داغ کے اندازِ شاعری کے دلدادہ تھے اس وقت بریلی میں " زبان کے شعر " کی واہ واہ ہوتی تھی مشاعروں میں تلامذہ حسن، شبیر احمد غوری، تلمیذ داغ اور ان کے شاگردوں کا کلام مقبول ہوتا تھا۔ اس مقبولیت کا اثر زبان پر پڑنا ناگزیر تھا۔ قیصر اور محو تو متاثر نہیں ہوئے۔ مگر [illegible] نے یہ اثر قبول کیا۔ محو کے خاندان میں مفتی بدر الحسن تفتہ ہوتے ہیں ان کے چھوٹے بھائی تھے وقتی ماحول سے متاثر ہوئے اور ان کی غزلیات کی رنگینی داغ اسکول سے مستعار ہے۔ قیصر کے خاندان میں ان کے دو لڑکے مرزا سعادت یار جنگ مجبور اور مرزا یعقوب بیگ حسرت اسی ڈگر پر چلے اور پرواز تخیل کے بجائے ہجر و وصل پر توجہ کیا۔ جس طرح برف پگھل کر پانی بن جاتا ہے اسی طرح بریلی کے شعر و آہنگ کی ہوا لگنے سے رفتہ رفتہ پگھل کر داغ کے رنگ میں گھل مل گئے۔ ا عام شعری کیفیت کا نقشہ بھی نہالِ سخن میں ملتا ہے۔ بریلی کے زیادہ تر مقامی شعرا کا کلام بتدریج داغ سے متاثر ہوا۔ اور اس رنگ کی غزلیں نہا میں شائع ہوئیں۔

پرانے گلدستوں میں، جیسا کہ نہال سخن تھا، اکثر مفید معلومات مل جاتی ہیں۔ مثلاً جون ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں ماصی عبدالرحمٰن بریلوی تلمیذ غالب کی مندرجہ ذیل غزل چھپی ہے۔

جاں فروشی کا اگر دعویٰ عدو کرتے ہیں	لیجئے ہم بھی تہِ تیغ گلو کرتے ہیں
جا شب پہ حضرتِ واعظ کو بڑی ہے کی	ہم اگر جام تو خالی وہ سبو کرتے ہیں
آپ جو چاہیں کہیں آپ کی بیجا بھی بجا	غیر کیوں آپ کی باتوں پہ رفو کرتے ہیں
تشنۂ خونِ شہادت ہیں بلا کے جانباز	آپ شمشیر سے تر اپنا گلو کرتے ہیں
زخم سوزن سے بچا کچھ جو اثر نوکِ مژہ	لب زخم اس لئے احسان رفو کرتے ہیں
ہاتھ آیا مجھے اس پردہ نشیں کا دامن	جس کو لینے کو فرشتے بھی وضو کرتے ہیں
نہ نگہ جلوہ پرستاں کی نہ دل مایۂ عشق	کیسے ارمان ترے لب سے عدو کرتے ہیں
کیوں نہ ہو پشتِ فلک تم شبِ تاریک میں	بو دماغ اس پہ جو یہ آئینہ رو کرتے ہیں

کہیں وحشی کی نمازیں بھی قضا ہوتی ہیں

میکدہ میں وہ گلابی سے وضو کرتے ہیں

اس سے قبل ہماری قاضی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

داغ کے بعض تلامذہ کا بیان ہو چکا ہے۔ چند کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں—

محمد یوسف حسن طپش۔ حبیب لعل رعد۔ بجنور گو الیار۔ متین الدین مجیلی شہر جونپور۔ محمد حسین حیران۔ اکبر آباد۔

نہالِ سخن میں امیر مینائی کے مندرجہ ذیل غیر معروف تلامذہ کی غزلیات شائع ہوئیں

سید قمر الدین احمد قمر سندیلوی۔ حکیم محمد عابد علی کوثر خیر آبادی۔ بالکرشن قمر لکھنوی۔ حضور احمد خان آثم بریلوی۔

نہالِ سخن کے ذریعہ مندرجہ ذیل اخبارات، رسائل اور گلدستوں کے اسماء معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں دو ایک معروف ہیں: —

۱۔ اخبار "زمیندار و کاشتکار" بجنور۔
۲۔ رسالہ "تحقیق سخن" متھرا
۳۔ اخبار "اہل اسلام" لاہور
۴۔ ظریف لاہور
۵۔ اخبار "تاجر" میرٹھ۔ مدیر محمد ابن الحکیم صبر
۶۔ "جلوہ یار" میرٹھ۔ مدیر محمد شریف خاں آزاد
۷۔ "زبان اردو" شاہجہانپور۔ مدیر محمد شاہ جہانپوری۔
۸۔ اخبار اتحاد لمرد بہ مراد آباد۔ ۹۔ بہارِ سخن کلکتہ۔

نہالِ سخن میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اشتہار چھپا یا ریویو کیا گیا

۱۔ رواسم روزانہ
۲۔ بذریعہ العشرت
۳۔ تحفۃ العلوم
۴۔ رسالہ علم قیافہ
(از حکیم فصیح الزماں اثر۔)

۵۔ تحریض اہلی و مظلوم طرابلس — از محمد اسمٰعیل خاں تحیر رامپوری۔
۶۔ اوراق ماتم تسلیم یعنی یادگار تسلیم — ایضاً
۷۔ گلدستہ قرار۔ — از تصدق حسین قرار شاہجہانپوری
۸۔ سفینۂ نوح۔ — محمد نوح ناروی

میں نے نہالِ سخن کے جس فائل سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اکتوبر ۱۹۱۵ء تک کے شماروں پر مشتمل ہے اس وقت یہ نہیں معلوم کہ نہالِ سخن کا آخری شمارہ کب تک چھپا۔ ۱۹۱۵ء کے رسالوں میں پہلا سا طمطراق نہیں ہے۔ دو ایک شمارے وقت پر بھی نہیں نکلے صفحات کی تعداد بھی ۳۲ سے کم ہو کر ۲۰ رہ گئی۔ اور معاونین کے نام بھی کم ہیں ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گلدستہ مائل بہ زوال تھا۔ میں نے شہر بریلی کے معمر لوگوں سے دریافت کیا تھا جن سے پتا چلا کہ حکیم اثر ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں بریلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے کیونکہ ان کا مطب چلنا بند ہو گیا تھا اور انھوں نے کئی بار جائے مطب تبدیل کی۔ ممکن ہے کہ نہالِ سخن دسمبر ۱۹۱۵ء کے بعد نہ چھپا ہو۔

مولانا حامد علی خان

شیخ عبدالقادر مرحوم

موجودہ صدی کے ابتدائی پچاس سال میں شیخ عبدالقادر مرحوم و مغفور نے اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے اور اسے مدارجِ ترقی پر پہنچانے کے لئے جو مسلسل اور بے حاصل جد و جہد کی برِ عظیم پاکستان و بھارت کے تمام اہلِ علم اس سے پوری طرح واقف اور اس کے لئے اس بلے ریا خادمِ قوم کے دل سے احسان مند ہیں۔ یہ شیخ صاحب نے اس زمانے میں علماء و اکابرِ قوم کو تحفظِ اردو کی طرف متوجہ کیا اور نوجوانوں کے دلولۂ خدمتِ ملک و ملّت کو ابھارا اور ان کی عملاً حوصلہ افزائی بھی کی جب بہت سے دوسرے رہنماؤں کو بھی ہماری قومی زندگی میں اردو کے صحیح مقام کا احساس بھی نہ ہوا تھا اور وسے حضرت ممدوح کا عشق آنا کہ تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر بھی زبان کی خدمت کے بارے میں ان کا جذبۂ والہانہ سرد نہ ہو سکا۔ سفر ہو یا حضر، دیس ہو یا پردیس وہ ہر دم اور ہر آن اپنی محبوب زبان کے دمساز رہے جس خصوصیت نے ان کو اردو کا سب سے بڑا محسن بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ صاحب محض ایک بڑے ادیب ہی نہ تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ایک بہت بڑے ادیب ساز اور ایک بہت بڑے شاعر گر بھی تھے اس سے زیادہ ادب کا کوئی نقاد کیا شرف حاصل کرے گا کہ جس زمانے میں حکیم الامت علامہ اقبال، خود اپنی شاعری کی اہمیت سے ناواقف تھے بلکہ شعر گوئی ترک کر دینا چاہتے تھے، اور عبدالقادر علیہ الرحمتہ کے نام اس قسم کے شعر لکھ بھیجتے تھے کہ:

> دیر مخزن کو جا کے اقبال کوئی میرا پیام دیدے۔!
>
> جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اور انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ فی الواقع شعر گوئی ترک کر دینے کے ارادے کا اظہار بھی کیا تو اس زمانے میں بھی اپنی قوم اور اپنی زبان کا یہ سچا شیدائی یعنی نوجوان گر دور اندیش نقاد عبدالقادر، اپنے فاضل اجل فلسفی دوست کے اس پیغام سے مرعوب نہ ہوا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے بتایا کہ خدا نے تمہیں وہ جوہر بخشا ہے کہ اگر تم اس سے کام لوگے تو بہت بڑا کام کرو گے محض اسی وجہ سے جب تک پاکستان باقی ہے یا دنیا کے کسی حصے میں اردو کے شیدائی موجود ہیں حضرت شیخ عبدالقادر کا نام ہماری قومی زبان کی تاریخ میں درخشندہ و تابندہ رہے گا اور یقیناً ان کے نقشِ قدم جادہ پیمایانِ منزلِ ادب کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں گے۔

۱۹۴۸ء کے اواخر میں جب حمید نظامی مرحوم نے شیخ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ادارہ "نوائے وقت" کی طرف سے درخواست کی کہ "مخزن" کے از سرِ نو اجراء کی اجازت مرحمت فرمائی جائے اور شیخ صاحب رسالے کے سرورق پر اپنا نام نامی لکھنے کی اجازت بھی دیں تو میں بھی طلاورسوم کے "مخزن"

اڈیٹر کی حیثیت سے نظامی صاحب کے ساتھ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ شیخ صاحب قبلہ نے ہمیں نہایت مسرت سے اجرائے "مخزن" کی اجازت دے دی اور پھر ازراہِ ذرہ نوازی فرمایا کہ اگر یہ ہو سکے تو میرا نام بطور ڈائرکٹر کے نہیں۔ بطور مدیر اعزازی لکھیے"

بعد کی ملاقاتوں میں شیخ صاحب نے رسالے کے متعلق مجھے متعدد گراں بہا مشورے دیئے اور "مخزن" کے لئے افتتاحی مضمون بھی عنایت فرمایا جس کا عنوان تھا "مخزن کے لئے دو حرف" ہے۔

پہلا پرچہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا جن اصحاب کو میں نے شیخ صاحب کی طرف سے تعاون کی دعوت دی تھی انہوں نے بصد مسرت اسے قبول کیا۔ مثال کے طور پر میر غلام بھیک نیرنگ کا وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو مجھے اپنے خط کے جواب میں ملا۔ میر صاحب ایک مدت سے لکھنا ترک کر چکے تھے اور شب و روز تبلیغی مشاغل میں معروف رہتے تھے شیخ صاحب کی روحانی کشش انہیں پھر میدان میں کھینچ لائی اور ان کی طرف سے یہ دلکش نظم اور نثر موصول ہوئی میرے خیال میں ان کا یہ خط اردو کے بہترین مکتوبات میں شامل ہونے کے قابل ہے مجھے مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔

آپ کا مکتوب مورخہ ۲۰ اکتوبر یکم نومبر کو ملا۔ مضمون کے لحاظ سے اس یاد آوری کا خاص شکریہ۔ نیرنگ کا انکار رفتہ دماغ اور غبارستان جھنگ سے ایسا ماحول کہ یہاں کے سہ ماہی قیام میں آج تک کوئی عام یا نجی صحبتِ شعر و ادب نہ دیکھی نہ سنی۔ کیسے ممکن تھا کہ حضرت شیخ کے ارشاد کی تعمیل کی جاتی وہ تو جناب شیخ کی جاذبیت اور "مخزن" کے نام کا جادو تھا کہ خط کو پڑھتے ہوئے اشعار آنا شروع ہوئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی آہستہ آہستہ تقاطر ہوا۔ مگر اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ ورنہ عرصۂ دراز سے کہہ چکا ہوں ؎

اب تو یوں ہم سے کوئی اہلِ سخن ملتا ہے
جیسے غربت میں کوئی یارِ وطن ملتا ہے

بہرحال یہ "خیر مقدم" حضرت شیخ اور "مخزن" کی نذر ہے

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

یہاں نوا کے وہ معنی سمجھئے جو "نوائے وقت" میں ہیں۔

میں نے غبارستانِ جھنگ کا ذکر کیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خطہ زمانے سے خالی نہیں رہا۔ ہیر کا مزار اسی جھنگ میں ہے حضرت سلطان باہو جیسے عارف کا مزار جھنگ سے پچاس میل پر اسی ضلع میں واقع ہے۔ مگر اس وقت تو یہاں کے لوگ ہر قسم کے ذوق سے خالی نظر آتے ہیں اونٹ اور بکریاں کثرت سے دیکھ کر یہ بستی نظر پڑی نہ بستی —

بھینس بہتیری مگر جایک بھیس دا ڈکھا نہیں گیا

میں راولپنڈی میں نو ماہ تک رہا۔ وہاں شعر و ادب کے خوب ہنگامے دیکھے۔ انجمن ترقی اردو نے ابتدا ہی میں میری عزت افزائی کے طور پر ایک مشاعرہ کیا۔ اس میں حکام سول و فوج کے علاوہ شعرا کی ایک بڑی تعداد تھی انہوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ مجبوراً مجھ کو کچھ پڑھنا پڑا۔ اس کے علاوہ یوم اقبال کی مجلسیں رہیں۔ مشاعرے ہوئے۔ ایسا ماحول ہو تو گونگا بھی بولنے لگتا ہے۔ خدا کرے "مخزن" اب بھی پہلی سی آب و تاب سے نکلا کرے۔ مخزن آثار باقی تو تعجب نہیں نیرنگ بھی کبھی کبھی اس کے صفحات میں کچھ لکھا کرے۔

میرا تمام کتب خانہ اور تمام مسودات انبالے میں رہ گئے۔ دماغ کو کرید کرید کر میں اس نظم کے دو ڈھائی شعر سے زیادہ نہ نکال سکا جس کی نسبت حضرت

شیخ کا ارشد رفقا اُن کی خدمت میں میرا سلام شوق عرض کر دیجئے اور معذرت بھی۔ والسلام۔

راقم نیرنگ۔

ہم نشیں یہ کون کہتا تھا کہ مخزن چل بسا، / باثمرہ تھی ملتوی تھا کچھ دنوں نخلِ سخن
لیجئے حامد علی خاں لکھتے ہیں لاہور سے / منعقد ہونے کو ہے اب پھر وہی بزمِ کہن
پھر وہی سرخیلِ اہلِ ذوق و اربابِ ادب / شیخ عبدالقادر اس کے ہوں گے صدرِ انجمن
کھنچ گئے جن کی کشش سے بزمِ مخزن کی طرف / چار دانگ ہند سے جوق جوق اربابِ سخن
خان بہادر بھی ہوئے نائٹ بھی ہوئے سر بھی ہوئے / عمر بھر لیکن رہی اردو کی خدمت کی لگن
اک رسالہ ہی نہیں "مخزن" یہ اک تحریک ہے / آج ہیں جس کے نتائج ہر طرف جلوہ فگن
سیکڑوں علمی رسالے جس سے پیدا ہو گئے / سیکڑوں اہلِ قلم اور سیکڑوں نقادِ فن

اب زمانہ ہے کہ اس تحریک کی قوت بڑھے،
یعنی عالمگیر ہو اردو کے سکے کا چلن

ہر جگہ اب تو اردو کو ابھارا جائے گا / بلدۂ دہلی ہو یا ہو لکھنؤ یا ہو دکن
ہر طرف سے کر کے ہجرت آئے گی لاہور میں / مغربی پنجاب ہی اب ہوگا اردو کا وطن
وقت پر آئے جناب شیخ پھر میدان میں / ہو مبارک آپ کو اے نکتہ سنجانِ زمن

گلشن مخزن بنے گا پھر جہانِ رنگ و بو
عندلیبانِ سخن پھر ہوں گے اس میں نغمہ زن

افسوس ہے کہ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو شیخ صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اُن کی رحلت کے چند مہینے بعد کچھ ایسے ناسازگار حالات پیدا ہوئے کہ "مخزن" کی اشاعت تیسری مرتبہ پھر ملتوی کر دینی پڑی۔ "ملتوی" کا لفظ میں نے عمداً استعمال کیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ مخزن پھر جاری ہوگا، "مخزن" ہمیشہ بند نہیں رہ سکتا۔

بانیِ "مخزن" کی رحلت پر ان کی یاد میں "مخزن" کا جو پرچہ شائع ہوا، اس میں برِ عظیم کے طول و عرض سے نثر و نظم کے جو پیغامات ملے تھے، شائع ہوئے۔ دوسرے رسائل و جرائد سے اقتباسات بھی درج کئے گئے تھے۔ کچھ منتخبات کا ذکر شاید یہاں مناسب ہو۔

حفیظ ہوشیارپوری

اُسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں / وہ تھا قلب و دماغ شہر لاہور

تلوک چند محروم از دہلی

افسوس کہ اردو کا نگہباں نہ رہا / شاعر گر و نقادِ سخنداں نہ رہا

بے صدمہ ہوا انجمن علم و ادب | یعنی ادب آموز ادیباں نہ رہا

(ولہ)

یکساں دل اہلِ وطن کا وہ پیارا شیخ | تہذیبِ کہن کا پیکرِ زیبا شیخ
تھا کوئی اگر تو تھا وہ عبدالقادر | شاعر مدح جس کے ہوں ایسا شیخ

امین حزیں سیالکوٹی

اقبال کی یادگار تھے شیخ | اقبال کے یارِ غار تھے شیخ
"اک بلبلِ خلد" جس پہ چہکا | لاریب وہ شاخسار تھے شیخ
ملت کا چمن تھا رشکِ فردوس | اقبال تھے گل، ہزار تھے شیخ
پیرانہ سری میں بھی وہی عشق | اردو پہ دل نثار تھے شیخ

اس موقع پر علی گڑھ سے آل احمد سرور نے راقم کے نام ایک خط میں لکھا تھا "اس وقت آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو بیساختہ میری ایک رباعی یاد آ رہی ہے مرحوم پر یہ رباعی صادق آتی ہے۔

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آویں اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

سرور صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "مخزن" کو شیخ صاحب کی سب سے بڑی یادگار سمجھ کر چلایئے۔" ان کی یہ آرزو آج بھی ہم سب کی آرزو ہے کاش "مخزن" جلد ہی پھر جاری ہو جائے اور اپنے ہر پہلے دور کی طرح اب بھی نئے اور پرانے ادب کا سنگم ثابت ہو۔

(ربہ شکریہ کوہستان لاہور)

پروفیسر شبیر کاظمی

اساسِ اردو

(لکھنؤ روزمرّہ)

(۲)

چندن چوکی پر بیٹھنا ۔ آرام سے بسر کرنا ۔ اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے ۔
چنگ پر چڑھانا ۔ صلاح دینا ۔ آمادہ کرنا ۔ لوگوں نے چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجئے تو آج کی بلا ٹل جائے ۔
چوٹیں خالی دینا ۔ وار بچانا ۔ حملہ کو روکنا ۔ شکیل نے سب چوٹیں خالی دیں اور سر پڑھ کر تلوار کا وار کیا ۔
چوٹ چلنا ۔ مقابلہ کرنا ۔ صبا رفتار شمشیر کھینچ کر آ پڑی ۔ برق سے چوٹ چلنے لگی ۔
چونگا کرنا ۔ فریب اور شرارت کرنا ۔ ابھی لڑکپن بہت ہے ۔ بچپنا نہیں جاتا ۔ ان کو چونگا کرنے اور روپیہ اینٹھنے کی ترکیبیں نہیں یاد ہیں ۔
چومکھ لڑنا ۔ ہر طرف سب کو جواب دینا ۔ حضرت آپ اس وقت چومکھ لڑ رہے تھے ۔ یہ آپ ہی کا کام ہے ۔
چونے پر پانی چھڑک دینا ۔ بہت غصہ میں آجانا ۔ یہاں آزاد دیکھتے ہی دیکھتے بگڑ گئے اور ایسے گرمائے ۔ جیسے چونے پر پانی چھڑک دیا ۔
چھ گدم ہونا ۔ چھ دوستوں کا ایک جا جمع ہونا ۔ ایک شاعر اور آ جانے تو چھ گدم کی خوب ٹھہرے ۔
چھان بنان ہونا ۔ اچھی طرح دریافت کرنا ۔ جب تک ایک بات کی خوب چھان بنان نہ ہو تب تک لطف نہیں ۔
چھیچھڑے پر چھری چلنا ۔ معمولی بات پر لڑائی ہونا ۔ آج چک منڈی میں بزقصابوں میں چھیچھڑے پر چھری چلی ۔
چھپر پر رکھنا ۔ بند کر دینا ۔ ہٹا دینا ۔ ان سے کہہ دو نا کہ اس شعر خوانی کو چھپر پر رکھیں ۔
چھاپ بیٹھنا ۔ دبا لینا ۔ چھا جانا ۔ گھوڑا تو ان کے تن و توش سے چھپ جاتا تھا جیسے اچھا خاصا بنڈیلا سور گھوڑے کو چھاپ بیٹھے ۔
چھوٹی امت کا ہونا ۔ معمولی طبقے سے تعلق رکھنا ۔ ان کی چال ڈھال سے میں تاڑ گئی کہ چھوٹی امت کی ہیں ۔
چھک کر کھانا ۔ خوب سیر ہو کر کھانا ۔ ردھے اور میوہ نرجس تند ۔ جی چاہا خوب چھک کر کھائے ۔
چھکے چھوٹ جانا ۔ عاجز ہونا ۔ آزاد نے پیچ پر وہ داؤں پیچ کئے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے ۔
چھٹی کا دودھ یاد آنا ۔ بہت عاجز ہونا ۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آیا

چھٹو یار بتانا۔ دوست بتانا۔ مصاحبین سب کے سب مل کر میاں آزاد کو چھیتے یار بتاتے تھے۔
چیں بول جانا۔ ہار مان لینا۔ بٹیر مرغ پر لپک کر لات مارے تو وہ بھی چیں بول جاتے۔

ح

حواس پیترہ ہونا۔ گھبرا جانا۔ تو جی نے اس کو ایسا للکارا اور وہ ڈانٹ بتائی کہ اس کے حواس پیترہ ہو گئے۔
حواس تفرد ہونا۔ خوف زدہ ہونا۔ قبلہ تلوار کی چمک کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے ایسا سہما کہ ہوش حواس تفرد ہو گئے۔
خالہ جی کا گھر نہ ہونا۔ بہت مشکل میں پھنسنا۔ عاشقی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔
خار کھانا۔ ناخوش ہونا۔ میں بیگم سے خار کھاتا ہوں۔
خالی از علت نہ ہونا۔ کسی نہ کسی مصلحت کا ہونا۔ بھبی بیگ کیلئے جانا خالی از علت نہیں ہے کچھ دال میں کالا کالا ہے۔
خام پارہ ہونا۔ نااہل ہونا۔ ہم سے یارانہ پیدا کرنا چاہتی تھی خام پارہ۔
خدائی خوار ہونا: ذلیل، ننگا ہونا۔ اماں جان کی بات نہ ٹلے گی اور موا آزاد خدائی خوار ہے۔
خط گھٹوانا۔ حجامت بنوانا۔ پیر بخش کو خط گھٹوانے کا شوق جو چرایا تو حجام کو بلوایا۔
خفت مٹانا۔ شرمندگی دور کرنا۔ اب جو شہزادی سے بس نہ چلا تو اپنی خفت ہم پر مٹائی۔
خلوئے عہدہ۔ ملازمت کے لئے جگہ کا خالی ہونا۔ اور اچھا اہلکار نہ ملا تو حکام خلوئے عہدہ کا حال مشتہر کرتے ہیں۔
خنجر روز کند ہونا۔ دن کا ختم ہونا۔ اس عرصہ میں وہ دن بھی تمام ہوا اور وہ زمانہ آیا کہ شبِ تیرہ نام نے منہ دکھایا خنجر روز کند ہوا۔
خون جسم کا ہلکا ہونا۔ نازک بدن نازک خیال ہونا۔ ابھی نام خدا کنوارا ہنڈا ہے خون جسم کا بہت ہلکا ہے۔
خیز کرنا۔ تیز کرنا۔ اتنے دق ہوئے کہ سوئی کو انہوں نے خیز کیا۔
خیمے نصب کرنا۔ ٹھہر جانا۔ قیام کرنا۔ اب یہاں سے چلو تب کوئی بات ہو۔ تم نے تو یہاں خیمے نصب کر دیئے۔

د ڈ

دال میں کالا نظر آنا: مشکوک نظر آنا۔ شبہ معلوم ہونا۔ کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔
دامن امید گوہر آمد سے مالا مال ہونا۔ مطلب حاصل ہونا۔ اس حقیر سراپا تقصیر کا دامن امید گوہر آمد سے مالا مال ہو جائے گا۔
دھتا بتانا ...... راستہ سے ہٹا دینا۔ رئیس نے مارے غصہ کے آزاد کو دھتا بتایا۔

دھول دھپا مچانا ۔۔۔۔ ہنسی مذاق کرنا۔ تیسرے ٹول بیابانی میں دھول دھپا ہوتا تھا۔
دبے پیر بلی کا چوہے سے کان کٹانا۔ طاقتور کا کمزور سے مجبور ہو جانا۔ آزاد نے چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔ سچ
ہے دبے پیر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔
دبول دبول کر کے عیب چھپانا۔ خاموشی اختیار کر لینا۔ چپ سادھ لینا۔ لوگ کہیں گے کہ نرگسی چشم کہیں کسی کے ساتھ
پکڑی گئی۔ ماں نے دبول دبول کر کے عیب چھپایا۔
دبدبے سے ڈرنا۔ خوف کھانا۔ مہ جبیں نے کہا۔ سبحان اللہ کیا کہنے ڈریئے آپ کے دبدبے سے کہ ایسی چاہنے والی
پر کچھ رحم نہ کیا۔
دبوں دبوں کرنا۔ عیب کو چھپا دینا۔ ماں نے دبوں دبوں کر کے عیب کو چھپایا۔ مگر بیٹی کو نکلنے نہیں دیتی ہے۔
دست ہوس دراز کرنا۔ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ ملکہ نے ہنس دیا۔ شاہ نے پھر دست ہوس دراز کیا۔
دست برد کرنا۔ قبضہ میں کرنا۔ تاجر مال اٹھوا کر چلا۔ یہ بھی ساتھ ہوا کہ راہ میں اور کچھ دست برد کر دوں۔
دل میں ہول سمانا۔ خوف زدہ ہونا۔ خالہ جان کیا کہوں۔ دل میں ہول سمایا ہے۔
دل لگی باز ہونا۔ پر مذاق ہونا۔ وہ دل لگی باز آدمی ہیں۔ بس ہمارے تمہارے سوا اور کوئی نہ جاننے پائے۔
دم ٹوٹ جانا۔ تھک جانا۔ بے حال ہو جانا۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو لگے ہاتھ سے چھوٹ پڑے۔
دم میں نہ آنا۔ دھوکہ نہ کھانا۔ افراسیاب نے یہ تقریر سن کر کہا کہ اس کے فقرے پر اور دم میں نہ آنا۔
دن پھرنا۔ آرام میسر ہونا۔ سو ہمارے تو آج دن پھرے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔
دو دو چونچیں ہونا۔ تو تو میں میں ہونا۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر شاہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔
دو گال ہنسنا بولنا۔ دل بہلانا۔ رنگین کمروں پر دو گال ہنس بول آئیے۔
دھن بدھن اور مشت بمشت کشتی ہونا۔ دست بہ دست لڑائی ہونا۔ جنگ آغاز ہوئی۔ دھن بدھن اور مشت بمشت کشتی بعد
درشتی رہی۔
دھان پائیں پنیری لگانا۔ سب کو ایک طرح سمجھنا۔ اور ایک سرے سے سب بائیں۔ سب دھان پائیں پنیری لگا دیے۔
دھرے اڑانا۔ بھر کس نکالنا۔ سخت سزا دینا۔ اپنے شہزادے کے ساتھ دھرے نہ اڑا۔
ڈھٹی دینا۔ ٹھہرنا۔ قیام کرنا۔ سب باتیں بھی ہوں گی ڈھٹی بھی دیں گے۔
ڈینگ کی لینا۔ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا۔ ان کے لنگوٹیے یار بیٹے ڈینگ کی لے رہے ہیں۔
راستہ ناپنا۔ چلنا۔ ادھر ادھر چکر لگائے راستہ ناپا اور تھک کر سو رہے۔
رام رام کی گوٹیاں لکھنا۔ تعویذ لکھنا۔ جو دنیا ترک کر کے پہاڑوں کی کھوہ میں بیٹھے ہیں۔ یا جو رام رام کی گوٹیاں دن بھر

لکھا کرتے ہیں۔

رتی زور پر ہونا۔ کامیابی حاصل ہونا۔ ان موئے نمک حراموں کی تو آج کل رتی زور پر ہے۔

ردائے شاہد دہر میلی ہونا۔ شام ہونے کو آئی۔ آخر جب ردائے شاہد دہر میلی ہوئی اور گیروا لباس درویش روزگار نے اتارا۔ خیمہ عالم میں قدم شب مشک فام نے رکھا۔

رقمیں کھانا۔ روپیہ پیسہ حاصل کرنا۔ وہ جنبش دیوانی نواب کے یہاں رقمیں کھا کھا کر تہی بنی پھرتی تھی۔

رقمیں چیرنا۔ خوب روپیہ کمانا۔ ضرور ہے کہ سرکاری رقمیں چیرتے اور دندناتے تھے۔

رکھائی کے ساتھ بولنا۔ بے مروتی کرنا۔ میں ہو گئی تو بڑی بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں۔

رنج کا خار دل میں چبھنا۔ رنجیدہ ہونا۔ میں سبز گلزار سے اس وقت عار رکھتا ہوں کہ رنج کا خار دل میں چبھا ہے۔

رنگ بے رنگ نظر آنا۔ حالات کا مناسب نہ ہونا۔ عمرو یہ سنتے ہی کانپنے لگا کہ ابھی اس کا آنا خالی از علت نہیں۔ رنگ بے رنگ نظر آتا ہے۔

رولا لانا۔ نعرہ کرنا۔ ینا۔ جہاز پر فوجی کو سردیا بی کی خبر نہیں ورنہ وہ رولا لاتے کہ الامان۔

روتے روتے خون کبوتر کی طرح سرخ ہونا۔ بہت زیادہ آنکھوں کا سرخ ہونا۔ باجی کی آنکھیں روتے روتے خون کبوتر کی طرح سرخ ہو گئیں۔

رو بفرار لانا۔ بھاگ جانا۔ اور تیغ بکف فوج دشمن میں در آیا۔ فوج رو بفرار لائی اور بھاگ کر قلعہ کے اندر گئی۔

ریت ڈالنا۔ ذبح کرنا۔ تکلیف پہنچانا۔ مگر میری گردن تو کند چھری سے ریت ڈالی۔

ز

زر دینا، ضامن نہ ہونا۔ روپیہ دے دینا۔ مگر ضمانت نہ کرنا۔ ہر کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی۔ زر دیجئے۔ ضامن نہ ہوجیئے۔

زلف چلیپا کی بلائیں لینا۔ زلفوں پر نثار ہونا۔ شیطان در غلاتا تھا کہ جھک کر زلف چلیپا کی بلائیں لیں۔

زمین کے گز بننا۔ زیادہ گھومنا پھرنا۔ میاں آزاد زمین کے گز بنے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

زنگئ شب کا عالم میں قدم رکھنا۔ شام ہونا۔ عمرو بن امیہ ضمری نے جب وہ زمانہ آیا کہ زنگئ شب نے اس عالم میں قدم رکھا اور روز کا سایہ مغرب میں جا کر آرام پذیر ہوا۔

زور کے آگے ظلم نہ چلنا۔ طاقتور کے سامنے کمزور کا کامیاب نہ ہونا۔ مثل مشہور ہے کہ زور کے آگے ظلم نہیں چلتا۔ مگر عیاروں نے آفت برپا کر دی۔

زہرہ خوف سے آب ہونا۔ بہت ڈر جانا۔ جس کی ہیبت سے برج اسد میں جا کر چھپا اور خنجر گزار سپر کا زہرہ خوف سے آب ہوتا۔
زہرہ آب ہونا۔ گھبرا جانا۔ پریشان ہو جانا۔ بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے ورنہ سلام۔ پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہو گیا۔
زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑنا۔ گہرے تعلقات میں شکر رنجی پیدا ہونا۔ چلیے اب تعریفیں رہنے دیجئے۔ زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑتے ہیں۔
زبان وا کرنا۔ کہنا ارشاد فرمانا۔ اکبر نے بعد خاطر داری زبان گہر ریز کو وا کیا۔

س

سا کھے کی لڑائی ہونا۔ سخت مقابلہ ہونا۔ اول تو عذر کریں گے اور اگر نہ مانا تو دیکھے گا وہ سا کھے کی لڑائی ہوگی اور ایسی تلوار چلے گی کہ حریف کے دانت کھٹے کر دیں گے۔
سات پانچ نہ آنا۔ نظرت اور ہوشیاری۔ بی بی مجھ کمبخت کو تو سات پانچ نہیں آتا۔
ساغر اجل سے سیراب ہونا۔ زندگی کا خاتمہ ہونا۔ مارا جانا۔ اے مجرم جو کھانا ہو وہ کھالے اور پیاسی ہو تو پانی پی لے کہ ساغر اجل سے سیراب ہوا چاہتی ہے۔
سات بار سلام کرنا۔ مان لینا۔ تسلیم کر لینا۔ جب ایسی ہی ساس پاؤگی اور پھر جل جل کے رہوگی تو سات سلام کروں گی۔
سبھ گھڑی یاد کرنا۔ اچھی گھڑی یاد کرنا۔ وہ سبھ گھڑی یاد کرو جب ہم دولہا بنے تھے۔
سبز بخت ہونا۔ خوش نصیب ہونا۔ آج تو ہیں سرخرو رہا۔ آپ سبز بخت ہیں۔
ستر ہوں کرم ہونا۔ بری حالت ہونا۔ جب تک کوئی رو کے رو کے ستر ہوں کرم ہو جائیں۔
ستو باندھ کر پیچھے پڑنا۔ ہمہ تن مصروف ہونا۔ وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے۔
سٹی پٹی بھول جانا۔ گھبرا جانا۔ کپتان کے ہاتھ پھول گئے اور اس کے لفٹیننٹ بھی سب سٹی پٹی بھول گئے۔
سرہنگی کی لینا۔ اونچی اونچی باتیں کرنا۔ اور کبھی سرہنگی کی لیتی ہو کہ معلوم ہو بڑی کراری ہو۔ بڑی پہلوان ہو۔
سر بدر کرنا۔ برآمد ہونا۔ یہ سیاحان منازل سپہر دشت ظلم بھی در بے سے باہر ہوئے اور وہ خاور سے خورشید انور نے سر بدر کیا۔
سر بفخر آسمان تفاخر پہنچنا۔ عزت پانا۔ آج کی شب یہیں استراحت کریں۔ سر بفخر ہمارا آسمان تفاخر پہ پہنچائیں۔
سر کو قدم بنا کر حاضر ہونا۔ محبت کے ساتھ آنا۔ بعجلت تمام آنا۔ میں بھی بہت اشتیاق ملاقات رکھتا تھا اسی لئے بادشاہ کے لکھتے سے فوراً سر کو قدم بنا کر حاضر ہوا۔

سر رشتہ عقل ہاتھ سے کھونا ۔ ناسمجھی کرنا ۔ اس نے دیکھ کر سر رشتہ عقل ہاتھ سے کھویا ۔ اور خود رعب میں آکر ملکہ کو مجرا کیا ۔

سنیچر پاؤں پر سوار ہونا ۔ ہر طرف گھومنا ۔ تڑکے خواب خرگوش سے بیدار ہوئے تو پھر سنیچر پاؤں پر سوار ہو گیا ۔

سون کھینچنا ۔ چپکے پڑے رہنا ۔ بیگم سنتی ہو کر نہیں ۔ جگی نہیں ۔ مگر سون کھینچے پڑی ہیں ۔

سودا لیو ہونا ۔ بیقرار ہونا ۔ گھبرانا ۔ جب سے اسے دیکھا ہے اس کی زلف گرہ گیر میں دل الجھا ہوا ہے سودا لیو ہو گیا ہے ۔

سینہ سپر ہو کر لڑنا ۔ بڑی جانبازی سے لڑنا ۔ ساحران نامی ملازم افراسیاب سینہ سپر کر کے لڑنے لگے ۔

ش

شام فنا دکھانا ۔ مار ڈالنا ۔ صبح سب کو شام فنا دکھایئے گا ۔

شپّہ لڑانا ۔ رسائی حاصل کرنا ۔ اس طباخی بچے کی خوش قسمتی کو دیکھو کہاں جا کے شپّہ لڑایا ۔

شکل میں رونا لگنا ۔ رونی صورت ہونا ۔ صاحب کیا تیری شکل میں رونا لگا ہے ۔ میں روتے آدمی سے گھبراتی ہوں ۔

شہ دینا ۔ تعریف کرنا ۔ خوشامد خورے شہ دے رہے ہیں کہ حضور کا آج تمام لکھنؤ میں نام ہو رہا ہے ۔

شیشے میں اتارنا ۔ قابو میں کرلینا ۔ یار ایسی پری تو کروڑوں روپے بھی تر چینے سے شیشے میں نہیں اتر سکتی ۔

ص

صفحہ دل سے حک ہونا ۔ بھول جانا ۔ کوکب کا خیال کیسا نام تک صفحہ دل سے حک ہو گیا ۔

ط

طائر ہوش پرواز کرنا ۔ گھبرانا ۔ پریشان ہونا ۔ یہ کلمات جو شریر نے سنے طائر ہوش پرواز کر گئے ۔

طرح دینا ۔ درگزر کرنا ۔ اب تک میں نے طرح دی کہ باغی راہ پر آجائیں ۔

طوق محبت در گلو ہونا ۔ محبت ہو جانا ۔ مالن کے سرو قامت کو دیکھ کر قمری کی طرح طوق محبت در گلو ہوا ۔

ع ۔ غ

عاشق تن ہونا ۔ جاں نثار کرنا ۔ حضرت آپ تو عاشق تن آدمی ٹھہرے ۔

عقل کی دوا کرنا ۔ سمجھ داری سے کام لینا ۔ ارے عقل کی دوا کر مردوے ۔

غائب غلہ رہنا ۔ غیر حاضر رہنا ۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ دو دن غائب غلّہ رہنا چہ معنی دارد ۔

غچا دینا۔ دھوکہ دینا۔ وہ غچا دیا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتا ہوگا۔
غٹ کے غٹ کو ساتھ لینا۔ زیادہ آدمیوں کو ساتھ لے چلنا۔ حضور اگر میرا کہنا مانیں تو اس غٹ کے غٹ کو ساتھ نہ لے چلیں۔
غلغلہ اقلو بلند ہونا۔ قتل قتل کا شور بلند ہونا۔ طبل جنگ اور نفیر سحر لشکر روتاس میں بجا۔ شور و غلغلہ اقلو بلند ہوا۔
غلغلک مارنا۔ بانک کا ایک داؤ استعمال کرنا۔ الحاصل لڑنا شروع کیا کہ جب غلغلک ماری۔ چھ چھ آدمیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔
غین ہونا۔ مدہوش ہونا۔ وہاں سے جاکر اتنی شراب پلادی کہ فوجی غین ہو گئے۔
غیرت کا پانی پانی ہوکر بہہ جانا۔ بے حیائی اختیار کرنا۔ عمرو نے کہا عشق میں غیرت پانی پانی ہوکر بہہ جاتی ہے۔

ف

فرشتہ خاں کو خبر نہ ہونا۔ کسی کو نہ معلوم ہونا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ چپ چپاتے کل کارروائی کی جائے۔ لوگوں کے فرشتہ خاں کو بھی خبر نہ ہو۔
نفرو ہو جانا: بھاگ جانا۔ پاتروں نے ان کا بیگ لیا اور جوتی اور پیسے لئے اور نفرو ہوئیں۔
نفرہ کرنا: دھوکہ دینا۔ جھوٹ بولنا۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہ کبھی نہ دے گا۔ نفرہ کرتا ہے۔
نفرے دینا۔ دھوکہ دینا۔ عمرو نے کہا تو بھاگ نہ سکے کی تو نفرے نہ دے گی۔ کہے گی کہ میں مر مر ہوں۔

ق

قافیہ تنگ کرنا۔ لاجواب کر دینا۔ اچھا حضور کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھئے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔
قفل دہن زبان سے واکرنا۔ بات چیت کرنا۔ بادشاہ نے قفل دہن زبان سے واکیا۔
قلب پھر جانا۔ پریشان رہنا۔ کبیرہ خاطر ہونا۔ مگر عارض کو بی کا اس حال کے گزرنے سے قلب پھر گیا۔
قدم ڈگ جانا۔ بھاگنا۔ پیٹھ دکھانا۔ تو جوانو لڑ بھڑ کر سرخ رو ہو۔ جس کا قدم ڈگ جائے گا وہ پھر کہیں آبرو نہ پائیگا۔
قدم زن ہونا۔ روانہ ہونا۔ ناچار پھر ایک طرف قدم زن ہوا۔

ک

کانٹے کا من منتر نہ ہونا۔ زیادہ خطرناک ہونا۔ تمہارے تو کانٹے کا من منتر نہیں ہے۔ نواب کے ساتھ اچھا سلوک کیا
کانا اور بے دوڑنا۔ عجلت کرنا۔ جلد بازی۔ صاحب برسوں ریاض کیا ہے تب جاکے یہ بات حاصل ہوئی ہے۔ دل لگی نہیں کہ کانا اور بے دوڑا۔

کانٹے بونا۔ مشکلات پیدا کرنا۔ یہ کس موئے نٹ کھٹ نے کانٹے بوئے ہیں۔
کافر نگاہ ہونا۔ گھورنے والی نگاہ۔ اندازہ لگانے والی نگاہ۔ مردوں کی نگاہ بڑی کافر نگاہ ہوتی ہے۔
کائی لگنا۔ بہت عرصہ لگ جانا۔ پرانا ہونا۔ دیر تک رکنا۔ جب تک کائی نہ لگ لے گی اٹھنے کا نام نہیں گے۔
کالا پانی پینا۔ شراب پینا۔ امی جان کیا ہم مسلمان لوگ بھی کالا پانی پیتے ہیں۔
کتوں سے آٹا سنوانا۔ کام کا سرانجام نہ ہونا۔ آپ تو کتوں سے آٹا سنواتے ہیں۔
کر ہونا۔ بہرہ ہونا جس کی صدائے گوشِ فلک کر ہوا اور شہزادہ ملک قاسم مرکب چمکاتا ہوا ظاہر ہوا۔
کٹورہ کھنکنا۔ ہر طرف جشن منایا جانا۔ عمرو نے اندر شہر کے آکر دیکھا کٹورہ کھنک رہا ہے۔ گرم بازاری ہر طرف ہے۔
کٹ مرنا۔ بیقرار ہونا۔ تڑپنا۔ (پریشان ہونا۔ شرمندہ ہونا)۔ بدن میں سکت نہیں تو پھر کیوں مرتے ہو۔
کچا کھا جانا۔ ختم کر دینا۔ لیکن خبردار کسی سے کہنا نہیں۔ ورنہ یہ لاشیں کچا ہی کھا جائیں گی۔
کچومر نکلنا۔ بہت زیادہ پٹنا۔ الغرض بعد خرابی بصرہ میاں خوجی کی جان بچائی۔ مگر کب۔ جب کچومر نکل گیا۔
کٹ پڑنا۔ شرمندہ ہونا۔ نادم ہونا۔ ملکہ یہ کلام سن کر کٹ پڑی۔
کچا چٹھا کہہ سنانا۔ صاف صاف حال بتا دینا۔ روپیہ کی طمع میں کچا چٹھا کہہ سنایا۔
کچے گھڑے کی چڑھنا۔ نشہ سے مدہوش ہو جانا۔ مگر ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی۔
کرکری ہونا۔ ذلت اٹھانا۔ رسوا ہونا۔ آپ کے پاس بیٹھے لی بنی۔ میری بڑی کرکری ہوئی۔
کڑے خان سے پالا پڑنا۔ طاقتور سے سامنا ہونا۔ خلیفہ بے چارے پر ساری چوٹیں صرف کر دیں۔ کبھی کسی کڑے خاں سے بھی پالا پڑا ہے۔
کلیجے پر سانپ لوٹنا۔ ناگوار معلوم ہونا۔ بالیدگی ہوتی ہے کہ سانپ کلیجہ پر لوٹ رہے ہیں۔
کلیجہ دراز ہونا۔ لڑاکا۔ زبان دراز ہونا۔ بڑی کلہ دراز عورت ہے۔
کلیجہ بیپ کر دینا۔ رنج پہنچانا۔ یہ خوشی کا کون موقع ہے۔ بہن تم نے تو کلیجہ بیپ کر دیا۔
کمیت قلم کو میدانِ قرطاس میں جولاں کرنا۔ قلم سے کاغذ پر لکھنا۔ نوجوانان تہور شعاران جلالت آثار۔ کمیت قلم کو میدان قرطاس میں یوں جولاں کرتے ہیں۔
کمان کے تیر کی طرح چل کھڑا ہونا۔ بہت تیزی سے روانہ ہونا۔ میاں آزاد کڑی کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے۔
کمروں کو تاکتے رہنا۔ طوائفوں کے کوٹھوں کو دیکھنا۔ فرنگی محل کی طرف سے بھی نکلے تو کمروں کو ہی تاکتے رہے۔
کندے تول کے رہ جانا۔ لڑائی کے لئے آمادہ ہونا۔ وہاں کوئی جنگ ہوئی یا ابھی روسی کندے ہی تول کر رہ جاتے ہیں۔
کور دبنا۔ کمزور پڑنا۔ خوف زدہ ہونا۔ اچھا اچھے بانکوں کی کور دبنے لگی۔

کوڑیوں کے مول خریدنا۔ معمولی داموں میں لینا۔ میاں روشن علی نے سوا چار سو کی جوڑی خریدی اور اسی وقت صاحب کو لے جا کر دکھائی اور کہا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔
کوڑی کنا بیچتے پھرنا۔ بہت معمولی اور کم قیمت کی دوکانداری کرنا۔ میاں کل تک کوڑی کنا بیچتے پھرتے تھے۔ آج باتیں بنا تے ہو۔
کوڑیوں کا ملوہ بچنا۔ کوڑیوں کا محفوظ رہنا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں ملوہ بچ نکلیں۔
کھاٹ کٹنا۔ غرض مند ہونا۔ لو صاحب بھلا ایسی میری کیا کھاٹ کٹتی تھی جو اس سے اشارہ کرتی۔
کھٹیا سمیت دفان ہونا۔ مع چارپائی کے غائب ہونا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا سمیت دفان ہوں۔
کھانستے کھونستے آنا۔ کھانستے ہوئے آنا۔ ایک پیر مرد لٹھیا ٹیکتے کھانستے کھونستے آن کھڑے ہوئے۔
کھچڑی پکنا۔ بک بک کرنا۔ ابھی کھچڑی پک رہی ہے۔
کس کھیت کی مولی ہونا۔ کم حقیقت ہونا۔ ابی آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوتے ہیں

گ

گاڑی کا کھل جانا۔ ریل کا چھوٹنا۔ کانسٹیبل نے غل مچایا۔ ہاں۔ ہاں گاڑی کھل گئی الگ رہو۔
گاڑھے وقت آڑے آنا۔ مصیبت کے وقت کام آنا۔ وہ تو کہیے حضور کی نیک نیتی اس گاڑھے وقت آڑے آئی۔
گاج پڑنا۔ مصیبت آنا۔ تکلیف میں مبتلا ہونا۔ تم خود ہی انصاف کرو کہ تمہارے بڑبس سے مجھ پہ کیا گاج پڑی۔
گدے لگانا۔ خیالی پلاؤ پکانا۔ ہم خدا جانے پہاڑوں کی نسبت کیا کیا سوچتے تھے۔ گدے لگاتے تھے بس۔
گرو گھنٹال ہونا۔ استاد ہونا۔ ہاں یوں کہئے کہ یہ فکرے بہت ہیں اور ان سب کے گرو گھنٹال وہ ذات شریف آپ ہیں۔
گزی کی لنگوٹی لگانا۔ بہت معمولی کپڑا پہننا۔ لاکھوں روپیہ کھا جاؤ۔ مگر گزی کی لنگوٹی لگائے ہوئے ہو۔
گلچھرے اڑانا۔ مزے کرنا۔ عیش و عشرت میں رہنا۔ کل کا مزدوری کرنے والا شمیم لاٹری نکل آنے سے گلچھرے اڑا رہا ہے۔
گولا فسوں پڑھنا۔ جادو کرنا۔ ایک گولا فسوں پڑھ کر ایسا مارا کہ شکیل کے گرد دھواں ہو گیا۔
گاؤزوریاں کرنا۔ طاقت دکھانا۔ زبان درازی کرنا۔ میاں خوجی پہلے تو بہت ہی تھلائے اور لگے گاؤزوریاں کرنے۔
گوئیاں بنانا۔ سہیلیاں بنانا۔ ایک نصیحت بزرگان یاد رکھو کہ آس پاس کی چھوکریوں کو گوئیاں نہ بنانا۔
گوش فلک کر ہونا۔ شور و غل کے باعث کچھ نہ سنائی دینا۔ نقاروں کی آواز سے گوش فلک کر ہوا۔

گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیا ہونا۔ غیر مستقل مزاج ہونا۔ تیرے قول و فعل کا اعتبار کیا۔ گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیا۔
گھی کے چراغ روشن کرنا۔ بہت زیادہ خوش ہونا۔ مراد بر آنا۔ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔ گھی کے چراغ مسجد میں روشن کر دوں۔
گھڑی کا کھٹکا ہونا۔ ہر وقت گردن ہلانا۔ آزاد کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔
گہری چھننا۔ زیادہ دوستی ہونا۔ خدا نے چاہا تو گہری چھنے۔ آج پو بارہ ہیں۔
گھاتنے رہنا۔ گھیرے رہنا۔ چو رچو رارے میاں کہاں کدھر۔ کس رخ۔ لینا۔ پکڑ لیا ہے۔ دیکھو گھاتنے رہنا۔
گھمار لڑنا۔ لڑائی لڑنا۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں میں گھمار لڑتے تھے۔

ل

لادے لادے پھرنا۔ ساتھ رکھنا۔ برس بھر کے لئے انعیم ایں جاب کو دیجیئے میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔
لٹو ہو جانا۔ فدا ہو جانا۔ آخر حسن آرا میں کیا بات ہے جو آپ لٹو ہو رہے ہیں۔
لڑکوری ہونا۔ بچہ والی ہونا۔ اتنا نہ سمجھے کہ ابھی میں آپ بچہ ہوں۔ لڑکوری کیونکر ہو سکتی ہو بھلا۔
لسان ہونا۔ باتونی ہونا۔ میاں آزاد سمجھ گئے کہ یہ کوئی بڑے لسان آدمی ہیں۔
لطف و مدارا کرنا۔ خاطر مدارات کرنا۔ تعلقات رکھنا۔ مجھے کیا۔ چاہے کوئی کسی پر عاشق ہو یا اسکا دشمن بنے۔ مگر میرے دشمنوں سے لطف و مدارا نہ کرے۔
لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا۔ غربت میں بھی مزے لوٹنا۔ ہم نے تو گھر پھونک تماشا دیکھا۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلا۔
لمبے ہونے کا طور سوچنا۔ بھاگنے کی تجویز سوچنا۔ نامرد لمبے ہونے کا طور سوچتے۔
لوکا لگانا۔ آگ لگا دینا۔ موئے غارتی نے کیا دل لگی نکالی ہے۔ استانی بناتا ہے۔ تیرے استاد کو لوکا لگاؤں۔
لوٹ ہو جانا۔ محبت کرنا۔ فدا ہونا۔ اندھا نہ ہوتا تو کلوئی پر کاہے کو لوٹ ہو جاتا۔
لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنا۔ ہنستے ہنستے بے قرار ہونا۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ سناؤں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنے لگو۔
لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا۔ فرضی طریقہ سے کسی گروہ میں مل جانا۔ چلئے۔ بندہ بھی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔

م

ماتھے جانا۔ نقصان اٹھانا۔ ابلو آئی گئی ہمارے ماتھے گئی۔
ماچا توڑ ہونا۔ بیٹھ کر اٹھنے کا نام نہ لینا۔ ماچا توڑ ایسے کہ بیٹھے تو بس جم گئے۔
مت بھنگ ہونا۔ جکڑا جانا۔ دماغ کا صحیح طور پر کام نہ دینا۔ کہتے تھے مردک سے کہ ہم کو نہ پلانا۔ نہ مانا۔ دیکھ بھنگ سے کیسی مت بھنگ ہوئی۔
مثل باد فنا اڑنا۔ ختم کر دینا۔ تباہ و برباد کر دینا۔ ساحروں کی خاک ہستی دم تیغ سے مثل باد فنا اڑا دی۔
محبت پھٹ پڑنا۔ بہت زیادہ چاہنا۔ سپہر آرا روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت پھٹ پڑی تھی تو بیاہا کیوں۔
مسکوٹ کرنا۔ صلاح مشورہ کرنا۔ دو ایک دل لگی بازوں نے مسکوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہئے۔
معمے بولنا۔ صاف بات نہ کہنا۔ ہاں کیوں نہیں۔ کیا معمے بولتے ہیں۔ جیسے ناہیں سمجھواتے ہیں۔
منکنا۔ جنبش کرنا۔ ہو کا عالم۔ جانور نہ آدم کتنے تک دبکے پڑے ہیں۔ کوئی منکتا نہیں۔
منہ میں گھی شکر ہونا۔ دعا دینا۔ آپکے منہ میں گھی شکر۔ آپ نے خدا لگتی بات کہی۔
منہ کی کھانا۔ نیچا دیکھنا۔ ایں جانب برق دم ہیں جو سامنے آیا نیچا دکھایا۔ جو منہ چڑھا منہ کی کھائی۔
منہ سے انگارے برسنا۔ سخت سست کہنا۔ ان دونوں کے منہ سے تو انگارے برستے ہیں۔
منہ آنا۔ زبان درازی کرنا۔ اب تم منہ آتے ہو۔ کسی دن گردن ناپوں گا۔
منزل کھوٹی ہونا۔ وقت پر نہ پہنچا۔ تمہاری باتوں میں پھنس کر رہ گیا اور میری منزل کھوٹی ہو گئی۔
منہ سے بولنا نہ سر سے کھیلنا۔ خاموش ہو جانا۔ چپ سادھ لینا۔ وہ کالی ناگن تھی جسکے کاٹے کا منتر نہیں جس کا کاٹا منہ سے نہ بولے نہ سر سے کھیلے۔
منہ پر ہوائی اڑنا۔ گھبرا جانا۔ پریشان ہونا۔ جراروں کے چہروں پر سرخی چھائی تھی۔ نامردوں کے منہ پر ہوائی تھی۔
مُو بمُو کہہ دینا۔ صاف صاف منہ کے سامنے کہنا۔ سب حال صاف صاف مُو بمُو کہہ دیا کہ نواب نے بھیجا ہے۔
موس لے جانا۔ لوٹ لینا۔ وہ تو خیر گزری کہ صندوق ہاتھ سے گرپڑا نہیں تو سب موس لے جاتا۔
مہنا متھ جانا۔ آفت برپا کرنا۔ چھوٹی بیگم مہنا متھ رہی ہیں۔ اس بڈھے خبیث کو کھڑے کھڑے شہر بدر کر دو۔
میزان نہ پٹنا۔ موافقت نہ ہونا۔ کبھی روٹھ جاتے کبھی گدگداتے۔ غرض کسی طرح میزان نہ پٹتی تھی۔
مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑکنا۔ بے حد بے چین و پریشان ہونا۔ ان کے سر پر تڑاتڑ پڑیں پھر پھیر دیکھے جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑک دیا۔

ن

ناکوں دم کرنا۔ بہت زیادہ پریشان کرنا۔ آتی فرداں بھولوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔

ناک ناک بدنا ۔ ہار جانا۔ میں جو ابھی موقوف نہ کر دیں تو ہاتھ کٹاتا ہوں۔ ناک ناک بدتا ہوں ۔
ناک پر مکھی بیٹھنا ۔ برداشت نہ کرنا۔ ایسی نک چڑھی مزاج دیکھی نہ سنی ۔ مجال کیا کہ ناک پر مکھی تو بیٹھ جائے ۔
نتھنوں میں تیر چلانا ۔ عاجز کر دینا۔ عمرو کا یہاں سے چڑا اکیسا ۔ وہ تو آسمان پر سے لے جا سکتے ہیں ۔ ایسے ہیں کہ نتھنوں میں تیر چلاتے ہیں ۔
نرے چوپنج ہونا ۔ بے وقوف ہونا ۔ آپ بھی واللہ نرے چوپنج ہی رہے ۔
نرا گاؤدی ہونا ۔ بالکل کم عقل ہونا ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ واللہ نرا گاؤدی رہا ۔
نشہ کی جھانج ہونا ۔ نشہ کا زور ہونا ۔ اور کہیں نشہ کی جھانج ہوئی تو کھول کر پی جاتا ۔
نصیب آزمائی کرنا ۔ مقابلہ کرنا ۔ کل ہم تم پھر نصیب آزمائی کریں گے ۔
نکھٹو کے کھونٹے میں باندھنا ۔ نااہل کے ساتھ شادی کرنا میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے کھونٹے میں باندھ دیا ۔
نوحہ و شیون برپا کرنا ۔ رونا پیٹنا ۔ جس وقت اسے معلوم ہوا کہ میرا فرزند مارا گیا ۔ عجیب طرح کا نوحہ و شیون برپا کیا ۔
نیارے بنے ہونا ۔ چالاک ہوشیار ہونا ۔ میاں صاحبزادے ہم تو دنیا بھر کے نیارے بنے ہیں ۔ ہمیں کوئی کیسا رنگ بدلائے گی ۔

ھ

ہالا ڈولا آنا ۔ زلزلہ آنا ۔ اللہ جانتا ہے میں تو سمجھی کہ ہالا ڈولا آگیا ۔
ہتھیلی پر سرسوں جمانا ۔ بہت جلدی کرنا ۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا لمبا سفر فوراً ختم کر کے واپس ہو سکوں ۔ کب ہتھیلی پر سرسوں جما لوں ۔
ہتھے مارنا ۔ جلد جلد کھانا ۔ ہتھے مارے اور سیر ہو گئی ۔ کئی سیر کھانا کھایا ۔
ہتھے سے اکھڑنا ۔ ناخوش ہو جانا ۔ تو یہ کہئے ۔ ہتھے پر سے اکھڑ گیا ۔
ہتھے ہی پر ٹوک کے جانا ۔ زیادہ نہ کہنے پانا ۔ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ہتھے پر ٹوک دیئے گئے ۔
ہر دیگچی چمچا ہونا ۔ ہر جائی ہونا ۔ ہر آدمی کے استعمال میں آنا ۔ جیسے خود ہر دیگچی چمچے ہو ایسے ہی سب کو سمجھتے ہو ۔
ہر ڈنگا بیگی ہونا ۔ چھوٹے بنکی ہونا ۔ اس ہری نگوڑی کو تو دیکھو ۔ کیسی ہر ڈنگا بیگی رہے ۔
ہڑ دنگی دیو کی بچی ہونا ۔ بے تہنر اور موٹی ہونا ۔ بھلا میں اس ہڑ دنگی دیو کی بچی کلو ٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرنا ۔
ہڑ ہونا ۔ بھاگ جانا ۔ تلوار کا چمکنا تھا کہ سب ساتھی رفیق نام سے بانکے ہڑ ہو گئے ۔
ہلڑی ہونا ۔ شور مچانے والا ۔ ہاں ہلڑی نہ ہو ورنہ اجیرن ہو جائے گی ۔

ہنگامہ انبساط گرم ہونا۔ ناچ رنگ کی محفل قائم ہونا۔ ناچ ہو رہا تھا۔ ہنگامہ انبساط گرم تھا۔

ہنڈیاں پکنا۔ باتیں کرنا۔ صلاح مشورہ کرنا۔ کمیدان نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو باہم ہنڈیاں پکنے لگیں۔

ہنڈیا چڑھنا۔ مطلب پر آنا۔ حکیم صاحب نے کہا ہم تو ایسا شہر چاہتے ہیں جہاں مینے کا گھر ہو۔ بخار پیچھا نہ چھوڑتا ہو۔ جب البتہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔

ہوائی دیدہ ہونا۔ ڈھیٹ ہونا۔ آزادی پسند ہونا۔ خطاب کیا کہ اوہ چھوکری تو اب ہوائی دیدہ ہوئی ہے۔

ہوش کی دوا کرنا۔ سمجھ سے کام لینا۔ میں نے کہا ہوش کی دوا کر دلالہ جی۔ مجھ کو اب چھیڑو گے تو سو گالیاں دونگی۔

ہوش پینترا ہوجانا۔ گھبرا جانا۔ گھبرائیے نہیں آپ کے تو ہوش ہی پینترا ہوئے جاتے ہیں۔

ہوا بندھنا۔ شہرت ہونا۔ اس جوار میں کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے۔ محلہ محلہ ہوا بندھی ہے۔

ہولا خبط ہونا۔ بے وقوف کم عقل ہونا۔ نظر قہر آلود ڈال کر کہا۔ ابے او ہولا خبط۔ اتار ٹوپی۔ بدل جوتا۔

ہوا سے مینڈھے اچھلنا۔ بہت تیز ہوا کا چلنا۔ طوفان آنا۔ ہوا سے مینڈھے اچھل رہے تھے۔ دریا نوجوانوں کے مزاج کی طرح ہلیورن پر تھا۔

ہیاؤ نہ پڑنا۔ ہمت نہ پڑنا۔ بیسواؤں کی طرح بننے ٹھننے کا ہیاؤ نہیں پڑتا تھا۔

مطبوعات انجمن

تاریخ و سیاست:-

کتاب	مصنف	قیمت
کابل و یاغستان	مولوی محمد علی قصوری	۲-۲۵
تذکرہ اہل دہلی	سر سید احمد خان۔ مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی	۵-۵۰
جغرافیۂ قرآن	مفتی انتظام اللہ	۱-۵۰
تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو	ہاشمی فرید آبادی	۳-۵۰
داس کیپٹال (جلد اول)	مارکس۔ مترجم سید محمد تقی	۷-۵۰
جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے	امیر شکیب ارسلان۔ مترجم نجم الدین شکیب	۴-۵۰

سلسلۂ اصطلاحات:-

کتاب	مصنف	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بنکاری		۴-۵۰
" " فلکیات		۱-۵۰
" " کیمیا		۲-۲۵
" " جغرافیہ		۱-۰۰
اردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ	بابائے اردو	۵۰

سائنس:-

کتاب	مصنف	قیمت
اردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس	بابائے اردو	۱-۰۰
اضافیت	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۳-۰۰
طبیعیات کی داستان	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۸-۷۵
قوائے طبعیہ	ڈاکٹر صادق حسین	۲-۲۵
جدید معلومات سائنس	میجر آفتاب حسن	۷-۵۰
جراثیمیات	محمد احمد حامی	۲-۰۰
حیوانیات	پروفیسر محشر عابدی	۲-۲۵
نباتی دباغت	سید امداد علی	۵-۵۰
سیر افلاک	مرزا محمد رشید	۳-۵۰

گرد و پیش

تصویر کا پہلا رُخ

ناطقہ سر بگریباں ہے . . . . !

ڈھاکہ ۱۱ مارچ ۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صدیقی نے ٹیچرس ٹریننگ کالج ڈھاکہ کے ایک سیمنار میں مقالہ پڑھتے ہوئے انگریزی کو ثانوی مدارج تک ذریعۂ تعلیم برقرار رکھنے کی سفارش کی ہے ہا ہے کہ انگریزی تعلیم محض کلرکوں کی فوج ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ متوسط طبقے پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیتی ہے انھوں نے کہا کہ اپنے پر انگریزی کی راہ مسدود کر لینا قوم کے لیے تو نقصان رساں ہوگا ہی لیکن ساتھ ہی ہمارے نظریات کی ہمہ گیری بھی مجروح ہوگی اس کے ساتھ ہی نے لوگوں کو یہ زریں مشورہ دیا کہ انگریزی جیسے نزاعی مسئلے پر جذباتی نہ بنیں۔ پروفیسر عبدالحی نے بھی ڈاکٹر صدیقی کے ان غیر قومی نظریات کی پر تائید کی۔ سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے ان فرسودہ نظریات کی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ ہم انگریزی کو اس کی تمام نوآبادیاتی ت کے ساتھ رائج رکھ کر اپنا قومی وقار مجروح کر رہے ہیں بلکہ انگریزی ہماری قومی روایات کے فروغ میں بھی رکاوٹ بن رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی زبان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں سندھی پنجابی اور پشتو کے فروغ کا کام کرنا چاہیے۔

لاہور۔ مغربی پاکستان اردو اکاڈمی کی مجلس منتظمہ کے ایک اجلاس میں اس بات پر اظہار تشویش کیا گیا ہے کہ اب تک منظور شدہ سرکاری امداد ادا نہیں ملی جس کی وجہ سے اکاڈمی کے کئی خریداری منصوبے ملتوی ہوگئے ہیں اور ملازمین کو برطرفی کے نوٹس بھی دے دیے گئے ہیں اس اجلاس نے جس صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ فرما رہے تھے صوبائی گورنر اور وزیر تعلیم سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سال کے بجٹ میں اکاڈمی کے لیے مختص شدہ سرکاری امدادی رقم کی ادائیگی کا جلد از جلد حکم دیں۔ ایک قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ملک میں سائنس کو مقبول بنانے اور اردو تعلیم کو فروغ دینے میں ڈمی نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ اگر قومی زبان اردو ذریعۂ تعلیم اور سرکاری زبان نہ ہوئی تو ملک سائنسی، تعلیمی اور انفرادی ترقی ممکن نہیں۔ اجلاس میں موجود تمام اراکین نے اس بات کا تہیہ کیا کہ وہ اس ادارے کو ہر قیمت پر زندہ رکھیں گے۔

ڈھاکہ: مرکزی حکومت نے ماہرین تعلیم اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو ہر پہلو کی طرح سے اس بات کا جائزہ لے گی کہ اعلیٰ سطح پر قومی زبان کو کس طرح بلا تاخیر ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔ صوبائی وزیر تعلیم جناب مجر حسینی نے بتایا ہے کہ حکومت کو تمام سطحوں پر بنگلہ ذریعۂ تعلیم بنانے کی ضرورت کا پورا احساس ہے اور اس ضمن میں اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس قسم کی یقین دہانیوں کا اعادہ ہر ماہ حکومت کی طرف سے پابندی سے کیا جاتا رہا ہے اور کئی سال سے یہ یقین دہانی اپنے تمام دوروں کے بعد یقین دہانی کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

دوسرا رُخ

آزاد کشمیر میں اُردو

مظفر آباد: ۴ مارچ۔ آزاد کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے دفاتر میں رائج کرنے کے سوال پر حکومت غور و خوض کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک سرکاری ترجمان نے بتایا ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے کے سلسلے میں مالی اخراجات کا جائزہ لے رہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اُردو

قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی اسپیکر جناب فضل القادر چودھری نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور بنگلہ کو بحیثیت قومی زبان کے مساوی درجہ دیا جائے اور ان دونوں زبانوں کو مشرقی پاکستان میں ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ جناب فضل القادر چودھری نے مولانا راغب احسن کے نام ایک پیغام میں کہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے بعض اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں ہیں۔ اس لیے انھیں توقع ہے کہ حکومت اسکولوں میں دونوں زبانوں کی تعلیم کے لیے مناسب انتظام کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر کسی قومی زبان کی تعلیم کے لیے مناسب انتظام نہیں کیا جاتا تو یہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

کیتھولک تنظیم المصنفین

کیتھولک تنظیم المصنفین پاکستان کی پانچویں سالگرہ کراچی میں منعقد ہوئی جس میں ملک کے استحکام اور اردو زبان کی خدمت کا عہد تازہ کیا گیا۔ اس تنظیم کا قیام ۱۹۶۳ء میں عمل میں آیا تھا اور اس کا مقصد اردو زبان کا فروغ ہے۔ تنظیم کی جانب سے مختلف موقعوں پر ادبی محفلیں اور تقاریب منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

قومی وحدت کی اساس

لاہور ۲۳ فروری۔ چیف اسکاؤٹ کمشنر پاکستان جناب این ایم خان نے کہا ہے کہ مغربی پاکستان میں رہنے والے بنگلہ اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے اردو سیکھیں تو اس سے دونوں صوبوں کے درمیان محبت کے رشتے استوار ہوں گے۔ اور اسی طرح قومی وحدت و اتحاد کو لازوال فروغ حاصل ہوگا۔ جناب این ایم خان نے کہا کہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ دونوں صوبوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

قائد اعظم کی یادگار کتابیں

کراچی ۲۸ فروری بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کی جائے پیدائش وزیر مینشن کے لائبریری ہال میں ایک سادہ تقریب میں مرکزی وزیر تعلیم جناب قاضی انوار الحق کو قائد اعظم کی ۵۰۰ قانونی کتابوں کا تحفہ [illegible]

فرنیچ نامی برطانوی ادارے کے صدر جناب ایف۔ ایم ریوبینس نے پیش کیا۔ قائد اعظم نے یہ کتابیں سنہ ۴۷ء میں فروخت کردی تھیں ان میں سے بعض کتابوں پر قائداعظم کے دستخط ثبت ہیں۔ اس تقریب میں وزیر تعلیم نے فرمایا کہ یہ قیمتی کتابیں قائداعظم کی دوسری چیزوں کے ساتھ ہمیشہ ہماری یادوں کو منور رکھیں گی۔ اور توانائی کا سرچشمہ ہوں گی۔ وزیر تعلیم نے ہز ہائینس کلائن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قائداعظم کی اس یادگار کو ہمیشہ محفوظ رکھا جائے گا۔

ملک بھر میں واحد نصاب

راولپنڈی ۲۳ فروری۔ گورنر کانفرنس میں جس کی صدارت صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے کی، فیصلہ کیا گیا ہے کہ ملک بھر میں واحد نصاب تعلیم رائج کردیا جائے۔ اس مقصد کے لئے فہرست مضامین اور نصاب کا ایک قومی بورڈ قائم کیا جائے گا جو پرانے نصاب پر نظر ثانی کرکے اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنائے گا۔ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ فنون کے تمام مضامین کی کتابیں ماہرین کا ایک خاص گروپ تیار کرے گا اور نچلے درجوں کے لئے ڈگری کی کتابوں کو آسان اردو زبان میں پیش کیا جائے گا۔ ترجمان نے بتایا ہے کہ صدر پاکستان نے یہ ہدایت کی ہے کہ بعض کتابیں ۱۹۶۸ء تک تیار کرلی جائیں۔

امریکہ میں کشمیری زبان

نیویارک ۲۳ فروری۔ امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار الینوس یونیورسٹی میں کشمیری زبان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ ماہرین کے خیال میں یہ پہلا موقع ہے کہ ساری دنیا میں سرکاری طور پر اس زبان کی تعلیم کا انتظام کسی یونیورسٹی میں کیا گیا ہو۔ اس طرح جنوب مشرقی پروگرام کے تحت اردو بنگالی اور فارسی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ کشمیری زبان کی تعلیم کا آغاز اسی سال اگست کے آخر تک کردیا جائے گا

ایران میں اردو مشاعرہ

تہران۔ ۲ فروری۔ حافظ و خیام کے دیس میں اردو کا ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت کونسلر مہدی مسعود نے کی۔ پروفیسر ادریس صالح صدیقی نے اس موقع پر فرمایا کہ ایران کی ادب پرور و مردم خیز سرزمین پر اردو کا یہ مشاعرہ ایک نیک فال ہے اور اس کے تابناک مستقبل کی طرف ایک واضح قدم ہے۔

نعیم صدیقی کے دو مجموعے

مشہور شاعر و ادیب اور ماہنامہ "سیارہ" لاہور کے مدیر جناب نعیم صدیقی کے دو شعری مجموعے عنقریب شائع ہو رہے ہیں "خون آہنگ" نعیم صدیقی کے رجزیہ کلام کا مجموعہ ہے جس کی تقریظ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھی ہے۔ اس کو مکتبہ کارواں جلد پیش کر رہا ہے "پھر ایک کارواں لٹا" دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں ولولہ انگیز نظموں کا انتخاب شامل ہے

نیشنل بک سینٹر کے انعامات

کراچی ۲ مارچ۔ نیشنل بک سینٹر آف پاکستان نے ۱۹۶۶ء میں چھپی ہوئی دیدہ زیب اور خوب صورت کتابوں پر انعامات کا اعلان کیا ہے۔ ججوں نے کسی کتاب کو پہلے انعام کا مستحق قرار نہیں دیا ہے۔ دوسرا انعام بڑوں کی کتابوں میں نذر رحمان کو دیا گیا ہے اور بچوں کی کتابوں میں "بچوں کے لئے حدیث" کو ملا ہے۔ فنکاروں میں جناب عبدالرحمن چغتائی کو ضیاء جالندھری کی کتاب "نارسا" کے سرورق پر انعام کا مستحق سمجھا گیا ہے اور دوسرا انعام جنگ کے کارٹونسٹ جناب زیدی کو حفیظ جالندھری کی کتاب "بچوں کا بینک" پر دیا گیا ہے۔

افریشائی مصنفین کانفرنس

بیروت — ۲۳ر فروری ایفرو ایشائی ممالک کے مصنفین کی کانگریس کی تیسری کانفرنس بیروت میں منعقد ہو رہی ہے۔ جس میں افریقہ اور ایشیا کے ۰۰ ۳ مصنفین کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے ۰ ۶ ممالک کے نمائندے بھی شریک ہو رہے ہیں۔ اس کانفرنس میں ایفرو ایشائی مصنفین کی انجمن کے لیے قوانین وضع کئے جائیں گے اور "مصنف اور تحریک آزادی کے درمیان رشتہ" پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔

دیدہ زیب کتابوں کی نمائش

نیشنل بک سینٹر کے زیر اہتمام ۶ مارچ کو کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں دیدہ زیب کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اس نمائش میں چھ سو کتابیں شریک کی گئی ہیں جن میں سے چار سو انگریزی کی ہیں۔ اور دو سو اردو کی۔ عوام کی توجہ کا مرکز ۱۸۰۲ء میں دہلی سے چھپی ہوئی ایک کتاب "تذکرہ عالم" ہے جس میں دو رنگوں کی تصاویر ہیں۔ اس موقع پر ٹیلی ویژن کے ڈائرکٹر جناب ذوالفقار علی بخاری نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اخبارات ٹائپ میں شائع ہونا چاہئیں۔ جناب بخاری نے سستی کتابوں کی اشاعت پر زور دیا ہے۔

آئینہ خانے میں

رشید احمد صدیقی / ایک موضوع

کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی افتتاحی تقریب میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور مزاح نگار جناب رشید احمد صدیقی کی ذات اور اُن کا فن تھا۔ مقررین نے رشید احمد صدیقی کی شخصیت اور اُن کے فن پر سیر حاصل خیالات کا اظہار کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ مذاکرہ کی صدارت جناب ڈاکٹر محمود حسین فرما رہے تھے۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والے حضرات میں شان الحق حقی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ پروفیسر سید محمد شفیع۔ ڈاکٹر سید شاہ علی جمیل نوری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

عبداللہ ریاض صاحب کی آمد

لاہور — ۱۴ر فروری مجلس ایران کے اسپیکر جناب عبداللہ ریاض جو ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ اورنٹیل کالج لاہور میں تشریف لائے اس موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ فارسی اور اردو ادب کا سرچشمہ اسلامی ادب ہے اور یہ ادب ہمیں صرف قرآن حکیم ہی میں ملتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ہزار سعدی اور ہزار حافظ و فردوسی بھی فارسی ادب پر اتنا گہرا اثر نہ ڈال سکے۔ جتنا قرآن حکیم کی ادبی خصوصیات نے ڈالا ہے

پروفیسر حمید عسکری کا امتیاز

پروفیسر حمید عسکری پاکستان کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سائنس کی کتابوں پر تین اول انعام حاصل کیے ہیں۔ ان کتابوں میں جو انعام کی مستحق سمجھی گئی ہیں۔ برق و مقناطیس — مادے کے خواص۔ حرارت شامل ہیں جن پر یکے بعد دیگرے مصنف کو انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر موصوف جن اور کتابوں پر کام کر رہے ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔ روشنی — جدید طبعیات۔ انسائیکلوپیڈیا طبعیات —

حبیب جالب فنڈ

لاہور کے شعرا اور اہل علم نے مشہور شاعر حبیب جالب کے خاندان اور اہل وعیال کی امداد کے لیئے ایک فنڈ قائم کردیا ہے۔ حبیب جالب کو اکثر قید وبند کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک چار رکنی فنڈ کمیٹی بھی بنادی گئی ہے اس فنڈ میں عطیات بیگم حبیب جالب فردوس پارک سنت نگر لاہور کے پتے پر بھیجے جاسکتے ہیں۔

یادوں کے چراغ

یوم اقبال رح

شاعر مشرق علامہ اقبال کی اُنتیسویں برسی پر ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ اپریل کو کراچی میں ایک شاندار پروگرام ترتیب دیا جارہا ہے جو تین اجلاس پر مشتمل ہوگا۔ یوم اقبال کا یہ پروگرام یونیورسٹی انتظامیہ کمیٹی نے منظور کیا ہے اس سلسلے میں خواتین کا ایک خصوصی اجلاس بھی ہوگا۔ جس کی صدارت بیگم رعنا لیاقت علی خاں کریں گی اس میں شرکت کے لیئے علامہ اقبال کی صاحبزادی بیگم منیر صلاح الدین خاص طور پر کراچی آئیں گی۔ ایک علم نمائش بھی ہوگی جس میں علامہ اقبال کی نادر ونایاب کتابوں خطوں اور تحریروں کی نمائش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ پہلی بار اقبال کے پیغام کو تصویری صورت میں دکھایا جائے گا۔ کلام اقبال کو ملک کے مشہور عالم مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے مصور کیا ہے مصوری کا ایک مقابلہ بھی ہوگا جسمیں انعامات بھی تقسیم کئے جائینگے۔

یوم اقبال کی اس شاندار تقریب میں شرکت کے لیئے متحدہ عرب جمہوریہ۔ ترکی۔ انڈونیشیا۔ افغانستان۔ چیکوسلاوکیہ۔ فرانس۔ چین۔ برطانیہ امریکہ اور مغربی جرمنی سے ادیبوں کی بڑی تعداد کراچی پہنچ رہی ہے ایک محفل موسیقی کا انعقاد بھی ہورہا ہے جس میں پاکستان کے ممتاز موسیقار حصہ لے رہے ہیں۔ طلبہ کے لیئے ایک مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے جس میں بہترین طالب علم مقررین کو انعامات دیئے جائیں گے۔ ایک طرحی مشاعرہ بھی پروگرام میں شامل ہے۔ جس میں ملک کے تمام ممتاز شاعر شرکت کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی اور پیغام پر ایک ڈرامہ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی سینما گھروں میں علامہ کی حیات و پیغام پر دستاویزی فلمیں دکھائی جائیں گی۔ اس اہم اور شاندار تقریب کے سلسلے میں محکمہ ڈاک قومی یادگاری ٹکٹ بھی جاری کر رہا ہے۔

ماتم میں ہم شریک

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں...

اسلامی تہذیب اور علم وادب کا سرپرست، مسلمانوں کے اقتدار کا آخری چراغ، اُردو کا مربی اور محسن ۲۴ر فروری کو حیدرآباد دکن میں پورے عالم اسلام کو داغ مفارقت دے گیا۔ میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ نظام دکن کی وفات کی خبر برصغیر پاک وہند اور عالم اسلام میں یکساں غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی۔ وہ صرف ایک ریاست کے حکمراں ہی نہ تھے، دنیا کے امیر ترین افراد ہی میں شمار نہ کئے جاتے تھے اور صرف سلطنت آصفیہ کے آخری چراغ ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک عظیم انسان، انسانیت کے پرستار، علم وادب کے سرپرست، اسلام کے دلدادہ وشیدا، اردو کے عاشق ومحسن تھے۔ جبتک اردو زندہ ہے۔ جبتک اسلامیان ہند کا علمی سرمایہ برقرار ہے جبتک علم وادب کی شمع روشن ہے اس وقت تک نظام کی ذات ایک لازمی جز کی طرح زندہ او

شامل رہے گی۔ بادشاہ اور حکمران بھی افراد ہوتے ہیں۔ اور افراد فنا ہوتے رہتے ہیں۔ آج دنیا کے کتنے بادشاہ اور حکمران ہیں جنہیں ہم اور آپ جانتے ہیں صرف وہی جنھوں نے تاریخ کے صفحات سے اٹھ کر عالم انسانیت کو محیط کر لیا ۔ نظام حیدرآباد بھی ایسے ہی گنتی کے افراد میں شامل ہیں۔

بیگم حسن مخفی کا انتقال

اردو کے ادبی حلقوں کو یہ سُن کر افسوس و رنج ہوگا کہ مشہور شاعرہ اور ادیبہ بیگم حسن مخفی کا انتقال ۱۹ر فروری کی رات کو کراچی میں ہوگیا ہے خدا مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ ادارہ قومی زبان بیگم حسن مخفی کے خاندان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مقصود شہزاد کی رحلت

تاشقند ۔ ۲۰ر فروری۔ ازبکستان کے مشہور و ممتاز شاعر مقصود شہزاد کا انتقال ۲۰ فروری کو ہوگیا ہے اُن کی عمر ۵۹ برس تھی اور وہ اس علاقے کے سب سے ممتاز و مقبول شاعر و ادیب تھے۔ اُن کے شعری مجموعوں اور ڈراموں نے پورے روس میں دھوم مچا رکھی تھی، اور وہ روس کے اہم ترین فن کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ مقصود شہزاد کی خدمات اس لیے بھی ہمیشہ یادگار رہیں گی کہ انھوں نے پشکن، شیکسپیئر اور گوئٹے کی تخلیقات کا روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

آئینۂ ہند

ایک اہم اعلان

ہندوستان کے صوبہ مدراس کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی دراوڑ کازگام پارٹی کے رہنما جناب این انندرائے نے اعلان کیا ہے کہ وہ سب سے پہلے بھارتی آئین کی اس شق میں ترمیم کرانے کی جدوجہد کریں گے جو ہندوستان کی چودہ علاقائی زبانوں کے بارے میں ہے باقی زبانوں کو ہندی کے برابر درجہ دیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ ہم محض ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان نہیں بننے دیں گے یہ واضح رہے کہ مدراس میں کانگریس کی زبردست شکست بھی ہندی کی بیجا تائید کا نتیجہ ہے۔

اُردو کا خیال

ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے یو۔پی اور بہار کے وزرائے اعلیٰ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ" ایسے انتظامات پر فوری توجہ دی جائے جس سے تعلیمی انتظامی اداروں میں اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو ۔ انھوں نے بلرام پور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ" جن علاقوں میں اردو کی تعلیم کے لیے معقول انتظامات ہونے چاہیں وہاں یہ انتظامات نہیں کیے گئے ہیں" انھوں نے پھر یہ یاد دہانی کرائی کہ" یہ صورت حال تکلیف دہ ہے۔ حکومت کو اردو کی تعلیم کی ضرورت کا پورا احساس ہے۔

ادیبوں کی خدمت

معلوم ہوا ہے کہ حکومت یو۔پی۔ (اتر پردیش) نے ۱۰۰ ادیبوں اور فن کاروں کو مالی امداد دینے کا اعلان کیا ہے یہ امداد یکم مارچ ۶۶ء سے ۲۸ر فروری ۱۹۶۸ء تک برابر جاری رہے گی۔

ہندوستان ٹائمز کا اداریہ

ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنے ایک حالیہ اداریہ میں" مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی" کے زیر عنوان ایک تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں جس قوم کے ساتھ سب سے زیادہ بے انصافی ہوئی ہے وہ مسلمان ہیں۔ اخبار نے اس رجحان کی شدید مذمت کی ہے اور ایسے تمام مسائل پر کھل کر لکھا ہے جو مسلمانوں کے لیے آزار کا باعث ہیں۔ ان مسائل میں اردو بھی شامل ہے۔ اس اخبار نے لکھا ہے کہ ۔ "مسلمانوں کی شکایت

کی ایک بنیادی وجہ اردو ہے جو مسلمانوں کی ثقافتی زبان ہے اور جس کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔ اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو کی جڑیں ہندوستان کی دھرتی کی گہرائی میں ہیں اور وہ ہندوؤں کی بھی بلا امتیاز مادری زبان ہے۔ اخبار نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر فوری توجہ دے اور اردو کو اس کا جائز اور صحیح مقام دے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا اعزاز اردو زبان کے محقق اور انشاپرداز شانتی رنجن بھٹاچاریہ کو امرنیل کالج بمبئی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی ہے یہ سند انہیں "تذکرہ تصانیف اردو بنگال" پر دی گئی ہے اس کتاب میں انیسویں صدی کے آخر تک کی اردو کتابوں کے بارے میں تفصیلات مہیا کی گئی ہیں جو بنگال میں طبع اور شائع ہوئیں۔ ہر کتاب کے مصنف کے حالات بھی دیئے گئے ہیں۔ بنگال میں اردو زبان کی رفتار ترقی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کتاب ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ پہلے بھی ایک اہم تحقیقی کتاب "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" لکھ چکے ہیں۔ اس کتاب پر حکومت مغربی بنگال نے مصنف کو پانچ ہزار روپے کا ٹیگور انعام دیا تھا۔

ہندوستان میں اردو ادب اور زبان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کام ہو رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر شانتی رنجن جیسے محققوں ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔

غبار خاطر پر ایک نظر

پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں حال ہی میں ایک جلسہ ہوا جس میں جناب مالک رام صاحب نے غبار خاطر پر مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے فرمائی۔ مالک رام صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ کہنے کو تو غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ در اصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ مالک رام صاحب کے مقالے کے دو حصے تھے پہلے میں انہوں نے مکتوب الیہ کے خاندان پر روشنی ڈالی اور عہد وسطی کے ہندوستان میں اس خاندان کے عروج و زوال کی داستان بیان کی اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی علمی و قومی خدمات کا ذکر کیا دوسرے حصے میں غبار خاطر کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے حالات اور ان کی شخصیت کے بارے میں معلومات اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوب تحریر ہے مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا نقطۂ معراج غبار خاطر ہی ہے اس کی نثر ایسی نپی تلی ہے۔ اور الفاظ کا استعمال یہاں افراط و تفریط سے اس حد تک بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بہت ناہمواری تھی۔ اور عوام تو درکنار متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہوسکتا تھا اس کے برعکس غبار خاطر جیسا ایک نئی دنیا نظر آتی ہے اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دلنشین ہے کہ ہر شخص اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اور تو اور مشکل پیچیدہ موضوعات کے بیان میں بھی اسلوب تحریر کی دل کشی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ اس مجموعے کے بعض مباحث بادی النظر میں بہت معمولی ہیں۔ مثلاً چڑیا چڑے کی کہانی۔ لیکن مولانا آزاد کے جولانی قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر کئی صفحات قلم بند کردیئے ہیں ان خطوں کا ایک اور مایۂ ناز امتیاز ان کا ہلکا سا طنز یہ رنگ ہے جو جابجا الفاظ کا پردہ چاک کرکے جھلکنے لگتا ہے۔ مالک رام صاحب نے مزید کہا کہ مولانا کی تحریر کی ایک اور قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ خواہ معمولی سے معمولی چیز کا ذکر ہو وہ اسے دائمی صداقتوں

اور ابدی اقدار سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فاضل مقالہ نگار نے مثالیں دے کر بتایا کہ مولانا آزاد عام واقعات کو فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے کے عادی تھے۔ مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے تھے اور اگرچہ عشق اور مزاولت سے انھیں اردو پر پوری قدرت حاصل ہو گئی تھی لیکن تلفظ میں عراقیت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے اور اس کی مثالیں ان کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔ مولانا اشعار کے برمحل استعمال کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے غبار خاطر میں کوئی سات سو اشعار آئے ہیں۔ مرحوم انھیں اپنے حافظے سے لکھتے تھے شاید اسی لیے بہت جگہ لفظی تفاوت ہے۔ بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے شعر میں دانستہ بھی رد و بدل کر لیتے تھے۔

مقالے سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر و صدر شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ نے جناب مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسن خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب دونوں کے کارنامے الگ الگ ہیں لیکن ایک خوبی دونوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ دونوں کے فرائض منصبی کا اردو زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن دونوں نے جی جان سے اردو کی خدمت کی ہے اور اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کر دی ہے۔ مالک رام صاحب غالبیات کے ماہر ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا ہے اس سے عامی و عالم سب یکساں طور پر استفادہ کرتے ہیں ان کی تصنیف کی تعداد زیادہ نہیں اور ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے وہ ان پیشہ ور ادیبوں کی طرح نہیں جو ساری عمر کاغذ کالا کرتے رہتے ہیں اور اگرچہ جانتے ہیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن محض اس لیے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں کہ ادب کی تجارت ان کا پیشہ بن جاتی ہے۔ مالک رام صاحب نے جو کام بھی کیا ہے پوری دیانت داری محنت اور دلسوزی سے کیا ہے وہ صلہ و ستائش اور نام و نمود سے بے نیاز رہے ہیں۔ اردو میں گفتار کے غازی بہت ملیں گے کردار کے غازی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ باتیں بنانا ہماری کمزوری ہے، کام سے ہم دور بھاگتے ہیں۔ مالک رام صاحب نے نام کو نہیں کام کو مقصد بنایا ہے پچھلے سال نذر عرشی اور کربل کتھا کی اشاعت اس کی بہترین مثال ہے۔ کربل کتھا کی اشاعت مالک رام صاحب اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو دونوں کی مرہون منت ہے۔ کربل کتھا کا مقدمہ متن، فرہنگ، تعلیقات، اشاریے سب کچھ نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دیوان غالب۔ نسخۂ عرشی اور کربل کتھا کی اشاعت سے اردو میں ادبی ایڈیٹنگ کا ایک نیا معیار سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بارے میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ ان کی تصانیف سے اردو زبان میں ادب کا وزن بڑھا ہے۔ غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے یا نہیں لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کی جڑیں ہماری جذباتی و تہذیبی زندگی میں دور دور تک پیوست ہیں یوں تو غزل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے گئے ہیں لیکن اس کی افہام و تفہیم کا حق صحیح معنوں میں یوسف صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں سب سے بڑی خوبی ان کی نظر کی جامعیت ہے وہ قدیم و جدید فلسفہ و نفسیات اور تاریخ و ادب سب کے رمز آشنا ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھرپور علمیت ملتی ہے ان میں وہ یک رخا پن نہیں جو ہماری موجودہ تنقید کا خاصہ بن گیا ہے۔ جامع تنقید کے لیے جس بصیرت اور آگہی تخلیقی حس موضوعیت اور معروضیت اور ہمدردی و بے تعلقی کی ضرورت ہے اس کی اچھی مثالیں یوسف صاحب کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب چپ مار کر کام کرنے والوں میں ہیں ان کے ہاں علمی انکسار اور اعتدال پسندی ہے، ادعا پسندی نہیں۔ مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا

ہی طور پر رومانیت پسند تھے۔ ان کی قومیت ہو یا اسلامیت دونوں کی نوعیت رومانی ہے وہ عبدہ اور رشید رضا کی تحریروں سے متاثر تھے اور انہوں نے
یسی علم و ادب کے عربی ترجموں سے استفادہ کیا تھا۔ غبار خاطر کے اسلوب اور انداز تحریر کے اعتبار سے فرانسیسی مصنف ONTESQUIEU (1689-1755)
PERSIAN LETTER سے مشابہت رکھتے ہیں۔

MONTESQUIEU اپنے زمانے کا مشہور سیاسی مفکر تھا اور اس کے خطوط کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ یقیناً مولانا کی نظر سے گذرا ہوگا
خطوں میں مشرقی فضا ملتی ہے۔ اسکے مخاطب ایرانی تھے انکے خط کسی شخص کے نام نہیں۔

غبارِ خاطر میں بھی حبیب الرحمن شروانی کی ہستی ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اپنے ابتدائی طرزِ نگارش سے عام فہم نثر کی روایت کو بدلنے کی کوشش کی جس کا آغاز غالب و سرسید و حالی سے ہوا تھا، یہ ایک طرح کی بدقسمتی تھی۔ اردو زبان کا GENIUS کیونکہ فہم اور سہل پسندی کا ہے، اور مولانا کا اسلوب اس کے خلاف تھا اس لئے اردو کے بنیادی اسلوب کو بدلنے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی ان نثر اگرچہ فسانۂ عجائب کی نثر نہیں، لیکن یہ سرسید و حالی و عبدالحق کی نثر بھی نہیں۔ اسلوب کی سطح پر مولانا نے رومانیت کو فروغ دیا۔ ان خصیت میں ایک طرح کا تصنع تھا اور یہ تصنع ان کی نثر میں بھی ہے وہ آرائش کا بہت خیال کرتے تھے اور اپنے مسودات میں کانٹ چھانٹ تے رہتے تھے۔ ان کی نثر میں جاذبیت اور حسن تو ہے لیکن ان کا آرٹ تصنع کا آرٹ ہے، یہ زندگی کا آرٹ نہیں اور اس میں وہ بے ساختگی فطری پن نہیں جو غالب کے آرٹ کا وصف ہے۔ مولانا ادیب اتنے بڑے نہیں تھے جتنے بڑے سیاست دان تھے وہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھے اور انہوں نے ملک و قوم کی نہایت اہم خدمات انجام دیں۔

آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے فاضل مقرر جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ موصوف نے کہا کہ تحقیق اور ادبی تنقید کا سب العین حق کی تلاش اور ان قوموں کی دریافت ہے جو زبان و ادب کی تشکیل کے پیچھے بروئے کار ہوتی ہیں جناب مالک رام اور ڈاکٹر ف حسین خان دونوں نے اردو میں تحقیق اور تنقید کا معیار و اعتبار پیدا کیا ہے

(مرسلہ:- امین عالم راکھی)

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

سنہ ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ — مولانا سعید احمد اکبرآبادی — میاں بشیر احمد — خواجہ غلام السیدین — رئیس احمد جعفری

ماہر القادری — فرقت کاکوروی — نواب مشتاق احمد خاں — ڈاکٹر محتشر عابدی — ڈاکٹر احسن فاروقی

سید شبیر علی کاظمی — ڈاکٹر وزیر آغا — سید قدرت نقوی — رئیس امروہوی — ابو سلمان شاہجہانپوری

اور دیگر اہل قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

★—★—★

"**مرقع عبدالحق**" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

—

"**بزم عبدالحق**" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کا تذکرہ۔

—

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

—★—

آفسٹ کی چھپائی، عمدہ سفید کاغذ —— صفحات ساڑھے تین سو قیمت چھ ر

انجمن ترقی اردو — بابائے اردو روڈ — کراچی ۱

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

(اشاریہ بابت ماہ ستمبر ۶۶ء)

ادبیات اردو

تاریخ و سیاسیات

تعلیمات

تہذیب و تمدن

سائنس و طب

سیر و سیاحت

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

اقبال حضرت علامہ

عبدالحق، بابائے اردو مولوی

غالب، اسد اللہ خاں

دیگر شخصیات

صحافت

کتابیات و کتب خانے

لسانیات

مذہبیات

سیرت و سنت نبوی صلعم

قرآن و تفسیر

مسائل و مباحث

نفسیات

پیش نظر اشاریہ کی ترتیب میں ستمبر ۱۹۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

سہ ماہی اردونامہ کراچی ستمبر ۱۹۶۶ء ماہنامہ جامعہ دہلی ستمبر ماہنامہ کتابی دنیا کراچی ستمبر

ماہنامہ افکار ” ” ” چراغ راہ کراچی ” ” ماہ نو ” اگست و ستمبر

پندرہ روزہ الارشاد ” ۱۰ جولائی و یکم اگست ” خاتون دکن حیدرآباد ” ” معارف اعظم گڑھ ستمبر

ماہنامہ البلاغ بمبی ستمبر ” رہنمائے تعلیم دہلی ” ” مولوی دہلی ”

” الرحیم حیدرآباد ” ” زندگی رام پور ” ” مہر و ماہ لاہور اگست

” انجمن اسلامیہ میگزین کراچی ” ” سب رس حیدرآباد اگست ” میثاق ” ”

” انوار اسلام رام نگر بنارس ” ” شاعر بمبی اگست ستمبر ” ہمایوں دہلی ستمبر

” آجکل دہلی اگست ستمبر ” صبح دہلی ” ” ” ہمدم کراچی آزادی نمبر

” برہان ” ستمبر سہ ماہی صدف کراچی جلد ۲ نمبر ۲ ہفت وار رسائل

” بہائی میگزین لاہور ” ماہنامہ صبح امید بمبی ستمبر آئین لاہور، المنبر لائل پور، چٹان لاہور۔

” بینات کراچی ” ” طلوع اسلام لاہور ” شہاب لاہور۔ صدق جدید، لکھنؤ —

” پکچر (تاجور نمبر) لاہور ۱۹۶۵ء ” عارف لاہور ” قندیل لاہور۔ لاہور، لاہور۔ ہماری زبان،

” پیام عمل ” ستمبر ” عالمی ڈائجسٹ کراچی ” علی گڑھ۔

” تاج کراچی اگست ” فاران ” ” روز نامے

” تجلی دیوبند ستمبر ” فروغ اردو لکھنو ” انجام کراچی (صرف اشاعتہائے جمعہ و اتوار)

” تحریک دہلی ” ” فکر و خیال کراچی اگست جنگ ”

” ترجمان القرآن لاہور ” ” فکر و نظر راولپنڈی مئی تا جون و ستمبر حریت ”

” تہذیب الاخلاق ” ” ” قومی زبان کراچی ستمبر

” ثقافت ” ” ” کتاب لاہور ”

ادبیات اردو

مصنف	عنوان	ماخذ
احمد، انیس	دورجہاد کا افسانوی ادب	چراغ راہ، ص ۱۷ تا ۲۲، ستمبر
احمد دین مرحوم، مولوی	مجاز و حقیقت.	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۴۳، "
احمد مختار	ادیب، قومیت اور نظریہ	چراغ راہ، ص ۳ تا ۴، "
اختر، شمیم	ادب، سائنس اور زندگی	تاج، ص ۲۵ تا ۲۷، اگست
ارشاد، سید تقی احمد	حافظ کا اثر شعرائے اردو پر	شاعر، ص ۱۵ تا ۲۲، ستمبر
اعظمی، انجم	تقسیم کے بعد (اردو ادب)	افکار، ص ۳۱ تا ۳۴ + ۴۶، ستمبر
اعظمی، عبداللطیف	قومی شعور اور ادیب	صبح، ص ۶ تا ۸، اگست ستمبر
تاباں، مسعود قمر	نئی شاعری نیا زاویہ	شاعر، ص ۱۰ تا ۱۳، اگست
جعفری، رئیس احمد	گزشتہ جنگ کا اثر ہمارے ادب و شاعری پر	انجام، ص ۹، ۷ ستمبر
چودھری، جے کرشن	جائسی کے بارہ ماسے	آج کل، ص ۲۳ تا ۲۶، ستمبر
حامد، حکیم سید حامد علی	صحت مند شعر کے افادی پہلو	تاج، ص ۲۸ تا ۳۰، اگست
حق، وحیدالحق	تہذیب، تمدن اور معاشرت پر زبان کا اثر	ہمدم، ص ۸۹ تا ۹۵،
دیپ، چندر	"پردہ غفلت" پر ایک نظر	شاعر، ص ۱۰ تا ۱۲، ستمبر
رئیس امروہوی	خیال سے خبط تک	جنگ، ص ۷، ۲۶ "
رئیس، ناظر حسن	اردو ادب میں یورپین شعراء کا حصہ	ماہ نو، ص ۱۵ تا ۲۸ + ۵۹، ستمبر
سدید، انور	غلام الثقلین نقوی کے افسانے	" ، ۲۱ تا ۲۸ + ۶۲، اگست
سرور، پروفیسر آل احمد	نظم کی زبان	افکار، ص ۵۳ تا ۶۳، ستمبر
صدیقی، محمد اسحاق (مترجم)	ملیالم ادب	کتابی دنیا، ص ۱۰ تا ۱۲، "
صدیقی، محمد شکیل احمد	مومن فارسی غزل کے آئینے میں	فروغ اردو، ص ۳ تا ۱۰، "
طالب دہلوی	دلی کی شاعری کا ایک اسکول (۸)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۰ تا ۱۲، "
عالم، غیور	باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ	قومی زبان، ص ۴۵ تا ۵۰، "
علی، سید ساجد	ہماری شاعری	" " ۳۵ تا ۳۸، "
علیمی، سید اکمل	اردو ادب پر جنگ کے اثرات	انجام، ص ۹، ۷ ستمبر

علی، ڈاکٹر بشارت	فارقلیط (تصنیف عبدالعزیز خالد) پر ایک عمرانی نظر[1]	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۸، ۱۹ ستمبر
عنوان چشتی	اردو کی صوفیانہ شاعری	جامعہ، ص ۱۴۵ تا ۱۶۰، ستمبر
فاروقی، ضیاء الحسن	کاروانِ فکر (مجموعہ مضامین ڈاکٹر یوسف حسین خاں)	،، ،، ۲۲۴ تا ۲۳۱، ،،
فاروقی، نثار احمد	آثار الصنادید	آج کل، ص ۲۳ تا ۲۹، ،،
قریشی، ڈاکٹر وحید	ادب کا نیا دور جنگ کے بعد	قندیل، ص ۱۱ تا ۱۲، ۲۲، ۲۴ ستمبر
منیر، انوار	لیلیٰ اور لیلیٰ کے خطوط	شاعر، ص ۵۴ تا ۷۴، ستمبر
ناجی، ڈاکٹر عبدالعلیم	اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ (خورشید)	،، ،، ۶۵ تا ۷۶ + ۹۱، اگست
ناز، ایم ایس	سرحد کی لوک کہانیاں	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۲۵ ستمبر
نظیر صدیقی	اردو شاعری کا مزاج (ڈاکٹر وزیر آغا)	ماہِ نو، ص ستمبر
یاور، غبار	شاعری میں عقلیت	صدف، ص ۱۰ تا ۱۳

تاریخ و سیاسیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد کے سیاسی حالات	الرحیم، ص ۳۷۲ تا ۳۸۵، ستمبر
اسرار احمد	تحریک جماعت اسلامی — نقضِ غزل	میثاق، ص ۳۳ تا ۵۶، ،،
اطہر مبارک پوری، قاضی	اسلامی علوم کے عوامی مراکز مجالس اور امالی	البلاغ، ص ۲۳ تا ۳۵، ،،
انصاری، ڈاکٹر محمد ولی الحق	شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز	معارف، ص ۲۲۱ تا ۲۳۴، ،،
آفندی، راجہ محمد زبیر خاں	تاریخ پاکستان کے گزشتہ آٹھ سال	انجام، ص ۵، ۵ ستمبر
بولاٹیمقو، ہیکٹر		
زبیر صدیقی (مترجم)	قائد اعظم اور قومی جدوجہد	جنگ، ص ۴، ۱۲ ستمبر
حفیظ اللہ پھلواروی، محمد	حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی رواداری	فاران، ص ۴۴ تا ۴۸، ستمبر
،، ،، ،،	رسالت اور خلافتِ راشدہ میں علمی ترقیاں	انجام، ص ۶، ۱۰ ستمبر
جعفری، سید شبیر حسین	سعودی عرب	،، ،، ۶، ۲۵ ،،

---

[1] اس مضمون کی دوسری قسط ۲۶ ستمبر کے چٹان میں ص ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

و شاہ پوری	مسلمان قوم اشتراکیت کے سامنے میں[1]	آئین / ص ۱۰ تا ۱۱ / ۳۱ اگست
فری / رئیس احمد	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں[2]	انجام / ص ۱۲ / ۳ ستمبر
دری / خلیل	افریقہ میں اسلام کا ماضی[3]	ترجمان القرآن / ص ۶۰ تا ۷۷ / ستمبر
، ،	مصر اور اخوان	، ، ص ۷۸ تا ۸۸ / ،
بین / اسلام	متحدہ عرب جمہوریہ ۔ شہنشاہیت سے جمہوریت تک	ہمدم / ص ۴۷ تا ۱۱ /
بین / اعجاز	مجاہدین الجزائر کی جدوجہد آزادی	، ، ص ۵۳ تا ۵۵ /
احمد / مشفق	قائداعظم کے دو غیر مطبوعہ خط[4]	جنگ / ص ۵ / ۱۲ ستمبر
یا بادی / مولانا عبدالماجد	علی گڑھ ۔ کیا تھا، اور کیا ہے؟	صدق جدید / ۵ / ۳ ر ،
شدی / پیر علی محمد	مشرق و مغرب[5]	جنگ / ص ۱۲ / ۳ ر ،
یری / علی جواد	لکھنؤ کے شب و روز (۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء)	صبح / ص ۲۵ تا ۳۸ / اگست ستمبر
روش / رفعت	نقوش دلی (۱۹۳۶ء ۔ ۱۹۴۵ء)	، ، ۳۹ / اگست ستمبر
واتی / مولانا حکیم فضل الرحمان	سرسید اور دیوبند	برہان / ص ۱۶۵ تا ۱۷۸ / ،
سیل / محمد اقبال	اتحاد عالم اسلام اور سامراجی عزائم	آئین / ص ۸ تا ۹ / ۳۱ اگست
ابر / ڈاکٹر محمد	ترکیہ و پاکستان	ماہ نو / ص ۵۰ تا ۵۳ / ستمبر
اہر / سید جعفر	میر غلام بھیک نیرنگ اور ان کی شاعری[6]	انجمن اسلامیہ میگزین / ص ۴ تا ۱۸ / ستمبر
لم / خورشید	تجارت کا عالمی کردار	طلوع اسلام / ص ۳۳ تا ۴۱ / ،
بدالحق / ڈاکٹر محمد	چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی مذہبی اور ادبی صورت حال	فکر و نظر / ص ۶۹۹ تا ۷۱۰ / اپریل مئی
بدالقادر / شیخ	(ملک) کہاں ہے	لاہور / ص ۵ / یکم اگست

---

[1] سلسلہ مضمون ۸ ستمبر اور ۱۰ ستمبر تک جاری ہے ۔

[2] اس سلسلے کی دیگر اقساط اس ماہ کے جمعہ ایڈیشنوں میں ملاحظہ فرمائیں ۔

[3] بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر منظور الدین قریشی کے نام

[4] قومی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل و اخبار پر تبصرہ اور تاریخ کا مستقل سلسلہ، مضامین دیگر اقساط کے لئے دیکھئے ۱۰ ر اور ۲۴ ر ستمبر کا روزنامہ جنگ کراچی ۔ [5] ماہنامہ قومی زبان کراچی سے منقول ۔

مصنف	عنوان	ماخذ
عبدالرحمان، سید صباح الدین	سولہویں اور سترہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں	معارف، ص ۱۸۴ تا ۲۰۶، ستمبر
علی، ڈاکٹر جواد	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۱۴۳ تا ۱۷۴، "
عمر، محمد	دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب	آجکل، ص ۵ تا ۱۹، ستمبر
غازی، عبدالحمید	صدر ناصر اور اخوان میں کشمکش	المنبر، ص ۱۵ + ۲۲، ۹ ر ۱۷ ر ستمبر
فاروقی، محمود	اسلام کا عسکری نظام	حریت، ص ۳ + ۸، ۷ ر ستمبر
لطیف، اختر	چینی عوام کا انقلاب تا آزادی	ہمدم، ص ۳۳ تا ۳۴،
مجیب، پروفیسر محمد	ترکی پر ایک نظر	جامعہ دہلی، ص ۱۱۵ تا ۱۲۲، ستمبر
مسعود، محمد	مسلمانوں کے ہاں علم ہیئت	الرحیم، ص ۲۶۱ تا ۲۷۴، "
مشر، ستیہ دیو	وادی سندھ کی تہذیب اور دید	ہمایوں، ص ۲۹۹ تا ۳۰۶، "
ملک، بختیار	برٹرینڈ رسل امن فاؤنڈیشن رپورٹ (جنگ ویت نام سے متعلق)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۵۲ تا ۶۶، ستمبر
مہر، مولانا غلام رسول	اسلامی اندلس کی ایک جھلک	چٹان، ص ۵ + ۱۸، ص ۲۶ ر "
ناز، ایم ایس	پہلی جنگ عظیم سے پاک بھارت جنگ تک	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۱۸ ر "
نواز، محمد	تحریک جماعت اسلامی کا ایک تحقیقی جائزہ	فاران، ص ۲۲ تا ۳۷، ستمبر
ہارٹ، ایلین	شاہ فیصل سے انٹرویو	ثقافت، ص ۵۰ تا ۵۴، "
بوسٹیس، گراہم	اپوزیشن کے بغیر جمہوریت	تحریک، ص ۴۲ تا ۵۲، "
	اسلامیان ہند — غلامی سے آزادی تک	ہمدم، ص ۱۱ تا ۲۷
	جھنبھور میں ایک قدیم مسجد کی دریافت	انجام، ص ۲، ۲۴ ر ستمبر
	کشمیر کی سرگزشت (۳)	ثقافت، ص ۵۵ تا ۷۱، "
	مراکش — جنوبی افریقہ کی آزاد ریاست	ہمدم، ص ۳۷ تا ۴۷،
	نقش غزوات و سرایا جو عہد نبوی میں ہوئے	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۵ تا ۳۵،
	ویت نام — عہد حاضر کا رستا ہوا ناسور	ہمدم، ص ۵۹ تا ۶۵،

تعلیمات

رانا محمد	مشنری تعلیمی ادارے	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۳، ۵ ستمبر
پروفیسر سجاد	تعلیم و تربیت میں تفریحات کی اہمیت	فکر و خیال، ص ۳۲ تا ۵۲، اگست
حکیم محمد سعید	ہماری دانش گاہیں	لاہور، ص ۱۲ + ۱۴، ۱۵ اگست
حامد حسن	تعلیم کی ضرورت	فکر و خیال، ص ۱۵ تا ۱۸، اگست

تہذیب و تمدن

مولانا محمد تقی	ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت	تہذیب الاخلاق، ص ۲۲ تا ۲۷، ستمبر
الطاف	موجودہ صنعتی انقلاب اور مسلم معاشرہ	فکر و نظر، ص ۱۱۶ تا ۱۳۰، ستمبر
رشید، ڈاکٹر سید	ہمارا کلچر، ہماری تہذیب[1]	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۸ تا ۲۲، ستمبر

سائنس و طب

بدیع الزماں	کہکشاں اور اس سے پرے	آج کل، ص ۹ تا ۱۴، ستمبر
افسر	ہمارا طریقہ علاج — حکیم سید ذاکر حسین سے ملاقات	حریت، ص ۱۰، ۲۴ ستمبر
حکیم سید ساجد	طب یونان اور ریسرچ	جنگ، ص ۷، ۱۹ ستمبر
وقار	کائناتی شعاعیں	فکر و خیال، ص ۲۶ تا ۲۹، اگست

سیر و سیاحت

شاہ معین الدین احمد	میرا سفر حج (۳)	معارف، ص ۱۶۵ تا ۱۸۳، ستمبر
شار	چین میں چند روز (سفرنامہ چین قسط ۵)[2]	جنگ، ص ۲، ۵ ستمبر

---

[1] منقول از ماہنامہ قومی زبان کراچی [2] دیگر اقساط کے لئے دیکھئے ۱۲ ستمبر، ۱۹ ستمبر اور ۲۶ ستمبر کا جنگ ص ۳ اور ص ۲

شخصیات

سیرت، سوانح و خدمات

آزاد، مولانا ابوالکلام

ابوسلمان شاہجہانپوری — مولانا آزاد کی یاد میں اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر — ہماری زبان، ص ۶ تا ۸، ۱۵ ستمبر

" — مولانا آزاد کی یاد میں اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر (۲) — " " ۶ تا ۷، ۲۲ " "

اعظمی، ابوعلی — الہلال کے دو مختلف قسم کے مضمون — " " ۳ تا ۴، یکم "

سعدیہ، رضیہ — فاطمہ بیگم عرف آرزو بیگم (مولانا ابوالکلام آزاد کی بہن) — چٹان، ص ۹ + ۱۸، ۱۷ ستمبر

اقبال، حضرت علامہ

بیگم، زیب النساء — علامہ اقبال — چٹان، ص ۸ + ۱۲، ۱۹ ستمبر

بیگم عشرت — اقبال — انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶ تا ۸، ستمبر

جاوید، الطاف — فرد اور جماعت کا رشتہ — حکمت اقبال کی روشنی میں — فکر و نظر، ص ۶۶۱ تا ۶۷۲، اپریل مئی

صدیقی، محمد مظہر الدین — اقبال اور مسئلہ اجتہاد — " " ۷۲۱ تا ۷۵۶، جون

مصطفی، محمد — ڈاکٹر اقبال اور سیموئل راجرس — ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ ستمبر

عبدالحق، بابائے اردو مولوی

اختر حسین (صدر انجمن ترقی اردو پاکستان) — بابائے اردو کی پانچویں برسی — صبح، ص ۹ تا ۱۰، اگست و ستمبر

" " " — بابائے اردو کی یاد میں — قومی زبان، ص ۳ تا ۴، ستمبر

اختر، سلیم — چند ہم عصر (مولوی عبدالحق) — ماہ نو، ص ۹ تا ۱۸، اگست

حسرت کاسگنجوی — اردو کا جنازہ (بابائے اردو سے متعلق) — تاج، ص ۱۶ تا ۱۸، "

یک واقف کار (سہیل عظیم آبادی)

اور الیس ایم سرور	کچھ مولوی عبدالحق کے بارے میں[*] .	ہماری زبان، ص ۲ تا ۷، ۸ ستمبر
شہابی مفتی انتظام اللہ	چند یادیں (بابائے اردو سے متعلق	ماہ نو، ص ۷ تا ۸، اگست
عبداللہ، ڈاکٹر سید	بابائے اردو مولوی عبدالحق	صبح، ص ۱۱ تا ۱۵، اگست دسمبر

غالب، اسداللہ خاں

نیر کھوروی	سلسلۂ غالبیات ــ مسلسل	فروغ اردو، ص ۲ تا ۱۳، ستمبر
رائے ضیف	میں اور دیوان غالب کی مصوری	کتاب، ص ۴۳ + ۴۵، "
عبدالودود، قاضی	شمع انجمن اور غالب	صبح، ص ۸۴ تا ۹۴، اگست دسمبر
عشق آبادی، سحر	غالب اور عندلیب شادانی	" " ۵۲ تا ۵۶، " "

دیگر شخصیات

احمد، خواجہ جمیل	مہدی سوڈانی	حریت، ص ۱۰، ۳ ستمبر
احمد سعید	سیماب اکبر آبادی ــ ایک شاعر ایک انجمن	شاعر، ص ۶۱ تا ۶۲، "
احمد، مولوی ریاض الدین	امام اکبر آبادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳ تا ۴، ستمبر
اختر، کلیم	قائد اعظم	قندیل، ص ۲۳ تا ۱۱ ستمبر
سٹیفن، ایم ٹی	پاکستان کا پہلا گورنر جنرل	جنگ، ص ۵، ۱۲، "
اعظمی، عبداللطیف	عزیز لکھنوی اور ان کی خصوصیات شاعری	صبح، ص ۹ تا ۱۲، اگست دسمبر
" "	یاد عزیز لکھنوی	" " ۵ تا ۶، " "
اعظمی، اقبال احمد	حضرت امام اوزاعی	ثقافت، ص ۵ تا ۹، ستمبر
اکبر لاہوری، چودھری	چند تاثرات (متعلق علامہ تاجور)	پکچر، ص ۱۹ تا ۲۴،
لغت، شری ہنس راج	علامہ کیفی دہلوی	رہنمائے تعلیم، ص ۳ تا ۴، "
ایوب قادری، محمد	مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے	الرحیم، ص ۲۸۹ تا ۲۹۸، "

---

[*] ابوسلمان شاہجہانپوری کے چند سوالات اور جناب آل سرور کے جواب مطبوعہ ہماری زبان ۱۵ اگست کے سلسلے میں۔

مصنف	مضمون	رسالہ
می، پروفیسر خالد	علامہ تاجور کی شخصیت اور ان کی شاعری	پیکر، ص ۶۶ تا ۷۸،
جور، علامہ	تاجور کی کہانی تاجور کی زبانی[1]	" ، ۹ ،
غتائی، محمد اکرام	ولی گجراتی کا نام اور اس کے اختلافات	اردو نامہ، ص ۷ تا ۱۴، ستمبر
رحمت الاکرام، سید	فیض اور ان کا فن	جامعہ، ص ۱۳۲ تا ۱۴۳، "
سن، سبط	حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری	صدف، ص ۲ تا ۹،
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	مولانا تاجور سے یکجائی کی ایک یاد	پیکر، ص ۵۶ تا ۶۷،
راہی، کلیم	راجہ مہدی خاں	شاعر، ص ۲۳ تا ۲۷، ستمبر
رضوی، اختر	محمد محسن عرف دودھو میاں — مشرقی پاکستان کے ایک خدا رسیدہ بزرگ	انجام، ص ۵، ۳۰ ستمبر
رفیق، سعید احمد	الکندی	ثقافت، ص ۳۱ تا ۴۴، "
زیدی، علی جواد	رام بابو سکسینہ	ہمایوں، ص ۳۰۶ تا ۳۱۰، "
"	غنی کاشمیری	معارف، ص ۲۰۷ تا ۲۲۰، "
زیروی، ثاقب	آہ علامہ تاجور	پیکر، ص ۵۳ تا ۵۴،
ساجد، اعتبار	اقبال ارشد	قندیل، ص ۹ تا ۱۰، ۱۱ ستمبر
"	وزیر پانی پتی	" " ۲۰، ۲۵ "
سلمانی، مولانا محمد علی سید نفیس الحسینی (مترجم)	سیرت خواجہ گیسو دراز	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۲ "
سبط حسن، سید	یزداں و اہرمن کی ازلی پیکار (حکیم زرتشت کے حالات و تعلیمات)	حریت، ص ۱۲، ۵ ستمبر
سحر یوسف زئی	رحمان بابا کا تصوف	ماہ نو، ص ۴۱ تا ۴۴، اگست
سکسینہ بدایونی، دیریندر پرشاد	جگر بریلوی کا حب وطن	صبح، ص ۳۶ تا ۴۷، اگست و ستمبر
"	سرور جہاں آبادی اور شاکر میرٹھی	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ ستمبر
سومرو، فیض محمد	منفرد ہستی (قائد اعظم)	ماہ نو، ص ۹ تا ۱۱، ستمبر

---

[1] اس نمبر میں تاجور کے بہت سے مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔

	شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۲۹ تا ۳۲،
شاہین، سید مبارک علی	قائد اعظم اور کشمیر	انجام، ص ۱۱، ۱۲ ستمبر
شائق، احمد	استاد سید قطب	المنبر، ص ۷، ۹ / ۱۶ ستمبر
شجاع، حکیم احمد	شمس العلماء، مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۳۶ تا ۴۴،
شہابی، انتظام اللہ	حافظ امام الدین اکبر آبادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴، ستمبر
صابری، امداد	مولانا محمد سعید مرحوم	قومی زبان کراچی، ص ۷۵ تا ۷۷، "
صارم، مولانا عبدالصمد	شمس العلماء، تاجور	پکچر، ص ۲۵ تا ۲۸،
صدیقی، محمد علی	وان گو ـــ فن زندگی کی روشنی میں	شاعر، ص ۵۸ تا ۶۰، ستمبر
عاشق ہرگانوی، مناظر	فکر تونسوی کی طنز و ظرافت	" " ۲۶ تا ۴۲، "
عبدالرحمان، صباح الدین	عرشی صاحب	قومی زبان، ص ۲۴ تا ۳۲، "
عبدالوحید خاں، ڈاکٹر	مولانا تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۳۸،
عثمان، پروفیسر شیخ محمد	آغا خاں مرحوم کے مذہبی تصورات	فکر و نظر، ص ۱۳۱ تا ۱۴۰، ستمبر
عزیز، غلام ربانی	دل شاد	اردو نامہ، ص ۶۴ تا ۸۸، "
عزیز، نصر اللہ خاں	عبدالمجید سالک	صبح، ص ۵۷ تا ۶۲، اگست وستمبر
فائق، کلب علی	قمر الدین منت (۲)	تہذیب الاخلاق، ص ۴۸ تا ۵۳،
فکر تونسوی	نرلش کمار شاد	خاتون دکن، ص ۶ تا ۱۰، ستمبر
قریشی، طفیل احمد	علامہ ابن حزم	الرحیم، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸، "
قریشی، فضل حق	قائد اعظم کے خاندانی حالات پر ایک نظر	انجام، ص ۱۵، ۱۲ ستمبر
قریشی، محمد عبداللہ	علامہ تاجور کے استاد	پکچر، ص ۱۰،
کامل، مولانا محمد وارث مرحوم	علامہ تاجور	" " ۳۹ تا ۴۵،
کبریا کمال	رانی کیتکی کی کہانی	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۵، ستمبر
گپت، من متھو ناتھ	جنگ آزادی کے تین شہید	ہمایوں، ص ۳۳۴ تا ۳۳۹، ستمبر
مجید، حامد	جنرل محمد موسیٰ	قندیل، ص ۲، ۵ ستمبر
محب، احسن	سید وحید قیصر ندوی	" " ۲ + ۲۳، ۱۸ ستمبر
نظامی، شمس الحق	میرے فاضل استاد مکرم ـــ حامد حسن قادری	انجام، ص ۲، ۳ ستمبر

نظر زیدی	علامہ تاجور نجیب آبادی شاعر اور ادیب کی حیثیت سے	نکھار، ص ۴۷ تا ۵۶،
نظیر لدھیانوی، اصغر حسین خاں	علامہ تاجور اور ان کی شاعری	" " ۶۹ تا ۷۵،
نیازی، نیر نگ	قائد اعظم کی عالمی شخصیت	انجام، ص ۲، ۱۲ ستمبر
وفا راشدی	کوئی غلام مصطفیٰ بحیثیت قومی شاعر	ماہ نو، ص ۵۳ تا ۵۴ + ۴۴، اگست
ہاشمی، امین	حضرت شاہ ابوالمعالی	عارف، ص ۱۱ تا ۱۶، ستمبر
ہاشمی، وحید الحسن	احسان دانش شاعر فطرت	تہذیب الاخلاق، ص ۵ تا ۲۵، ستمبر
یقیش	ویت نام کا عظیم قائد — ہوچی منہ	عالمی ڈائجسٹ، ص ۹۶ تا ۵۷ + ۸۱، "
	اسعد گیلانی (۲)	چراغ راہ، ص ۷۳ تا ۵۴، ستمبر
نصیر حمید (مترجم)	پاکستان کا شمالی مجاہد — نواب زادہ شیر علی خاں	ماہ نو، ص ۴۵ تا ۵۰، اگست
	جنرل آغا محمد یحییٰ خاں	قندیل، ص ۲۳، ۲۵ ستمبر
	میرا مربی میرا اصلاح کار (علامہ تاجور)	نکھار، ص ۳۳ تا ۴۳،

صحافت

صدیقی، محمد اکبر الدین	رسالہ "افتخار" جاورہ	قومی زبان، ص ۹۳ تا ۴۴، ستمبر
ہیلی، سرولیم	صحافی اور اس کے فرائض	جنگ، ص ۷، ۱۹ ستمبر

کتابیات و کتب خانے

ابو سلمان، شاہجہانپوری	سنئے خزانے (فرنگی کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان، ص ۷۶ تا ۸۵، ستمبر
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	امیر مینائی کی دو کمیاب کتابیں	ہماری زبان، ص ۳ تا ۵، ۲۲ ستمبر
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۲۳ تا ۲۵ + ۲۲، "
بیبانی، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا (ماہنامہ معارف کا اشاریہ)	برہان، ص ۶۷ تا ۸۱، ستمبر
خلیل، وقار	نادر مخطوطات "ایوان اردو" میں	سب رس، ص ۴ تا ۹، اگست
شرف الدین، ابوالحسن محمد	ابو جعفر الداؤدی اور ان کی تصنیف کتاب الاموال	فکر و نظر، ص ۱۰۷ تا ۱۱۶، "
عمران خاں، حکیم محمد	ٹونک کے کتب خانے	معارف، ص ۲۰۲ تا ۲۰۳، "

فاروقی، ظہور الحق	کتب سازی اور لعبریات	کتاب/ ص ۷۶ تا ۸۶/ ستمبر

لسانیات

اردو نامہ	اردو لغت قسط نمبر ۱۹	اردو نامہ/ ص ۳۵۹ تا ۳۷۸/ ستمبر
افتخار حسین، آغا	فرانس میں اردو (آخری قسط)	افکار/ ص ۳۵ تا ۴۶/ ستمبر
پنجابی، ارشاد احمد	مرکزی اردو بورڈ	کتاب/ ص ۳۹ تا ۴۲/ "
پنڈت، غلام احمد	کشمیر میں اردو	قومی زبان/ ص ۵۱ تا ۵۶/ "
رزمی، کامل	اپ بھرنش	جامعہ/ ص ۱۴۹ تا ۱۵۳/ "
رضوی، فرزانہ ناز	اردو ــــ بحیثیت قومی زبان	انجام/ ص ۷/ ۵ ستمبر
سبزواری، ڈاکٹر شوکت	اشتقاقیات	اردو نامہ/ ص ۱۰۱ تا ۱۰۳/ ستمبر
عبداللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ	عربی کا مسئلہ	قومی زبان/ ص ۱۹ تا ۲۳/ "
فرید کوٹی، عین الحق	اردو الفاظ کی اصل	اردو نامہ/ ص ۹۱ تا ۱۰۰/ "
کاظمی، شبیر علی	اردو بنگلہ کا اشتراک	ماہ نو/ ص ۱۹ تا ۲۰/ اگست
مختار، روحی	عربی اہم کیوں؟	انجمن اسلامیہ میگزین/ ص ۳۴ تا ۴۲/ ستمبر
مرزا، غلام ربانی	علاقائی زبانوں کی آمیزش	ماہ نو/ ص ۴۵ تا ۴۹/ ص ستمبر
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	اردو کی آوازیں	اردو نامہ/ ص ۴۶ تا ۵۴/ "

مذہبیات

سیرت وسنت نبوی صلعم

اسحاق سلہٹی، مولوی محمد	کتابت حدیث	بینات/ ص ۴۱ تا ۴۷/ ستمبر
الاصبہانی، ابو الشیخ	اخلاق النبی صلعم	" " ۱۰ تا ۱۸/ "
فارانی، ابو طاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور/ ص ۵/ ۱۹ ستمبر
ــــ	کاروان رسالت	ہادی میگزین/ ص ۱۶ تا ۱۹/ ستمبر

	صدرنشیں بزم نبوت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم	الارشاد جدید، ص ۸۴ تا ۱۳۰، ۱۶ رجولائی و یکم اگست

قرآن و تفسیر

احمد، پروفیسر انیس	قرآن کا تصور انسان	فکر و نظر، ص ۷۹ تا ۱۰۶، ستمبر
ارشد، سید مطیع الحسن	امن عالم قرآن کی روشنی میں	تہذیب الاخلاق، ص ۴۵ تا ۵۸، ستمبر
اصلاحی، مولانا ضیاء الدین	قرآن کی اثر انگیزی	تجلی، ص ۳۵ تا ۴۴، ستمبر
اصلاحی، مولانا امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران	میثاق، ص ۹ تا ۲۸، ″
النقوی، علامہ سید علی نقی	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، ″
انصاری، ڈاکٹر محمد عبدالحق	قرآن و سنت میں اخلاق	فکر و نظر، ص ۱۴۱ تا ۱۴۹، ″
تھانوی، مولانا احتشام الحق	درس قرآن (سورہ بقر)[1]	جنگ، ص ۳، ۳ ستمبر
دریابادی، مولانا عبدالماجد	سورہ فلق	صدق جدید، ص ۵، ۹ ستمبر
″	سورۃ الناس	″ ″ ۵، ۲۳ ″
عثمان، پروفیسر شیخ محمد	قرآن کا معاشی رجحان	فکر و نظر، ص ۷۴۶ تا ۷۶۰، اپریل
مودودی، ابوالاعلیٰ	الذاریات (تفہیم القرآن)	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۳۶، ستمبر
نعمانی، مولانا محمد ولی	قرآنی آیتوں کا ربط شاہ ولی اللہ کی نظر میں	الرحیم، ص ۲۹۹ تا ۳۱۳، ستمبر

مسائل ومباحث

آزاد، مولانا ابوالکلام	صدائے توحید	صبح امید، ص ۹، یکم ستمبر
اکبرآبادی، سعید احمد	ہندوستان کی شرعی حیثیت	برہان، ص ۱۳۳ تا ۱۴۵، ″
السباعی، ڈاکٹر مصطفی الحسنی	مستشرقین کا تصور سنت (ترجمہ)	بینات، ص ۳۳ تا ۴۴، ″
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۱۵۵ تا ۱۶۶، ″
پھلواروی، شاہ محمد جعفر	طلاق	ثقافت، ص ۶ تا ۱۹، ستمبر
ٹونکی، مفتی ولی حسن	اسلامی قانون میں حد کا تصور	بینات، ص ۹ تا ۳۲، ″
رام نگری، ابو محمد امام الدین	آریہ سماجی عقیدہ نجات کا تحقیقی جائزہ	انوار اسلام، ص ۵ تا ۵۲، ″

---

[1] تفسیر قرآن مجید کا مستقل سلسلہ دیگر اقساط ۱۰، ۱۷ اور ۲۴ ستمبر کے جنگ میں ملاحظہ فرمائیں

مصنف	عنوان	ماخذ
یع اللہ، پروفیسر ابوشہاب	شرعی حدود کا فقہی تصور	فکر و نظر، ص ۳۷۴ تا ۳۸۱، اپریل مئی
" "	طلاق بدعت اور خاندانی منصوبہ بندی	" " ۷۷۰ تا ۷۷۶، جون
یری مولانا عزیز	قرآنی دعاؤں کی باتیں ۔ منکرین حدیث کے خیالات کا جائزہ	الارشاد جدید، ص ۱۰ تا ۱۵، جولائی اگست
رؤ محمد	اسلام کا معاشی انقلاب	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴، ۱۳ ستمبر
برازی، حکیم آزاد	شاہ ولی اللہ اور اسلامی سوشلزم	" " ۹، ۱۹ "
دیقی، عبدالحمید	تجدید مذہب اور اس کی ذمہ داریاں	ترجمان القرآن، ص ۳۷ تا ۴۸، ستمبر
دیقی، نجات اللہ	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	زندگی، ص ۹ تا ۱۴، ستمبر
باسی، پروفیسر منظور احسن	حدود اللہ کی بحث	آئین، ص ۸ تا ۹، ۱۴، ۲۰ ستمبر
مانی، محمد تقی	دعا کیوں کی جائے	فاران، ص ۴۴ تا ۵۸، ستمبر
مان، مولانا شائق احمد	اذان کیا ہے؟	انجام، ص ۵، ۳ ستمبر
ری، سید جلال الدین	انکار دین کے اسباب	زندگی، ص ۵۲ تا ۵۹، ستمبر
نل الرحمان، ڈاکٹر	مسئلہ زکواۃ ۔ چند سوالات	فکر و نظر، ص ۷۶۲ تا ۷۶۹، جون
سعود، خالد	زکواۃ (۲)	میثاق، ص ۹۲ تا ۹۳، ستمبر
، مولوی احمد	کتب سماوی پر ایک نظر	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶ تا ۱۵، ستمبر
دودی، ابوالاعلیٰ	برطانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل	ترجمان القرآن، ص ۴۹ تا ۵۹، "
مرایم اے، عبدالہادی	امام ابوداؤد صاحب السنن کے اصول درایت	فکر و نظر، ص ۷۵۰ تا ۷۶۵، جون
دی، سید سلیمان	اسلام کی تعلیم وحدت	المنبر، ص ۹ تا ۱۰، ۲۳ ستمبر
لے پوتہ، ڈاکٹر عبدالواحد	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ	الرحیم، ص ۲۴۵ تا ۲۶۰، "
	ابن سینا اور راسخ العقیدہ مسلمان	فکر و نظر، ص ۶۳۵ تا ۶۴۶، اپریل مئی
	مصابیح الاسلام کا تحقیقی جائزہ	تجلی دیوبند، ص ۲۶ تا ۳۷، ستمبر

نفسیات

مصنف	عنوان	ماخذ
یس امروہوی	القائے غیب	جنگ، ص ۷، ۱۹ ستمبر
" "	روحانی انقلاب (انسانی کردار کا نفسیاتی جائزہ)	" " ۷، ۲۶ "
" "	نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۲ تا ۱۱۹، ستمبر

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۰ شمارہ ۵

مئی سنہ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک اُردو کالج کے لئے مبلغ ایک لاکھ اکیس ہزار چھ سو چھیانوے روپے تہتر پیسے (۱۲۱۶۹۶ء۷۳) جمع ہوچکے ہیں۔ ان میں سے مبلغ اکسٹھ ہزار پانچ سو چوالیس روپے تینتیس پیسے (۶۱۵۴۴ء۳۳) کے ذاتی عطیات موصول ہوئے اور مبلغ ساٹھ ہزار ایک سو باون روپے چالیس پیسے (۶۰۱۵۲ء۴۰) رسائد کی فروخت سے جمع ہوئے۔ ذاتی طور پر عطیہ دینے والے اور رسائد کی فروخت سے رقم جمع کرانے والے حضرات اور اداروں کے نام "قومی زبان" میں مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ گزشتہ دو ماہ میں جو رقوم موصول ہوئی ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے۔

رسائد کی فروخت سے مندرجہ ذیل حضرات نے دو ہزار سے زائد رقوم جمع کرائیں

۱ :۔ جناب جمیل نشتر صاحب (یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کراچی) چھ ہزار پانچ سو پانچ روپے

۲ :۔ چیرمین میونسپل کمیٹی نواب شاہ دو ہزار تین سو ستائیس روپے

مندرجہ ذیل حضرات نے ذاتی طور پر عطیات عنایت فرمائے۔ ان میں سے عطیہ نمبر ۴ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کراچی کی معرفت ملا ہے۔ اور اس کے بعد کے تمام عطیات حبیب بنک لمیٹڈ کراچی کے ذریعے موصول ہوئے ہیں :۔

۱ ۔ جناب غلام فاروق صاحب ۔ وزیر تجارت حکومت پاکستان پانچ سو روپے

۲ ۔ اراگ لمیٹڈ ۔ حبیب چیمبرز جوڑیا بازار کراچی دس ہزار روپے

۳ ۔ فخری فرنیچر مارٹ ۔ کراچی چالیس روپے

۴ ۔ قسمر آٹو موبائیل ۔ کراچی سات سو پچاس روپے

۵ ۔ جناب محمد اصغر صاحب ۔ کراچی تریسٹھ روپے چالیس پیسے

۶ ۔ جناب کلو صاحب ۔ ایف ۶۷ کورنگی ۔ کراچی پچاس روپے

گزشتہ سال صدر انجمن جناب اختر حسین صاحب نے آفاقی اردو کالج کی تعمیر کے لئے عطیات کی جو اپیل کی تھی، اس سے قبل مندرجہ ذیل رقوم جمع ہوچکی تھیں۔

مختلف عطیات	ایک لاکھ چار ہزار ایک سو چھیاسٹھ روپے پچاس پیسے
امداد مرکزی حکومت	تیس ہزار روپے
امداد حکومت مغربی پاکستان	پچہتر ہزار روپے
امداد بلدیہ کراچی	ایک لاکھ روپے

صدر انجمن کی اپیل کے بعد رسائد کی فروخت اور ذاتی عطیات سے مبلغ ایک لاکھ اکیس ہزار چھ سو چھیانوے روپے تہتر پیسے جمع ہوئے۔ اس طرح جمع شدہ رقم چار لاکھ تیس ہزار آٹھ سو تریسٹھ روپے تیئس پیسے ہے۔ کالج کی تعمیر کا کام شروع ہوچکا ہے اور اس پر اب تک تین لاکھ ترانوے ہزار چار سو اکیاون روپے تہتر پیسے خرچ ہوچکے ہیں۔

واضح رہے کہ کالج کی عمارت کے لئے جو بیس ایکڑ زمین حاصل کی گئی ہے کے ڈی اے نے اُس کی قیمت مبلغ گیارہ لاکھ اکسٹھ ہزار چھ سو روپے مقرر کی تھی جس میں سے مبلغ آٹھ لاکھ اکہتر ہزار دو سو روپے کی رعایت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ بقیہ رقم کی ادائی کے لیے کے ڈی اے نے یہ سہولت بھی دی ہے کہ یہ رقم (مبلغ دو لاکھ نوے ہزار چار سو روپے) آئندہ دس سال میں مساوی سالانہ اقساط کے ذریعے ادا کی جائے۔

۷ - جناب محمد شفیع اللہ صاحب - دفتر ٹاؤن پلاننگ - کراچی۔ انتالیس روپے

۸ - پرل ٹریڈنگ کمپنی - صالح محمد اسٹریٹ - کراچی۔ سترہ روپے ترانسی پیسے

۹ - جناب عبدالستار صاحب - ۸۲۵ - فیڈرل بی ایریا - دہلی کالج - کراچی۔ پندرہ روپے

۱۰ - جناب جمال خان و بشیر محمد صاحبان - ۵/۱/۵۱ - دیپ چند اوجھا روڈ کراچی دس روپے

۱۱ - جناب عبدالرشید صاحب - ۸/۱۷ - ب/۱۳/ - لانڈھی کالونی کراچی دس روپے

۱۲ - جناب محب اللہ صاحب سیکشن آفیسر - وزارت مالیات کراچی پانچ روپے

۱۳ - جناب سید فصاحت علی صاحب ۳/۲۳/ پٹیل پاڑہ - کراچی پانچ روپے

۱۴ - جناب عطاء الحسن صاحب - کراچی پانچ روپے

۱۵ - بیگم آمنہ جعفر صاحبہ - ۶ جی - بلاک ۶ - پی ای سی ایچ ایس کراچی پانچ روپے

۱۶ - جناب محمد احمد صاحب ۳۶ سی - ۲۹/۳ - لانڈھی - کراچی پانچ روپے

۱۷ - جناب سید پاشا لودھی صاحب - ۳۱ - بی روڈ - لیاقت آباد کراچی پانچ روپے

۱۸ - جناب آفاق احمد خان صاحب ۸۳/ آئی - کورنگی کراچی چار روپے

۱۹ - جناب محمد اقبال صاحب پاکستان نیوی کوارٹر نمبر ۲۳۰ - کورنگی کراچی چار روپے

۲۰ - جناب جمال الدین صاحب بلاک سی شیرشاہ کالونی - کراچی دو روپے اسی پیسے

۲۱ - جناب معین الدین احمد صاحب - لسبیلہ ہاؤس ۱۴/ ۴۰۱ - لارنس روڈ کراچی دو روپے

۲۲ - جناب فخرالدین صاحب - پی اینڈ ٹی ڈائریکٹریٹ جنرل - بلاک نمبر ۲۵ - کراچی ایک روپیہ

۲۳ - جناب انعام اللہ صاحب - آدم جی سائنس کالج ۲/سی - دیپ چند اوجھا روڈ کراچی ایک روپیہ

۲۴ - جناب جعفر علی صاحب - ۱۵ - اے - زبیری کالونی - منگھوپیر روڈ کراچی۔ دو روپے

۲۵ - جناب امیر حیدر عابدی - ۱۸ - کنگھی بلڈنگ نیگ ہیبینڈ روڈ - کھارادر کراچی ایک روپیہ

۲۶ - جناب نبی اللہ - تاراچند روڈ - بلاک ۴۲ دکان ۳۹ - کیماڑی کراچی ایک روپیہ

پروفیسر شبیر علی کاظمی

اساسِ زبان

ہندوپاک کی سرزمین ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک ہزارہا ایسے واقعات کو جنم دے چکی ہے کہ جنھوں نے
ادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں انسان اور انسانی معاشرہ کو متاثر کیا ہے۔ مگر ان واقعات کے جنم داتا یعنی یہاں کے
ندوں کی نسلی داستان خود اپنی جگہ غیر متعین اور ہنوز پردہ خفا میں ہے۔ باوجود ہزاروں تحقیقات کے اصلیت کا
اروپ نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ جس طرح یہاں کے باشندوں اور ان کی نسلوں کا پورا علم نہیں اسی طرح
ان کی زبانوں کی اصلیت دریافت کرنا بھی قریب قریب غیر ممکن ہے۔ ہندوپاک کے شمالی میدان کی قدامت کے متعلق
زانیہ دانوں کے مختلف خیالات ہیں لیکن زیادہ تر اس امر پر متفق ہیں کہ شمالی میدان کے وجود سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا
ی سمندر بہتا تھا۔ جنوبی اور شمالی دو حدب تھے جو گونڈوانا اور انگارا کہلاتے تھے۔ زمین کی اندرونی تبدیلیوں کے
ث سمندر کی جگہ میدان اور پہاڑ پیدا ہوئے اور اس طرح دونوں حدب مل گئے اور انسانوں کے گروہ جو اپنی وحشی
لت میں گھوما کرتے تھے گھومتے پھرتے اس نئے میدان میں بھی آنکلے۔ اس میدان کا وجود پذیر ہونا۔ گونڈوانا اور انگارا
کے حدبوں کے باشندوں کا نقل مکانی کرنا آج کی دنیا میں جغرافیائی داستانیں ہیں۔ ہزاروں سال پرانی باتوں کو ہمارا جدید ترقی
فتہ ذہن پورے طور پر تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں ہے کہ انسان کا پہلا گھر تبت ہے اور
مر یہ بھی عوامی عقیدہ ہے کہ حضرت آدم گونڈوانا کے علاقہ لنکا میں پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا شمالی میدان کے باشندے ان ہی دونوں
روں سے آئے اور بعد کو مغرب سے سیلانی قبائل نے آکر تسلط جمایا۔ کیونکہ شمالی میدان کی زرخیزی۔ پانی کی فراوانی نے ہمیشہ
ی طرف کھینچا ہے۔ اسی طرح کول اور بھیل وغیرہ وہ ابتدائی قبائل ہیں جو شمال اور جنوب سے آکر شمالی میدان میں بسے اور بعدہٗ
راوڑ لوگ مغرب سے آئے جو پورے ہندوستان پر چھا گئے۔ اسلئے لفظ دراوڑ کو تحقیق کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ لغت اور
ریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ دراوڑ عہدِ عتیق میں تامل ملک کا نام تھا۔ اور تامل اور دراوڑ ہم معنی ہیں۔ ہندوپاک میں آریائی
سل کی زبانوں کے علاوہ دراوڑی زبانوں کا ایک گروہ ہے جس میں تامل۔ تیلیگو۔ ملیالم وغیرہ مشہور ہیں۔ اور تامل اور تیلیگو میں خاصہ

پرانا ادب موجود ہے اس ادب کی تخلیق مسیح سے قبل ہوئی ہے۔ اس وقت ہند و پاک میں سنسکرت یا آریائی ادب کا نشان بھی نہیں تھا۔ پرانی دراوڑی زبان کا رسم خط "وٹ لٹو" کہلاتا تھا جو عربی النسل تھا۔ دراوڑی تمدن کے نشانات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ دراوڑ قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک تھی۔ متمدن زندگی نے اُسے آرام کا عادی بنا دیا اور جب آریوں کے جنگجو اور غیر متمدن گروہ آ حملہ آور ہوئے تو یہ تاب مقاومت نہ لا کر پسپا ہو گئے۔ قتل و غارت کا شکار ہوئے۔ تباہ و برباد ہوئے۔ نقد جان کے ساتھ سرمایہ تمدن بھی لٹا بیٹھے۔ جو بچے وہ بھاگ کر جنگلوں میں چھپے، اور جو میدانی علاقوں میں رہے وہ ہمیشہ کے لئے غلام بنے اور شودر کہلائے ان کی تباہی کے ساتھ ان کی زبان بھی تباہ ہو گئی۔ غرضیکہ جہاں جہاں آریا پہنچے، دراوڑ اپنی عظمت کھوتے گئے۔ آریوں کی آمد سب سے پہلے پنجاب میں ہوئی۔ مگر اس وقت کا پنجاب آجکل کا پنجاب نہ تھا۔ اس کا رقبہ وسیع تھا۔ گندھارا اور پانی پت کے قرب میں آریوں کے مرکز قائم ہوئے۔ انھیں علاقوں کے قریب دراوڑوں کی تہذیب کے بھی مراکز تھے۔ جن کے آجکل کھنڈر ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ آریا جب آگے بڑھتے ہیں تو گنگ و جمن کے دوآب یعنی انتر ویدی علاقہ میں پہنچتے ہیں۔ یہاں بھی انھیں تہذیب و تمدن کے مرکز ملتے ہیں آریوں کے قبیلوں نے یہاں کے دراوڑوں پر بھی تسلط حاصل کیا اور ہمیشہ کے لئے یہاں کے ہو گئے۔ یہاں آب و ہوا پنجاب سے مختلف تھی مگر امن و امان زیادہ تھا۔ اس طرح آریوں کا تسلط پنجاب اور دوآب میں ہو جاتا ہے اور پھر وہ مشرق جنوب کی طرف بڑھتے ہیں آریوں کے انتر ویدی دو قبائل بہت مشہور ہیں۔ وہ کورو اور پانچلا ہیں۔ کورو قبیلہ کے پاس دلی اور میرٹھ کے قرب و جوار کا علاقہ تھا اور پانچلا کے پاس موجودہ روہیل کھنڈ یعنی بریلی۔ سنبھل۔ رامپور۔ بدایوں۔ اور فرخ آباد وغیرہ۔ اضلاع تھے۔ پانچلا قبیلے میں بڑے بڑے راجا ہوئے جنھوں نے کورو کو شکست دی اور آریائی علاقہ میں اپنی دھاک بٹھائی۔ اس قبیلہ نے بڑے بڑے علماء اور فلسفی پیدا کئے۔ جن میں ارونی اور سوات کیتو آج بھی مشہور ہیں۔ اس علاقہ کے باشندے جنگ کے ماہر ہی نہیں تھے بلکہ صاحب علم بھی تھے۔ آریوں کی تہذیب کا یہی مخصوص علاقہ تھا۔ اور آگے چل کر یہیں برہمن مت پیدا ہوا۔ اِس علاقے کے بدلے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں پروہت کا درجہ سینا پتی سے نیچا تھا۔ سینا پتی بادشاہ جیسے اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ فوجی تنظیم کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف بھی اس کے فرائض میں تھے۔ یہ لوگ شہر کے اندر قلعے بناتے اور ان کو "پلور" کہتے تھے۔ اسی علاقے کے شہر سنبھل کے متعلق لکھا ہے "دسواں اوتار" "نس کلنک" نامی اب والا ہے اور وہ سنبھل مراد آباد میں وشن جس برہمن کے گھر میں ظاہر ہوگا"۔ یہی علاقہ اُردو کے خمیر کا اصل گھر تھا۔ پورے ہندوستان میں اردو زبان شہروں میں ہے لیکن یہاں اندرونی دیہاتوں میں بھی کتابی زبان بولی جاتی ہے۔ البتہ ش۔ ق کا سہو ہوتا۔ دراصل کھڑی بولی کا دیس ہے۔ بدھ مت کی آمد نے اس کی فضیلت کم کر دی۔ اس طرح آریاؤں کا تسلط سرسوتی سے لیکر گنگ کے دوآب تک پھیلا ہوا تھا۔ اور مشرق کی طرف بڑھ کر مخلوط النسل قبائل سے جا ملتا ہے جو مشرقی اور جنوبی بہار اور شمالی میں بستے تھے۔ اور جنوب کی طرف وندھیاچل قبیلوں سے جا کر ٹکراتا ہے۔ اس لئے دراصل۔ اردو کا خمیر اسی علاقہ میں تیار ہوا ہے۔ اور اس وقت کی کون سی بولی یا پراکرت ایسی تھی کہ جس نے اس کو اپنایا یہ بات ابھی تک مسلمہ طور پر قرار نہیں پایا

لسانیات کے ماہروں کے مختلف خیالات ہیں۔ اور اردو زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ جن کو عام لوگوں کی آسانی کے لئے چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی

۱۔ دراوڑی نظریہ۔

۲۔ آریائی نظریہ۔

۳۔ سامی نظریہ۔

۴۔ مسلم آریائی نظریہ۔

یہ ادوار اردو کی ابتدا اور آغاز سے متعلق ہیں لیکن یہ زبان اسی طرح چار لسانی ادوار سے بھی گذری ہے۔ جن کو دراوڑی۔ آریائی مسلمانی۔ اور یورپی کہا جا سکتا ہے۔ اور ان ادوار کی داخلی شہادتیں خود زبان کے قالب میں اس وقت تک موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گی ــــ بلکہ یہی خصوصیات اس کا بنیادی مزاج ہیں۔ جو اس کو دنیا کی دوسری زبانوں میں ایک ممتاز حیثیت دیتی ہیں۔

دراوڑی نظریہ

اُردو زبان جس پراکرت کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کا ہیولیٰ آریوں کی آمد سے پہلے موجود تھا۔ دراوڑ قوم کے تمدن کے نشانات جو اس وقت ہم لوگوں کے لئے فخر اور حیرت کے موجب ہیں اس امر پر دال ہیں کہ ان کی زبان بھی ان کے تمدن کی ترجمان اور خاصی جاندار ہوگی آریوں کے مقابلے میں وہ کمزور پڑے اور مار کھا گئے۔ آریوں کو اپنی جسمانی قوت پر ناز تھا اس کے سہارے انھوں نے دراوڑی تمدن کو نیست و نابود کیا اور ان کی زبان کو بھی ہڑپ لیا۔ دریاؤں کے کنارے تمدن کے ٹھکانے آریوں کی یورش کے سب سے پہلے نشانے بنے دراوڑ پیچھے ہٹے اور دور جا کر آباد ہو گئے جو باقی رہے وہ غلام بن گئے۔ اور اپنے آقاؤں کی خدمت میں لگ گئے۔ آریوں نے آگے چل کر اپنی فضیلت کو برقرار رکھنے کے لئے تہذیب کے ایسے اصول وضع کئے کہ دراوڑوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ اس وقت کے تمدن میں جو کچھ تھا وہ آریوں کی دین تھا۔ دراوڑ پیروں تلے روندے گئے۔ ان کی زبان بھی آہستہ آہستہ آریوں کے تمدن کی زبان میں ضم ہو گئی اور اپنی اصل یعنی دراوڑی نسل سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔

سنسکرت میں جو دراوڑی عنصر ہے اس کو برملا دراوڑی مانتے ہوئے شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی زبانوں کے محققین کو اپنے آریا نژاد ہونے پر فخر ہے اور دراوڑی عنصر کو اجاگر کرنے میں کچھ نسلی تفاخر کو ٹھیس لگتی ہے۔ مگر کبھی کبھی بات منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔ اکثر ہندوستانی باشندے خود کو آریوں کا جانشین متصور کرتے ہیں حالانکہ ذات پات کی پابندیوں کے باوجود معلوم نہیں ان میں کتنا دراوڑی خون موجود ہے۔ ادھر سنسکرت زبان کے دیسی عناصر کو دراوڑی کہنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ شودروں کی زبان دیوبانی میں داخل ہو جاتی ہے۔ لہذا دھرم تو یہیں بھرشٹ ہو گیا۔ اسی لئے شودروں کو ویدک اشلوک سننے کی بھی ممانعت رہی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود دیوبانی میں اپنی مادری زبان کے الفاظ ملا کر ذہنی کثری

کو دور پھینک کر مد مقابل ہو جاتے۔ اگر رگ وید کی تشریح مکمل ہو جاتے تو دراوڑی عنصر کا اور زیادہ پتہ لگ سکتا ہے۔ پرانی ایرانی اور ویدک زبانوں کے ذریعہ سے تو رگ وید کی تشریح مکمل نہیں ہو سکی۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ دراوڑی بولیاں قطعی طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں بلکہ دبے سُروں میں اپنا راگ الاپتی رہیں جو الہامی اور دیو بانی سروں میں ملکر اپنی انفرادیت کھو بیٹھا۔ رگ وید کے اندر صدہا دراوڑی لفظ ملتے ہیں۔ جن کی صورتیں مسخ ہو گئی ہیں ان کو صوتی اصولوں کے تحت اپنا گیا ہے کیونکہ آریوں کے قدرتی آلات صوت دراوڑوں سے مختلف تھے لہٰذا انھوں نے دراوڑی الفاظ کو اپنی صوتی ضرورتوں بلکہ مجبوریوں کے تحت بدل ڈالا۔ یہ الفاظ آج بھی ہند و پاک کی زبانوں میں مروج ہیں مگر غضب یہ ہے کہ بعض علماء ہماری زبانوں کے ان مروجہ الفاظ کو سنسکرت سے ماخوذ متصور کرتے ہیں جبکہ صورت حال بالکل برعکس ہے۔ اس کے علاوہ ہندو دیو مالا کے دیوتاؤں کی طویل فہرست ہمیں بتاتی ہے کہ آریوں یا ان کے جانشینوں نے دراوڑی دیوتاؤں کو بھی اپنا لیا ورنہ آریا تو چار پانچ دیوتا اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن فی الحال ان کی ایک خاصی بڑی فہرست ہے۔ اور عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ سب آریائی ہیں۔ اس طرح عقائد کی دنیا میں بھی سب کچھ آریوں ہی کا مانا گیا۔ سیاسی فوقیت اور برتری نے دراوڑی تمدن۔ عقائد اور زبانوں کو آریوں کی ملکیت بنا دیا۔ اور زمانہ کی ضرورتوں کے تحت ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور ہند و پاک کی پراکرتوں میں آئندہ چل کر ایک پراکرت یا اس کی شاخ ایسی ترقی یافتہ نکلی کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کے تمدن اور زبانوں کا اثر اس پر زیادہ ہوا اور وہی اردو کی جنم داتا مان لی گئی۔ حالانکہ اردو اپنی اصلیت میں اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ ہند و پاک۔

آریائی نظریہ

ہندوستان کی آریائی زبانوں کے محققین، مثلاً کیتھ۔ گریرسن اور ان کے تابعین اُردو کی ابتدا آریوں کی آمد سے سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو ایک خالص آریائی زبان ہے جو سنسکرت یا کسی ایسی پراکرت سے نکلی ہے جو آریائی نسل کی تھی۔ ان کے مفروضہ کے مطابق آریا ہندوستان میں مختلف گروہوں میں داخل ہوئے۔ ان کی آمد ۱۵۰۰ سال قبل مسیح بیان کی جاتی ہے۔ سنسکرت کے بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ آریا باہر سے نہیں آئے بلکہ آریا ہندوستان ہی کے باشندے تھے۔ لیکن اس رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ مسلّم امر یہ ہے کہ آریا وسط ایشیا سے آئے۔ رگ وید میں اس کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ اور جا بجا دیسی اور بدیسی باشندوں کے جھگڑوں کا تذکرہ ہے۔ ہند و پاک پہنچنے سے پہلے آریوں نے ایران میں قیام کیا جہاں ان کی زبان میں کچھ تبدیلی ہوئی یعنی ہند یورپی کے بجائے ہند ایرانی بن گئی، اور یہی زبان اُس زبان کی ماں ہے کہ جسے آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ آریوں کا داخلہ کوئی منظم صورت میں نہ تھا۔ مختلف گروہ مختلف اوقات میں داخل ہوئے۔ پرانے گروہوں کو امتداد زمانہ نے ہند و پاکستانی بنا دیا تو نئے گروہ پہنچے اور پرانے بسنے والوں سے مقابلے ہوئے۔ اسی لئے سنسکرت کی بعض کتابوں میں آریوں کو بدیشی نہیں کہا ہے۔

اس نظریہ کو پوری طرح مان لینے کے بعد یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آریوں کی آمد کے وقت ہند و پاک کے باشندوں کی کوئی اپنی زبان ضرور تھی ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان غیر آریہ اقوام کی زبان کا کیا حشر ہوا۔ قتل و غارت میں ان کی خاصی تعداد ماری گئی ہوگی مگر بالکل نیست و نابود نہیں ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا ان کی زبان بھی ان کے ساتھ باقی رہی ہوگی۔ آریوں کو اپنی ضرورتوں کے تحت غیر آریوں کا دست نگر رہنا پڑا ہوگا۔ اور اپنا کام نکالنے کے لئے مقامی بولیوں کو اپنانے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ ان کی زبان کو فنا کرنے کے بجائے اس کی بقا کے ضامن بنے ہوں گے البتہ اس طرح غیر آریائی زبان پر جو آریائی چھاپ پڑی ہوگی اس نے زبان کے رنگ روپ کو بدلا ہوگا۔ اور یہی مخلوط جدید بھاشا جو دونوں فریقوں کی ضرورتوں کی کفیل تھی آگے بڑھتے بڑھتے اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اردو کو خالص آریائی زبان ٹھہرانا ایک قسم کا تعصب ہے۔ اس میں ذہنی اور نسلی فوقیت کے احساسات جلوہ گر ہیں۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے کول اور دراوڑ بولیاں ہند و پاک تمدن کی پروردہ تھیں اور یہاں کے باشندوں کی ضرورتوں کی کفیل۔ زبانوں کی آمیزش نے سنسکرت کو جنم دیا۔ عوامی بولیاں اپنی من مانی کرتی رہیں۔ انھیں کی ایک ترقی یافتہ شکل اُردو ہے۔ لہٰذا آریا بھی اُردو کے جنم داتا نہیں۔ انھوں نے اس کو سنوارا ہے، ورنہ زبان کا ہیولیٰ پہلے سے موجود تھا۔ جس طرح ہند و پاک تمدن کو خالص آریائی نہیں کہا جا سکتا اسی طرح اردو کو بھی خالص آریائی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آریوں کو ہند و پاک پہنچ کر ایک ایسے تمدن سے سابقہ پڑا تھا جو ان کے صحرائی تمدن سے بہتر تھا۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ اس تمدن کی عکاسی کرنے والی زبانیں بھی خاصی جاندار ہوں گی مگر افسوس کہ اس وقت کے شمالی ہند و پاک کی دراوڑی زبانوں کا ادب محفوظ نہیں۔ البتہ یہ امر مسلم ہے کہ آریوں نے سنسکرت کو جنم دیا اور عوامی بولیوں یعنی پراکرتوں کو یونہی چھوڑ دیا۔ پراکرت کے عالموں نے دو معنی بتائے ہیں۔ اول پراکرت وہ زبان جو ہندوستانی باشندوں کی اصل زبان تھی۔ دوم پراکرت وہ زبان تھی جو سنسکرت سے ماخوذ تھی۔ جن علماء کا خیال ہے کہ پراکرت ہند و پاک کے باشندوں کی اصل زبان تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ پراکرتی کے معنی سنسکرت نہیں بلکہ اس کے معنی اساس ہیں کیونکہ سنسکرت کے تو معنی ترقی یافتہ۔ مُزیّن اور باقاعدہ کے ہیں جو خود اساسی زبان پراکرت یعنی عوامی کی زبان سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت تو علماء کی تحریری زبان بن جانے کے بعد عوام سے اپنا ناطہ توڑ بیٹھی مگر پراکرت کی کتابیں ان لوگوں کے لئے لکھی گئیں جو سنسکرت نہیں سمجھتے تھے یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں کہ جو زبان عورتوں اور بچوں کی سمجھ سے باہر ہو وہ معاشرہ میں اساسی زبان کی حیثیت رکھتی ہو۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ پراکرتیں وہ زبانیں ہیں جو سنسکرت یا سنسکرت جیسی زبان سے ماخوذ ہیں۔ یہ خیال لفظ پراکرت کی اس تشریح پر مبنی ہے جو ہیم چندر نے کی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

प्रकृतम । संस्कृतम तत्र भवं तत आगतं वा प्राकृतम ।

"سنسکرت زبان پراکرت سے نکلی ہے اور پراکرت سنسکرت سے"۔

اس کے علاوہ دوسرے ثبوت بھی ہیں مثلاً پراکرت کے ۱۵ فیصدی الفاظ سنسکرت سے ماخوذ ہیں اور پراکرت کی قواعد کی کچھ کتابیں ایسی ہیں جو سنسکرت قواعد کی تتمہ معلوم ہوتی ہیں۔ تیسرے پراکرت کی سب کتابیں سنسکرت میں لکھی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پراکرتیں دراصل سنسکرت سے نکلی ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پراکرت کے باقی ماندہ الفاظ کی اصل کیا ہے۔ یہ عوام

ں کی مادری زبانوں کے باقیات السالحات ہیں۔ علاوہ ازیں پراکرت کے صد ہا الفاظ شست پراکرت یعنی سنسکرت میں داخل
۔ اس طرح پراکرت نے سنسکرت کو جنم دیا۔ اور یہ کہنا کہ

प्रकृति : संस्कृतम . तत आगत प्राकृतम ।

" دراصل سنسکرت ہی زبان تھی اور اُسی سے پراکرت نکلی "

الٹی گنگا بہانا ہے۔ جبکہ خود سنسکرت کی تشریح میں پراکرت کے وجود کا اعتراف پوشیدہ ہے۔ مندرجہ بالا معنی قواعد
ہ۔ نے بیان کئے ہیں جن کو علماء نے قبول نہیں کیا۔ قواعد نویسوں نے زبان کی اصل کے متعلق کبھی غور نہیں کیا انھوں نے تو اس
، قواعد لکھ دی جو عام طور پر بولی جاتی تھی اور اس زبان کا مستقبل روشن تھا مگر اس زبان کی قواعد لکھنے کے لئے سنسکرت
ں کو اپنے سامنے رکھا اور وہی اصطلاحات استعمال کیں جو سنسکرت کے ذریعہ مقبول ہو چکی تھیں۔ انھوں نے لفظ پرکرتی
لے معنی میں نہیں بلکہ اساس کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

لہذا ہندو پاک کی یہ بولیاں اپنے اساس اور بنیادی خمیر میں دراوڑی نسل کی حامل ہیں۔ ان میں باہمی طور پر جو اختلافات ہیں وہ
بالمزید ثبوت ہیں کہ یہ ہرگز سنسکرت زبان سے ماخوذ نہیں ہیں۔ اردو جو عام طور پر فارسی اور سنسکرت کی بیٹی کہی جاتی
اوڑی خمیر سے اٹھی ہے البتہ اس کا سنگار آریائی ہے۔ تحقیق کی راہ میں سد راہ شمالی ہند و پاک کے دراوڑی ادب کی عدم
ہے۔ صرف الفاظ کی حد تک رسائی ہوتی ہے۔

سامی نظریہ

اس نظریہ کو پیش کرنے والے مسلمان علماء اور ادیب ہیں۔ ان میں نصیر الدین ہاشمی مولف "دکن میں اردو" مولانا سلیمان
ولف "عرب و ہند کے تعلقات" اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے کافی تحقیق و
کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ عربی و ہندوستانی بولیوں کی آمیزش سے ایک تیسری زبان پیدا ہوئی جو آئندہ چل کر اردو کہلائی۔ ان
، کا یہ فیصلہ لسانی اصول اور تاریخی شہادتوں کے تحت کچھ یک طرفہ سا معلوم ہوتا ہے۔ ہاشمی صاحب فرماتے ہیں کہ جنوبی
تان میں عرب سوداگروں کے تعلقات ظہور اسلام سے قبل قائم ہو چکے تھے اور ساحلوں پر ان کی بستیاں تھیں۔ لہذا عربی
ش جنوبی ہند کی بولیوں سے ہوئی اور اس طرح دکن میں اردو کی ابتدا ہو گئی۔ یعنی اردو دکن میں پیدا ہوئی اور دکھنی بولی
حیثیت ابتدائی تھی۔

دکھن میں عربوں کی آمد کب ہوئی اس کی تاریخ مقرر کرنا غیر ممکن ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عرب تاجر اسلام کے ظہور سے
سو سال پہلے سے سواحل دکن پر آباد تھے اور کاروباری تعلقات تو اس سے بھی پرانے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی
سے ہوتی ہے۔ دکھنی ادب کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے آگے نہیں لے جا سکتے۔ اس طرح یہ ہزار آٹھ سو سال کی

مدت بالکل خالی رہتی ہے اور اس مدت مدید میں عربی و دکنی بولیوں کی آمیزش پر کیا گزری کچھ معلوم نہیں۔ اس لئے عرب تاجروں کی آمد سے دکنی ادب کا منطقی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ دوم دکنی ادب کو قدیم بھی نہیں مانا جا سکتا کیونکہ دکنی ادب کے دور سے پہلے مرہٹہ دیس کے شاعر نام دیو اور گیان ایشور کے یہاں اردو کے ایسے نمونے ملتے ہیں۔ جو دکنی سے آسان ہیں۔ بدقسمتی سے یہ نمونے غیر اردو رسم خط میں ہونیکی وجہ سے عام نہیں ہو سکے۔ شمالی ہند کے بھی ایسے نمونے دستیاب ہو چکے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی سے پہلے یا دکنی کے ساتھ ہی ساتھ شمالی ہند میں ایک ایسی زبان بھی موجود تھی جو دکنی سے زیادہ صاف اور با محاورہ ہے۔ اس لئے دکنی زبان کو اردو کی ماں کیسے مان لیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ بہن البتہ دودھ شریکی بہن کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دکنی زبان ہماری رو بہ ترقی اردو زبان کا ایک مقامی چولا تھا۔

اس نظریہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ عربی زبان کی آمیزش سے علاقہ سندھ میں جو زبان پیدا ہوئی اور عرف عام میں سندھی کہلاتی ہے اردو کی ماں ہے۔ اس خیال کے موئید مولانا سلیمان ندوی و مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ہیں۔ ندوی صاحب اپنے مضمون جو کبھی "ہندوستانی" میں چھپا تھا اور اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" جو ہندوستانی اکاڈمی کی فرمائش پر مرتب کی تھی فرماتے ہیں: "معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ عربی اور فارسی کا میل جول بھاشاؤں کے ساتھ جس حصے میں پہلے ہوا وہ سندھ ہے۔ جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی" ایک اور جگہ فرماتے ہیں "عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی و ملتانی ہے۔ اس کے بعد پنجابی اور پھر اس کے بعد دکنی"

شیروانی صاحب کا قول ہے کہ "اندرونی اور بیرونی بولیوں کا سب سے پہلا سنگم سندھ کا علاقہ ہے، جہاں عرب ۱۱۳ھ میں آئے ان کی زبان عربی تھی۔ اس لئے اس زبان کا رواج ان کے عہد میں ہوا۔ اور یہ زبان سندھی کے دوش بدوش زبانوں پر عام ہوگئی"

ان نگارشات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اردو کا خمیر سندھ میں تیار ہوا۔ اور اردو کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے ہوتی ہے ان خیالات کو جب لسانی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ نظریہ اردو کے آغاز و ابتدا کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا البتہ اردو زبان کے تدریجی ارتقا کی ایک اور منزل واضح کر دیتا ہے۔ اول تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دو زبانیں مل کر ایک تیسری زبان پیدا کر دیں جبکہ وہ دونوں زبانیں مختلف النسل ہیں۔ ان کی داخلی اور خارجی صورتوں میں بعد المشرقین ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ سندھی رسم خط بعینہٖ عربی ہے۔ ایک محض خارجی دلیل ہے اور یہ رسم خط بھی مسلمانوں نے ایک عرصہ کے بعد اختیار کیا۔ یہ علاقہ مسلمانوں کی آمد سے بہت قبل ایک ایسے رسم خط سے واقف تھا جو عربی کی طرح دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا تھا۔ میری مراد "آرین پالی" کے خروشتی رسم خط سے ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربی الفاظ سندھی زبان میں داخل ہوئے اور آج تک موجود ہیں۔ عربی بولنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ شہروں اور وہاں بھی مخصوص علاقے میں آباد تھے۔ مقامی انتظامات کے لئے مقامی افسران کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی کم تعداد پر مبنی اقلیت اتنی بڑی اکثریت کی زبان سے مل کر ایک تیسری زبان پیدا کر دے گی۔ فوج اور حکام

ے توسّل سے الفاظ کا لین دین ہوا۔ عربی میں بھی کافی الفاظ ہندوستان سے چلے گئے اور آج تک جزوِ زبان ہیں۔ عرب کے باشندوں
رعربی بولنے والوں کا تعلق سیکڑوں سال سے دوسری زبان کے لوگوں سے ہے۔ اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں غیر عرب بھانت بھانت
بولیاں بولتے ہوئے عرب میں جمع ہوتے ہیں لیکن آج تک عرب میں کوئی اردو زبان پیدا نہیں ہوئی۔ تو بھلا ہندوستان ہی میں کیوں
دو ایسی جامع زبان اور مقامی بولیوں کی آمیزش سے پیدا ہو سکتی تھی۔ اس لئے دکن کی طرح سندھ بھی اردو کا مولد نہیں۔

اس نظریہ کی ایک فروگذاشت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے عرب تاجروں کے عمل اور لسانی کاوشوں کو ہندوستان میں صرف سندھ اور
من کے سواحل سے وابستہ کرکے اردو زبان کے ارضِ لسانی کو محدود کردیا۔ سواحلِ ہند میں بنگال کا ساحل بھی شامل ہے۔ اور اس
احل پر دنیا کا ایک بہت پرانا بندرگاہ چٹاگام بھی ہے۔ اور یہاں پر عرب نسل کے لوگوں کی بستیاں آج تک آباد ہیں۔ ان کی ایک
سومی زبان ہے جسے عرفِ عام میں چٹاگامی کہا جاتا ہے اور اس زبان میں دکھنی اور سندھی کی طرح صدہا عربی کے الفاظ شامل ہیں۔ ان
گوں کا لب و لہجہ اور خط و خال عربی النسل ہونیکے ثبوت ہیں۔ چٹاگام شہر میں بعض محلّوں کے نام بھی عربی زبان کے ہیں۔ اس لئے چٹاگامی
بان کا بھی وہی درجہ ہے جو دکھنی اور سندھی کا۔

مولانا ندوی نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں عربوں کے راستے کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :"..... سمندر
ے کنارے کنارے .... خلیج بنگال میں داخل ہوجاتے تھے اور بنگال کے ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برہما اور سیام
و کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستہ سے لوٹ آتے تھے"

اس بیان سے ثابت ہوجاتا ہے کہ چٹاگام عرب ملاحوں کا مستقر رہا ہے۔ اور یہاں بھی عربی اور مقامی بولی کی آمیزش سے چٹاگامی
بان پیدا ہوئی ہے جو سندھی اور دکھنی کی طرح اردو کی ماں ہے اور مشرقی پاکستان اردو کی جنم بھومی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عربی اور مقامی بولیوں میں لین دین ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ عرب مسلمانوں کی آمد سے پہلے عربوں
ور ہندوستانیوں کے کاروباری تعلقات کی مساوی حیثیت تھی۔ عربوں کو برتری اور ہندوستانیوں کو کمتری کا احساس نہ تھا۔ دنیوی لین
ین کے ساتھ ساتھ زبان کا لین دین بھی ہوتا رہا۔ باہمی مفاہمت کے لئے دونوں زبانوں سے کچھ نہ کچھ لے کر ایسا پیرایہ اختیار
یا گیا ہوگا جسے دونوں فریق سمجھ سکیں۔ ممکن ہے عربوں کو ہندوستانی زبانوں سے نسبتاً زیادہ اخذ کرنا پڑا ہو کیونکہ وہ زیادہ
صاحبِ غرض تھے، مسلمان عرب تاجروں اور حملہ آوروں کی آمد کے بعد حالات بدل جاتے ہیں۔ اور مذہبی و معاشرتی صدہا الفاظ
ربی سے ہندوستانی زبانوں میں داخل ہوجاتے ہیں، مگر مسلمانوں کی وسیع القلبی نے ہر مقامی زبان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا
ہے۔ اور مقامی بولیوں کو اپنا کر انھیں آگے بڑھایا ہے۔

لہٰذا اس نظریہ کے تحت ہم اردو کا دکن۔ سندھ یا چٹاگام میں پیدا ہونا نہیں مان سکتے۔ دکھنی۔ سندھی اور چٹاگامی پر عربی
ا اثر ضرور پڑا ہے۔ لیکن یہ ہرگز اردو کی "مائیں" نہیں بن سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ انھیں اُردو کی "ساحلی بہنیں" کہا جاسکتا ہے۔

مسلم آریائی نظریہ

سامی اور مسلم آریائی دونوں نظریے ایک ہی نقطۂ نظر کی پیداوار ہیں۔ جس کے مطابق اردو کا آغاز عربوں اور مسلمانوں کے داخلے
نگ بھگ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو زبانوں کی میل سے دنیا میں آج تک کبھی اور کہیں ایسی زبان پیدا
سکی جو اردو کی طرح مکمل۔ جامع اور توانا ہو۔ اس نظریہ کے سب سے بڑے حامی مولانا شیرانی ہیں۔ ان کے نزدیک اردو کا سب
قریبی تعلق پنجابی سے ہے۔ یعنی پنجاب اردو کا مولد و مسکن ہے۔ یہ بات شیرانی صاحب سے پہلے گریرسن بھی کہہ چکا ہے۔ لیکن
رانی صاحب نے اس نظریہ کو نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنجابی اور اردو میں بڑی مماثلت
۔ شیرانی صاحب نے اردو قدیم اور پنجابی میں مماثلت کے جو نکات پیش کئے ہیں وہ پنجابی ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اس وقت
دوسری پراکرتوں بالخصوص راجستھانی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ ان پراکرتوں کا ماخذ وہ اپ بھرنش ہے
شمالی ہندوستان میں روزمرہ کی حیثیت سے رائج تھی اور جسے عام طور سے دیشی بھاشا کہتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ
بی زبان خود اس زبان کی ایک مقامی صورت تھی جو شمالی ہندوستان میں رائج تھی۔ جس کے ایک طرف الہ آباد اور دوسری طرف شمالی
بصوبہ تھا۔ شیرانی صاحب نے اپنی تشریحات میں ارض اللسان کا تعین نہیں کیا ہے۔ شمالی میدان جس کا قدیم نام آریا ورت۔ جدید
ہندوستان۔ اور حالیہ نام ہند و پاک ہے ہمیشہ سے حکومت اور اقتدار کا پایہ تخت رہا ہے۔ اور بڑی بڑی حکومتیں اس جگہ
م ہوئیں اور بڑے بڑے واقعات مثلاً مہابھارت اور رامائن کے قصے اسی خطۂ ارض سے وابستہ ہیں۔ یہاں کی ہموار زمین اور پانی کی
لی نے ہمیشہ باہر کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اس علاقہ کے دریاؤں کے راستے بدلتے رہے ہیں۔ دریائے ہکرا اور دریا ہندا غائب ہو گئے
ب ان کی جگہ ریگستان ہیں۔ دریائے ستلج سو میل کے قریب اپنا راستہ بدل چکا ہے۔ لہذا پنجاب سے مراد وہ مخصوص علاقہ نہیں ہے جو
نی صاحب کے وقت میں صوبہ پنجاب کہلاتا تھا۔ بلکہ وہ اس سے زیادہ فراخ اور وسیع تھا۔ اس لئے اردو کسی حد تک اس زبان پر مبنی ہو سکتی
۔ جو بارھویں صدی میں پنجاب میں بولی جاتی تھی لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اردو اس زبان سے بالکل بے تعلق اور بے نیاز ہے جو اس
۔ دہلی کے اطراف دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستانی زبانوں اور بولیوں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ورنہ بارھویں صدی عیسوی سے قبل پنجابی اور دہلی
راف کی زبانوں میں اختلافات ظاہر کرنے والی بہت ہی کم خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ عہد حاضر میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کب پنجابی اور
ہلی کی زبانیں مختلف ہوئیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ اس علاقہ میں برج بھاشا کا بول بالا تھا۔ مقامی لحاظ سے اس میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔
یل شدہ صورتیں مختلف ناموں سے موسوم ہوئیں۔ جن میں اس وقت سب سے بہتر صورت کھڑی بولی کی تھی۔ کیونکہ یہ زبان ان
کی زبان تھی جو اس وقت برسر اقتدار تھے اور صاحب ملک و مال تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی یہ زبان عزت کی نگاہ سے
انی تھی لہذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو زبان کا اٹھان اس زبان سے ہوا جس سے پنجابی۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا

نکلی تھی اسی لئے ان سب میں مشابہت ہے۔

اس نظریہ کے تحت پنجابی پر تین زبانوں کا اثر پڑتا ہے یعنی عربی۔ فارسی اور ترکی۔ یہ تینوں زبانیں داخلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اردو میں ان کا اثر آمیزش الفاظ کی حد تک ہے۔ جس نے ہماری زبان کو مالا مال اور جلال بخشا لیکن یہ آمیزش ہرگز ہماری زبان کی پیدائش اور اب اس کے وجود کی ضامن نہیں۔ اور نہ مسلمان اردو زبان کے جنم داتا۔ البتہ یہ اس زبان کے دایہ ہیں۔ جس طرح مسلمان عربوں نے ایران میں پہنچ کر پرانی ایرانی کی خاک سے نئی فارسی کو وضع کیا اسی طرح ہندوستان میں پہنچ کر اردو زبان کے واضع ہوئے۔

ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان اپنے خمیر کے لحاظ سے دراوڑی۔ ہیئت کے لحاظ سے آریائی۔ حسن کے لحاظ سے سامی اور سنگار کے لحاظ سے سلمان اور توانائی کے لحاظ سے یو۔پی ہے۔ پورا ہند و پاک۔ اس کا وطن مگر اس اردو کی جنم بھومی پرانا پنجاب ہے کھڑی بولی کے علاقے نے اس کو چونچال کیا۔ دلی سے پورے ہندوستان میں پھیلی۔ یہ کسی جگہ اجنبی نہیں۔ علاقائی رنگ اور روپ مختلف ہیں مگر اصلیت کسی جگہ معدوم نہیں۔ دراصل یہ مشترکہ کلچر کی زبان ہے۔ اس کی قوت انجذاب بلا کی ہے اس میں سب کچھ سما سکتا ہے۔ یہ اس صلاحیت کی مالک ہے کہ انگریزی کی طرح عالمگیر زبان بن جائے بشرطیکہ اس کے بولنے والوں میں بھی وہی دم خم ہوں جو اس میں ہیں۔

ڈاکٹر محمود الٰہی

احتشام حسین بحیثیت نقاد

اب یہ حقیقت محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے جہاں ملک میں ہمہ جہتی تبدیلیاں ہوئیں وہاں شعر و ادب کو بھی نئی نئی راہیں ملیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اردو تنقید واضح طور پر تذکروں کے حدود سے آگے بڑھی اور اس کے انداز و نہج میں تبدیلی آئی۔ سرسید کا نام ناقدین کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن جن نقوش کو مرتب کرکے حالی نے ایک مکمل تصویر بنائی اور اس میں رنگ بھرا، وہ نقوش سرسید کے زائیدہ ہیں۔ ان کے مضامین میں ایسے فقرے اور جملے ملتے ہیں جن کی تفصیل، تشریح اور ترجمانی حالی کے یہاں ملتی ہے۔ حالی جن تنقیدی شعور و بصیرت کے حامل نظر آتے ہیں وہ صرف ان کی قوت اختراع کا نتیجہ نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے ایک وقیع اور ادب کے ایک شعبے کی حیثیت سے برتا۔ تنقید حالی کے یہاں ایک ضمنی اور ثانوی چیز نہیں۔ انہوں نے اسے ایک مستقل اور منفرد علم کا درجہ دیا۔

مقدمہ شعر و شاعری سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام تک اردو میں تنقیدی نگارشات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس ذخیرے میں کیا کچھ نہیں۔ تنقید کے نام پر مناظرہ و مجادلہ کیا گیا۔ ایک کی تنقیص دوسرے کی تحسین کی گئی، معائب اور منصفانہ رائیں پیش کی گئیں، تخلیقات کا تجزیہ کیا گیا اور تجزیے کے دوران تنقید کے مباحث و مسائل بھی زیر بحث آئے۔ لیکن اس طویل مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تنقید اور تخلیق کے درمیان مقابلے اور مسابقت کی روح دوڑی ہو۔ تنقید شعر و ادب کی رگِ جاں سے قریب ہوتے ہوئے بھی کبھی خود شعر و ادب کی رگِ جاں نہیں بنی۔ تنقید اور تخلیق دونوں کو اپنے اپنے منصب و محور کا احساس تھا اور دونوں ایک رشتے میں منسلک ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے قلمرو کے حدود میں تھیں۔ پچھلے پچیس تیس سال میں تنقیدی ادب کا جو اضافہ ہوا ہے وہ کوئی تشویشناک بات نہیں لیکن اس اضافے کے دوران مقابلے اور مسابقت کی روح دوڑتی رہی۔ کسی شاعر، ادیب یا نقاد نے اس کا اظہار کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے اردو کی تخلیقی قوتوں پر تنقید حاوی رہی ہے اور نظریاتی طور پر نہ سہی لیکن عملی طور پر تنقید کے مقابلے میں تخلیق ایک کمتر درجے کی چیز سمجھی جاتی رہی ہے، ناقدین

سے تنقید کے باب میں کتنا ہی عجز و انکسار سے کام کیوں نہ لیا ہو لیکن تنقید کی برتری کے نقوش ہمارے پچھلے ربع صدی کے لٹریچر میں پہچانے جا سکتے ہیں، یہاں اس پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے کہ کیا تنقید کی برتری نے اعلیٰ تخلیقی ادب کی نشوونما روک دی لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ برتری کے بڑھتے ہوئے رجحان نے بہت سی ادبی اور شعری صلاحیتوں کو گمراہ کر دیا جو لوگ اچھے ادب اور اچھے شعر کی تخلیق کر سکتے تھے انہوں نے اپنا موضوع بدل دیا اور وہ تنقید کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ صرف یہی نہیں کہ جن کی تخلیقی صلاحیتیں زیر تربیت تھیں وہی تنقید کی طرف بڑھنے لگے بلکہ جنہیں تخلیقی ادب میں حسن قبول حاصل ہو چکا تھا ان کے ہاتھ میں بھی نقاد کا قلم آگیا۔

تنقید نگاری کی رفتار یکایک تیز ہو جانے کے کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ہے "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" یہ ایک پیغام بھی تھا اور ایک نعرہ بھی اور اسے دونوں حیثیتوں سے برتا بھی گیا۔ اردو میں ادبی معرکہ آرائیوں کی کمی نہیں لیکن انجمن نے یہ آواز کچھ اس طرح بلند کی کہ اس میں سیاسی رستخیز کی خو بو بھی شامل ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذاکروں اور مباحثوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا آواز جس سطح سے بلند کی جاتی تھی، اسی سطح سے اس کا جواب دیا جاتا تھا، ترقی پسندی کی تحریک من حیث التحریک یہاں زیر بحث نہیں ہے اور نہ اس کے اثرات و نتائج کی نشاندہی کرنا مقصود ہے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے اردو میں شعوری طور پر تنقید کے مباحث و مسائل کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ ہمارے تنقیدی ادب میں آج مختلف نظریات کے رد و بدل کے قبول کے باب میں جو تحریریں ملتی ہیں وہ بڑی حد تک اسی تحریک کی دین ہیں۔

تنقید کی تیزگامی کا دوسرا بڑا سبب دانش گاہوں میں اعلیٰ سطح تک اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ ہمارا نظام تعلیم ناقص ہے کہ نہیں، یہ سوال اس حقیقت پر پردہ ڈال سکتا ہے کہ تعلیم و تعلم کا ایک بڑا مقصد امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اس طرح ہمارا طریقۂ تعلیم امتحان کا پابند ہے امتحانی پرچوں میں امیدواروں کو جس نہج کے سوالات سے واسطہ پڑتا ہے اسی نہج سے اسے پڑھایا جاتا ہے اگر دانش گاہوں کے پچھلے پچیس تیس سال کے امتحانی پرچوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوالات کی نوعیت میں تنقید اور اس کے اصول و مبادیات حاوی ہوتے جا رہے ہیں ــــ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طلبا اور اساتذہ نصاب کے واجبات سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ کوشش کرتے رہے ہیں۔

یونیورسٹیاں بجا طور پر اعلیٰ تعلیم کی علامتیں ہیں۔ یہیں سے علم و دانش کی نئی کرنیں پھوٹتی ہیں اور ہمیں اپنی صلاحیتوں کو جلا دینے اور انہیں بروئے کار لانے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اردو شعر و ادب کے باب میں طلبا اور اساتذہ کی سرگرمیاں جائز رہی ہیں لیکن ہوا یہ کہ طلبا جب یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو وہ تنقیدی بصیرت بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی جو سیاق و سباق کے لحاظ سے نصابی اور امتحانی تھی۔

- یہی نصابی اور امتحانی بصیرت یونیورسٹی کے باہر کے ادبی مذاکروں اور مباحثوں میں مشعل راہ بن گئی۔ اس کا رنگ اس وقت اور بھی تیز ہو گیا جب اس میں اس سیاسی رست خیز کی خو بھی شامل ہو گئی جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے تنقید کی طرف رجحان کی شدت اور تنقیدی نگارشات کی فراوانی نہ تو کوئی تشویشناک امر ہے اور نہ یہ اعلیٰ تخلیقی ادب کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے لیکن اردو میں تنقید کی نشو و نما جس انداز میں ہوئی ہے اس سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ تنقید کی برتری تسلیم کی گئی اور تخلیق کی اہمیت نظرانداز کر دی گئی جو صورت ۱۹۳۵ء میں تھی وہی کم و بیش آج بھی ہے اور یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک تنقید خود اپنا دائرۂ عمل نہ پہچانے گی اور جب تک ایک عقیدے کی صورت میں تخلیق کی اہمیت نہ تسلیم کی جائے گی۔

(۲)

تنقید نگاروں کے اس ہجوم میں چند ایسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں جن کی کاوشوں سے تنقید کی اہمیت و افادیت کا احساس عام ہو چلا ہے ان میں پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے نام سرفہرست ہیں، آخرالذکر نے سب سے زیادہ توجہ، انہماک، اور ریاضت سے کام لیا ہے اور وہی اردو کے سب سے بدنام نقاد بھی ہیں، کلیم الدین احمد کی بدنامی کا سبب دراصل ان کے استہزائیہ، مضحکانہ اور تمسخر آمیز جملے اور فقرے ہیں جو نہ تو ان کے شایان شان ہیں اور نہ خود تنقید کے۔ ان کا طرز تحریر استدلالی ہے۔ وہ تخلیقات اور رجحانات کا تجزیہ کر کے: ور اثبات و نفی میں دلائل پیش کرتے کرتے جب استنباط نتائج کی منزل پر پہنچتے ہیں اور گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا تو ایک تشنجی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے اور ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں جن کے بارے میں ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ وہ نہ تو ان کے شایان شان ہوتی ہیں اور نہ تنقید کے۔ بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد شاعر کو، ادیب کو، نقاد کو اور خود اپنے کو ایک سائنسداں کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں اور دو اور دو کا جواب چار اور صرف چار سننا چاہتے ہیں لیکن ان کا یہ مطالبہ صرف سماجی مفروضات پر نہیں ہوتا، ان کے استدلال، ان کے مطالبات اور ان کے تجزیے کی بنیاد علم و دانش، شعر و ادب کے عمیق مطالعے پر ہوتی ہے۔ انہیں عام طور پر مغرب زدہ بتایا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مشرقی بالخصوص اردو ادبیات کے منتہی نہیں ہیں، اردو ادبیات سے ایک ایک رگ سے وہ اتنا ہی واقف ہیں جس کی توقع کسی بڑے عالم یا نقاد سے کی جا سکتی ہے۔ وہ تنقید پڑھ کے تنقید نہیں لکھتے، وہ ادبیات کے اماموں کا صرف نام سن کر ان کے حوالے نہیں دیتے بلکہ وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے متن اور ان کے اسلوب کو سمجھ کر کچھ لکھتے ہیں اور ان کے ایک ایک نقص کو اس مقصد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ لوگ جسے خوب سمجھ رہے ہیں اس سے خوب تر کے لئے جد و جہد کریں، وہ اپنے ماضی اور اپنے حال سے مایوس نظر

آتے ہیں لیکن ان کی قوت تنقید کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب انتہا پسندی کی یہ نقاب ان کے چہرے سے ہٹا دی جائے ایک نقاد کو جس وسعت مطالعہ، دقت نظر اور قوتِ فیصلہ کا حامل ہونا چاہیئے وہ ان میں موجود ہے۔ ان کی تنقیدیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں اور ادبیات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ ادھر ان میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ انتہا پسندی اور تضحیک و تمسخر کی جو فضا "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" میں ملتی ہے، وہ فضا "عملی تنقید (حصہ اول)" میں نہیں ملتی اس میں ان کا تجزیاتی اور استدلالی انداز پختہ تر نظر آتا ہے اور انتہا پسندی اور تضحیک و تمسخر کی صرف جھلک ملتی ہے۔

آلِ احمد سرور اردو کے مقبول ترین نقاد ہیں۔ دنیائے تنقید میں قدم رکھتے ہی انہیں حسنِ قبولِ عام کی وہ منزل ملی جہاں آج وہ نظر آتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی کی ابتدائی کاوشیں اس کے بقائے دوام کی ضمانت بن جائیں۔ موجودہ صدی میں یہ خصوصیت یا تو ابوالکلام آزاد کے حصے میں آئی یا آلِ احمد سرور کے۔ آزاد اور سرور میں ایک مایوس کن مماثلت بھی ملتی ہے۔ آزاد نے جب کوچۂ ادب چھوڑا تو پھر ادھر بھول کر بھی نہیں آسکے۔ اب یہی بات آلِ احمد سرور کے بارے میں بھی کہی جانے لگی ہے۔ آلِ احمد سرور نے تنقید کو ادبی سلیقہ اور تخلیقی رکھ رکھاؤ دیا۔ انہوں نے اسے دلکش مگر وقیع فن بنایا۔ ان کے یہاں مجادلانہ اور مناظرانہ انداز نہیں۔ وہ سطحیت سے بہت دور رہتے ہیں، وہ نہ تو تبلیغ کرتے ہیں اور نہ اپنے نقطۂ نظر کے تسلیم کئے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ تنقید میں افہام و تفہیم کے قائل ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ سخن فہمی کی ایک فضا پیدا کر کے اپنے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ تنقید کے منصب و حدود کو جتنا آلِ احمد سرور نے پہچانا اتنا اور کسی نے نہیں پہچانا۔ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تنقیدیں اردو کے ادبی مزاج سے انحراف نہیں کرتیں، وہ اردو والوں کے لئے اردو کے ہو کے لکھتے ہیں۔ یہیں ان کے اسلوب کی بات آتی ہے۔ اسلوب اسی وقت ہدفِ ملامت بنتا ہے جب وہ ذریعۂ اظہار نہ بن کر خود اپنا مظاہرہ کرنے لگے سرور صاحب کا اسلوب انشائیہ کی یاد دلاتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ان کے مفہوم پر پردہ ڈال دے۔ سروح کے اندر خیالات کے متلاطم ہوتے ہوئے بھی وہ گفتار کے اسلوب پر قابو رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں نے یہ ثابت کر دیا کہ متغزلانہ اسلوب سائنٹفک نقطۂ نگاہ کا بھی ساتھ دے سکتا ہے۔

(۳)

پروفیسر احتشام حسین اردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کے مباحث و مسائل پر زور دیا۔ وہ شعر، ادب اور تنقید کے آداب و ضوابط مرتب کرنا چاہتے ہیں، وہ سخن سنجی کے اصول وضع کرتے ہیں، سخن فہمی کی فضا نہیں پیدا کرتے۔ وہ ادب کیا رہا ہے سے زیادہ ادب کو کیا ہونا چاہیئے کا جواب دیتے ہیں۔ وہ ایک نئی کائنات

کی بشارت دیتے ہیں، اور اس کی تعمیر و تزئین کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ یہ کائنات عبارت ہے جدلیاتی مادیت کے تصور سے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے معیارِ حسن کی تبدیلی کا جو نظریہ پیش کیا تھا، احتشام صاحب کی تنقیدیں اس کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہیں۔ شروع میں کہا گیا ہے کہ یہ نظریہ نعرہ بھی تھا اور پیغام بھی۔ احتشام صاحب نے اسے ایک پیغام کی حیثیت سے پیش بھی کیا۔ ان کے یہاں یہ تصور ایک عقیدے کی شکل میں نہیں بلکہ ایسے لائحہ عمل کی صورت میں پایا جاتا ہے جو عقل کی روشنی میں متعین ہوا ہے۔ انہیں اس تصور کے رد و قبول میں تشکیک کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جن سے وہ خطاب کر رہے ہیں، وہ بھی ان منزلوں سے ہو کر گزریں۔ وہ تبلیغ نہیں کرتے بلکہ حکمت و بصیرت کی ایک فضا قائم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس طرح لوگ خود اپنا راستہ متعین کریں۔ انہیں یقین ہے کہ اس طریقہ کار سے جو راہِ عمل متعین ہوگی وہ ان کے اختیار کردہ راستہ سے مختلف نہ ہوگی۔ ایک مبلغ کے یہاں جو جذباتی آتار چڑھاؤ، تخویف تہدید کی طرف جو میلان اور اپنے موقف کی قطعیت کا جو انانیتی اور پرشکوہ اظہار ملتا ہے، احتشام صاحب کی تحریریں ان سے یکسر خالی ہیں، وہ جب کسی مسئلے کو چھیڑتے ہیں تو اس ضمن میں وارد کئے جانے والے اعتراضات کو بھی سامنے رکھ لیتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تجزیئے کے دوران ان کا انداز استدلالی مگر تفہیمی ہوتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دوسروں کی باتیں سننا چاہتے ہیں اور ان کے حسن و قبح کو پرکھنے کے بعد ہی آگے بڑھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ کبھی آمرانہ اور تحکمانہ انداز میں دو ٹوک اور قطعی فیصلہ نہیں سناتے۔ ان کا ہر فیصلہ مشروط ہوتا ہے جسے ان کے دائرۂ بحث سے الگ لیجا کر پرکھنا مناسب نہیں، جو لوگ احتشام صاحب کو ایک سیاسی نظریئے کا مبلغ سمجھتے ہیں انہوں نے دراصل ان کی تحریروں سے زیادہ اس سیاسی نظریئے کے کیف و کم کو دیکھا اور پرکھا اور جو باتیں اس نظریئے کے بارے میں کہی جاتی ہیں وہ باتیں احتشام صاحب کی تحریروں کے متعلق کہہ دی گئیں۔ جو بُعد یا قرب سیاست اور ادب کے درمیان ہوتا ہے، بڑی حد تک وہی بُعد یا قرب اشتراکی نظریۂ سیاست اور اشتراکی نظریۂ ادب کے درمیان ان کے یہاں ملحوظ رہتا ہے۔

ادب میں ایک لچک اور کسی قدر تذبذب کی شان پائی جاتی ہے۔ اس میں کبھی کبھی یوں بھی ہے اور یوں بھی کی فضا ملتی ہے، ایک ادیب یا شاعر کے ساتھ پاسبانِ عقل رہتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں واضح اور علانیہ طور پر نہ سہی، احتشام صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ وہ ادبیات کے اس راز کو جانتے ہیں کہ اس میں سیاست دانوں جیسا احتساب نہ کارگر ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ یہی بات ہے کہ وہ اسلاف کے کارناموں کی نفی نہیں کرتے اور اس سے بڑی بات یہ کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کو اندھی تقلید کا حکم نہیں دیتے۔ ان کے یہاں وہ اصطلاحیں استعمال نہیں ہوتیں جو مارکس پرستوں کا تکیہ کلام بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کے معترضین کی یہ بات صحیح ہے کہ ادب سیاست نہیں ہے لیکن اعتراض کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ادب نفی سیاست کا بھی نام نہیں ۔ اگر ادب میں کسی مخصوص اخلاقی یا سیاسی نظامِ حیات کی روح دوڑ سکتی ہے تو احتشام صاحب جن نظریات کے حسن و قبح

پر بحث کرتے ہیں ان کی بھی گنجائش ہے۔ دراصل سلسلۂ گفتگو یہاں آکر ختم ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے، اس میں ادبی فضا برقرار ہے یا نہیں، احتشام صاحب نے اس نکتہ کو نظرانداز نہیں کیا۔ وہ اُسی تخلیق کو ادب یا شعر کہتے ہیں جس میں ادبی اور شاعرانہ فضا برقرار رہتی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں ایسے لوگوں کی قابلِ لحاظ تعداد تھی جنہوں نے ادب کو اپنے سیاسی نظریات کے استحکام اور ان کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا اور بقدر لب و دندان ان کا کام بھی نکلا یہ لوگ اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے، اس کا جواب اہلِ سیاست دیں گے، ادب میں ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس انجمن میں احتشام صاحب جیسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں جنہوں نے ادب میں وقیع اضافے کئے۔ ان کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ ایک سیاسی تصور کو ادب کے قالب میں ڈھال دیا اور اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ ادب کسی موضوع سے بیر نہیں رکھتا، ادب نے کبھی دوسروں سے رسم و راہ رکھنے پر پابندی عائد نہیں کی وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں جنہیں ملحوظ رکھا جائے۔

(۴)

احتشام صاحب نے باقاعدہ تنقید نگاری کی ابتدا ۱۹۳۹ء میں کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد نظیر اکبر آبادی کو ایک نقطۂ امتحان اور ایک معیارِ تنقید کی حیثیت حاصل ہوئی اور جس نے انہیں ایک عظیم عوامی شاعر تسلیم نہیں کیا، اسے رجعت پسندوں کی صف میں جگہ ملی۔ احتشام صاحب نے بھی غالباً سب سے پہلے اسی شاعر کو موضوعِ قلم بنایا، انہوں نے نظیر اکبر آبادی کے اکتسابات پر تنقیدی نظر ڈالی اور تاریخ ادب میں ان کی جگہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ اگرچہ احتشام صاحب کا پہلا مضمون تھا لیکن اس میں توازن اور اعتدال کی جھلک ملتی ہے انہوں نے اس رجحان کی بیخ کنی کی کہ نظیر ایک پرولتاری شاعر ہیں یا وہ دورِ جدید کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے نظیر کو اس زاویے سے بھی دیکھا جس سے ان کے معاصرین اور اخلاف دیکھتے رہے۔ انہوں نے نظیر کو اشتراکیت کے چوکھٹے میں نصب نہیں کیا بلکہ اس آئینہ خانے کو بھی دیکھا جس میں نظیر سانس لے رہے تھے۔ ان خوبیوں کے باوصف ان کی تنقید تاثراتی ہو کر رہ گئی ہے۔ نظیر کے نقادوں کو افراط و تفریط کا شکار بتاتے ہوئے وہ خود افراط و تفریط سے نہ بچ سکے۔ نظیر کے باب میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ ان کے ساتھ تذکرہ نگاروں نے انصاف نہیں کیا۔ اگر تذکرہ نگاروں کے محدود معیار کو دیکھا جائے تو یہی بات اکثر شاعروں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے اور پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ایک تحریک کی صورت میں نظیر کی تنقیص کی ہو، تذکروں میں ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جن سے نظیر کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے تذکرہ نگاروں کو معذور سمجھتے ہوئے بھی ان کی شکایت کی۔ نظیر نے جو خیالات اور تجربات پیش کئے ہیں کیا ان کے نقوش ان کے معاصرین اور ان کے پیش رووں کے یہاں نہیں ملتے؟ یہ ایسا سوال ہے جس پر

غور کرنے کی زحمت نہیں کی گئی، حالانکہ اگر صرف میرؔ اور سوداؔ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو نظیرؔ کے اسلوب کا جواز ان بزرگوں کے یہاں مل جائے گا۔ دوسرے نقادوں کی طرح احتشام صاحب نے بھی اس سوال کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ادب میں اسلوب کی بہرحال ایک اہمیت ہے اور احتشام صاحب اس کے قائل بھی ہیں لیکن نظیرؔ پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے ان کے اسلوب کا چنداں خیال نہیں کیا۔ احتشام صاحب کے خلوص یا ان کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا وہ خود اپنے اس مضمون سے مطمئن نہیں تھے یہاں تک کہ نظیرؔ پر انہوں نے ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں اس شاعر کا مطالعہ ایک وسیع تر فضا میں کیا گیا اور اردو شاعری کے رنگا رنگ رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اس مضمون میں ان خامیوں کا کھل کر اعتراف کیا گیا جن کی وجہ سے نظیرؔ ایک عظیم فنکار کے دائرے سے الگ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظیرؔ پر احتشام صاحب کی نظرثانی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد جذبات و تاثرات پر نہیں بلکہ علم و شعور پر رکھنا چاہتے ہیں اور وہ حقائق کو فریب کی تخیل کاریوں سے نہیں ملاتے، ان کی تنقید نگاری کی خشت اول ایک حکیمانہ بصیرت تھی جو امتداد وقت کے ساتھ پختہ تر ہوتی گئی۔

(۵)

احتشام صاحب کی تنقیدی کاوشوں کو حسب ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث و مسائل۔

(ب) عملی تنقید جس کے ذیل میں وہ مضامین آتے ہیں جن میں ادب کی کسی صنف یا تحریک پر روشنی ڈالی گئی ہے، یا کسی شاعر اور ادیب کے اکتساب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(ج) سیاسی، سماجی اور قومی مسائل۔

(د) اردو کے علاوہ ادبیات کے کسی گوشہ کا مطالعہ۔

(ہ) لسانیات۔

ان سارے موضوعات میں اگرچہ وہ اپنے بنیادی موقف سے انحراف نہیں کرتے لیکن موضوع کے اختلاف کی بنا پر ان کے نقطۂ نظر میں یکساں شدت نہیں رہ پاتی۔

انہوں نے دوسروں کی کتابوں پر دیباچے بھی لکھے ہیں، ان سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے کہ دیباچوں میں اکثر خیال اطراحباب کا گلہ ہوجاتا ہے کوئی کتنا ہی بااصول اور دیانت دار نقاد ہو لیکن دیباچے کی دنیا میں آتے ہی وہ مصلحت اور رافت نفس کا اسیر ہوجاتا ہے۔

"تنقیدی جائزے" سے لے کر "تنقید اور عملی تنقید" تک کا سفر انہوں نے تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث و

مسائل کے سہارے طے کیا۔ اس مدت میں انہوں نے عملی تنقید کے بھی نمونے پیش کئے لیکن ان میں بھی نظریاتی مباحث کا رجحان غالب ہے۔

"اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت"، "ادب اور اخلاق"، "قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد"، "مواد اور ہیئت"، "ادبی تنقید کے مسائل"، "افسانہ اور حقیقت"، "اصولِ نقد"، "اردو ادب میں آزادی کا تخیل" ایسے مضامین ہیں جن پر اردو تنقید کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ حالی کے بعد احتشام صاحب پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ادب اور تنقید کے اصول و ضوابط پر اس طرح بحث کی کہ فکر کو روشنی اور ذہن کو بالیدگی ملی، عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ احتشام صاحب (یا بعض دوسرے نقاد) اصول تنقید پر کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ناقدین بشمول احتشام صاحب اس پر معذرت کر لیتے ہیں بات کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ سوال کرنے والے تنقید کو صرف و نحو یا عروض کے مسائل کوئی فن مانتے ہیں جس کی تحلیل، ترکیب اور تقطیع کے لئے کچھ (سماعی اور قیاسی) قاعدے مقرر کر دیئے گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اصول عبارت ہے ان مباحث و مسائل سے جن سے ایک نقاد عملِ تنقید سے پہلے دوچار ہوتا ہے اور جس پر قابو پا لینے کے بعد ہی وہ آگے بڑھتا ہے تنقید میں ایک نقطۂ نظر اور ایک انداز گرفت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی توضیح اور تشریح کرنے کا مطلب ہے اصولِ تنقید کی توضیح و تشریح کرنا۔ ادب کیا ہے، مواد اور ہیئت میں کیا اور کتنا رشتہ ہے، ادب کا سماج سے کیا تعلق ہے، اخلاق کو ادب کا پاسبان ہونا چاہئیے کہ نہیں، یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات اصولِ تنقید کے ذیل میں آجاتے ہیں اور ان پر بحث کر کے کوئی نتیجہ نکالنا ہی اصول تنقید کا دوسرا نام ہے۔ یہ سارے سوالات احتشام صاحب کے سامنے بھی آئے اور ان کا جواب تلاش کرنے کی انہوں نے کوشش کی، اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ ان کے مضامین اصولِ تنقید کا درجہ رکھتے ہیں۔ یوں تو ان مسائل پر حالی کے بعد اب تک بعض اچھے لکھنے والے کبھی کبھی قلم اٹھاتے رہے ہیں، لیکن احتشام صاحب نے متعلقہ علوم کے مطالعے کے بعد اور معترضین کے اقوال پر نظر رکھتے ہوئے جتنے انہماک اور خلوص کے ساتھ قلم اٹھایا اتنا اور کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کی بھی کوشش رہی ہے کہ وہ اصولِ تنقید کی ذمہ دارانہ تدوین کریں۔ انہوں نے تنقید کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس سے اختلاف کیا گیا ہے اور کیا جائے گا، لیکن ان مضامین کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ اردو میں اصولِ تنقید پر کوئی کتاب نہیں حقیقت سے آنکھیں چرانا ہے۔ ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ تنقید میں نقطۂ نظر اور اندازِ گرفت کی توضیح و تشریح کا مطلب ہے اصولِ تنقید کی توضیح و تشریح۔ نقطۂ نظر اور انداز گرفت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اصول تنقید بھی بدل جائیں گے۔ احتشام صاحب کے تنقیدی اصول ان کے کام نہیں آئیں گے۔ جو ادب کو کسی اور زاویئے سے دیکھتے ہیں۔ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اصول تنقید پر کسی ایسی کتاب کا وجود میں آنا محالات میں سے ہے جو ہر نقطۂ نظر کا ساتھ دے۔

یہاں اس پر بحث کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ موقع کہ تنقید کے باب میں احتشام صاحب کا موقف کس حد تک قابل قبول ہے۔ دراصل یہ بحث اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس موقف کے محرکات کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مارکسیت کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کئے بغیر احتشام صاحب کے نقطۂ نظر کا بطلان نہیں کیا جا سکتا۔ مارکسی تصورِ حیات کے بارے میں دو رائیں ہیں اور رہیں گی، اسی طرح احتشام صاحب کا موقف بھی محل نظر رہے گا لیکن یہ سمجھنا ایک کھلی ہوئی غلطی ہے کہ انہوں نے مارکسیت کو من و عن قبول کیا ہے انہوں نے اس تصورِ حیات کو ادب کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ادب میں جگہ دی اور یہی ان کی سب سے بڑی دین ہے۔ انہوں نے مارکسیت کو ادبی زاویئے سے دیکھا سیاسی انداز سے نہیں۔ انہوں نے ترقی پسندی کے نام پر غلط قدم اٹھانے والوں کو ہر موقع پر ٹوکا اور نئے تجربوں میں ادب کے لوازم برقرار رکھنے پر زور دیا۔ انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی ناقد ادب کے محض "غیر ادبی پہلوؤں" ہی کو ادیب یا شاعر کا کمالِ فن سمجھے تو یہ ادب کے ساتھ بے ادبی ہوگی، اسے تنقید نہیں کہیں گے۔

پچھلے پندرہ بیس سال کی ادبی تخلیقات پر احتشام صاحب کے نظریاتی مباحث کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ ترقی پسندی کی تحریک کے متوسلین ادب میں جن سیاسی نعروں کو در آمد کر رہے تھے ان کا زور اس تحریک کے مخالفین نے نہیں بلکہ احتشام صاحب کے مضامین نے توڑا مارکسی نقطۂ نظر سے اپنی تمام تر دلچسپیوں کے باوجود انہوں نے ادب کو کمتر درجے کی چیز نہیں سمجھا۔ وہ صرف نقاد ہی نہیں بلکہ ادیب اور شاعر میں بلندیٔ فکر، وسعتِ مطالعہ اور پختگی شعور دیکھنا چاہتے تھے۔ آج انجمن ترقی پسند مصنفین نہ تو ایک تحریک کی صورت میں زندہ ہے اور نہ اس کی مخالفت میں پہلی سی صف آرائی ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ آواز ایک ہنگامی دور کی پیداوار تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئی بلکہ آج وہ آواز جزوِ ادب بن چکی ہے اور انجمن کے مطالبات ادبی سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ اردو میں ایسی تخلیقات کا قابلِ لحاظ ذخیرہ ہے جو نغمہ کے لحاظ سے مارکسی اور لے کے اعتبار سے ہندوستانی ہے۔ مارکسی نقادوں کی صف میں صرف احتشام صاحب کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جن کے مضامین توازن اور سنجیدگی قائم رکھنے پر زور دیتے رہے اور ہر ایسی تخلیق کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج سمجھتے رہے جو ادبی بے راہ روی کی حامل تھی۔

ترقی پسندی کی تحریک اردو کی ساری پچھلی شعوری اور غیر شعوری تحریک سے زیادہ موثر اور ہمہ گیر تھی۔ اس نے بین السطور میں ایک اور کام کیا اور وہ یہ کہ جو ذہن صرف ایک ڈھنگ سے سوچتے سوچتے جمود کا شکار ہو رہے تھے، انہیں جھنجھوڑا اور وقت اور ادب کے مقتضیات پر از سرِ نو غور کرنے کی دعوت دی۔ یہی کام سر سید کی تحریک نے بھی کیا تنقید کی دنیا میں جس کی قیادت حالی نے کی۔ کسی تحریک کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اس کے داعیات و مطالبات سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن روایت پرستی کے شکنجوں سے آزاد ہو جائیں۔ حالی نے شعر و تنقید کا جو تصور پیش کیا تھا اسے من و عن تسلیم کس نے کیا لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ حالی کی اسی پیش کش نے روایت پرستی کی بیخ کنی کی۔ ترقی پسندی کی تحریک

نے جمود شکنی اور روایت پرستی کی بیخ کنی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ اس ہمہ گیر اقدام میں احتشام صاحب کے نظریاتی مباحث نے اہم حصہ لیا ہے۔

اس مدت میں احتشام صاحب نظریاتی مباحث کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کرتے رہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے ان مباحث میں نظریاتی کش مکش کا عنصر نمایاں ہے اور انہیں عملی تنقید سے زیادہ نظریۂ تنقید کے خانے میں جگہ ملنی چاہیئے۔ ان میں بعض ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جن میں یا تو وہ نمایاں طور پر افراط و تفریط کے اسیر ہو گئے ہیں یا اپنے نظریے سے دور ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فانی بدایونی، سحر البیان پر ایک نظر، اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی معتبر کا رنگ سخن، اختر شیرانی کی رومانیت، سجاد ظہیر ادیب کی حیثیت سے، علی سردار جعفری ۔۔۔ رومان سے انقلاب تک ان کے ایسے مضامین ہیں جن پر عدم توازن، جذباتیت اور نقطۂ نظر سے اعراض کی پرچھائیاں آجاتی ہیں۔

(۶)

احتشام صاحب کا قلم کبھی جمود کا شکار نہیں ہوا۔ "تنقید اور عملی تنقید" کے بعد ان کے چار اور مجموعۂ مضامین شائع ہو چکے ہیں ان مجموعوں میں چند ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو یا تو پہلے کسی مجموعے سے ماخوذ ہیں یا ۱۹۵۲ء سے پہلے لکھے گئے۔ لیکن بوجوہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے، ایسے مضامین سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید اور عملی تنقید احتشام صاحب کے نظریاتی سفر کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد ان کے یہاں کیفیت کا واضح زوال ملتا ہے۔ یہ زوال بتدریج آیا ہے اور ہر مجموعہ پہلے مجموعے سے کم وزن نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے انحراف کر چکے ہیں۔ دراصل تنقید کے جن اصول و ضوابط کی وہ وضاحت کر رہے تھے اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی جیسا کہ اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک جزو ادب بن چکی تھی اور اس طرح وہ نقطۂ نظر عام ہو چکا تھا۔ بدلتے ہوئے حالات نے احتشام صاحب کو ان سماجی اور قومی مسائل کی طرف مائل کیا جن سے اردو والے بالواسطہ دوچار ہو رہے تھے، اردو میں ادھر تحقیقی ادب کا اچھا خاصہ اضافہ ہوا ہے، اب احتشام صاحب کے یہاں بھی تحقیق کا رجحان غالب ہے۔ اب ان کے موضوعات میں تنوع آگیا، اور "تنقیدی جائزے" سے لے کر تنقید اور عملی تنقید تک ان کے یہاں جو فکری تسلسل اور سمت و رفتار کی جو حد بندی ملتی ہے وہ تقریباً ناپید ہو گئی۔ یہ چند عنوانات ان کے موضوعات کی گوناگونی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں:۔

مشاعرے کی افادیت، غالب کے غیر مطبوعہ خط، قطب مشتری کی لسانی خصوصیات، آتش کی صوفیانہ شاعری، موازنۂ انیس و دبیر، قدیم ایرانی تہذیب، تلسی داس، ٹیگور کا اثر اردو ادب پر، امیر خسرو اور حافظ شیرازی، داغ کا ماحول، ہندوستانی ادبیات اور مسلمان، نیا ہندی ناٹک، امریکی تنقید کے چند پہلو۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان موضوعات کی اہمیت نہیں یا ان پر جو کچھ احتشام صاحب نے لکھا ہے، ان کی کوئی افادیت نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ تنقید کی جس طرح سے گفتگو کرتے آئے تھے، اس کے مقابلے میں ان مضامین کی سطح کچھ پست ہے۔ وہ اردو میں ایک نئے نظریئے تنقید کے خالق ہیں۔ ان کے مضامین نے ہر ہر قدم پر دعوت فکر و نظر دی ہے ان کے خیالات میں آنچ اور فیصلوں میں ایک حکیمانہ بصیرت ملتی ہے۔ انھوں نے تنقید کی اور نتیجے کے طور پر ادبیات کی سطح بلند کی۔ ایسے نقاد سے یہ امید رکھنا غلط نہیں کہ وہ اس سطح کو بلند سے بلند کرتا جائے گا۔ کم از کم پچھلے تین مجموعوں کو دیکھ کر ہماری مایوسی بے سبب نہیں۔ پچھلے چند سال سے ادب پھر گھٹی گھٹی فضا میں سانس لینے لگا ہے۔ روایت پرستی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں اور شاعر و ادیب مجہولیت و انفعالیت کی طرف مائل ہوتا نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں احتشام صاحب جیسے اہل نظر ہی ہماری راہ عمل متعین کر سکتے ہیں۔

احتشام صاحب ایک فلسفی نقاد ہیں۔ ان کے قلم کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ اصول و نظریات پر بحث کرتے ہیں۔ اب بھی جب کبھی وہ ان مباحث کو چھیڑتے ہیں تو وہ اقدام اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ بن جاتا ہے۔ تنقید میں ان کی برتری انہیں نظریاتی مباحث کی وجہ سے ہے۔ اردو تنقید کے مورخ کو صرف حرف ریزے نہیں ملیں گے کچھ گوہر نایاب بھی ہاتھ آئیں گے جن میں احتشام صاحب کے نظریاتی مضامین سب سے زیادہ آب و تاب کے حامل ہوں گے۔

انجمن کی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری	از بابائے اردو	۵-۵۰ روپے
وضع اصطلاحات	وحیدالدین سلیم	۷-۰۰ "
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
کیفیہ	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	۴-۵۰ "
سید احمد خاں حالات و افکار	از بابائے اردو	۴-۔۔ "
غالب فکر و فن	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
تلخیص الاردو (رسالہ "اردو" کا انتخاب)		۵-۵۰ "
مقالات گارساں دتاسی حصہ اول	گارساں دتاسی	۱۰-۰۰ "
اردو تھیٹر (تین جلدوں میں)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی قیمت فی جلد	۷-۰۰ "
سعادت یار خاں رنگین (حالات و کلام)	ڈاکٹر صابر علی خاں	۵-۷۰ "
محمد حسین آزاد (جلد اول۔ حالات)	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۸-۰۰ "
محمد حسین آزاد (جلد دوم) ادبی کارنامے	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵-۰۰ "
جلال لکھنوی۔ (حالات و انتخاب کلام)	ڈاکٹر محمد حسن	۳-۰۰ "
سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۶-۵۰ "
سودا۔ (حالات اور تبصرہ بر کلام)	شیخ چاند مرحوم	۷-۰۰ "
نیا ادب	پنڈت کشن پرشاد کول	۴-۵۰ "
آرٹ ان اردو پوئٹری (انگریزی)	شہاب الدین رحمت اللہ	۶-۷۰ "
فن شاعری (بوطیقا)	ارسطو مترجم پروفیسر عزیز احمد	۲-۵۰ "

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱۔

غیور عالم (علی گڑھ)

خواجہ حالی

جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں

حالی طبیعت کے اعتبار سے فرشتہ تھے۔ ادب میں شخصیت کا اظہار بھرپور نہ سہی لیکن بڑی حد تک ضرور ہوتا ہے ان کا یہ فرشتہ پن ان کی تحریروں میں بڑا صاف جھلکتا ہے۔

حالی نے شعوری طور پر سرسید کا اثر قبول کیا تھا ان میں متاثر ہونے والی شخصیت موجود تھی وہ انفرادی احساس اور تیزی جو شبلی کے ہاں ملتی ہے حالی کے ہاں نظر نہیں آتی۔ غالب اور شیفتہ سے متاثر ہوئے اور آخر میں سرسید کی شخصیت آفرین حیثیت کا اثر قبول کیا۔ سرسید کے اثر نے حالی کو نثر کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے میں مدد دی۔

سرسید کا دور اردو نثر کی تاریخ میں سنہرا باب ہے اس میں کئی دیوپیکر شخصیتیں نظر آتی ہیں خود سرسید نذیر احمد، حالی، شبلی اردو کے دیوزاد ہیں اس دور میں نثر کے معیار اور نثر کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس دور میں جدید شاعری، جدید تنقید اور سوانح عمریاں حالی کی دین ہیں۔ اپنی تخلیقات میں موضوع کے اعتبار سے جو اسلوب بیان حالی نے اختیار کیا ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آتا۔

شبلی اور آزاد اردو کے اچھے انشاپرداز ہیں شبلی کی ہنگامی نثر ایک کیفیت رکھتی ہے محمد حسین آزاد کی نثر کی ڈرامائیت نثر کے بنیادی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ سرسید کی سادہ نگاری اور منطقیت اور حالی کی سادہ نگاری میں فرق ہے ان کا ذہن تخلیقی تھا اس لئے ان کی نثر بے کیف ہے۔ ان کی تحریروں میں زور پیدا نہیں ہوتا وہ افسوسناک حالتوں کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں یہ حالی کی بجھی ہوئی طبیعت کی نشان دہی ہے وہ محمد حسین آزاد کی طرح چلتی پھرتی تصویریں نہیں بنا سکتے" لیکن ان کی نثر میں استدلال اعتدال سلاست اور روانی پائی جاتی ہے ہم ان کی نثر کو ادبی کیف کیلئے پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں ان کی نثر میں ان کی شخصیت اپنی رہتی ہے۔ انہوں نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ آزاد کی صناعی نذیر احمد کا زور بیان سرسید کی سادگی شبلی کی عالمانہ شخصیت اور رنگینی اپنی جگہ لازوال اور خوب ہیں لیکن آج نثر کا رجحان حالی کا رجحان ہے۔

اردو میں جدید تنقید حالی کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ اردو شاعری کی تنقید سخن سنجوں اور سخن فہموں کی داد اور تذکروں کے دندان تنقید سے گذر کر مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں نظر آتی ہے یہ تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں شعر و شاعری کے بارے

میں اصولی بحثیں ملتی ہیں یہ حالی کی جہاں اور حیثیتیں ہیں وہاں ان کی عظمت کی بڑی وجہ ان کی تنقید ہے۔

حالی ہماری ذہنی زندگی کے معمار تھے انہوں نے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا مقدمہ شعر و شاعری میں ایک ادبی بغاوت تھی جس کی بنا پر قدامت پرستوں کے ہاتھوں حالی کو نشانہ بننا پڑا لیکن حالی نے کبھی دم نہ مارا یہ آفاقی ذہن تھا جس نے انہیں اردو کا اچھا نقاد بنا دیا۔ حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب میں بھی ہمیں تنقیدی خیالات ملتے ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے حالی کی عظمت کا اعتراف کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کی مغرب سے واقفیت معمولی تھی اس سے بیشتر ان کے خیالات میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ مشرقی نقادوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی ملٹن اور میکالے کی طرف جھکتے ہیں لیکن ان کے ذاتی خیالات انہیں بڑی حد تک سنبھالے ہوئے ہیں۔

اردو تنقید پر حالی کا احسان ہے انہوں نے ادب کو مقصدی بنایا اور زندگی سے قریب کیا ان کے یہاں ہمیں ترقی پسندی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں مقدمہ شعر و شاعری کی نثر تنقید کے لئے مثالی نثر ہے۔

میں نے ابھی تک حالی کی مجالس النسا، مکتوبات حالی اور مضامین حالی کا ذکر نہیں کیا ان تصانیف سے بھی حالی کی شخصیت پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے مکتوبات حالی میں تو ہمیں بوڑھے حالی اپنی جوانی محبت کے ساتھ نظر آتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے محبت اور خلوص ٹپکتا ہے وہ اپنے چھوٹوں کو بھی نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ یاد کرتے ہیں تو ہمیں حالی کے نیک اور فرشتہ ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے وہ نیک انسان تھے اور ایسے بڑے فنکار تھے جن کا دل سب کے لئے دھڑکتا ہے۔

اردو میں سوانح عمریاں بھی حالی کی دین ہیں میں اس اظہار خیال سے جھجکتا ہوں کہ حیات سعدی سوانح عمری نہیں۔ جھجک میں اس لئے رہا تھا کہ اردو کے بڑے نقادوں نے اسے سوانح عمری شمار کیا ہے لیکن میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ سوانح عمری جس شخص کی لکھی جارہی ہے اس سے لکھنے والا کا ذاتی لگاؤ ہونا چاہئے۔ حیات جاوید اور یادگار غالب اردو میں اچھی سوانح عمریاں ہیں۔ حالاں کہ دونوں پر بعض اہل علم کو یہ اعتراض ہے کہ یادگار غالب تنقیدی جائزہ ہے اور حیات جاوید معاشرتی جائزہ۔

حیات جاوید کے سلسلہ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ ایک قومی ہیرو کی تاریخ ہے جس نے حالی کو بے پناہ متاثر کیا حیات جاوید میں انہوں نے خلوص محبت مروت اور عقیدت کا اظہار کیا حالی کا بنیادی اصول اخلاقی نقطۂ نگاہ تھا وہ نیک اور صلح کل تھے اس لئے کسی کی برائی نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شاید اسی لئے لکھا تھا کہ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے تھے اس لئے ناگوار واقعات کو ابھارنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دراصل یہ غلط فہمی شبلی کی اس تنقید سے پیدا ہوئی ہے کہ "حیات جاوید کتاب المناقب" ہے اور شاید اسی لئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا کہ شبلی نے معاصرانہ کمال کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ شبلی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے جملوں کو ہم حالی پر تنقیدی خیالات کا درجہ نہیں دے سکتے شبلی کا یہ تنقیدی زاویہ یا تنقیدی خیال حالی سے زیادہ خود سرسید پر ہے شبلی کے سرسید سے نظریاتی اختلافات چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خیر ایک دور میں

حالی حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے اور کہا تھا کہ سرسید کے ان کاموں پر خاک نہیں ڈال سکتا لیکن جب حیات جاوید لکھی تو انہیں کاموں کو رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا۔

حیات جاوید پر ہمیں مختلف تنقیدی اعتراضات ملتے ہیں ان تنقیدی خیالات اور نظریات کی اہمیت سے بحث نہیں لیکن یہ تنقیدی خیالات اس دور میں سوانحمری پر تنقید کو ظاہر کرتے ہیں۔

- کتاب ناقص ہے۔
- سرسید کی شخصیت نہیں ابھرتی
- حالی کارناموں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔
- حالی نے سرسید کے کمزور پہلوؤں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔
- حالی نے حیات جاوید میں عقیدت کا اظہار کیا ہے۔
- حالی اچھے فنکار کی طرح ہمیں حیات جاوید میں غیر جانبدار نظر نہیں آتے۔
- حالی نے حیات جاوید میں سرسید کے غلط کاموں اور نظریات کی پردہ پوشی کی ہے وغیرہ وغیرہ

اسی قسم کے اعتراضات ہمیں "حیات جاوید" پر ملتے ہیں لیکن ان تمام اعتراضات کے ساتھ اب تک "سرسید احمد خاں" پر حالی کی حیات جاوید سے بہتر کتاب نظر نہیں آتی۔ دنیا کی مقبول ترین سوانح عمری "لائف آف جانسن" پر بھی اعتراضات کی کمی نہیں۔ حیات جاوید لکھ کر حالی نے سرسید کے ساتھ اپنی محبت اور خلوص کا ثبوت دیا ہے انہوں نے اپنی تخلیقی سادہ اور پرکار نثر کے ذریعے سرسید کی شخصیت اور کارناموں میں رنگ بھرا ہے۔ حیات جاوید میں ایک ہمدردانہ برتاؤ ملتا ہے اور سرسید کے کاموں اور نظریات کو اس دور کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس میں حالی کا تاریخی تنقیدی اور سماجی شعور کارفرما ہے۔

حالی کی سب سے زیادہ مقبول سوانح عمری یادگار غالب ہے لیکن اس مقبولیت کی بڑی وجہ خود غالب کی دلچسپ شخصیت ہے حالی نے سسکتی ہوئی دلی کی محفلیں دیکھی تھیں حالی کے سینہ میں دلی کی یادیں محفوظ تھیں انہیں یادوں کے سائے میں انہوں نے یادگار غالب لکھی۔ یادگار غالب میں جو محبت اور خلوص ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے دلی کی محبت کے یہ سائے ہمیں یادگار غالب میں بہت گہرے نظر آتے ہیں۔

اکرام نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ حالی سے بہتر تنقید غالب پر اب تک نہیں لکھی گئی "یادگار غالب سوانح عمری بھی ہے اور تنقید بھی"، حالی نے غالب کے ساتھ بجنوری یا ڈاکٹر عبداللطیف جیسا انداز تنقید اختیار نہیں کیا۔ متوازن تنقید جو ہمیں حالی کے ہاں ملتی ہے غالب کے سلسلے میں کہیں اور نظر نہیں آتی غالب کے اشعار کی جو شرح حالی نے لکھی بعد کے نقاد ان سے بھی محروم رہے اب تک جو کتابیں غالب پر لکھی گئی ہیں ان میں یادگار غالب کا اثر صاف نمایاں ہے۔

حالی پر یہ اعتراض کہ ان کے ہاں شخصیتیں نہیں ابھرتیں بلکہ کارنامے اور حالات ابھرتے ہیں اس میں حالی کا قصور نہیں یہ ان کی شرافت تھی اسے آپ ان کی خوبی سمجھیں یا خامی کہ وہ ناخوشگوار پہلوؤں کو اپنے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ابھارنا پسند نہیں کرتے تھے۔

حالی کی تنقید نے غالب کو روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ شعرا میں انہیں ایک ممتاز درجہ دلایا ہے اور اردو اور فارسی میں ان کا درجہ متعین کر دیا ہے حالی نے لکھا تھا کہ "لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا"۔ اس جامع رائے کے سلسلے میں ہمیں ایک مغربی نقاد کا قول نہیں بھولنا چاہیئے جس نے کہا تھا کہ "شاعری یا شعرا کی تنقید کے لئے ہمیں صرف اچھے شاعروں پر بھروسہ کرنا چاہیئے"۔ اسی لئے بجنوری نے کہا تھا کہ غالب کا مقام متعین کرنا اور ان کے ساتھ پورا انصاف کرنا کسی شاعر کا کام ہے"۔

سوانح نگاریوں کے بارے میں تو صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ "یادگار غالب ایک عظیم شاعر کی سوانح عمری ہے جو ایک اچھے شاعر نے لکھی اور حیات جاوید ایک شریف ترانسان کی سوانح لکھی ہے"۔

ارسطو نے یونان میں جب اپنی مثالی ریاست کا نظریہ پیش کیا تو شعرا کو ناکارہ قرار دے کر اپنی ریاست میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن "فن شاعری" تنقید کی بنیادی کتاب خیال کی جاتی ہے ارسطو کی اس کتاب کے دنیا میں ترجمے ہی نہیں بلکہ اس کے تنقیدی خیالات اور نظریات کی آج بھی تشریحات اور تاویلات شائع کی جا رہی ہیں حالی نے بھی اردو کی بہت اچھی شاعری کی لیکن اردو شاعری کے سرمایہ کو گندا اور ناپاک دفتر قرار دیا انہوں نے اپنے اخلاقی، سماجی اور اصلاحی نقطۂ نگاہ سے اردو شاعروں اور شاعری پر سخت تنقید کی لیکن ہیئت کے اعتبار سے حالی نے اردو شاعری پر تنقید نہیں کی حالی اپنی شاعری کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں ان کی شاعری اصلاحی، اخلاقی اور تاریخی ہے اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں اس دور کے تمام شاعرانہ آداب ملتے ہیں اگر وہ اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتیں غزل کہنے پر صرف کرتے تو یقیناً ان کا شمار اردو کے بڑے غزل گو شعرا میں ہوتا ان اشعار کو دیکھئے۔

تنی نہ بڑھا پا کئی داماں کی حکایت	دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ
آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم	سب کچھ کہا کھلے نہ مگر رازداں سے ہم
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں	اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں	نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے	کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

کاش ہم میں سے پھر کوئی حالی اٹھے اور ہمارے ادب کا وسیع پیمانے پر جائزہ لے، وہ ہمارے ادب، شاعری اور ذہنی زندگی کا معمار ہو۔ ہمیں مغربی قدروں، خیالات اور نظریات کی غلامی سے آزاد کرے اور مشرقی فضا میں اعتماد و سربلندی اور فخر سے سانس لینا سکھائے۔

سید دل محمد فضا جالندھری

مکتوبات دل شاہجہان پوری

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہان پوری کا نام ضمیر الحسن خاں تھا۔ اور آپ کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے شاہ قاسم سلیمانی تک پہنچتا ہے جو سلسلہ قادریہ کے نہایت مشہور بزرگ تھے اور سید عفیف الدین کے خلفاء اجل سمجھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو مریدوں کی کثرت نے حکومت کو آپ کی طرف سے خائف کر دیا۔ اور دور جہانگیری میں آپ قلعہ چنار گڑھ میں مقید کر دیئے گئے چنانچہ ۱۱۰۶ھ میں بحالت قید آپ واصل حق ہوئے۔ اس طرح اول اول آپ کا خاندان ہندوستان میں آیا پھر بعد کو شاہجہان پور میں آپ کے آباؤ اجداد سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں ۱۸۷۵ء میں حضرت دل کی ولادت ہوئی آپ نے ابتدائی تعلیم کے مدارج گھر پر ہی طے کئے۔ خداداد ذہانت اور طبیعت کی بدولت آپ نے بہت جلد ترقی کر لی۔ پندرہ سال کی عمر میں شاعری کا چسکا پڑا سب سے پہلے آپ نے یہ شعر نظم کیا۔

چلا ہے آج کسی تیر مژگاں کسی کا ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

نقد طب عربی فارسی کی تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد استاد سخن حضرت امیر مینائی لکھنوی کو استاد منتخب کیا کچھ عرصہ بعد حلقہ تلامذہ حضرت استاد سے اصلاح لی بعد ازاں بمقام رامپور حاضر ہو کر زیارت استاد کا شرف حاصل کیا آپ کے ساتھ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل تشریف لائے انکے ساتھ ملازم تھے۔ ملازم کے سر پر ایک خوان تھا جس میں کافی مقدار میں شیرینی تھی فرمایا کہ جناب قبلہ نے بھیجی ہے عرض کیا کہ فرض شاگرد ہے کہ استاد کی خدمت میں شیرینی پیش کرے۔ حضرت جلیل نے فرمایا کہ جناب منشی صاحب (حضرت امیر مینائی) نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں (ضمیر حضرت دل کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں جس نظر سے مسعود احمد (خلف کوچک) کو لہذا بچوں کو شیرینی کھلانا فرض بزرگی ہے۔ دوسرے روز بوقت حاضری خصوصیت کا تذکرہ فرماتے ہوئے جناب منشی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "ضمیر" تمہاری شوخی طبیعت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا۔ سبحان اللہ حضرت استاد کی پیشین گوئی بالکل درست نکلی اسکے بعد حضرت دل اپنے استاد گرامی کی خدمت میں بارہا حاضر ہوتے رہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں لکھنؤ۔ سندیلہ۔ آگرہ الہ آباد۔ دہلی پٹنہ۔ رام پور۔ بریلی وغیرہ کے مشاعروں میں آپ کو بلوایا گیا۔ آپ نے ملک کے ممتاز اساتذہ حسرت موہانی۔ سیماب اکبر آبادی صفی لکھنوی عزیز لکھنوی ثاقب لکھنوی بیخود بدایونی دلاور فگار جگر مراد آبادی۔ فصاحت جنگ جلیل۔ اثر لکھنوی جوش ملیح آبادی اصغر گونڈوی یگانہ چنگیزی۔ سراج لکھنوی۔ فراق گورکھپوری کے ساتھ متعدد مشاعروں میں شرکت کی اور اہل ذوق سے خراج

نہیں حاصل کیا۔ کبھی کسی سے چشمک یا کسی چھوٹ کا سوال نہیں ملا۔ آپ کی خاندانی نجابت و وجاہت نے طبیعت میں ایک عجیب قسم کا انکسار پیدا کر دیا تھا جس سے ایک خاص وضع داری برتنے کے لئے اس کے ہو گئے۔

آپ نے دوران شباب ہی دو دولہ کے عنوان سے ایک ناول لکھا جو ملک بھر میں نہایت مقبول ہوا۔ یہ ناول ظیم اور مجبور کی محبت کا دلچسپ افسانہ ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف دل سوز ہے جو ۱۹۰۹ء میں رسالہ پیام یار لکھنؤ کے ہمراہ شائع ہوا۔ یہ انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ اس کی سنت تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی۔

۱۹۳۲ء کے دوران نغمۂ دل شائع کیا اور ۱۹۵۹ء میں کلیات ترانۂ دل کے نام سے طبع ہوا جس میں علامہ نیاز فتح پوری کا مبسوط مقدمہ قابل دید ہے ۱۹۳۷ء میں محکمہ تعلیم نے آپ کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں اپنے رسالہ کا دل نمبر نکالا جو کہ پونے دو صد صفحات کو محیط ہے۔ آپ کا انتقال ۲۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کو بمقام شاہجہان پور ہوا۔ مرنے سے قبل یہ مصرعے بار بار زبان پر آتے۔

اجل آتی تو مہلت دے کہ اک سجدہ ادا کر لوں

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

حضرت دل سے ۱۹۳۲ء میں خط و کتابت شروع ہوئی اور اگست ۱۹۵۹ء تک مسلسل جاری رہی میرے پاس ان کے مکتوبات کا کافی ذخیرہ تھا افسوس کہ مشرقی پنجاب کے ہنگامہ میں نذر ہو گیا۔ کچھ خطوط وہاں کے احباب نے (ہنجار پور اور مشرقی پنجاب) جو ان کے ہاتھ لگے مجھے بھیج دیئے جن میں پہلی قسط آج رسالہ ہذا میں شائع ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ یہ سلسلہ مسلسل جاری رکھا جائے گا۔

(۱)

۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء شاہجہان پور

مکرمی تسلیم۔ کلام واپس ہے۔ شاہجہان پور کے ایک مشاعرہ میں جو غالباً ۴ ستمبر ۱۹۳۲ء منعقد ہوا تھا۔ میں نے مرقومہ غزل پڑھی تھی۔ زمین پامال ہے تاہم بچ کر اشعار موزوں کئے ہیں بغرض مطالعہ ارسال ہے غیر مطبوعہ ہے نظم بھی ارسال ہے ہمہ ایں سیرو صاحب کلکٹر شاہجہان پور کی ستائش میں ہے۔ موصوف فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ صدر صاحب کا پتہ یہ ہے۔ غلام مہدی صاحب صابر مٹھالوی ہیڈ ماسٹر ور ضلع اٹک "

کوئی عجلت نہیں جب کافی وقت ہو اُس وقت ارسال کیجئے گا۔ نغمۂ دل کی اشاعت نے مجھ کو غیر معمولی مصروف اصلاحات کر دیا ہے بکثرت حضرات کا کلام آنے لگا۔ دس بارہ غزلوں کی اصلاح کا اوسط ہے کل نشتر فیروز پوری نے بھی دس جلدیں نغمۂ دل کی طلب کی ہیں۔ رہنمائے تعلیم دو ماہ سے غائب ہے۔

دل شاہجہان پوری

محلہ ہاتھی تھان

(۲)

۱۰ فروری ۱۹۳۳ء شاہجہان پور

والا نامہ از سلام نیاز۔ نوازش نامہ موجب اطمینان ہوا۔ دونوں نمبر مطالعہ سے گزرے آپ کے حسن خیال کا معترف پذیر ہوں کلام پر حقیقتاً آپ کی محنت سخی پر

یقین دلیل ہے۔ جزاک اللہ۔ دیوانِ نغمۂ دل کی کتابت ہو رہی ہے۔ جناب نیاز کا مقدمہ شامل دیوان ہوگا۔ دو تصویریں بھی شامل دیوان ہوں گی۔ ایک عالم شباب کی اور دوسری موجودہ زمانے کی۔ دیوان کو نظمی اور معنوی خوبیوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کا اندازہ ملاحظہ بالاستیعاب سے ہو سکتا ہے۔ بوقت اشاعت ہدیۃً ایک جلد جناب کی خدمت میں بھی پیش کروں گا۔ ہوش نمبر کی دس جلدیں مدیر رہنمائے تعلیم نے بغرض تقسیم اہلِ ذوق میرے پاس بھیجی تھیں لیکن ان کی قیمت اب تک وصول نہیں ہوئی۔ اب میرا ارادہ ہے کہ دس نمبروں کی قیمت اپنے پاس سے ان کی خدمت میں روانہ کر دوں۔ اگر مدیر صاحب رہنمائے تعلیم میری تحریر پر بذریعہ وی پی ان اصحاب کے پاس بھیج دیتے۔ تو وہ ضرور قیمت وصول کر لیتے۔ بہتر یہی تھا کہ ان اصحاب کے نام پر بذریعہ وی پی ایک ایک رسالہ بھیج دیا جاتا۔ البتہ میں اشاعت رسالہ کی کوشش کرتا رہوں گا۔

دلؔ شاہجہاں پوری۔

(۳)

۳۰، نومبر [illegible] از شاہجہاں پور

مخلص بے ریا محب باصفا۔ سلام نیاز۔ شاعر کو ہر اندیشۂ ہستی سے بے نیاز ہونا چاہیے لیکن میرا ہر نفس ایک طوفان انتشار اور ہر لمحہ ہنگامۂ افکار تھا اس نقطۂ نظر سے یا تو میں حقیقی شاعر نہیں ہوں۔ یا قدرت کو میرا امتحان مقصود ہے۔ کاش ترقیات سے مطمئن ہو جاتا۔ پھر میری شاعری شگفتہ شاعری کہی جا سکتی تھی۔ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرزا احسان احمد اعظم گڈھی مرزا جعفر علی اثر لکھنوی وغیرہ ہم نے وقت اشاعت دل نمبر میرے کلام پر پُرخلوص تنقید فرمائی تھی۔ اس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے نغمۂ دل پر ایک بسیط نظر ڈالی ہے۔ قدیم رنگ کے بکثرت اشعار قلم زد کر دیئے ہیں۔ اکثر اشعار اضافہ ہو گئے ہیں۔ انداز بیان میں جہاں جہاں عریانی تھی وہاں وہاں ترمیمیں کی گئی ہیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ناظرین نغمۂ دل کو ایک نغمۂ دلکش ملاحظہ فرمائیں گے۔ اُردو کے متعلق جو تحریک کی گئی ہے وہ جناب کی ادبی خدمت ہوگی افسوس ہے کہ حریف اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں جو مشترکہ زبان تسلیم ہو چکی ہے۔ اگر یہی ارادہ ہے تو سب سے پہلے جواہر لال کے نام کو تبدیل کریں جواہر کی جگہ بھاشا یا سنسکرت کا لفظ ضم کریں انقلاب پسند مساوات کے مدعی ہیں اور سرمایہ داری کے مخالف مگر صحیح مساوات سے قطعی ناآشنا اگر مساوات پیش نظر ہے۔ تو نظامِ قدرت کی اصلاح کی جائے۔ شیر کی خوراک جانوران صحرائی وغیرہ صحرائی ہیں۔ اور چرند جانوروں کی خوراک دانہ گھاس ہے ان دونوں جنسوں میں مساوات پیدا کی جائے۔ ہاتھی قوی البدن پیدا کیا گیا ہے۔ اور پسو حقیر القامت رائی بہت حقیر دانہ ہے اور کشش قوی الجسامت میں مساوات کی ضرورت ہے۔ رات شکوہ سنج ہے کہ مجھ کو کیوں تاریک پیدا کیا گیا ہے اور دن کو کیوں روشنی بخشی ہے۔ دستِ چپ فریادی ہے کہ مجھ سے آبدست کا کام کیوں لیا جاتا ہے اور دست راست سے ملو پلاؤ کیوں کھائی جاتی ہیں۔ یہ تخصیص مساوات کے خلاف ہے کاش اس طرف بھی نظر فرمائے جاتے۔ اگر بعض تبدیلیاں امکان میں نہیں تو کم سے کم کسی دست راست سے آبدست ہی کی خدمت لی جائے۔ ہاں ایک امر اور قابل ذکر ہے۔ مخلوقات میں کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو بچہ پیدا کرنے سے پیشتر شیر دار ہو جب یہ مسلم ہو چکا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد دودھ پیدا ہوتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قدرت نے دودھ بچہ کی خوراک پیدا کی ہے پھر کس قدر ظلم ہے کہ بچہ کی حق تلفی کی جائے۔ ہمارے لئے ہر قسم کا غلہ۔ پھل۔ ترکاریاں ہیں۔ باوجود ان نعمتوں کے ایک بے زبان کی قدرتی غذا [illegible] تصرف بے جا کرنا سراسر ظلم ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا کیا جا سکتا ہے کہ گائے بھینس کا دودھ بچہ کی خوراک سے زیادہ ہوتا ہے اس لحاظ سے ہم استعمال کرتے ہیں۔ جواباً عرض ہے کہ جتنی کا دودھ بچہ کل جانوروں سے زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کو کیوں [illegible] کے کون پیتا ہے صحرائی جانوروں کا دودھ کون حاصل کر سکتا ہے ہم [illegible] کی [illegible]

ان کی تو ناک کم کر دیتے ہیں۔ کاش اس طرف بھی ہمارے برادران وطن توجہ فرماتے۔ قلم برداشتہ یہ عریضہ ارسال کر رہا ہوں۔ گاڑی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس وقت ختم کر رہا ہوں۔ ورنہ یہ ملک کے لیے بھی ہو گی۔ برخورداران شبیر حسن و مشفق حسن بخیریت ہیں۔

دلؔ شاہجہاں پوری

(۴)

۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء

دلنواز کرم۔ السلام علیکم۔ نوازش نامہ کاشف حالات باعث شکریہ۔ میں اب بفضلہ اچھا ہوں۔ ضعف بے حد ہو گیا ہے۔ دماغ ابھی اس قابل نہیں کہ عالمگیر کی غزل یا کوئی نظم مکمل کر سکوں۔ نار کے متعلق یہ گزارش ہے۔ کہ اس کی آواز میرے مقابلے میں قابل سماعت نہیں قرار دی گئی۔ اخبار یا رسائل میں اعتراض سے نئے ہستی کی شہرت ہو جاتی ہے۔ ایسے نقروں کی اشاعت میں خود نہیں کرنا چاہتا۔ آپ لاہور کے مطابع سے گفتگو کیجیے۔ حق طباعت میں بقدر ضرورت مدیں لے لونگا۔ نقد کچھ نہیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ بحالت صحت دماغ فسانہ رو رکنی بحر میں تعمیل ارشاد کی جائیگی۔ آپکی مہربانیوں کا شکریہ۔

آپ کا پہلو نشیں

دلؔ

(۵)

۱۲ فروری ۱۹۴۰ء شاہجہاں پور

مکرمی تسلیم۔ بعد انتقال جناب بھائی صاحب خانگی جھگڑوں نے مجھ سے ضعیف العمر کو مبتلائے ترددات کر دیا۔ طبیعت مشغلہ شاعری سے بالکل بیگانہ ہے۔ سرسری نظر سے کلام دیکھ کر واپس کر رہا ہوں۔ دعا کیجیے کہ پروردگار عالم میرے دل کو مطمئن کر دے۔ ۱۱ فروری کو بسلسلہ اعزاز سر تیج بہادر سپرو الہ آبادی ایک اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ شاہجہاں پور سے مجھ کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ انکار لکھ دیا تھا لیکن پھر مجبور کیا گیا۔ کلکٹر صاحب شاہجہاں پور جو سر تیج بہادر صاحب کے خلف الصدق ہیں۔ مجھ کو مجبور کر رہے ہیں کہ ضرور شریک ہو جئے۔ وعدہ کر لیا ہے جانا ہو گا۔ شاہجہاں پور میں بسلسلہ نمائش سپرو صاحب اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ کر رہے ہیں۔ ۱۶ فروری سے آغاز نمائش ہے اور ۲۳ کو آٹھ بجے شب کے مشاعرہ ہے۔ یا میرے مشاعرہ پر کوئی عزت شرکت دی گئی ہے۔ میں بھی اس کمیٹی کا ممبر ہوں۔ ہر دو مشاعروں میں میری... دو دلی دیکھیے کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ شاہجہاں پور کے شعراء بحیثیت غزل ... ۱۲ کے قریب ہونگے

نیاز کیش

دلؔ شاہجہاں پوری

(۶)

۳ جولائی ۱۹۴۲ء شاہجہاں پور

دلنواز مکرم۔ سلام نیاز۔ غیر معمولی زمانہ کے بعد انتقال برادر مرحوم کے سلسلے میں مواضعات کی نمبرداری کا مقدمہ جن کے مرحوم و مغفور نمبردار

تھے۔ ۱۹ جون ۱۹۳۲ء کو عدالت سے میرے حق میں مفید ہوا۔ ایک حصہ دار نے بھی نمبرداری کی درخواست دی تھی اس کشمکش سے بحمداللہ نجات ملی۔ اب جاوید صاحبہ کا معاملہ باقی ہے۔ ان کے برادرِ حقیقی نے خود غرضی کی بنیاد پر ان کو بگاڑ رکھا تھا مگر نتیجہ پر غور کر کے اب وہ معاملہ پر تیار ہیں۔ برادرِ مرحوم غیر معمولی قرضہ چھوڑ گئے ہیں وہ قرضہ جاوید صاحبہ کے انتظام سے ادا کرنا محال ہے ایسی حالت میں اب وہ تہیہ کر رہی ہیں کہ ماہانہ مقرر کر کے جائداد میرے حق میں چھوڑ دیں اور قرضہ بھی میں ادا کر دوں۔ دعا کیجیے کہ یہ مرحلہ طے ہو جائے مگر مہاجن کے قرضہ کی فکر ہے۔ آٹھ سات ہزار قرضہ ادا کرنا ہوگا۔ میں اس ضمن میں پریشان رہا۔ اور ہوں۔ مگر خدا پر بھروسہ ہے۔ شامی صاحب کا عنایت نامہ آپ کے توسط سے پہنچا۔ ان کی غزل بعد ترمیم ارسال ہے۔ جناب کلکٹر صاحب کے پاس چند رسائل آتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ عالمگیر کا لغوی نمبر جو حال ہی میں شائع ہوا ہے ایک نمبر اڈیٹر صاحب کی طرف سے بھجوا دیجیے تو وہ تحریری استدعا خریداری بھی کر دیں امید ہے کہ صاحب موصوف اجراء کی اجازت دے دیں گے۔ صاحب موصوف کا یہ پتہ ہے۔

لے این پسرو صاحب کلکٹر شاہجہاں پور

دل شاہجہاں پوری۔ ۲ جون ۱۹۳۲ء

(۷)

۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء

مکرمی تسلیم۔ غزل بعد ترمیم مناسب واپس ہے۔ جناب نے تلمذ کے متعلق جو اظہار خیال فرمایا ہے یہ جناب کا حسنِ ظن ہے۔ مجھ کو بے حد مسرت ہوئی۔ اگر آپ وہی نسبت قائم رکھیں خوشا نصیبا۔ ان حضرت امیر مینائی علیہ الرحمۃ میں باہم کوئی رشک نہیں۔ جناب جلیل میرے قدیمی مخلص ہیں۔ ایک مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری نے ایک مقطع جناب جلیل کی خدمت میں پیش کیا ؎

چُن چُن کے پھول لائے ہیں باغِ جلیل سے
صفدر عروسِ نظم کا زیور بنائیں گے

جناب جلیل نے فرمایا اگر بجائے جلیل آپ امیر لکھتے تو میں زیادہ خوش تھا۔ ایک مرتبہ سندیلہ کے عظیم الشان مشاعرہ میں تمام مشاہیر شریک تھے۔ میں بھی تھا حضرت ریاض بھی وہاں مقیم تھے مگر شرکت مشاعرہ کا قصد نہ تھا بایں وجہ خلوت نشین ہو گئے۔ میری خبر پا کر جناب وسیم مرحوم کو بھیجا کہ میں بوجوہ حاضری سے قاصر ہوں۔ آپ تنہا مجھ سے ملئے۔ لکھنؤ میں جب وہ میری حاضری کی خبر پاتے ہیں۔ مخلصانہ اور برادرانہ طور پر ملنے آتے ہیں۔ بہر حال ہم لوگ ایک ہی آستانہ کے خادم ہیں۔ اگر جناب کو میرے مشورہ سخن کا اعلان کرنا ہی مقصود ہے تو بلا تکلف دونوں نام لکھئے۔ میری رائے ہے آئندہ جو آپ کی مصلحت ہو۔ جناب نے دورِ جدید میں جو حق گو شعراء کے دیوان کی بابت مجھ سے استفسار فرمایا ہے۔ لہٰذا گزارش ہے کہ اصغر گونڈوی۔ جگر مراد آبادی، فانی بدایونی اس رنگ میں کہتے ہیں۔ صفات کی تقلید کیجیے اور نقائص سے گریز۔ نقائص کے متعلق اجمالاً گزارش ہے کہ بعض جگہ صرف الفاظ ہوتے ہیں جن کو مفہوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تغزل کا رنگ قائم رہے غزل مرثیہ یا ہجو یہ نامہ نہ ہو جائے۔

جناب عزیز لکھنوی نے تو صرف ہوا کہ شاعری کی بحث پر مجھ سے بذریعہ تحریر تبادلہ خیال کیا تھا جواباً میں نے ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ مضمون ۱۶ صفحہ پر ختم ہوا تھا جو غیر مطبوعہ ہے۔ میں نے مدیر عالمگیر سے اس مضمون کا وعدہ کیا تھا۔ انشاء اللہ جلد نقل کر کے ان کی

خدمت میں ارسال کروں گا۔ فقط

دل شاہجہانپوری

(۸)

۲۴ر جون ۳۳ء شاہجہاں پور

مخلص محتی سلام نیاز۔ عنایت نامہ کاشف حالات ہوا۔ فراہمی مضامین اور آپ کی سعی بلیغ کا شکریہ۔ میرا قیام آج کل بوجہ تحصیل وصول دیہات میں زیادہ تر رہتا ہے دو ایک یوم مکان پر قیام کرکے پھر چلا جاؤں گا۔ آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ آٹھ میں کے امتحان میں ایکمرتبہ برخوردار شبیر حسن سلمہ اپنے اسکول سے فرسٹ آیا اس کے علاوہ اسے ڈرائنگ اور ریاضی میں اسکول سے تخصیصی انعام ملا۔ کچھ سکون اور اطمینان ہو تو تازہ کلام کیطرف رجوع ہوں۔ نیرہلی کے مشاعرہ کی غزل ارسال کرتا ہوں۔ دل۔

(۹)

۱۳ر اکتوبر ۳۳ء شاہجہاں پور

مخلص بے ریا جناب فضاؔ تسلیم۔ میری بغل کا دنبل غیر معمولی تکلیف کی حالت میں پھوٹ گیا۔ طبیعت کچھ ایسی شگفتہ ہو گئی۔ کہ زمانہ دراز کی فرمائش پہ فکر شروع کردی۔ شاعروں کے لئے ایذا راحت ہے۔ میں بھی اسی خیال میں محو ہو کر تکلیف کو بھول گیا۔ صفحہ پلٹ کر متانت خیال ملاحظہ ہو۔ امید ہے کہ جناب بخیریت گزرے۔

آپ کا ضمیر[1]

(۱۰)

۱۷ر اکتوبر ۳۶ء شاہجہاں پور

مخلص سلام نیاز۔ غزل بعد ترمیم مناسب ارسال خدمت ہے آج کی قسط میں اپنی ایک نئی غزل پیش کر رہا ہوں خیالات نیا رہے ہیں۔ مگر انداز قابل توجہ ہے۔ اب میں کچھ نہیں کہتا بلکہ جناب فضاؔ کہلواتے ہیں تمنا ہوئی کہ دل فنا ہو گیا صرف خاکستر باقی ہے ممکن ہے کہ خاکستر دل کا کوئی ذرہ چمک اٹھے یہ غزل عالمگیر کے سالنامہ نمبر میں ضرور بھیجئے امید ہے کہ جناب بخیریت ہونگے اس غزل کا مطلع اور ایک نظم ہو گیا تعداد دو نشستوں میں باقی اشعار نظم کئے گئے۔

دل

(۱۱)

۱۷ر جون ۳۶ء شاہجہاں پور

دلنواز تسلیم

بوجہ عدیم الفرصتی جواب سے قاصر رہا معذرت خواہ ہوں۔ علالت کا حال معلوم ہو کر تردد ہے۔ شافی مطلق صحت کلی عطا فرمائے اعراض کردہ

---

[1] کبھی کبھی حضرت دل اپنے تخلص کی بجائے لفظ ضمیر لکھ دیتے تھے آپ کا نام محمد ضمیر الحسن خاں تھا۔ (فضا)

میں مقامی ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کرنا مناسب ہے واللہ اعلم شک گردہ پیدا ہو گیا ہے یا [illegible] ریاح شکایت ہے جناب انعام فرمائیے کہ کیا کیفیت ہے تاکہ رائے قائم کروں حضرت اقبال مرحوم کی شخصیت ہندوستان کے لئے مایۂ ناز تھی جہاں تک ان پر نوحہ خوانی کی جائے بجا ہے حضرت جگر مرادآبادی زندہ ہیں تازہ کلام جواب آنے پر ارسال کروں گا۔ الفضل آپ کی خیریت درکار ہے ـ

دل

(۱۲)

عزیزی مکرمی تسلیم۔ کیا عرض کروں بوجہ شدت بارش و ژالہ باری غضب کی سردی ہو گئی تھی اس لئے بہت کم فکر سخن کا موقعہ ملا یا ہر کا کلام بھی بکثرت اصلاحی آ گیا تھا۔ اب نئے نئے خریدار پیدا ہو گئے ہیں بوجہ ضعف بصارت کلام بروقت نظر سے گزرتا ہے ایک صاحب جن کا مقدر تخلص ہے گجرات سے حال آیا ہے خوش گو شاعر ہیں حسن عقیدت کے ساتھ اصلاح کلام کی درخواست کی تھی کل غزل ترمیم کے بعد روانہ کر چکا ہوں ہاں خوب یاد آیا آپ نے حضرت ریاض کے متعلق استفسار فرمایا تھا میری پہلی ملاقات مرحوم سے سندیلہ کے مشاعرہ میں ہوئی۔ شعراء کی کثرت تھی۔ بذریعہ وسیم صاحب مرحوم حضرت ریاض مرحوم نے کہلا بھیجا کہ چند طور پر ایک صاحب کا مہمان ہوں صاحب مشاعرہ باخبر نہ ہوں آپ بہمراہی وسیم صاحب مجھ سے مل جائیے میں حسب الطلب مرحوم کی قیامگاہ تک پہونچا بہت مخلصانہ اور برادرانہ گفتگو رہی پھر ایک مرتبہ بمقام سیتاپور ایک عزیز سب رجسٹرار سے ملنے گیا تھا ان کے در دولت پر تخصیصی ملاقات ہوئی۔ پھر چند سال کے بعد میں بسلسلہ ایجنٹی لکھنؤ گیا تھا اور چند روز بمقام امین آباد لکھنؤ مسلم ہوٹل میں مقیم تھا۔ حضرت ریاض میری خبر سن کر بالاخانہ پر تشریف لائے اور بہت دیر تک برادرانہ اور مخلصانہ گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے قیام گاہ کے متعلق استفسار کیا۔ فرمایا کہ میں مطلب سمجھ گیا۔ فرمایا کہ میں . . . . . . میں رہتا ہوں۔ اس حالت میں آپ میری قیام گاہ پر تشریف نہ لائیے میں خود ہر روز حاضر ہوا کروں گا پھر کئی مرتبہ ملاقات ہوئی اور نہایت خلوص کے ساتھ خط و کتابت آخر عمر تک جاری رہی ایک مرتبہ سندیلہ مشاعرہ میں بموجودگی استاذ وقت میری غزل بہت کامیاب رہی اس کے متعلق جناب وسیم نے حضرت جلیل مرحوم کو بمقام حیدرآباد خط لکھا نواب فصاحت جنگ نے بذریعہ تحریر مجھ کو مبارک باد دی۔ اسی مشاعرہ سے میری شہرت کا آغاز ہوا۔ ازاں بعد شعراء دیار لکھنؤ نے میری قدر افزائی فرمائی۔ یہ داستانیں اب خواب و خیال بن چکی ہیں۔ اردو دشمنی اس دو برس میں حد کو پہنچ گئی ہے شروع جنوری میں جناب جوش ملیح آبادی لکھنؤ سے واپسی پر شاہجہان پور میں تشریف لائے تھے غریب خانہ پر کئی گھنٹے تک قیام فرمایا بہت دیر تک نظم خوانی ہوئی۔ موصوف میرا بے حد احترام فرماتے ہیں۔ فقیر دل [illegible] دل کو میں خود طبع کرانا بوجہ ضعیفی پسند نہیں کرتا۔ بالفعل گرانی کاغذ کی شکایت ہے۔ وقت پر خیال رکھئے گا۔ کلام مختصر ارسال کیا کیجئے۔ زیادہ میں مجھ کو دقت رہتی ہے بوجہ ضعف بصارت [illegible] کا مطالعہ شاق ہے برخورداران سلام کہتے ہیں ـ

دل شاہجہانپوری۔ ۱۴ جنوری [illegible]

(۱۳)

عزیزی فضا صاحب۔ السلام علیکم۔ جو ورق دیکھنے کے بعد میں نے واپس کیا تھا اس کے مطلع کا مصرع ثانی ہے ـ

[illegible]

مجھے اشتباہ ہو رہا ہے کہ میں سہواً شاید بوجہ [illegible] نہیں لکھ گیا ہوں۔ [illegible] لہٰذا اس کو درست [illegible] قلم زد کیجئے

مصرع یوں پڑھئے سے سب ٹھیک ہیں بے گور و کفن دفنانے والا کوئی نہیں۔ یہ بحر متقارب مثمن اثر دہ رکنی ہے جس کے ارکان فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن ہیں۔ ہر مصرع کو جانچ لیجئے ممکن ہے کہ کوئی سبب خفیف گھٹتا یا بڑھتا ہو۔ میں توجہ
ری فراغ زیادہ کاوش نہیں کر سکتا۔

دل شاہجہاں پوری ۲۲ مارچ ۱۹۵۴ء

(۱۴)

عزیز مکرم تسلیم ہم لوگ اپنے وطن اور گھر میں مبتلائے افکار و پریشانی ہیں۔ غربت میں کیا حال ہوگا جس پر واقعات گذرتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ اپنا ہر لمحہ ہر آن خدا محفوظ رکھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی پارسل آپ کے یہاں نہیں پہنچا۔ اور نہ روانگی کی شاہجہاں پور سے باز ہے۔ مجھ سراپا معصیت کی دعائیں ہر وقت آپ سے مخلص کے لئے حاضر ہیں۔ خدا ہر آفت سے آپ کو محفوظ رکھے ہم لوگوں کے لئے بیچارا کچھ سے تو چاقو رکھنا بھی جرم ہے۔ سکھ تلواریں اور کرپانیں لئے پھرتے ہیں۔

بہرحال ہمارے کلکٹر صاحب بہت رحمدل اور امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ شاہجہاں پور کے لئے غنیمت ہے۔ نغمۂ دل نظرثانی سے مکمل ہو چکا ہے۔ تازہ نظموں کے نمونے ہیں۔ آپ مطمئن رہئے یہ مصیبت کے دن ان شاء اللہ جلد گزر جائیں گے۔

دل شاہجہانپوری
۱۵ نومبر ۴۷ء

تحسین سروری

اُردو ادب کے غیر ادبی ماخذ

(۹)

تاریخ النوایط

مؤلفہ نواب عزیز جنگ بہادر ولا

یہ کتاب (۵۹۲) صفحات پر مشتمل ہے جو حیدرآباد دکن کے عزیز المطابع میں چھپ کر ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی۔ دیباچے اور فہرست مضامین کے (۵۹) صفحات کو بھی اگر شمار کرلیا جائے تو اس کا حجم (۶۵۰) صفحات ہوجاتا ہے۔ جیساکہ کتاب کے سرورق پر اس کے مطالب کی صراحت کردی گئی ہے، یہ قوم نایط کی تاریخ اور اس قوم کے مشاہیر کا یہ ایک تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی افراد قوم کے واقعات ہجرت اور ان کے مخصوص رسم و رواج اور القاب معروفہ کا بیان بھی تفصیل سے درج ہے۔

تاریخ النوایط کے چار باب ہیں اور ہر باب کی دو دو فصلیں ہیں۔ آخری باب کی فصل دوم میں نایطی قوم کے مشاہیر کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے۔ ان میں بعض شاعر اور صاحب تصنیف و تالیف اصحاب بھی ہیں۔

نواب عزیز جنگ ولا نے اپنی کتاب تاریخ النوایط کے ماخذ کی فہرست بھی شامل باب کردی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کی (۴۷) کتابوں سے مواد حاصل کیا گیا۔

نایط ایک عرب قوم ہے، جس کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں، البتہ نسب کے سلسلے میں محققین اس پر متفق ہیں کہ نایط قوم کا نسبی شجرہ تین شاخوں پر مشتمل ہے۔ اور ان تینوں شاخوں کے جد اعلیٰ نضر بن کنانہ جد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

پہلی شاخ کی قوم کو بنو النضر، اور دوسری شاخ کو شیخ قریشی کہا جاتا ہے۔ تیسری شاخ کا سلسلہ حضرت سیدۃ النسا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک پہنچتا ہے جس کے افراد سادات حسینی اور اسمٰعیلی کہلاتے ہیں۔

مختلف تاریخوں سے ثابت ہے کہ قوم نایط کا اصلی مرکز مدینہ منورہ تھا، یزید بن معاویہ کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی نے اس قوم کو سخت پریشان کردیا تو۔ قوم کے مورث اعلیٰ عبداللہ نے خلیفۂ وقت پر بحث میں غلبہ حاصل کیا۔ اور اس کو ملزم ٹھہرایا، جس کے نتیجے میں خلیفہ نے عبداللہ اور ان کے خاندان کو مدینہ منو

سے نکل جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر بغداد چلے گئے اور وہاں نایط نام کے موضع کی سکونت اختیار کر لی۔ لیکن حاکم بغداد سے اختلاف عقائد کی بنا پر ہمیشہ جھگڑا رہا۔ مجبوراً بغداد بھی چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے یہ قوم بصرہ پہنچی ۷۵۲ھ میں امیر قوم سید عبدالرحمٰن نایطی بصرہ میں رحلت کر گئے تو قوم دل برداشتہ ہو کر سواحل ہند کو اپنے لئے پسند کیا۔ یہ واقعہ شیخ الافاضل علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب کشف الانساب میں تحریر فرمایا تھا، لیکن اس بیان سے نواب عزیز جنگ مغفور کو تھوڑا اختلاف تھا، جس کی انہوں نے تصحیح کر دی ہے۔ غرض اقوام عرب میں نایطی قوم نمایاں اور نسلی و نسبی خصوصیات کی بنا پر قابل احترام ہے۔ نواب عزیز جنگ ولاؔ کی یہ کتاب اسی نایطی قوم کی تاریخ ہے۔

نوایط پاک و ہند کے ہر شہر میں موجود ہیں۔ اور تعلیمی، تہذیبی اور قومی خدمات میں نائطی اصحاب نے خاصا کام کیا ہے۔

زیادہ تر یہ لوگ جنوبی ہند، خاص کر مدراس، حیدرآباد دکن، اور ارکاٹ میں آباد ہیں اور ان علاقوں میں اسلامی تعلیمات اور مسلم اقتدار کے استحکام کے سلسلے میں نائطیوں نے غیر معمولی کام انجام دیئے ہیں اور اس قوم میں اولیا و صلحا بھی گزرے ہیں چنانچہ ملا علی المہائمی، جن کا مزار پرانوار بمبئی میں زیارت گاہ عوام ہے وہ بھی قوم نایط سے تھے۔ بعض مسند نشینان ریاست اور ذی اقتدار امرا کی حیثیت سے بھی ہماری مسلم تاریخ میں نمایاں ہیں۔ خاص کر علمی خدمات اس قوم کے افراد نے ایسی انجام دی ہیں کہ ہم بجا طور پر ان پر فخر کر سکتے ہیں۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی اور سکریٹری محمد مرتضیٰ مرحوم اسی قوم نایط سے تعلق رکھتے تھے اردو زبان کے مشہور زمانہ محقق اور دکن میں اردو اور یورپ میں دکنی مخطوطات کے مولف مولوی نصیر الدین ہاشمی — اور قانون بین الممالک اور تاریخ اسلام کے مستند نامور محقق ڈاکٹر حمید اللہ بھی قوم نایط سے ہیں۔

نواب عزیز جنگ ولاؔ بھی نائطی تھے، اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب زیادہ مستند اور اس موضوع پر وقیع ہے اور اس کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ نوایط کی تاریخ پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔

کتاب کے شروع میں مولف نے اپنے اور اپنے خاندانی حالات بھی تحریر کئے ہیں۔

نواب صاحب کا نام احمد عبدالعزیز اور ان کے والد کا نام مولوی محمد نظام الدین تھا۔ یہ خاندان عربی الاصل قریشی نائطی اور شافعی المذہب ہے جس کا سلسلہ حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔

نواب عزیز جنگ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ کو ضلع نیلور (صوبہ مدراس) میں پیدا ہوئے اور آٹھ سال کی عمر میں (۱۲۸۰ھ) اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آ گئے۔ ابتدائی تعلیمی مدارج ان کے نانا محمد غازی الدین غازیؔ نے طے کرائے اس کے بعد انہوں نے نواب محمد حسین خان قادری راقمؔ، مولوی محمد نجم الدین خان قادری صبغۃ اللہی، مولوی حبیب اللہ ذکا (شاگرد غالب دہلوی) اور ان کے بیٹے محمد میاں سہاؔ سے فارسی کی تکمیل کی۔ اسی طرح چند نامی علما سے عربی پڑھی۔

۱۲۹۰ھ میں سرکار نظام میں صیغۂ عدالت کی خوشنویسی پر مامور ہوئے۔ فن سیاق اور دفتر کی کاردانی کے سبب ترقی کرتے کرتے وہ اول تعلقداری (کلکٹری) کے درجے تک پہنچے۔ اور حیدرآباد کے لایق و کارآموز اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا۔ پھر ایک روز وہ نواب عزیز جنگ بہادر کے خطاب سے بھی ملقب ہوگئے۔

عزیز جنگ کو شروع سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ زمانۂ ملازمت میں انھوں نے قوانین مالگذاری پر ایک درجن کے قریب ضخیم کتابیں لکھیں ہر کتاب پر گورنمنٹ نظام کی طرف سے اعزازی انعام ملتے رہے۔

وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے مستقل طور پر اپنے کو تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیا اور یہ کام اتنا پھیلا کہ اپنے مکان (عزیز باغ) میں انھیں "عزیز المطابع" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کرنا پڑا جس میں صرف عزیز جنگ کی مطبوعات چھاپی جاتی تھیں۔

نواب عزیز جنگ کی علمی خدمات کے اعتراف میں سرکار نظام کی طرف سے مختلف اعزازات کے علاوہ برطانوی ہند کی طرف سے پہلے خان بہادر اور بعد میں شمس العلماء کے خطاب بھی ملے۔ ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

اعظم العطیات	امراض الفصول
شیرازۂ دفاتر	ترکاریوں کی کاشت
عطیات آصفیہ	محبوب السیر معروف بہ تاریخ عزیزیہ
مصطلحات دکن	فلاحت النخل
سیاق دکن	کھجور کی کاشت
ذخیرۂ کھاد	غرایب الجمل (تاریخ گوئی کے فن کی تاریخ)
رسالۂ تذکیر و تانیث	آصف اللغات (۷ ضخیم جلدوں میں)

عزیز جنگ شاعر بھی تھے اور ولاؔ تخلص تھا ان کا کلیات نظم بھی چھپ گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تاریخ النوایط کے چوتھے باب کی دوسری فصل میں قوم نایط کے مشاہیر کا تذکرہ ہے ان مشاہیر میں ہر فن کے قابل ذکر اصحاب ہیں، جن میں شعراء بھی ہیں، اس لحاظ سے یہ فصل اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ کے سلسلے میں مفید ہو سکتی ہے۔

۱۔ نواب عزیز جنگ ولاؔ ص ۲۴۵
۲۔ اسلم خان والا جاہی، شایاںؔ ص ۲۴۹
۳۔ افضل خان لذتیؔ ص ۲۵۱
۴۔ باقر حسین، حسن علی خان مختارؔ ص ۲۵۵
۵۔ حبیب اللہ ذکاؔ (شاگرد غالب دہلوی) ص ۲۸۶
۶۔ حسین علی خان، افصحؔ ص ۲۹۷
۷۔ رحمت اللہ رساؔ (برادر ذکاؔ) ص ۳۰۱
۸۔ رضا حسین افسرؔ ص ۳۰۲
۹۔ حکیم شاہ زین العابدین وازعؔ ص ۳۰۷
۱۰۔ زین العابدین، دیواںؔ ص ۳۰۸
۱۱۔ شایق علی خان، شایقؔ ص ۳۱۲

۱۲۔ شرف الدین علی خان رنگین صہ ۳۱۵
۱۳۔ حکیم شرف الدین علی خان النت صہ ۳۱۶
۱۴۔ صبغۃ اللہ عتیق صہ ۳۱۸
۱۵۔ حکیم صفی الدین محمد خان ناصر صہ ۳۲۱
۱۶۔ عابد علی خان صولت جنگ عابد صہ ۳۲۵
۱۷۔ عبد القادر عزت صہ ۳۳۷
۱۸۔ عزیز الدین خان عزیز جنگ عزیز (شاگرد داغ دہلوی) صہ ۳۵۰
۱۹۔ عظیم الدین (احمد کلیم خان) عظیم صہ ۳۵۲
۲۰۔ علی دوست ذہین صہ ۳۶۴
۲۱۔ علی رضا خان ضیا مطلہ ولد آگاہ صہ ۳۶۵
۲۲۔ غلام حسین جودت صہ ۳۷۰
۲۳۔ غلام حسین حیدری صہ ۳۷۲
۲۴۔ حکیم غلام دستگیر خان لائق صہ ۳۷۶
۲۵۔ غلام عبد القادر، قادر عظیم خان ناظر صہ ۳۸۲
۲۶۔ غلام علی قریشی، ناظم صہ ۳۸۳
۲۷۔ غلام علی (پتور) صاحب صہ ۳۸۹
۲۸۔ غلام علی موسیٰ رضا رحکیم باقر حسین خان رائج صہ ۳۹۲
۲۹۔ غلام محمود تاباں صہ ۴۰۳
۳۰۔ غلام محی الدین خان معجز صہ ۴۰۵
۳۱۔ حکیم قادر علی، بے ہوش صہ ۴۱۲
۳۲۔ مولوی محمد باقر آگاہ صہ ۴۲۶
۳۳۔ محمد باقر برق صہ ۴۳۳
۳۴۔ محمد باقر خان گوہر صہ ۴۳۴
۳۵۔ محمد نقی حسین رفعت صہ ۴۳۸
۳۶۔ محمد سعید، رافت صہ ۴۶۲
۳۷۔ محمد صبغۃ اللہ مہاجر رافت صہ ۴۶۹
۳۸۔ محمد صبغۃ اللہ فرحت صہ ۴۷۰
۳۹۔ محمد صدیق حسین عاشق صہ ۴۷۵
۴۰۔ محمد عبد القادر طاہر صہ ۴۸۴
۴۱۔ محمد محی الدین خاطر صہ ۵۰۱
۴۲۔ محمد میراں سہا صہ ۵۰۶
۴۳۔ ملک محمود جوہر صہ ۵۱۵
۴۴۔ وجیہ الدین خان متقی صہ ۵۲۲
۴۵۔ ہدایت محی الدین وجد صہ ۵۳۳

ان میں بعض اسماء کے ساتھ خان کا لفظ بھی ہے ظاہر ہے یہ اصحاب پٹھان نہیں تھے، بلکہ خالص قوم عرب سے تھے خان کا لفظ خطابی ہے۔

اختر شہنشاہی

(اشاریہ)

(۱)

"سوانح عمری اخبارات، حصہ اول : اختر شاہنشاہی
جس میں مفصل کیفیت، مع تقریظ ہر ایک اخبارات اردو فارسی و عربی، ہفت اقلیم کے بیان
کی گئی۔ بار اول جون ۱۸۸۸ء جس کو اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی مالک اخبار اختر ہند
و آنریری سکریٹری انجمن علمی نے تالیف کر کے اپنے دفتر مقام اختر پریس شہر لکھنؤ صوبہ اختر نگر اودھ ملحقہ
منصور نگر سے شائع کیا۔"

ہندستانی صحافت کی پہلی تاریخ کا یہ سرورق ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ ہندوستانی مطبعوں اور اخباروں پر کام کرنے والا کوئی بھی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں یہ استناد کی پہلی کتاب ہے۔ اور باوجود بعض گمراہ کن بیانوں اور تسامحات کے اسے ہمیشہ حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہے گا۔

یہ کتاب ۲۹۸ صفحات اور ۱۵۱۸ اندراجات پر مشتمل ہے۔ اندراجات میں اخبار اور پریس دونوں گڈمڈ ہیں۔ (اور اخباروں میں وہ بھی شامل ہیں جن کے شائع ہونے کے اشتہارات مشتہر ہوئے اور امکان ہے کہ ان میں سے بعض کبھی نکلے ہی نہوں) ترتیب ابجدی ہے جس میں اس مخصوص حرف سے شروع ہونے والا اخبار بھی ملے گا مطبع بھی۔ اس سے بعض جگہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہندوستانی کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کلکتہ، مالک مولوی اکرام علی، مہتمم مولوی خلیل الدین، اجرا، یکم جنوری ۱۸۱۰ء اب یہ ہندوستانی یقینی طور سے مطبع کا نام ہے لیکن حامد حسن قادری صاحب، عبدالرزاق راشد صاحب اور بعض دوسرے محترم اسکالر اس سے دھوکا کھا گئے اور اسے اردو کا پہلا اخبار سمجھ بیٹھے۔ اس دھوکے کے بچنے کے لئے اس کتاب کے مصنف کے انداز تحریر کو سمجھنا ہوگا، اور اس میں کوئی دشواری نہیں۔ اخبار کے ذکر میں مصنف مقام، وقفہ، مالک اور ایڈیٹر کا نام اور تاریخ اجرا دیا گیا ہے اور مطبع کے ذکر میں صرف مہتمم کا نام، مقام اور تاریخ اجرا۔

میں نے اخبارات (جس میں رسالے اور گلدستے بھی شامل ہیں) کو اس کتاب میں سے الگ کر کے ان کا اشاریہ تیار کیا ہے۔ اس اشاریے میں غیر ضروری باتیں نکال کر باقی اصل کو جوں کا توں قائم رکھا ہے۔

مصنف نے جس طرح لکھا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

"آریہ گزٹ۔ کیمپ فیروز پور متعلق بہ اصول آریہ دھرم وملکی خدمات و قومی حالات۔ ہفتہ وار جو
یکم، ۸، ۱۵، اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ ۸ ورق خورد یوم یکشنبہ سالانہ قیمت سرکار و والیان ملک
سے ہے معہ رؤسا، و امراء سے صدر آریہ سماج و دیگر شائقین سے ہے۔ طالب علموں سے عہ ہر سکرٹری لشن سماجے
ایڈیٹر منشی گوبند لال پر نودھاری آریہ، قوم کا بہت ملتا گر سہارن پوری۔ مہتمم لالہ لاہوری لال۔ کاتب محمدین
پریس مین فیض بخش از مطبع گولڈ میری اجراء ۱۵ر جولائی ۱۸۸۵ء"

میں نے اس طرح لکھا ہے:-

آریہ گزٹ۔ کیمپ فیروز پور ... ہفتہ وار .... ۸ ورق خورد ... ایڈیٹر گوبند لال ... مہتمم لاہوری لال

یا مثلاً:-

"اخباروں کا قبلہ گاہ۔ شہر لاہور محلہ دہلی دروازہ متصل مسجد نواب وزیر خاں مرحوم مجاریہ
مولاہی فتح الدین صاحب بسمل مرحوم مالک مولوی فیروزالدین صاحب گھائل۔ ایڈیٹر مولوی نہال الدین
مہتمم بھگوان داس۔ ہفتہ وار۔ ۴ ورق اوسط۔ یوم جمعہ۔ سالانہ حکام و والیان ریاست سے ہے عہ
عام سے ہے معہ۔ از مطبع قبلۃ المطابع۔ اجرا ۱۸۷۸ء"

اس عبارت کو میں نے اپنے اشاریہ میں یوں لکھا ہے:-

"اخباروں کا قبلہ گاہ۔ لاہور ..... مجاریہ فتح الدین بسمل مرحوم۔ مالک فیروزالدین گھائل۔ ایڈیٹر
نہال الدین۔ مہتمم بھگوان داس۔ ہفتہ وار۔ ۴ ورق اوسط ..... اجراء ۱۸۷۸ء"

اصل کتاب میں بھی اندراجات کے نمبر شمار دیے ہیں۔ میں نے بھی یہی طریقہ رکھا ہے تاکہ گنتی بھی ہو جائے اور حوالہ کے
لئے شمار نمبر کام آسکے۔

کتاب کے شروع میں ۴ صفحے کا دیباچہ ہے اور آخر میں تقاریظ۔ ان میں سے ایک تقریظ عبدالحلیم شرر کی بھی ہے
ہندوستانی اخبارات کے ذیل میں مصنف نے بعض غیر ملکی عربی، فارسی، اردو پرچوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ان
پرچوں کو میں نے اصل اشاریہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:- ۱۲۹م

۱۔ ترجمان شرق قسطنطنیہ .... پندرہ روزہ ... زبان اردو ... مالک اسکندر آفندی ... اجراء ۱۸ر جمادی الاول
مطابق ۲۲ر مارچ ۱۸۷۸ء"

۲۔ دارالخلافت قسطنطنیہ ... زبان فارسی ... پندرہ روزہ ... ۴ ورق اوسط ... مالک اسکندر آفندی؛

اجراء ۱۸۷۶ء"

۱۔ عروۃ الوثقیٰ۔ پیرس ۔۔ ہفتہ وار ۔۔ ۲ ورق کلاں ۔۔ چھاپہ آہنی ۔۔ زبان عربی، مالک مولانا سید جمال الدین الحسینی افغانی ۔۔ مہتمم شیخ محمد عبدہ اپریل ۱۸۸۲ء"

۴۔ فرہنگ۔ اصفہان ۔۔ ۲ ورق کلاں ۔۔ زبان فارسی ۔۔ مقرب الخاقان مرزا تقی خاں ۔۔ مدیر مرزا عبدالرحیم ایڈیٹر ۔۔ ۱۸۷۹ء"

۵۔ فرید الاخبار۔ رنگون ۔۔ ہفتہ وار ۔۔ ۶ ورق اوسط ۔۔ مالک حکیم شیخ فرید ۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۳ء"

۶۔ نحلہ ۔ عربی اخبار ۔۔ ۱۰ ورق اوسط ۔۔ ماہواری ۔۔ مالک ریو رنڈ جان لوئس سابت جی ۔۔ لنڈن ۔۔ اجراء ۱۸۷۸ء"

۷۔ ہندوستان ۔ اردو ۔۔ انگریزی ۔۔ ناگری ۔۔ لنڈن ۔۔ اڈیٹر و مہتمم ٹیمپل ۔۔ ماہواری ۔۔ ۸ ورق ۔۔ مالک راجہ رام پال سنگھ ۔۔ اگست ۱۸۸۴ء۔

۸۔ اختر ۔ زبان فارسی ۔۔ قسطنطنیہ ۔۔ مالک طاہر آفندی ۔۔ ۱۸۷۵ء۔

۹۔ الجوائب ۔ عربی ۔۔ قسطنطنیہ ۔۔ ۲ ورق ۔۔ مجاوبہ احمد فارس آفندی ۔۔ مہتمم سلیم آفندی ۱۸۷۱ء

۱۰۔ آئینہ انگریزی سوداگری۔ لندن ۔۔ جنوری ۱۸۸۷ء ۔۔ مالک گلبرٹ۔

۱۱۔ ایران ۔ تہران ۔۔ ہفتہ وار ۔۔ ۲ ورق ۔۔ ۱۸۸۴ء

۱۲۔ ایران منگر۔ (کلوں کے اشتہار پر) لندن، انگریزی، جرمن، اٹالین، ڈچ اور اردو زبان میں ۔۔ تتمہ بھی اردو میں ۔۔ ۱۸۸۶ء میں اشتہار۔

مندرجہ بالا اخبارات میں جن حضرات کو دلچسپی ہو، ہندوستانی پر نادم سیتاپوری کا مضمون ہماری زبان ۱۹۵۴ء میں ملاحظہ کریں۔ النحلہ پر ہماری زبان ۱۹۵۷ء میں عابد رضا بیدار کے مضامین اور براؤن کی انقلاب ایران" میں ایک نوٹ ملاحظہ ہو۔ اور العروۃ الوثقیٰ پر انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے پرچے انٹرنیشنل اسٹڈیز میں عابد رضا بیدار کا مقالہ۔

اب اشاریہ ملاحظہ کریں:۔

۱۔ اخباروں کا قبلہ گاہ۔ لاہور ۔۔ مجاریہ فتح الدین بسمل مرحوم ۔۔ مالک فیروز الدین گھایل ۔۔ ایڈیٹر نہال الدین ۔۔ مہتمم بھگوان داس ۔۔ ہفتہ وار ۔۔ ۴ ورق ۔۔ اجراء ۱۸۷۸ء

۲۔ اخبار عام ۔ لاہور ۔۔ مالک پنڈت مکند رام ۔۔ اڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ ۔۔ ہفتہ میں ۳ بار ۔۔ ۴ ورق خورد اجراء یکم جنوری ۱۸۷۱ء۔

۳۔ اخبار عالم۔ میرٹھ۔۔۔ مجاریہ وجاہت علی خاں مرحوم۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۸ ورق اوسط۔۔۔ مالک حکیم مقرب حسین اڈیٹر عبدالحلیم۔۔۔ اجرا ۱۸۶۱ء۔

۴۔ اخبار الاخیار۔ متعلقہ سینٹیفک سوسائٹی بہار۔۔۔ قصبۂ مظفرپور ضلع ترہٹ۔۔۔ پندرہ روزہ۔۔۔ ۸ ورق اوسط میر مجلس نواب سید محمد تقی خاں بہادر آنریری مجسٹریٹ۔ سکریٹری سید امداد علی خاں بہادر۔ اڈیٹر قربان علی خاں۔ اجرا ۱۸۶۸ء۔

۵۔ اخبار الاخیار۔ لکھنؤ۔۔۔ پندرہ روزہ۔۔۔ مجاریہ سید محمد علی۔۔۔ اجرا ۱۸۸۲ء (پہلے ہفتہ وار۔۔۔ اجرا یکم دسمبر ۱۸۷۲ء)

۶۔ اخبار الاخیار۔ دہلی۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۴ ورق اوسط۔۔۔ مالک شیخ محمد دین۔۔۔ ایڈیٹر حسیب الدین احمد سوزاں۔۔۔ اجرا ۱۸۸۷ء)

۷۔ اخبار ہند۔ لکھنؤ۔۔۔ مجاریہ مرزا فیاض الدین بیگ صاحب بہادر مرحوم۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۸ ورق اوسط۔۔۔ مالک گوری شنکر۔۔۔ مہتمم اودھ بہاری لال۔۔۔ اڈیٹر مرزا رفیع الدین۔۔۔ اجرا ۱۸۸۰ء

۸۔ اخبار الامصار بدایوں۔۔۔ ماہواری۔۔۔ ۲ ورق خورد۔۔۔ ضمیمۂ رسالہ انجمن۔۔۔ اڈیٹر و مالک علی امجد حسین اثنا عشری اجرا ۱۰ر فروری ۱۸۸۳ء۔

۹۔ اخبار النساء۔ دہلی۔۔۔ عشرہ وار۔۔۔ ۴ ورق اوسط۔۔۔ مالک سید احمد مدرس فارسی دہلی ضلع اسکول۔۔ اجرا یکم اگست ۱۸۸۴ء جلد ا نمبر ۲۔

۱۰۔ اخبار چنار۔ چنار ضلع مرزاپور۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۴ ورق اوسط۔۔۔ مالک ہنومان پرشاد۔۔۔ مہتمم رجب علی خاں خاں۔۔۔ اڈیٹر محمد علی خاں سیدی لکھنؤ۔۔۔ اجرا ۳۰ ستمبر ۱۸۸۴ء۔

۱۱۔ اخبار بہار۔ عشرہ وار۔۔۔ ۲ ورق اوسط۔۔۔ اجرا ۱۸۸۵ء

۱۲۔ آب حیات ہند۔ آگرہ۔۔۔ پندرہ روزہ۔۔۔ ناگری مشترک۔۔۔ ماہواری۔۔۔ ۸ ورق اوسط۔۔۔ مالک پنڈت بنسی دھر۔۔۔ اجرا یکم جنوری ۱۸۶۲ء جلد ا نمبر ۹

۱۳۔ ابو الظرفا۔ بمبئی۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۴ ورق کلاں۔۔۔ مالک امیر علی۔۔۔ اجرا یکم جون ۱۸۸۳ء۔۔۔ جلد ا نمبر ۱۲

۱۴۔ اتالیق پنجاب۔ لاہور۔۔۔ ماہواری۔۔۔ ۸ ورق خورد۔۔۔ مہتمم پیارے لال۔۔۔ علمی مضامین کا رسالہ۔۔۔ اجرا یکم جنوری ۱۸۷۴ء۔

۱۵۔ اتالیق ہند۔ لاہور۔۔۔ ہفتہ وار۔۔۔ ۸ ورق اوسط۔۔۔ مہتمم نادر علی سیفی۔۔۔ اجرا یکم دسمبر ۱۸۷۴ء جلد ا نمبر ۱۲۔

۱۶۔ اتالیق ہند لکھنو، ، ہفتہ وار ، ، ۶ ورق اوسط ، ، مالک محمد علی خاں عرشی ، ، اجرا ۱۳ جولائی ۱۸۸۳ء

۱۷۔ اتالیق زمینداراں۔ ہوشیار پور ، ، پندرہ روزہ ، ، ۱۲ ورق خورد ، ، مالک لالہ نرائن داس ، ، اجرا یکم اپریل ۱۸۷۷ء۔

۱۸۔ اتحاد۔ مدراس ، ، ہفتہ وار ، ، ۲ ورق ، ، اڈیٹر و مہتمم غلام غوث ، ، اجرا ۷ جنوری ۱۸۸۴ء جلد ۱ نمبر ۲

۱۹۔ اتفاق۔ مدراس ، ، ہفتہ وار ، ، ۲ ورق کلاں ، ، مالک و مشتہر عظیم الدین ، ، اجرا ۹ جون ۱۸۸۴ء

۲۰۔ اتفاق۔ مدراس ، ، ہفتے میں دو بار ، ، مجاریہ انجمن اسلامیہ ، ، میر مجلس آنریبل میر ہمایوں جاہ ، ، سکریٹری احمد محی الدین خاں ، ، اجرا ۱۸۸۴ء جلد ۲ نمبر ۱۔

۲۱۔ آثار الامصار۔ لکھنؤ ، ، ہفتہ وار ، ، ۴ ورق خورد ، ، اخبار مذہبی صاحبان اثنا عشری کا ، ، مالک سید سخاوت حسین ، ، اڈیٹر فدا علی عیش ، ، اجرا ۲ جنوری ۱۸۷۴ء۔

۲۲۔ احسن الاخبار۔ بانس بریلی ، ، ہفتہ وار ، ، ۴ ورق اوسط ، ، مالک محمد احسن ، ، اجرا ۷ ستمبر ۱۸۶۲ء۔

۲۳۔ احسن الاخبار۔ الہ آباد ، ، ہفتہ وار ، ، ۶ ورق اوسط ، ، مالک شیخ کبیر الحق مچھلی شہری ، ، اجرا یکم جنوری ۱۸۷۸ء۔

۲۴۔ احسن الاخبار۔ قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد قسمت روہیلکنڈ ، ، ہفتہ وار ، ، ۶ ورق اوسط ، ، مالک سید علی حسن خاں بہادر ، ، مہتمم و اڈیٹر سید ابوالحسن ، ، اجرا ۱۸۸۰ء۔

۲۵۔ احسن الجرائد۔ مدراس ، ، ہفتہ وار ، ، ۶ ورق کلاں ، ، مالک محمد حسین مہتمم محمد حسن ، ، اجرا یکم جولائی ۱۸۸۱ء۔

۲۶۔ احتشام الاخبار۔ ریاست جاورہ ، ، ہفتہ وار ، ، ۸ ورق اوسط ، ، مالک سید نظام الدین ، ، اجرا یکم مارچ ۱۸۸۷ء

۲۷۔ احمدی۔ میمن سنگھ (بنگال) باہتمام مولوی نوشہر علی۔ اجرا جنوری ۱۸۸۷ء

۲۸۔ اختر ہند۔ سہارن پور ، ، ہفتہ وار ، ، ۶ ورق اوسط ، اجرا یکم جنوری ۱۸۷۵ء

۲۹۔ اختر ہند۔ بمبئی ، ، ہفتہ وار ، ، ۲ ورق اوسط ، ، مالک غلام علی ، ، اجرا ۱۸ اگست ۱۸۷۷ء۔

۵۶- اسلام - میرٹھ ... باہتمام سید محمد عمیر ... ہفتہ وار ... ۶ ورق اوسط ... اجرا ۱۵ اپریل ۱۸۸۲ء

۵۷- استانی - کلکتہ ... عورتوں کی زبان بول چال روزمرہ میں ہفتہ وار اخبار نکالنے کا مولوی عبد الغفور شہباز نے اشتہار اس کا یکم جنوری ۱۸۸۲ء کو دیا مگر ابھی پرچہ شائع نہیں ہوا۔

۵۸- اسعد الاخبار - آگرہ ... مالک قمرالدین ... اجرا جنوری ۱۸۴۷ء

۵۹- اشرف الاخبار - دہلی ... ۴ ورق اوسط ... عشرہ وار ... مالک ریاض الدولہ بہادر محمد مرزا خاں ... ایڈیٹر مراد خاں ... اجرا ۱۸۷۵ء۔

۶۰- اشرف گزٹ - اس اخبار کا حجم ۸ ورق سے جس قدر زیادہ بڑھتا جاوے کوئی حد مقرر نہیں ہے ... مالک اختر ولد دولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی ... ایڈیٹر خواجہ سید بندہ حسن خاں ... اجرا ۱۸۸۸ء۔

۶۱- اشاعت السنت - یہ رسالہ چھوٹے ۱۶ ورقوں کا اور ضمیمہ اس کا چھوٹے ۴ ورقوں کا ... ماہواری ... شہر لاہور سے باہتمام مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب غیر مقلد کے شائع ہوتا ہے ... اجرا ۱۸۷۸ء۔

۶۲- اشاعت الاسلام - راولپنڈی ... ماہ اگست ۱۸۸۵ء سے چھوٹے ۸ ورقوں پر یہ رسالہ جاری کیا گیا۔

۶۳- اشراق - اس رسالہ کا عین مقصد حکیمانہ خیالات کی اشاعت ہے ... لکھنؤ ... ۱۶ ورق خورد ... پندرہ روزہ ... مالک مرزا محمد ہادی ... اجرا ۱۵ مئی ۱۸۸۴ء۔

۶۴- آشوب محشر - گلدستہ ماہواری ... فرخ آباد ... مالک یوسف علی خاں ظریف وظہیر ... مہتمم ذوقی رام ... اجرا یکم جنوری ۱۸۸۵ء۔

۶۵- آصفی - حیدر آباد دکن ... ہفتہ وار ... ۶ ورق اوسط ... مالک سید محمد سلطان اثنا عشری عاقل دہلوی ... مہتمم و اسسٹنٹ ایڈیٹر سید الطاف حسین قابل اثنا عشری ... اجرا ۹ جنوری ۱۸۸۵ء

۶۶- آصف الاخبار - حیدر آباد دکن ... ہفتہ وار ... ۶ ورق اوسط ... اجرا یکم فروری ۱۸۷۸ء

۶۷- اصح الاخبار - لکھنؤ ... ہفتہ وار ... ۴ ورق اوسط ... مالک سید محمد اثنا عشری ... اجرا یکم جولائی ۱۸۷۴ء

۶۸- الصدیق - فیروز پور ... ہفتہ وار ... ۴ ورق اوسط ... ولی اللہ مہتمم ... اجرا یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء

۶۹- اعتراض - بمبئی ... شعر و سخن کا رسالہ ... ماہواری ... ۸ ورق خورد ... مالک امداد علی ... اجرا ۱۵ اپریل ۱۸۸۶ء۔

۷۰۔ افضل الاخبار۔ میرٹھ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۴ ورق اوسط ۔۔۔ مالک حافظ محمد اکبر ایڈیٹر عبدالصمد خان ۔۔۔ اجرا ۱۸۷۷ء

۷۱۔ آفتاب ہند۔ بنارس ۔۔۔ باہتمام گوبند چندر شیرالی ۔۔۔ پندرہ روزہ ۔۔۔ بارہ ورق ۔۔۔ اجرا ۱۸۵۴ء۔

۷۲۔ آفتاب ہند۔ جالندھر ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۴ ورق اوسط ۔۔۔ مجاریہ برکت علی شوکت مہتمم سلطان علی صولت ۔۔۔ اجرا ۱۸۸۱ء۔

۷۳۔ آفتاب ہند۔ اعظم گڑھ ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۲ ورق کلاں ۔۔۔ مالک قدرت علی خاں لکھنوی ۔۔۔ اجرا یکم نومبر ۱۸۸۶ء۔

۷۴۔ آفتاب عالمتاب ۔ لاہور ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۸ ورق اوسط ۔۔۔ اڈیٹر منشی رام سنگھ ۔۔۔ اجرا ۶ مارچ ۱۸۸۵ء۔

۷۵۔ آفتاب پنجاب۔ لاہور ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۸ ورق اوسط ۔۔۔ مالک دیوان بوٹا سنگھ ۔۔۔ ایڈیٹر نبی بخش ۔۔۔ اجرا یکم جولائی ۱۸۷۳ء۔

۷۶۔ آفتاب سخن ۔ بنگلور ۔۔۔ شعر و سخن کا ماہواری ۔۔۔ ۸ ورق خورد کا رسالہ ۔۔۔ مالک محمد ابراہیم طیش ۔۔۔ مہتمم عبدالقادر ۔۔۔ اجرا یکم جون ۱۸۸۵ء۔

۷۷۔ آفتاب سخن ۔ سرسی ضلع مراد آباد ۔۔۔ شعر و سخن کا ماہواری رسالہ ۔۔۔ ۱۲ ورق خورد ۔۔۔ مالک سید احمد حسن مہر ۔۔۔ مہتمم سید آل احمد بلیغ ۔۔۔ اجرا ۲۰ جنوری ۱۸۸۸ء

۷۸۔ آفتاب عالم۔ آرہ ۔۔۔ ۱۵ فروری ۱۸۸۶ء سے ۱۶ ورق خورد ماہواری شائع ہوتا تھا ۔۔۔ یکم جولائی ۱۸۸۶ء سے پندرہ روزہ ۶ ورق پر ہوگیا ۔۔۔ مالک عنایت علی بیگ ۔۔۔ اڈیٹر عبدالکریم مہتمم عبدالحق بہاری ۔۔۔ اجرا ۱۵ فروری ۱۸۸۶ء۔

۷۹۔ آفتاب محشر۔ علی گڑھ ۔۔۔ پندرہ روزہ ۔۔۔ چھ ورق خورد ۔۔۔ مالک لالہ کندن لال بشر ۔۔۔ مہتمم لالہ مکھن لال ۔۔۔ اجرا ۵ ستمبر ۱۸۸۷ء

۸۰۔ آفیشل گزٹ ۔ اجمیر ۔۔۔ ہفتہ وار ۔۔۔ ۲ ورق اوسط ۔۔۔ مالک دیوان بوٹا سنگھ ۔۔۔ اڈیٹر وزیر علی ۔۔۔ اجرا جنوری ۱۸۶۹ء۔

۸۱۔ افتخار الاخبار۔ دہلی ۔۔۔ عشرہ وار ۔۔۔ ۴ ورق اوسط ۔۔۔ مالک سردار مرزا ۔۔۔ اجرا جنوری ۱۸۷۵ء۔

۸۲۔ افسانۂ ایام۔ دہلی ۔۔۔ ماہواری ۔۔۔ ۱۰ ورق اوسط ۔۔۔ مالک سید نصرت علی خان قیصر ۔۔۔ اجرا یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۸۳۔ افسوں۔ پہلے یہ پرچہ شعر و سخن کا ۸ ورق خورد پر... فتح گڑھ باہتمام جگدمبا پرشاد یکم مئی ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا اور اب یہ اخبار کے طور پر ہفتہ وار ۴ ورق خورد پر شائع ہونے لگا... مالک نعیم الزماں خاں ساکن موضع رائے پور بھاٹہ قائم گنج فرخ آباد۔

۸۴۔ افلاطون۔ ضمیمہ ملا دو پیازہ... لاہور... مالک الدین... مہتمم خدا بخش... ایڈیٹر میاں علاؤ الدین ہفتہ وار... ۴ ورق خورد... اجرا یکم جنوری ۱۸۸۶ء۔

۸۵۔ افسر الاخبار۔ قلعہ گولکنڈہ ریاست حیدرآباد... ہفتہ وار... سب سے بڑے دو ورق... مالک مشتاق احمد اجرا یکم مئی ۱۸۸۷ء۔

۸۶۔ اکمل الاخبار۔ دہلی... ہفتہ وار... ۴ ورق اوسط... مالک سید فخر الدین... اجرا یکم جنوری ۱۸۶۶ء

۸۷۔ اکسیر اعظم۔ فقیر نے اردو عام فہم عبارت میں قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کی ہے جس میں... آنریبل سید احمد خاں بہادر کی تفسیر کا بھی جواب دیا جاوے۔ رمضان ۱۳۰۳ھ سے اس کی اشاعت شروع ہوگئی ہے... ماہواری... مراد آباد... مالک قاضی احتشام الدین... اجرا ۱۸۸۶ء۔

۸۸۔ آگرہ اخبار۔ آگرہ... عشرہ وار... مالک خواجہ یوسف علی... مہتمم خواجہ تجمل حسین... اجرا یکم جنوری ۱۸۶۹ء... سچ پوچھو تو ہندوستان میں آزادی کا پھیلانا ہے اخبار نویسی تو صرف ایک بہانہ ہے۔

۸۹۔ آگرہ اڈیوکیشنل گزٹ۔ آگرہ... عشرہ وار... ۴ ورق اوسط... مالک خواجہ یوسف علی... مہتمم امیر الدین... اجرا یکم جولائی ۱۸۶۹ء

۹۰۔ آگرہ پنچ۔ آگرہ... ہفتہ وار... ۶ ورق اوسط... مالک امیر خاں... اجرا... ۴ فروری ۱۸۸

۹۱۔ آلموڑہ اخبار۔ آلموڑہ... پندرہ روزہ... ۸ ورق اوسط... ناگری مشترک... مہتمم پنڈت لیلانند جوشی اجرا ۲ جنوری ۱۸۷۲ء۔

۹۲۔ الطاف۔ بمبئی... ہفتہ وار... ۲۰ ورق اوسط... مالک حکیم الطاف حسین خاں رام پوری پیشکار انجمن اشاعت اسلام... اجرا ۲ جنوری ۱۸۸۳ء۔

۹۳۔ البرٹ گزٹ۔ لاہور... ہفتہ وار... ۸ ورق اوسط... مالک خواجہ احمد... اجرا ۱۴ جنوری ۱۸۷۶ء۔

۹۴۔ اپنچ۔ پٹنہ... ہفتہ وار... ۶ ورق اوسط... مجاریہ محمد اعظم... ۵ فروری ۱۸۸۵ء... مہتمم عابد حسین... جون ۱۸۸۵ء سے سید رحیم الدین مالک اور سید محمد یوسف منیجر۔

ڈاکٹر افریدی

حیرت شملوی

چند یادیں چند خطوط

حیرت شملوی کا نام عبدالمجید خاں ہے۔ اور ولدیت عبداللطیف خاں۔ حیرت صاحب ۱۹۰۰ یا ۱۹۰۱ میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک شملہ ہی سے اور بی اے علی گڑھ سے کیا۔ ۱۹۴۶ء میں خرابی صحت کی بنا پر وقت سے دس سال پہلے ریٹائر ہو گئے۔ آپ مرکزی اسمبلی ڈیپارٹمنٹ دہلی میں ملازم تھے اب ۱۹۵۱ء سے رام پور میں مقیم ہیں۔

ریاست رام پور اردو شاعری کا تیسرا اسکول مشہور ہے۔ اردو شعراء سے دلی اجڑی تو لکھنو آباد ہوا، پھر لکھنو اجڑا تو رام پور میں علی بخش، بیمار آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ پھر قائم چاندپوری آئے اور یہیں کی زمین کے پیوند ہو گئے۔ مرزا غالب، داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، جان لکھنوی، امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی، جلال لکھنوی۔ جان صاحب (ریختی گو) وغیرہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یہاں گزارا۔ ان سب کی حیثیت سرکاری تھی۔ یہ رام پور دربار سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے۔ ان شعرائے نووارد ان رامپور میں سب سے آخری شاعر جناب حیرت شملوی تھے، لیکن ان کی حیثیت سرکاری و درباری نہ تھی۔

دلی کے ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد حیرت صاحب اپنی سسرال موڈک (ضلع کوٹہ۔ راجستھان) چلے گئے۔ وہاں سے کچھ عرصہ بعد رام پور آئے۔

۱۹۵۹ء کی ابتدا۔ ابتدا تھی، میرے ایک بزرگ دوست مرحوم بشیر درانی نے ایک دن مجھ سے کہا:— چلو ایک بہترین شاعر سے تمہاری ملاقات کرائیں۔ میں اور بشیر درانی محلہ آتشبازان پہنچے۔ میں نے دیکھا ایک معمر شخص اپنے کرائے کے مکان کی بیٹھک میں جو زنانہ مکان کے دروازے سے ملحق ہے پلنگ پر دراز پڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کچھ تکلیف کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی۔ بشیر صاحب نے نہایت بے تاب ہو کر کہا۔ نہیں نہیں حیرت صاحب آپ اٹھنے کی کوشش مت کیجئے یوں ہی آرام سے رہئے۔ میں ایک دم اچنبے میں آ گیا! کبھی حیرت صاحب کو دیکھا کبھی بشیر صاحب کو۔ حیرت صاحب نے میری اس کیفیت کو تاڑ لیا اور نہایت سادگی سے کہا: بھائی

۱؎ ۱۹۴۴ء کے آخر میں طبیعت خراب ہوئی تھی، اس وقت سے ریٹائر ہونے تک چھٹیاں لیتے رہے تھے۔

میں کچھ زمانے سے اپنے جسم کے نچلے حصے سے معذور ہیں، کولہوں سے پیروں کی انگلیوں تک خون کا دور ان سست پڑ گیا ہے۔ تمام پٹھے اینٹھ گئے ہیں۔ آپ حضرات سے اس بے ادبی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ورنہ آپ کی طرح کرسی پر بیٹھتا!

میں نے محسوس کیا کہ حیرت صاحب کی بات میں دکھ درد نہاں تھا۔ لیکن ان کے لہجے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پھر حیرت صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی ذاتی، کبھی صحافتی، کبھی شعر و ادب پر۔ لیکن حیرت صاحب کی گفتگو شروع سے آخر تک اعتدال میں رہی۔ نہ اپنی تکلیف کا اظہار کیا، نہ دوسروں کی بے مہری کا۔ نہ باتوں میں کوئی غم و غصہ، نہ کسی سے کوئی شکایت۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے اور آہستہ آہستہ پھر ان کی شخصیت میں ایک رنگ روپ اور ہی اضافہ کر رہا تھا! سانولی رنگت، درمیانہ قد، قدرے تندرست، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی گہری آنکھیں، اور اسی مناسبت سے ناک، ہونٹ، ٹھوڑی، (کچھ کتابی چہرہ) سارے پٹھانوں ایسے نقوش و نگار، آخر پٹھان جو ٹھہرے۔

جالندھر اور رامپور میں حیرت صاحب کے قیام پذیر ہونے کی خبر عام ہوئی۔ یہاں کے علماء، ادباء، شعراء ان سے ملاقات کو آنے جانے لگے۔ جانے والوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ کبھی صوفی آتے، کبھی ادیب، کبھی نئے لکھنے والے، کبھی پرانے لکھنے والے، مگر نام کچھ مشہور بہت کم ہو سکتے تھے۔ کبھی مولانا محمد امتیاز علی عرشی، کبھی راز یزدانی، کبھی خادم عارفی (اگرچہ شاد عارفی خود ہمیشہ کے بیمار، مگر رکتا میں) یہ سلسلہ ان کے یہاں کے قیام کے آخری ایام تک رہا! ہر کسی سے حیرت صاحب بڑی فراخ دلی سے ملتے۔ کبھی کسی کی کوئی دل شکنی ان کی طرف سے نہیں ہوتی اور نہ کوئی حیرت صاحب کا دل دکھا کر جاتا۔!

میں نے یہ دیکھ کر ایک بار کہا: حیرت صاحب آپ کا دولت کدہ تو خیر سے اس دنیا کا آئینہ خانہ ثابت ہو رہا ہے! مسکرا کے کہا۔ بھائی آپ لوگوں کی محبت ہے، ورنہ حقیر تو کسی قابل نہ تھا۔ میں نے کہا: حیرت صاحب انکسار سے کام نہ لیجئے، یہ تو بڑی فضیلت کی بات ہے، ہر کسی کو یہ رتبہ کہاں ملتا ہے کہ ایک دنیا سی ایک طرف جھک آئے۔ اس میں آپ کے اخلاص کو بڑا دخل ہے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ سلسلہ مقامی حضرات پر بس کرتا ہو۔ دوسرے شہروں سے جتنے بھی لوگ یہاں آتے! حیرت صاحب سے ملنے کو ضرور آتے۔ (جگر مراد آبادی، مانی جائسی، عرش ملسیانی کو میں نے موصوف کے ہاں خود کئی بار دیکھا ہے)

ان کے روزمرہ کے مشاغل میں ایک مراسلت تھی۔ یا تو وہ خطوط لکھتے رہتے یا آتے ہوئے خطوط کے جوابات دیتے۔ ان کا اندراج وہ ایک رجسٹر پر بھی کرتے رہتے تھے۔ (خبر نہیں، وہ رجسٹر کہاں ہے؟ اس سے ان کے احباب کے حلقے کا کلیہ طور پر علم ہو سکتا تھا!)

مقامی حضرات کو اکثر سگرٹ کے خول پر یا سگرٹ رکھنے والے کاغذ کے جتے پر خطوط لکھتے تھے یہ خطوط دستی بھیجے جاتے تھے اکثر اپنی غزلیں بھی پہلے اسی پر نوٹ کرتے، بعد کو اپنی بیاض پر اتارتے تھے۔

ان کے پاس اکثر کچھ بچے پڑھنے کو آتے تھے۔ کوئی اردو پڑھتا، کوئی فارسی، کوئی انگریزی۔ بہت سے اسکول کے لڑکے اپنا سارا کورس پڑھتے تھے۔ ان سب کے لئے حیرت صاحب بڑے مشفق ثابت ہوئے، ہر بچہ ان کی شفقت کا اظہار کرتا ملتا!

شعری مطالعے کے وقت اردو شاعری کے بہترین اشعار کا انتخاب ترتیب دیتے رہتے تھے۔ جو اچھا شعر ان کی نظر سے گزرتا (یا وہ اتفاق سے کسی سے سن بھی پاتے) اپنے پاس نوٹ کر لیتے۔ نوٹ کرنے کے لئے ان کے پاس اردو ادبیات کے لحاظ

سے تمام [illegible] ایک ایک دو دو کا پیاں تھیں (خبر نہیں یہ ذخیرہ اب کہاں ہے؟)

ان کا مطالعہ ہر نوع کی کتب و رسائل پر انحصار رکھتا تھا۔ یہ ساری مصروفیات پلنگ پر ہی دراز رہ کر انجام دیتے یا پھر کمر کو گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیتے۔ میں کہتا "حیرت صاحب آپ تو کسی گھر بند ہی نظر نہیں آتے۔ تصوف پڑھتے ہیں جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ کمیونسٹوں کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کا بھی! پھر شعر و ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جہاں آپ کی نظر نہ ہو! آخر یہ اتنی لامحدودیت کیا چاہتی ہے؟" کہنے لگے "بھئی! ذاتی زندگی کے لئے کسی ایک نظریے کا قائل ہونا اچھا نہیں، یا کسی ایک ہی نظریے کا پابند ہونا۔ ہر کسی کے ہاں سے تمام اچھی چیزیں حاصل کرنی چاہئیں، اور ان سے اپنی زندگی کو ترغیب دینی چاہیئے۔ ان کی برائیاں ان کے لئے چھوڑ دینا بہتر ہے۔ اس طرح دل کو کھلا رکھنے سے کم اچھا ملنے کی بجائے بہت اچھا اور بہت کچھ مل جاتا ہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۰ء کے نصف سال تک، میں حیرت صاحب کے ہاں آتا جاتا رہا۔ البتہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء کے نصف سال تک میں حیرت صاحب کے ہاں وطن (رام پور) میں اب جولائی ۶۰ء سے تو بالکل بمبئی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس عرصے میں، حیرت صاحب سے ضروری مراسلت ہوتی رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ان کا ایک طویل خط آیا، اس میں دوسری باتوں کے سوا یہ جملہ بھی تحریر تھا، یہ گنہگار وسط نومبر میں عازم پاک ہے۔

پھر مجھے اپنے اور ان کے مشترک احباب سے معلومات حاصل ہوئیں۔ حیرت شملوی نومبر ۶۲ء کے دوسرے ہفتے میں رام پور سے پاکستان چلے گئے۔ یہاں سے دلی پہنچے، دلی سے لاہور، لاہور سے سکھر، پھر سکھر سے کراچی! ہر جگہ تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا۔

کراچی میں کچھ عرصے بعد، ان کے ایک دیرینہ دوست مسٹر بدر الدین (ڈائرکٹر محکمہ شہری پرواز) نے محکمہ اوقاف میں ایک سو روپے پر ملازمت دلا دی ہے۔ رہنے کو درسگاہ حضرت عبداللہ شاہ بخاری میں ایک مختصر سا فلیٹ بھی۔

پھر ایک دن اخبارات، رسالوں اور دوستوں کے خطوط سے معلوم ہوا: ۸ ستمبر ۱۹۶۴ء کی دوپہر کو حیرت صاحب اپنی رہائش گاہ پر اپنے احباب میں، اپنی غزل سنا رہے تھے۔ اس اثنا میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ یہ جان لیوا ثابت ہوا۔

انسان جس وضع کا ہوتا ہے، زندگی کی تمام قدروں پر، ویسی ہی اس کی چھاپ ہوتی ہے۔

مرحوم عبدالحمید حیرت شملوی، ایک اچھے شاعر تھے، ایک مشہور شاعر تھے۔ یہ تو ہم آپ سب جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شریف طبع انسان تھے۔ سادگی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ سنجیدگی ان کے مزاج کا زیور۔ صرف کام کی باتیں کرنا، ان کا شیوہ تھا ان کی شاعری کی طرح ان کی خطوط نگاری بھی، ان چند اور اہم خصوصیات پر صاد کرتی ہے۔ یہ خطوط اگرچہ ذاتی ہیں۔ لیکن اہل علم و ادب کی کائنات کا سرمایہ ہیں، اس لئے ان کو دبائے رکھنا مناسب نہ تھا۔

مرحوم سے ۵۰ء سے ۶۴ء تک مجھ سے مراسلت رہی جب وہ رام پور میں مقیم تھے اور میں وہاں سے بمبئی چلا گیا تھا ۲۲

کے آخر میں، مرحوم پاکستان چلے گئے تھے۔ پھر وہاں سے ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہاں ان کی زندگی نے کچھ زیادہ وفا بھی نہیں کی۔

رام پور (یوپی)
محلہ آتشبازاں
جمعہ ۲۷ر مئی ۵۵ء

عزیز مکرم دور صاحب

اسلام علیکم۔ کرم نامہ مورخہ ۱۹ مئی ملا۔ شکر یہ۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ بمبئی جا پہنچے۔ یہ اقدام آخر آپ کر ہی گزرے خدا راس لائے۔ ہمت مرداں، مدد خدا۔ خدا آپ ہی سے یہ خبر بھی سنوائے کہ آپ برسر روزگار ہیں اور خوش اور مطمئن۔ یہاں ابھی کسی سے یہ نہیں سنا کہ دور صاحب بمبئی گئے، میں بھی چپ رہا اور ہوں۔ صاحب مشرق (کراچی) نے مشرق کا ایک پرچہ بھیجا تھا، مگر پرانا پرچہ جسے میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ایک خط بھی آیا تھا کہ کچھ بھیجئے۔ مگر یہ تہی دامن بھیجے کیا خیر ایک غزل تو بھیجنا ہی پڑے گی۔ ذرا سا انتظار یہ ہے کہ مشرق کا دوسرا پرچہ بھی آ جائے

بمبئی ۳ کو پر اسٹریٹ میں ایک صاحب اشرف مرحدی بھی ہیں۔ کبھی کہیں ملاقات ہو جائے تو احقر کا سلام پہنچائیں، سال بھر پہلے ان سے خط و کتابت بھی تھی مگر اب موقوف ہے، قصور نہ معلوم میرا ہے یا اُن کا۔

آج صبح جناب راز یزدانی تشریف لائے تھے، برسوں بعد ملاقات ہوئی۔ مسرت ہی مسرت، دیر تک بیٹھے رہے۔

کیا آپ ابھی جناب شرف زیدی سے نہیں ملے؟ ملیں تو ان کی خدمت میں سلام حیرت ضرور پہنچائیں۔ آپ کے جانے سے حیرت نواز دور، میں مستقل ایک کمی ہو گئی۔ ایسی کمی جو محسوس ہوتی ہے۔

والسلام، دعاگو
عبدالمجید حیرت

(۸۶)

رام پور (یوپی)
محلہ آتشبازاں
جمعہ ۱۲ر دسمبر ۵۵ء

عزیز مکرم دور صاحب

سلام و رحمت۔ کرم نامہ مورخہ ۲۲ر دسمبر[1] ملا۔ آپ کے نہ آنے سے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ آپ بمبئی پہنچے۔ خدا کرے وہاں

---

[1] اس جگہ دسمبر کے بجائے نومبر ہونا چاہیے، حیرت صاحب سہواً دسمبر لکھ گئے۔

قیام ہمارے پاس آئے، اور آپ کی مراد بر آئے۔ زاہد[1] صاحب مکرم سے میرا اسلام کہئے۔ سانپ کا تیل (سرخ تیل) خدا ہی جانے، راس آئے یا نہ آئے، اس تیل کے بعد، شاید دوسرا تیل اثر نہیں کرتا، میرے آزار کی نوعیت مختصراً یہ ہے کہ برسوں ہوئے بائیں ٹانگ چلتے چلتے یکایک بھاری پڑ گئی تھی، قبض سخت و سنگین تھا، اور پیشاب رک رک کر بار بار، جب سے اب تک سبھی قسم کے علاج ہوئے مگر تکلیف اپنی جگہ رہی، بلکہ اور بڑھی، زندگی قدرے قلیل گوارا ہوئی تو یبوکوہنی کے علاج بالمار سے، لیکن یہ ہپ باتھ اور سٹز باتھ بھی اس سردی میں کارِ دارد، صبح و شام ایک سے گذرنا، جان پر کھیلنا ہے۔ ایک ہفتے سے پیٹ گم سے رہتا ہے، سخت حبس ریاح کمر بوجھل، ٹانگوں میں تشنج، پیرپنڈ میں دکھن، ذرا دیر بیٹھنا مشکل، شاید آنتوں میں خشکی ہے، مگر بلا کی خشکی، ہمہ اوقات کرب داد دیت اور اسی میں یہ غزل :

دکھ میں بھی خبر نہ لی کسی نے اتنی بھی مدد نہ کی کسی نے !
اس پیکرِ غم کو پاس آ کر دیکھا ہی نہیں کبھی کسی نے!
چارہ تو کجا، بجرمِ غم میں پوچھی نہیں بات بھی کسی نے
مخدوش تھی راہ جب سفر کی کی کون سی رہبری کسی نے
اس دورِ بلا میں جیسے اب تک جھیلا ہے عذاب ہی کسی نے
اس گھر میں وہی نظر نہ آئی چاہی تھی جو روشنی کسی نے
اسی بات پہ ایک غل مچا ہے جو بات کہی نہ تھی کسی نے
اب اس سے کسی کو واسطہ کیا جیسی بھی گذار دی کسی نے

حیرت کی غزل نوائے دل ہے
کم کی ہے یہ شاعری کسی نے

(رام پور، ۲۵ دسمبر ۵۸ء)

دعاگو،

عبدالمجید حیرت

رام پور (یوپی)

راج دوارہ (مسجد پیلو)

جمعرات ۶ اکتوبر ۶۰ء

مکرمی دور صاحب اسلام علیکم

آپکا کارڈ مورخہ ۳ اکتوبر مجھے کل ملا۔ موسم عضباک ہوا سرد، بارش لگاتار، کام کاج معطل، اسی طرح ۲ رتے آج

---

[1] زاہد صاحب ابن مولانا شوکت علی مرحوم (علی برادران کی زندہ یادگار جو ان دنوں آل انڈیا خلافت کمیٹی بمبئی کے جنرل سکریٹری ہیں۔

ادھر ہو گئی اور آج پہلا دن ہے کہ بارش تو نہیں ہے، مگر ہوا کا دادی زور شور ہے، اور آسمان بدستور ابرآلود۔ آپ کا D.L.O سے واپس آیا ہوا کارڈ تو میں کہیں رکھ کر بھولا ہوں، یا شاید سلطان اشرف صاحب کے پاس رہا۔

آپ کی طرف سے یہ اطلاع کہ حیرت پر آپ کا وہ مضمون اکتوبر کے 'آجکل' میں آنے والا ہے، مجھے آپ سے بھی پہلے سلطان اشرف صاحب کی طرف سے مل گئی تھی، یہ آجکل یقیناً میں بھی دیکھوں گا۔ آپ نے میرے یہاں رومان دیکھا۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے، جیسے بعض حضرات نے حضرت ریاض خیرآبادی کو ان کی خمریات کے پیش نظر میگسار سمجھا، اور غلط سمجھا، کاش دور صاحب، مجھ سے یکسر واقف مجھ سے نہیں، صرف میری شعری یا وہ گوئی سے بحث کرتے، دوست پھر دوست ہوتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ فلمیات سے وابستہ ہو گئے یا ابھی نہیں خیر آئندہ سہی۔

دعاگو، عبدالمجید حیرت

پس نوشت: اگر یہ خط بھی D.L.O سے واپس آیا تو اسے محفوظ رکھوں گا، اور آپ کے پاس بھیج دوں گا تاکہ آپ ڈاکخانے سے احتجاج کر سکیں،

حیرت

رام پور (یوپی)

راج دوارہ (مسجد پیلو)

بدھ، ۳ مئی ۱۹۶۱ء

عزیز مکرم دور صاحب، سلام ورحمت

آپ کا کرم نامہ ۸ اپریل ۱۹۶۱ء مل گیا، دلی شکریہ، میں بھی آپ کو بھولا نہیں تھا، گنہگار ہوں، مگر اتنا نہیں کہ اپنے محسنوں کو بھول جاؤں اس وقت تک کچھ آپ ہی گم رہے اور میں تذبذب میں کہ عریضہ لکھوں کہاں، اب معلوم ہوا کہ آپ کہاں ہیں اور کیوں کر، فلم میں آپ کو وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جو آپ چاہتے تھے، لیکن کبھی تو ہوگی — جوئندہ یابندہ، بہرحال کچھ ہوئی تو ڈھاکے سے "ندیم" کی زیارت اب تک نہیں ہوئی۔ یہ ارشد صاحب کا کوئی بھی خوب آدمی ہیں، پھر ایک عریضہ لکھا تھا، جواب ندارد، سلطان اشرف صاحب یہاں ان دنوں کچھ کم ہی آرہے ہیں، پچھلی ملاقات پر دس دن ہو چکے ہیں۔

ع۱ سلطان اشرف صاحب میرے اور ان کے مشترکہ دوست کی حیثیت رکھتے ہیں، اور میرے تو بہت ہی عزیز دوست ہیں۔ ناقد ہیں، محقق ہیں، مگر شہرت حاصل کرنے کی ہوس نہیں ہے۔ (دور)

ع۲ میں نے اپنے اس مضمون میں، حیرت صاحب کی صرف عشقیہ شاعری پر بحث کی تھی، ارادہ تھا بعد کو دوسرے مضمون میں دیگر عوامل پر بحث کروں گا۔ یہ مضمون آجکل دہلی شمارہ اکتوبر ۶۰ء میں چھپا۔ (دور)

"نگار" میں آپ نے سلطان اشرف صاحب کا وہ مضمون[1] دیکھا؟ کیسا پایا؟ یہ آپ حضرات کا احسان ہے کہ آپ نے اس گمنام فقیر کو روشناس خلق کرانے کے لئے قلم اٹھایا۔

اچھا اب خدا حافظ ۔ ڈاک سے تجلی دیوبند آگیا ہے اور مجھے "تجلی" اور صاحب تجلی، دونوں پسند ہیں، خیال اپنا اپنا۔ نظر اپنی اپنی ۔

دعاگو، حیرت

رام پور (یوپی)

راج دوارہ (مسجد پیلو)

بعدہ ۱۱ جون ۱۹۵۶ء

عزیز مکرم دور صاحب، السلام علیکم

آپ کا ۲۹ مئی کا کرم نامہ ۳۰ کو مل گیا تھا، اس دوران میں سلطان اشرف صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ یہ ملاقات آج ہوگئی ہوتی ان کے نام کا خط ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، اس کے بعد آج ہی یہ عریضہ آپ کو لکھ رہا ہوں اس دوران میں "ندیم" کا ایک بنڈل کا بنڈل بھی آگیا ۔ صرف شروع کے دو شمارے کم پرچے سب میں نے دیکھ لئے اب عروج صاحب زیدی دیکھ رہے ہیں، دیکھ چکیں گے تو یہ سارا دفتر فروغ لائبریری کو بھیج دیا جائے گا۔

اس کرم کی رسید ارشد صاحب کاکوی کو بھیج چکا ہوں، آپ نے تو اس خط کا جواب حیرت پر ایک قصیدہ کہہ دیا، مگر یہ سب آپ کی محبت ہے ۔ یہ مضمون سودا نے خوب کہا ہے ۔

سودا جو ترا حال ہے، اتنا تو نہیں وہ
کیا جانے تو نے اُسے کس حال میں دیکھا

سنتا ہوں کہ ۱۵ اگست تک بمبئی سے ایک زور دار ہفت روزہ "زمانہ"[2] نکلنے والا ہے، امید ہے کہ اس مضمون سے آپ بھی باخبر ہوں گے اور جب یہ اخبار نکلے گا تو اس میں آپ بھی ہوں گے ۔

حیرت اگر گمنام نہیں تو معروف بھی نہیں ۔ ترقی پسند شعراء کے حلقے میں دیکھئے، وہاں حیرت تو حیرت، ماہر القادری جیسے قادر الکلام اور مقبول زمانہ لوگوں کا ذکر بھی نہ ملے گا، اس کے برعکس ہم ایسے جامد اور قدامت پسندوں کے یہاں ترقی پسند شعراء سر آنکھوں پر ۔ احقر کو تو خدا گواہ ہے، شاعری کا دعویٰ بھی نہیں، اس لئے اگر شعرائے اونچے حلقوں میں، اس کا کہیں ذکر نہیں تو حاشا کوئی ملال بھی نہیں ۔

ندیم کے بعض مضامین بہت خوب پائے ۔ مگر کاغذ اور طباعت، خدا کی پناہ ۔

اچھا اب خدا حافظ ۔ ۲ بجے کے بعد ڈاک اب آگئی ہے ۔ ایک خط شاہجہاں پور سے وصی اقبال کا ۔ اور دیوبند سے تجلی

[1] سلطان اشرف صاحب نے نگار میں حیرت صاحب کی سوانح عمری شخصیت اور شاعری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ (قدم)
[2] یہ رسالہ "زمانہ" نام کے بجائے "ہمہ رجحانات" کے نام سے بمبئی سے نکلا۔

خدا کرے آپ اپنے عزائم میں جلد کامیاب ہوں ۔

دعاگو، حیرت

رام پور (یوپی)
راج دوارہ (مسجد پیلو)
سنیچر، ۱۵ر جولائی ۱۹۶۱ء

عزیز مکرم دور صاحب اسلام علیکم ۔

آپ کا خط، ر جولائی ۔ جزاکم اللہ

مکرمی سلطان اشرف صاحب نے بھی دیکھا، ابھی ابھی یہیں تھے، آپ کو خط لکھ چکے ہیں، ملازمت اب پیش کر رہے ہیں ۔
۱۵ر اگست سے زمانہ نکلے گا، دیکھئے کیسا نکلتا ہے، اس میں آپ بھی ہوں گے ۔ مبارک،
آپ نے یہ نہیں لکھا کہ فلمی دنیا میں آپ کو بھی کوئی جگہ ملی یا نہیں، اگر بات نہیں بن رہی ہے تو آپ صحافت کے میدان میں کیوں نہیں آجاتے، پہلے کہیں کچھ دن بمبئی ہی میں تربیت، پھر کسی فلمی یا علمی اخبار سے رشتہ ۔
غیر ترقی پسند ادبی محاذ کی بنا آپ ہی کیوں نہ ڈالیں یا ڈلوائیں ۔ جو بوئے، وہی کنڈلی کھولے، عامیانہ محاورہ ہے، مگر خیر

جو مرے دیکھنے کو آتا ہے پھر وہ بار دگر نہیں آتا [۲]

یقیناً یہ شعر حضرت نظام کا ہے، میر کا نہیں، اسد مرحوم سے کچھ سہو ہوا ہوگا مگر اس شعر میں میرے کی جگہ غالباً "مجھے" ہے۔
موسم یہاں شگفتہ ہے وقتاً فوقتاً بارش، ۔ اگر کہیں سے ہفت روزہ "شہاب" (لاہور) ۹ر اور ۱۶ر اپریل مل جائے تو اس میں خطوط اسد بنام حیرت شملوی ملاحظہ فرمائیں ۔

دعاگو، حیرت

پس نوشت : ابھی ابھی ایک صاحب (قدیر احمد خاں) سید اقبال حسین شوقی کی طرف سے انکی مطبوعہ رباعیات کی ایک جلد مجھے دے گئے ۔ یہ شوقی صاحب کا کرم ہے، مگر واللہ اعلم کہ یہ شوقی صاحب کون ہیں، یا مجھے کہاں سے جانتے ہیں ۔ شاید آپ جانتے ہوں ۔

۱؎ یہ خط میرے جس خط کے جواب میں آیا تھا، اس میں میں نے آل انڈیا پیمانے پر ایک ایسی انجمن کی تشکیل کی طرف اشارہ کیا تھا ۔ جو غیر جانب دار ہو کر، شعر و ادب کی خدمت کر سکے ۔

۲؎ نظام رام پوری کا ہی شعر ہے، دوسری جگہ حیرت صاحب کی یاددہانی کہ میرے کے بجائے "مجھے" ہے، یہ بھی درست ہے اسد ملتانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس کو شک و شبہ کے ساتھ میر کا کہا تھا ۔

رام پور (یوپی)

راج دوارہ (مسجد پیلو)

پیر، ۱۵ر اکتوبر ۶۲ء

محبی دور صاحب السلام علیکم۔

آپ کے خط کے جواب میں دو چار دن کی تاخیر اس لئے ہوئی کہ سلطان اشرف صاحب سے ملنا تھا اور یہ ملاقات کل ہوئی، وہ فرماتے تھے کہ انہوں نے آپ کے خطوط کا جواب براہِ راست دے دیا ہے۔

یہ مشورہ دینا کہ کوئی معاش کی کون سی راہ اختیار کرے، آسان نہیں، بہر حال جہاں تک آپ کا سوال ہے، میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اگر فلمی دنیا میں گزر نہ ہو سکے، تو صحافت کی طرف آ جایئے۔ میرا خیال ہے کہ بمبئی میں میدان تنگ نہیں شروع میں شاید کچھ کشٹ اٹھانا پڑے، لیکن جب کچھ سیکھ جائیے گا تو چل نکلیئے گا، مشورہ بہر حال مشورہ ہوتا ہے، فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے، بمبئی گئے ہیں اور اتنے دن وہاں گزارے ہیں تو کچھ بننے اور بنانے ہی کی کوشش کریں۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔

عزیزی میاں بدر[1] جاوید سے ملاقات ہو تو کہیئے گا کہ "خلافت" اب کچھ روز سے نہیں آ رہا ہے اور پوچھئے گا کہ وہ رسالہ "تذدر حیات" (؟) کب نکلے گا۔

دعاگو، عبد المجید حیرت

رام پور (یوپی)

راج دوارہ (مسجد پیلو)

پیر ۲۹ر اکتوبر ۶۲ء۔

عزیز مکرم دور صاحب سلام و رحمت۔ پرسوں ایک خط ملا، کل سلطان اشرف صاحب ملے، اس طرح خط آں کی نظر سے بھی گزر گیا۔

آئینہ[2] حیرت نکلنے پر آپ قطعاً ذہن میں تھے لیکن آپ کا تازہ پتہ معلوم نہ تھا۔ آپ نے بڑا کرم کیا کہ خط لکھا اور اپنا پتہ، چنانچہ مکتبہ الحسنات کو یہ رقعہ بھیج چکا ہوں کہ آپ کے پتے پر مجموعے کی ایک کاپی بھیج دی جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کتاب آپ تک نہ پہنچتی۔

آپ نے خط لکھا، مگر آپ نے یہ نہ لکھا کہ آپ کا حال دل کیا ہے، خیر اب سہی یہ ہیچمدان گنہگار بعض نجی ضرورتوں کی خاطر وسط نومبر تک عازم پاک ہے، اس تاریخ کے بعد آئندہ خط و کتابت وہاں سے ہوگی۔ ابھی یہ طے نہیں کہ قیام سکھر ہوگا، یا کراچی۔

آپ کا بہی خواہ اور دعاگو،

عبد المجید حیرت

---

(۱) بدر جاوید رام پور کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور حیرت صاحب کے مداح!

(۲) "آئینہ حیرت" حیرت صاحب کی ابتدائی غزلوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ مجموعہ ۶۲ء کی ابتدا میں مکتبہ الحسنات رامپور سے شائع ہوا۔ (دور)

سید محمد عبدالرشید فاضل

اقبال اور تصوف[۱]

غرضیکہ اقبال نے یہ باب قائم کرکے عشق کی جو تعریف کی ہے اور اس کے آثار و نتائج بتلائے ہیں وہ اُس حقیقی عشق کا بیان ہے جس سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک عشق و محبت سے مراد مقصد کوشی ہے، مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن کوشش ہو جانا اور ہر لحظہ اُس کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنا اور اسی کا نام اُنکے نزدیک زندگی ہے۔ یعنی زندگی اور عشق لازم و ملزوم ہیں۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اور عشق کی بہترین شکل طلب خدا ہے جو اطاعت اور بندگی سے شروع ہوتی ہے اور "تخلقوا باخلاق اللہ" پر عمل پیرا ہو کر صفات الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کرنے سے درجہ کمال پر پہونچتی ہے۔

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

مگر ایسا عشق کسی کامل کے فیضانِ صحبت اور اتباعِ سنت کے ذریعہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے نفسی اعتبار سے جہاں تقلیدِ سنت اپنے کمال پر پہونچتی ہے عشق بھی درجہ کمال پر پہونچ جاتا ہے۔ مگر آفاقی نقطۂ نظر سے جو لامتناہی امکانات خودی میں پوشیدہ ہیں، خودی کو استوار اور مسخر موجودات بنانے کے لئے اُن کو محبوب رکھتے ہیں وہ اُن ممکنات کو اپنی کوشش کے ذریعہ بے نقاب کرکے اُن کے حسن و جمال سے دنیا کو محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ اور محبوبیتِ عام کا مقام حاصل کرکے دنیا کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنی ایک ابتدائی غزل میں بھی اس خیال کو ظاہر کیا تھا۔

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے!

چونکہ "نفی خودی" اور "رہبانی توکل" کا لازمی نتیجہ کمزوری، ناداری اور فقر و فاقہ ہے۔ اس لئے بھی تصوف کے حامیوں نے ان تمام رذائل کو اپنے پروپیگنڈے سے فضائل ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس قدر گوناگوں پیرایوں میں کی کہ لوگوں کو یقین آگیا کہ واقعی قوت، زور، توانائی اور دولت و ثروت کے مقابلے میں کمزوری، ناداری، فقر و فاقہ، عجز و انکسار اور نیازمندی و قناعت اچھی چیزیں ہیں۔ اگر اس تصوف کے حامی ایسا نہ کرتے تو تصوف سے بہت تعلق رکھنے والے بھی اُن کے دام فریب میں گرفتار نہ ہوتے۔ اس لئے یہاں زہر دیا جاتا تھا وہاں ہلاک ہو جانے کی تعریف

بھی حسین سے حسین تر پیرایوں میں کی جاتی رہی تاکہ لوگ زہر کو تریاق سمجھ کر کھاتے رہیں۔ اقبال نے اس کتاب میں ایک پاکر کے تمام مذکورہ بالا فقرے کی اُسی شدت سے مذمت کی ہے جس شدت سے انکی ستائش کی گئی تھی۔

رہبانی توکل یعنی ہاتھ پیر توڑ کر خلوت میں بیٹھ جانے اور ذکر ہی کو مقصد حیات سمجھ لینے کی صورت میں دو باتوں سے مفر ممکن ہو سکتا یا اپنی خواہش و احتیاج کو خود دارانہ طور پر ضبط کیا جائے یا دوسری کے آگے دستِ سوال دراز کیا جائے۔ پہلی صورت میں ہلاکت ہے اور دوسری صورت میں خودی کی موت۔ اسلئے اقبال اوّل ناداری و احتیاج کی مذمت کرتے ہیں۔

اے فراہم کردہ از شیران خراج ۔۔۔ گشتہ روبہ مزاج از احتیاج!
خستگی ہائے تو از ناداری است ۔۔۔ اصل درد تو ہمیں بیماری است
می رباید رفعت از فکر بلند ۔۔۔ می کشد شمع خیال ارجمند

مسلمانوں کو انکی گذشتہ تاریخ یاد دلاتے ہیں کہ جب وہ دولت و منصب کے فلک الافلاک پر تھے۔ اور ان کی قوت سے باطل کے ایوانوں پر زلزلہ آگیا تھا۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسلاف تو فقر و فاقہ، ناداری اور مسکنت کی پستیوں سے نکل کر دولت و اقبال کی انتہائی بلندی پر پہونچے اور ہم ہر چیز کی نفی کرتے ہوئے اسفل السافلین میں گر گئے۔ اور اس حالت کو شانِ تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی شیر سے روباہ بن جانا ہمارے لئے کمال ہو گیا، ایسا کمال کہ جس کو فکر کی بلندی، خیال کی ارجمندی اور خدا جانے کن کن اخلاقی اقدار کو قربان کر کے حاصل کیا ہے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جانا اور کچھ نہ کرنا، توکل نہیں رہبانیت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "الکاسب حبیب اللہ" کسب کرنے والا خدا کو محبوب ہوتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

آنکہ خاشاک بتاں از کعبہ رُفت ۔۔۔ مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

مگر اس فرمان کے علی الرغم کسب و کوشش اور ترقی و تعالی کے لئے جدوجہد کرنے کو مذموم اور فقر و فاقہ، ناداری و محتاجی اور سدا ایک ہی حال پر قائم رہنے کو قابلِ تعریف ٹھہرا لیا گیا۔ حضور صلعم نے نعم مالُ صالح فرما کر نفسِ دولت کی نفرت سے باز رہنے کی تعلیم دی ہے یعنی مسلمان کو اُس مال سے اجتناب نہیں کرنا چاہئے جو مال جائز ذرائع سے حاصل ہو جو مال جائز ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے اور ان کاموں میں صرف ہوتا ہے جو فرد اور قوم کی بقا و ترقی کا باعث ہیں تو ایسا مال اُس پانی کی مانند ہے جو زیرِ کشتی ہو کر اُس کی پشتی کا باعث ہوتا ہے۔ ہاں نا جائز مال اور پھر اُس کو اپنا محبوب و مطلوب بنا لینا مذموم ہے۔ کیونکہ مال کی محبوب و مطلوب بن جانے کے بعد اُس پانی کی حیثیت ہو جاتی ہے جو کشتی میں داخل ہو کر اس کو غرق کر دیتا ہے۔ جیسا کہ مولانا روم نے حدیثِ مذکور الصدر کو تضمین کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

مال را گر بہر دین باشی حمول ۔۔۔ "نعم مالُ صالحٌ" گفتہ رسولؐ
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است ۔۔۔ زیرِ کشتی بہرِ کشتی پشتی است

حضورؐ نے ایسے فقر سے خدا کی پناہ مانگی ہے جو انسان کو زندگی کی بنیادی چیزوں کا بھی محتاج کر دے۔ وہ فقر جس کی حضورؐ نے تعریف کی ہے، فقرِ اختیاری ہے کہ ایسا فقر انسان کے تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن کے لئے ضروری ہے۔ فقرِ اضطراری سے بچنے کی کوشش کرنی

چاہیئے۔ اقبال فرماتے ہیں:۔

از خُمِ ہستی مئے گلفام گیر　　نقدِ خود از کیسۂ ایام گیر

اگر ایسا نہ کیا تو دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنا پڑے گا اور سوال سے انسان کی خودی کمزور ہوتی ہے۔

از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　بے تجلّی نخلِ سینائے خودی

مشتِ خاکِ خویش را از ہم مپاش　　مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش

گرچہ باشی تنگ روز و تنگ بخت　　در رہِ سیلِ بلا افگن رخت

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش

ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

"جب بحالت سواری اُشتر جناب فاروقِ اعظمؓ کا تازیانہ گر گیا تو اُسے زمین پر سے اٹھانے کے لئے آپ خود اونٹ سے اترے۔ اور اس معمولی کام کیلئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ کیا" (اقبال)

اقبال نے اس بات کی تحقیق کی ہے کہ یہ فنا اور بے خودی کے تصورات مسلمانوں میں کس طرح پیدا ہوئے اس لئے کہ دین اسلام نفس کے انفرادی وجود اور بقا پر زور دیتا ہے اور نفوس کی اصلاح و درستی اور استحکام پر فرد اور قوم دونوں کی زندگی و فلاح کا انحصار بتلاتا ہے۔ جیسا کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" سے واضح ہے اور وہ اپنی تحقیق میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ تصورات مغلوب قوموں کی ایجاد ہیں جو انہوں نے اقوامِ غالب کو کمزور کرنے اور انکو مصافِ زندگی سے فرار پر مجبور ہونے کے لئے بطور خدعتِ حرب کے استعمال کئے ہیں۔ اور یہ قومیں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ یعنی جن کو شمشیر و سناں کے ذریعہ شکست نہ دے سکیں۔ ان کو ان تصورات کے ذریعے وہ شکست دی کہ انکو پھر سنبھلنے کے قابل ہی نہ رکھا۔ مسلمان بھی اُن رہبانی تصورات سے متاثر ہو کر ایسے میدان سے بھاگے کہ خانقاہوں اور تکیوں کی چار دیواری کے سوا اُن کو اور کہیں پناہ نہ ملی۔ اور آج تک حالتِ فرار میں رہی ہیں مگر اس طلسم کو دیکھئے کہ آج بھی ان تصورات سے نفرت اور بیزاری کے بجائے ان کو عین اسلام سمجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ نظریات ادب اور شعر کا لباس پہن کر اس درجہ دلکش ہو گئے ہیں کہ اچھے اچھے علماء حکماء اور صاحبانِ جاہ و اقتدار بھی ان کے اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اور یہ اثر برابر اپنا کام کر رہا ہے۔ اور جو کوئی ان اثرات کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اُسکو دشمنِ اسلام ٹھہرایا جاتا ہے۔

اقبال ان نظریات کا اولین بانی افلاطون کو قرار دیتے ہیں۔ پھر یہی نظریات عیسائیوں، ایرانیوں اور ہندو ویدانتیوں اور بدھ مت کے ماننے والے کی صحبت کے اثر سے مسلمانوں میں بھی داخل ہو گئے۔ چونکہ یہ نظریات حد درجہ مہلک و تباہ کن تھے اس لئے اقبال تمام فکری و ذہنی صلاحیتوں کو انکی تردید میں لگا دینے کا تہیہ کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنی قوم کو زندگی کی قوتوں سے بہرہ ور ہو کر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں، اُس راستہ پر جو اسلام نے بتایا تھا۔ اقبال کی اس تمنا کا اظہار سب سے پہلے اُن کے ملی ترانے میں ہوتا ہے

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا　　ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس کے بعد سے وہ برابر حدی خوانی کرتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ نغمہ کی قوم میں کمی دیکھ کر مایوس ہونے کے بجائے نوا کو تیز سے تیز تر کرتے رہے۔ انکو کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے، بانگِ رحیل سنائی دے رہی ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خود ان کی آواز تھی نہ قافلہ تھا نہ آوازِ جرس تھی۔

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک　　جسکو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!

اسرارِ خودی میں اقبال نے افلاطون کا ذکر کرتے ہوئے اسکے مسلک حیات کو گوسفندی سے تعبیر کیا ہے نیز یہ کہ مسلمان قوموں پر اسکے نظریات کا اسقدر مہلک اثر ہوا ہے کہ وہ شیرِ نر ہوتے ہوئے بھی گوسفند بنکر رہ گئیں۔

گوسفندے در لباسِ آدم است　　حکم او بر جانِ صوفی محکم است

اس لئے ہدایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس راہبِ یونانی کے نظریات سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

اقبال کے نزدیک عجمی تصوف چونکہ "نفیِ خودی" اور "وحدت الوجود" جیسے حیات کُش نظریات کی تعلیم دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ بے عملی اور فرائض و واجبات سے بے پروائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے انھوں نے اس کتاب میں اثباتِ خودی کے ساتھ ساتھ آئینِ الٰہی، احکامِ شریعت اور فرائض کی طرف متوجہ ہونے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں خودی کی تربیت کے تین مرحلے قرار دیتے ہیں۔ جن کے بغیر خودی تربیت، استحکام اور ترقیِ صالح سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ مرحلۂ اوّل کا نام اطاعت رکھا ہے۔ وہ یہ کہ قانونِ الٰہی کی اطاعت کی جائے:-

تو ہم از بارِ امانت سر متاب　　بر خودی از عندہٗ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم فرماتے ہیں:-

"اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال کی خودی، خود سری نہیں ہے۔ نیز حکمرانی کے لئے پہلے حکم برداری کی مشق ضروری ہے جس نے خود اطاعت کی مشق نہ کی ہو وہ دوسروں سے اطاعت طلب کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ انسان کو خدا اختیار ورزی کی مشق کرانا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ فطرت کے جبر سے نکل کر اپنے اختیار سے فضیلت کوش اور خدا طلب بن سکے۔ اصل مقصد اطاعت کو اختیاری بنانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جبر کو اختیار میں بدلنا ہے۔ فرماں پذیری کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنی فطرت کے نصب العین کی ہے۔"

"جب انسان اپنے اختیار سے اپنی سیرت کو مستحکم کرتا ہے تو وہ ایک منظم آئین کے ماتحت کام کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں ایک اختیاری جبر پیدا ہو جاتا ہے باقی تمام کائنات بھی آئین پر قائم ہے لیکن اُس میں آئین سے سرگردانی کی کوئی طاقت یا میلان نہیں۔"

دوسرے مرحلے کو ضبطِ نفس سے موسوم کیا ہے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ضبطِ نفس سے نفس کی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے خواہشوں کے پیچھے بھٹکتے رہنے سے نفس اور جسم کی قوتیں منتشر ہو جاتی ہیں اور کسی ایک مرکز پر اُن کو مرکوز کرنے سے کرنوں میں جو حدت پیدا ہو سکتی ہے۔ نفس اُس قوت اور حرارت سے محروم رہتا ہے۔"

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف — تا شوی گوہر، اگر باشی خزف
ہر کہ، بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں

ضبطِ نفس کی راہ میں دو چیزیں حائل ہو سکتی ہیں۔ خوف اور محبت۔ پھر ان کی بے شمار اقسام ان دونوں پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ضبطِ نفس کی منزل طے نہیں ہو سکتی۔ اقبال فرماتے ہیں:-

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

مگر اس پر یقین کی ضرورت ہے یقین پیدا ہو گیا تو پھر کوئی خوف تمہاری راستہ نہیں روک سکتا۔

ہر کہ، حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

اور یہ یقین دوسری قسم کی تمام بندشوں سے آزاد کرتا ہے اور بڑی سے بڑی محبت بھی اسکے آگے بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے حتیٰ کہ باپ اپنے بیٹے کی گردن پر خنجر رکھ دیتا ہے اور محبت پدری اُس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد ٭ فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ماسوا قطعِ نظر — می نہد ساطور بر حلقِ پسر

بلکہ وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا، اپنے آپ کو ایک لشکر کے برابر سمجھتا اور سر ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابلے میں آ جاتا ہے اور جب کلمۂ توحید کا یہ حال ہے تو نماز کی تاثیر کا کیا ٹھکانا کہ نماز اور کلمۂ توحید میں صدف اور گوہر کی نسبت ہے کلمۂ توحید صدف ہے اور نماز گوہر۔

لا الٰہ باشد صدف، گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اکبر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است — قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

روزہ، بھوک اور پیاس اور دوسری نفسانی خواہشات پر ضبط رکھنے کی ایسی تربیت ہے جو تن پروری کا خاتمہ کرتی ہے۔ حج ترکِ وطن اور ہجرت کی تعلیم دے کر خویش و اقارب، دوست و احباب اور وطن کی محبت کو دل سے دور کرتا ہے اور ملت کی جمعیت کا باعث یعنی کہ ملت کے اوراق کی شیرازہ بندی بھی حج ہی سے ہوتی ہے اور زکوٰۃ محبتِ دولت کو فنا اور افرادِ ملت میں معاشی مساوات پیدا کرتی ہے غرضیکہ ان تمام احکام سے نفس کی تربیت ہو کر اُس میں ضبط کی قوت پیدا ہوتی ہے اور ضبطِ نفس سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ اور بالآخر انسان نیابتِ الٰہی کا اہل ہو جاتا ہے۔

گر شتر بانی، جہاں بانی کنی — زیبِ سر تاجِ سلیمانی کنی!
تا جہاں باشد جہاں آرا شوی — تاجدارِ ملکِ لا یبلےٰ شوی
نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش [illegible]

اس کے بعد اقبال نے نائبِ حق کے اوصاف بیان کئے ہیں جن سے موجودہ زمانے کے خلوت پسند صوفیوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ نائبِ حق تارک الدنیا، خلوت پسند اور بے خودی کا دلدادہ نہیں ہوتا بلکہ "وہ حقائقِ عالم سے باخبر، اسرارِ حیات سے واقف، عالم کون و مکان کی جان اور راسم اعظم کا مظہرِ اتم ہوتا ہے اور رموزِ جزو و کل اُس کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں احکامِ الٰہی کے اجرا کے لئے زندہ رہتا ہے۔ عام فطرتوں کو پختہ اور کعبے کو بتوں سے پاک کرتا ہے۔ نوعِ انسان کے لئے بشیر بھی ہوتا ہے اور نذیر بھی، سپاہی بھی اور سپہ سالار بھی۔ اُس کی ذات علم الاسمار کی حقیقت کا بیان اور سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ کا راز آشکارا ہوتی ہے۔ اُس کی قم سے گورِ تن میں مردہ جانیں زندہ ہو کر اس طرح کھڑی ہو جاتی ہیں جس طرح باغ میں صنوبر کھڑے ہوتے ہیں۔ اُسکی ذات سے عالم کی توجیہ ہوتی ہے اُسکے جلال سے عالم کی نجات وابستہ ہے۔

نیابتِ الٰہی کے متعلق یہ وہی تصور ہے جو قرآن نے آدم کی خلافتِ الٰہیہ کے بارے میں پیش کیا ہے۔ آدم کو خلیفہ بنا کر علمِ اسمار سے بہرہ ور کرنا اور ملائکہ کو اُس کے آگے سر بسجود کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں حقائقِ عالم کے سمجھنے اور اس علم حقائق کی ذریعے موجوداتِ عالم کے مسخر کرنے کے لئے لامتناہی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ اسرار و رموز سے آگاہ ہوتا اور موجودات کی تسخیر کرتا ہے یعنی جس طرح چاند، سورج، شجر، حجر اور ملائکہ خدا کے فرمانبردار ہیں انسان بھی "تخلقوا باخلاق اللہ" پر عمل کر کے ایک حد تک ان کو مطیعِ فرمان بنا سکتا ہے۔ صفاتِ الٰہیہ سے آراستہ ہو کر انسان کی قوتِ تسخیر کی کوئی حد نہیں رہتی۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور اجرامِ فلکی پر اقتدار حاصل کرنا اور ملائکہ انبیاء اور بالآخر خدا کے ساتھ ہم کنار ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اُسکے علم اور اُسکی قوت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ عالم کے جزو و کل سے آگاہ ہوتا ہوا قائم بامر اللہ ہو جاتا ہے۔

از رموزِ جزو و کل آگہ بود | در جہاں قائم بامر اللہ بود

اور پھر ایک جہاں کی تسخیر پر ہی قناعت نہیں کرتا بلکہ خدا کی صنعتِ خلاقی سے بہرہ ور ہو کر بے شمار دوسرے نئے عالم وجود میں لاتا ہے کیونکہ اسکی فطرت میں ودیعت شدہ لامتناہی امکانات قوت سے فعل میں آنے کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتے ہیں۔

فطرتش معمور و می خواہد نمود | عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کل | روید از کشتِ خیالِ او چو گل

ایسا نائبِ حق جہان کے ساتھ موافقت کرنے کے بجائے جہان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ موافقت کرے۔ وہ شکوۂ فلک نہیں کرتا بلکہ اگر زمین و آسمان اس کے خلاف ہوتے ہیں تو ان کا نظام بدل دیتا ہے۔ اور مزاج کے موافق ایک دوسرا نظام وجود میں لے آتا ہے۔

گر نسازد با مزاجِ او جہاں | می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را | می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند | چرخِ نیلی فام را برہم زند

اس کے بعد اقبال نے اسمارِ علیؓ کی شرح کی ہے۔ علی کے اسمار کی شرح کیوں کی؟ اوّل اس لئے کہ یہ کتاب موجودہ تصوف کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے دوم ابھی ابھی نائبِ حق کے اوصاف بیان کر چکے ہیں اُس نائبِ حق کے جو خودی کے مراحل طے کر کے نیابتِ الٰہی کے مقام پر پہونچا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر علیؓ کے اسما کی شرح کرنا ہی مناسب تھا کہ آپ کی ذات سے تقریباً تمام سلاسلِ تصوف وابستہ ہیں اس لئے متوجہانِ تصوفِ حاضرہ علیؓ کے اوصاف کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کر سکیں کہ کیا ان اوصاف سے نفیٔ خودی اور ترکِ دنیا کی تعلیم ملتی ہے اور کیا فاتحِ خیبر کو اُس خانقاہی زندگی سے دور کا بھی کوئی تعلق ہو سکتا

جو آج کل خانقاہوں کی رونق بنا ہوا ہے اور کیا خواہشاتِ نفس کو فنا کر کے، دل کو تمنا سے خالی کر لینا اور خلوت میں ذکر کرتے رہنے سے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے یا پاکیزہ و بلند مقاصد تعمیر کر کے رہنا اور اُنکے حصول میں جدوجہد کرتا بھی ضروری ہے۔ کہ۔

مرد کشور گیر از کرّاری است ۔۔۔ گوہرش را آبرو خودداری است

انسان دشمن پر پے در پے حملے کر کے جوہر شجاعت و مردانگی دکھانے کے بعد کشور گیر ہوتا ہے نہ کہ خلوت نشینی اور ترک دنیا کے ذریعہ۔ غرضیکہ انسان کی بلندی و عظمت خودداری میں ہے ترکِ خودی و عشق فنا میں نہیں ہے:۔

ہر کہ زیں بر مرکب تن تنگ بست ۔۔۔ چوں ۔۔۔ بر خاتمِ دولت نشست

زیر پاش اینجا شکوہِ خیبر است ۔۔۔ دستِ او آنجا قسیم کوثر است

افلاطون کے "نظریۂ اعیان" اور تصوفِ جدید کے مسئلہ "وحدت الوجود" اور "فنا" کی رو سے تو یہ تمام موجودات ایک دھوکا اور سب خیال یا اگر کچھ ہے تو قابل ترک مگر علیؓ خیبر شکن کی زندگی سے ان نظریات کی تصدیق ہونے کے بجائے یہ باطل ہو کر رہ جاتے ہیں اسلئے اسرار علیؓ کی خودی دل گدازوں کو سبق دیتی ہے کہ۔

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش ۔۔۔ تا مئے روشن خوری از تاکِ خویش

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است ۔۔۔ خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

چونکہ عجمی تصوف نے ادبیات کے ذریعے فکرِ انسانی کو بہت زیادہ مسموم کیا ہے، جیسا کہ اقبال نے مثنوی اسرار خودی کے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ

"ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور اُن کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچکر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

اس لئے بقول مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے انکا خیال یہ تھا کہ:۔

"جب تک فکرِ اسلامی اور ادبیات اسلامی کو اس مہلک رجحان سے نجات نہ دلائی جائے گی اور ایک تنومند اور حیات افروز ادبی نصب العین قائم کر کے ادبیاتِ اسلامیہ میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے گا، مسلمانوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تغیر پیدا نہ ہو سکتا۔ جب تک فکر و احساس کی وہ روح نہیں بدلے گی جس نے صدیوں سے اس قوم کو تنزل کا شکار بنا رکھا ہے زندگی کے حالات میں کوئی بہتر صورت پیدا نہ ہو گی۔" [۱]

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم فرماتے ہیں:۔

"عرب کے کلام میں حقیقت پروری اور بہت افزائی تھی، اس میں صحرا کی سی گرمی اور بادِ صرصر کی تندی تھی۔ عجمی افکار و جذبات نے اسلامی ادب کو زندگی کی قوتوں سے بیگانہ کر دیا۔ نقدِ سخن کو ہمیشہ معیارِ زندگی پر پرکھنے کی ضرورت ہے

جس طرح "علم برائے علم" ایک لایعنی شغل ہے اسی طرح "فن برائے فن" بھی نخلِ حیات کی ایک بریدہ اور افسردہ شاخ ہے" ؎۳۱

غرضیکہ مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر اقبال نے اس کتاب میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" اول آرزو اور تمنا کی تعریف کرتے ہیں:

گرم خون انسان ز داغ آرزو آتش این خاک از چراغ آرزو
از تمنا رقص بہام آمد حیات گرم تیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمونِ تسخیر است و بس آرزو افسون تسخیر است و بس

پھر فرماتے ہیں کہ وہ حسن جو ہمارے دل میں آرزو اور مقصد کو شوق کا جذبہ پیدا کرتا ہے کہاں سے میسر آتا ہے۔

سینۂ شاعر تجلی زار حسن خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر فطرت از افسون او محبوب تر
فکر او با ماہ و انجم ہم نشیں زشت را نا آشنا خوب آفریں
خضر در ظلمات او آب حیات زندہ تر از آب چشمش کائنات
ما گراں سیریم و خام و سادہ ایم در رہ منزل ز پا افتادہ ایم
عندلیب او نوا پرداخت است حیلۂ از بہر ما انداخت است
تا کشد ما را بہ فردوس حیات حلقۂ کامل شود قوس حیات
کارواں ہا از درایش گام زن در پے آواز نایش گام زن
از فریب او خود افزا زندگی خود حساب و نا شکیبا زندگی

اہلِ عالم را صلا بر خوان زند
آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

مگر اُس قوم کا حال قابلِ رحم ہے جو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو اور اُس کا شاعر ذوقِ حیات سے نا آشنا ہو۔ زشت کو اپنے آئینہ کلام میں خوب کر کے دکھلائے اور اس طرح نوش کی بجائے زہر آلود نشتر سینوں میں پیوست کر کے کل مرنے والی قوم کو آج ہی مار کر رکھ دے۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

اس کے بعد موجودہ تنزل یافتہ شاعری کی تصویر کھینچی ہے کہ آج ہماری شاعری کا کیا حال ہے اور پھر اس کو بھی عرب کی شاعری کی طرف بلاتے ہیں۔ عرب کی قدیم شاعری کی طرف۔ جس کی صداقت، اخلاص اور حقیقت پر قائم ہے جس میں قوموں کی تقدیریں بدل دینے اُن کو دنیا کی نگاہوں میں معزز کر دینے کی قدرت پائی جاتی ہے، وہ شاعری جو زندگی کی قوتوں سے مالا مال ہے جس میں جمال اور جلال دونوں ساتھ

؎ ذکرِ اقبال صفحہ ۱۰۵-۱۰۶ علی نظر اقبال صفحہ ۷۰

ہیں نہ کہ وہ شاعری جو حیات بخشی کے بجائے قوم سے اُس کی رہی سہی قوتِ عمل بھی چھین لی اور اُس کو بیکار بنا کر با لآخر اپنے خواب آور دل سے موت کی نیند سلا دے۔

آشکارا کیہ اث نقد سخن | بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بیں عمل را رہبر است | چوں درخش برق پیش تندر است
فکر صالح در ادب باید ترا | رجعتے سوئے عرب می باید ترا
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد | تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدۂ | نو بہار ہند و ایران دیدۂ
اندکے از گرمیِ صحرا بخور | بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بر گرمش بدہ | تن دمے با صرصر گرمش بدہ
اے شمالِ زمین دامنت ارجمند | آشیانے ساز بر کوہِ بلند
آشیانے، برق و تندر در برے | از کنام جرّہ بازاں برترے

تا شوی در خورد پیکارِ حیات
جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

اقبال نے اس کتاب میں تصوف کی مزید تشریح کے لئے کچھ حکایتیں بھی لکھی ہیں۔ ایک حکایت میں عجمی تصوف کی اُن تمام اہم خصوصیات بیان کر دیا ہے جو شرعی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہیں ان خصوصیات سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ تصوف اور بالخصوص اُس کا نظریۂ نفیِ خودی مسلمانوں زور اور بیکار کرنے کیلئے اُن اقوام نے ایجاد کیا ہے جو مسلمانوں سے مغلوب ہو چکی تھیں۔

باقی حکایت کے ذریعہ دوسرا رُخ دکھلایا ہے یعنی چند ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے حقیقی صوفیہ کی عظمتِ شان کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ اپنی خودی کے امکانات کو بروئے کار لے آتے ہیں اُنکے اعتمادِ نفس اور اختیار کا کیا حال ہوتا ہے۔ تاکہ موجودہ زمانے کے صوفیوں کے اپنے نظریہ جبر کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے اور مسئلہ نفیِ خودی کا بے حقیقت ہونا بھی نظر آ جائے۔

آخر میں میر نجات نقشبندیؒ کی نصائح تحریر کی ہیں اور یہ نصائح وہ ہیں جن سے حقیقی تصوف کی شان آشکارا ہوتی ہے۔

ہماری عادت ہو گئی ہے کہ ہم زمانے کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حدیثِ قدسی ہے لَاتَسُبُّوا الدَّھرَ فَاِنّی اَنَا الدَّھر۔ زمانے کو برا نہ دو کیونکہ میں زمانہ ہوں۔ یا زمان و مکان کے وجود کو نفس و اعتباری سمجھتے ہیں کہ جب موجوداتِ عالم ہی فرضی و اعتباری ہیں تو وقت کی حقیقت ہے! اس لئے اقبال نے اس کتاب میں "الوقت سیف" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت حقیقتِ زمان پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع نہایت مشکل ہے، خود اقبال ایک مدت اس کی تحقیق میں سرگرداں رہے۔ مگر اقبال کے خیالات کو سمجھ لینے کے بعد وقت کی حقیقت کے متعلق ذہن میں ایک تصور آ سکتا ہے خواہ ناطقہ اس کے بیان کرنے میں پھر بھی سر بگریباں ہی رہے۔ ہم اس بارے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مکالمہ کا [illegible] ... خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔

اقبال زمان کو ماہیتِ وجود اور عینِ خودی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ زمان روز و شب کا زمان نہیں بلکہ تخلیقی ارتقاء کا نام ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ زمان یا دہر کوئی مجرد یا ساکن حقیقت نہیں بلکہ ایک تخلیقی حرکت ہے ایک حدیثِ قدسی ہے "لا تسبوا الدھر فانی انا الدھر"۔ غرضیکہ اس نظریے کے مطابق دہر خلّاق ایک شمشیر ہے جو خود اپنا راستہ کاٹتی اور مزاحمتوں کو راستے سے ہٹاتی چلی جاتی ہے دہر کی یہ آتشی اور خلاقی طاقت کبھی کلیم کے اندر کارفرما ہوتی ہے اور کبھی حیدرِ کرار کے پنجہ خیبر گیر میں اس زمانِ حقیقی میں دوش و فردا نہیں ہیں نہ انقلاب روز و شب ہے لوگوں نے زمان کو مکان پر قیاس کر لیا ہے اور یوں سمجھ لیا ہے کہ ایک لامتناہی لکیر ہے جو ازل سے ابد تک کھنچی ہوئی ہے نافہم انسان وقت کو لیل و نہار کے پیمانوں سے ناپتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا کا وقت ہمارا وقت نہیں۔ اسی طرح خودی میں ڈوب کر زندگی سے آگاہ ہونے اور زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والے انسان کا وقت بھی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم شدہ کوئی امکانی انداز کی چیز نہیں۔ خودی کی ماہیت حیات جاوداں ہے"

تو کہ از اصلِ خودی آگہ نہ ای   از حیاتِ جاوداں آگہ نہ ای؟

"زندگی وقت میں نہیں گزرتی بلکہ وقت زندگی کی تخلیقی قوت ہے گردشِ خورشید سے پیدا ہونے والا وقت مکانی اور مادی وقت ہے حقیقی وقت کا اس سے کچھ تعلق نہیں لیل و نہار کا شکار غلام ہوتا ہے۔ زندگی جب مردہ ہو جاتی ہے تو لیل و نہار کا کفن پہن لیتی ہے۔ اور انسان افسوس کرتا ہے کہ عمرِ گرانمایہ کے اتنے ایام گزر گئے اور اب گردشِ ایام مجھے موت کے قریب لیجا رہی ہے"

اقبال مسئلہ زمان کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ اس کے ہاں عبد اور حُر کی تمیز کا معیار بھی یہی ہے کہ کوئی رُوح ایام کی زنجیر سے پا بجولاں ہے یا مکانی وقت سے آزاد ہو کر حقیقی زمان میں غوطہ لگا کر تسخیرِ مسلسل اور خلاقی کا شغل رکھتی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ازل سے ابد تک بنی بنائی تقدیر کا تصور بھی زمان کے غلط تصور کی پیداوار ہے:-

عبد را ایام زنجیر است و بس   بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر   حادثات از دستِ او صورت پذیر

جس انسان کے ہاتھ میں زمانے کی تلوار ہو وہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کر سکتا ہے۔ زمانے کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ زمانے کی ظاہری صورت سے موافقت پیدا کرنے والا پست ہمت زمانہ ساز ہوتا ہے۔ حُر زمانہ ساز نہیں ہوتا۔ بلکہ زمانے کے ساتھ ستیز کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور اس پیکار میں اس کو کامیابی اُسی حالت میں ہوتی ہے کہ جب حقیقتِ زماں کی شمشیر اسکے ہاتھ میں ہو ---

یا مرا یا مے کہ سیفِ روزگار   یا توانا دستیِ ما لو دیا ر[illegible] لے

لے فکرِ اقبال صفحہ [illegible]

سید مصطفیٰ علی بریلوی

انگریزوں کی لسانی پالیسی اور مسلمان

جس زمانہ میں انگریزی ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے اس وقت دہلی کے مغل دربار اور برصغیر کے دیگر ریاستی درباروں کی زبان فارسی تھی۔ انگریزوں نے بھی برسر اقتدار آنے کے کافی عرصہ بعد تک اسی زبان کو برقرار رکھا۔ کہیں ۱۸۳۴ء میں فارسی کے بجائے اردو رائج کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس فیصلہ کو عملی شکل ۱۸۳۹ء میں دی گئی اور طے پایا کہ اردو صدر دیوانی نظامت عدالت پریذیڈنسی کی دفتری زبان ہوگی اور فارسی رسم الخط میں لکھی جائے گی۔[1]

انگریزوں نے اردو کو مرکزی حیثیت بالکل عارضی بنیاد پر دی تھی جوں ہی ان کے مطلب کی ایک نسل تیار ہوگئی انہوں نے اردو کو ختم کر کے انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کو نوازنا شروع کر دیا۔ اس طرح فارسی اور اردو زبانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند کی سالمیت و اجتماعیت بھی ختم ہونی شروع ہوگئی۔ ملازمتوں میں ان کا حصہ برائے نام رہ گیا تعلیمی اداروں میں ان کے بچوں کی تعداد گھٹنی شروع ہوگئی اور آخرش مسلمان علمی میدان میں پیچھے رہ گئے۔ خود ان کے ادارے گورنمنٹ کی عدم دلچسپی کے سبب مالی مشکلات کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ ختم ہوگئے۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی ہر صوبہ میں حالات کے تحت پہلو بدلتی رہتی تھی۔ لیکن فاسد مقاصد کے لحاظ سے اس میں بڑی حد تک یکسانیت تھی انہوں نے کسی صوبہ میں بنگلہ کو فارسی کا قائم مقام بنایا کہیں اردو کی جگہ ہندی کا نفاذ کیا۔ کسی جگہ فارسی کے بجائے سندھی اور پھر انگریزی کو رائج کیا۔ اس طرح ایک واضح اسکیم کے تحت انگریزوں نے دفتری زبانوں کی تبدیلی کے ذریعہ مختلف علاقوں میں خصوصی طور پر مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ذیل میں ہم اس مسئلہ کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں یہ جائزہ بعض اعتبارات سے خاصہ سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات کا حامل ہے۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں جو تخم فساد بویا تھا اس کے نتائج ہم آج بھی بعض حیثیتوں سے بھگت رہے ہیں۔

صوبہ سندھ سابق سندھ وہ صوبہ ہے جہاں سب سے پہلے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ اس علاقہ پر کم و بیش گیارہ سو سال تک کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل رہا۔ ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے اس

---

[1] بحوالہ مقالہ عدالتوں میں اردو کا رواج از پروفیسر شیخ صمد

حصۂ ملک پر غاصبانہ قبضہ و اقتدار جمایا۔ اس وقت اس صوبہ میں ۹۹ فی صد مسلمان جاگیر دار اور زمیندار تھے اور فارسی دفتری زبان تھی۔ اگرچہ آخری دور کے امیران سندھ کو علم و ادب سے خاص دلچسپی نہیں تھی تاہم عوامی سطح پر علم کی شمع آب و تاب کے ساتھ روشن تھی۔ جب سندھ میں انگریزوں کے قبضہ کو تقریباً آٹھ سال گزر گئے تو ان کو اپنی مخصوص تعلیمی اصلاحات نافذ کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک تعلیمی جائزہ مسٹر ایچ ایلس اسسٹنٹ کمشنر نے مرتب کیا[1]۔ صاحب موصوف اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کے فارسی اسکولوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جن اسکولوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم دی جاتی ہے ان کی حالت زیادہ تسلی بخش ہے۔"

نصاب تعلیم کی تبدیلی اور سندھی زبان کے حروف ابجد کی ایجاد

کسی آزاد قوم کے ذہن و دماغ کو تبدیل کرنے کا آسان ذریعہ یہ ہے کہ اس قوم کے لٹریچر زبان اور انداز غور و فکر میں حالات و واقعات کے تحت ایسی تبدیلی پیدا کر دی جائے کہ وہ اپنے ماضی سے تقریباً بے تعلق ہو جائے۔ چنانچہ انگریزوں نے سندھی مسلمانوں کو ماضی سے کاٹنے کے واسطے خود ان کی ہی بولی کو منتخب کیا یہ دلکش زبان بطور زبان تو بولی جاتی تھی، لیکن مسلمانوں کے افکار و خیالات، مذہبی لٹریچر، خط و کتابت غرض جملہ امور فارسی زبان میں انجام پاتے تھے۔ انگریزوں نے بہت غور و فکر اور طویل بحث و مباحثے کے بعد سندھی زبان کے حروف ابجد بنانے کا فیصلہ کیا[2]۔ ظاہر ہے کہ جب زبان نئی نئی بنائی جاتا ہے تو اس میں کسی قوم کا لٹریچر فوراً منتقل نہیں ہو سکتا۔ جب اس قوم کے بچے ایک نئی زبان کو پڑھتے ہیں تو ان کو اپنے ماضی کے لٹریچر تاریخ تمدن مذہبی کارناموں ..... واجبی واقفیت ہی ہو سکتی ہے۔ سندھی زبان کے حروف ابجد کی کہانی شیخ صادق علی مرحوم وزیر خیر پور میرس کی زبانی حسب ذیل ہے۔

"اول تجویز کی گئی کہ سندھی زبان کے حروف ابجد بنائے جاویں۔ نیز سندھی زبان کی صورت خطی مقرر کی جائے۔ ایک طویل و طویل مباحثہ کے بعد جس کا ذکر مسٹر ایلیس نے اپنی رپورٹ کے فقرہ (۳۳) سے (۴۲) تک میں کیا ہے۔ عربی صورت خطی تجویز کی گئی پھر ایک اسکیم تیار کی گئی اور یہ تجویز ہوئی کہ صرف سندھی اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے اور ایک نارمل سکول اس غرض سے کھولا گیا کہ مفصلات میں جو سندھی اسکول تحصیلوں کے ہیڈ کوارٹروں اور دیگر شہروں و دیہات میں کھولے جائیں گے ان کے لئے ماسٹر تیار کئے جائیں۔ اور صاحب کمشنر بہادر نے ایک سرکلر سالانہ امتحانوں کے متعلق جاری کیا اور یہ بھی قرار پایا کہ جو طلبا امتحانات میں عمدہ ترین ثابت ہوں گے۔ ان کو یا تو وظائف دیئے جائیں گے یا انہیں سرکاری نوکری میں لیا جائے گا۔

---

۱ بحوالہ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۰۷ء

۲ ادارہ سلسلہ آف ایجوکیشنل۔ تیہ ڈاکٹر گیلانی سابق ناظم تعلیمات کراچی

صاحب کمشنر بہادر کی تجویز تھی کہ سرکاری نوکریوں میں صرف انھیں لوگوں میں سے بھرتی کئے جایا کریں۔
یہ حکم کیا گیا کہ عربی اور فارسی تعلیم بعد حصول منظوری دی جایا کرے (اور یہ سفارش کی گئی کہ ان زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے طلبا سے فیس لی جایا کرے)[1]

صوبۂ بنگال

سابق متحدہ بنگال وہ بدنصیب صوبہ تھا جس پر سب سے پہلے انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ اس صوبہ کے شرقی حصہ میں خصوصاً مسلمانوں کی اکثریت تھی زمینداروں اور جاگیرداروں کی اکثریت مسلمان تھی لیکن برطانوی استعمار کی گہری چالوں کے نتیجہ میں مسلمانان بنگال کی خوش حالی بہت جلد داستان پارینہ بن گئی۔ مسٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر اپنی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی" میں لکھتے ہیں۔

"۱۸۰۰ء کے شروع میں بنگال کے کسی اچھے خاندان کے مسلمان کا غریب ہونا ناممکن تھا۔"

"ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام برقرار رکھیں گے لیکن جوں ہی ہم نے اپنے کو طاقتور پایا اس وعدہ کو فراموش کر دیا۔"

"ہم نے ان (مسلمانوں) پر ہمہ قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔"

"ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو ان کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا۔"

"جیسے ہی اس نظام کے تحت خاص آدمیوں کی ایک نسل تیار ہو گئی۔ ہم نے اس قدیم اسلامی نظام تعلیم کو الگ اٹھا کر پھینک دیا۔ اس وقت سے مسلمان نوجوانوں کو سرکاری ملازمتوں کا ہر ایک راستہ بند نظر آتا ہے۔"

مغلیہ سلطنت سے متعلق دیگر صوبوں کی طرح بنگال میں بھی فارسی ہی دفتری اور عدالتی زبان تھی۔ شاہ عالم خواہ کتنا ہی نااہل اور کمزور شہنشاہ تھا لیکن اس نے انگریزوں کو حقوق دیوانی دیتے وقت دفتری زبان فارسی اور اسلامی نظام قائم رکھنے کا معاہدہ طے کیا تھا۔ انگریز عجلت سے کبھی کام نہیں لیتا۔ لہٰذا انہوں نے اس معاملہ میں بھی اپنی من مانی کارروائی کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ غالباً ۱۸۸۳ء میں فارسی کے بجائے بنگلہ زبان دیوناگری رسم الخط میں صوبہ کی سرکاری زبان قرار دی گئی۔ اس وقت تک مسلم بنگلہ اور ہندو بنگلہ علیحدہ علیحدہ بولیاں تھیں۔ مسلم بنگلہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی چنانچہ اس تبدیلی سے قبل کی مسلمانوں کی ۹۹ فی صد کتابیں فارسی عربی رسم الخط میں پائی جاتی ہیں۔ بنگلہ زبان جاری ہونے سے قبل مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط زائد تھا۔ بقول سر عبدالرحیم صوبہ بنگال میں اس زمانہ میں مسلمانوں میں تناسب خواندگی زیادہ تھا کہ جب بنگالی زبان

---

[1] صفحہ ۹۰-۹۱ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۷ء

اردو حروف میں لکھی جاتی تھی[1]

رسم الخط اور زبان کی تبدیلی سے مسلمانانِ بنگال کو سخت ذہنی اور مالی نقصان پہنچا۔ آج کل کے ارباب دانش کو اس وقت کے مسلمانوں کے احساسات و جذبات سن کر اگرچہ سخت تعجب ہوگا لیکن حقیقت تو بہر حال حقیقت ہے مشتے نمونہ از خروارے ایک بزرگ کی تقریر کے اقتباس ملاحظہ ہوں جنہوں نے سرکاری ملازم ہونے کے باوصف اپنی رائے کا برملا اظہار کیا تھا۔ یہ تقریر انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۹۹ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ میں ارشاد فرمائی تھی[2]

"زبان بنگلہ ہمارے مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگئی اور کس طرح (فارسی) جو بالکل شائع ہوتی تھی اٹھ گئی اور پھر زبان بنگلہ اور انگریزی اس کی قائم مقام بن گئی"۔

"اب زبان بنگلہ گویا ہماری مادری زبان ٹھہر گئی"۔

"اگر میں سرسری طور پر پندرہ برس یا اس کے قریب زمانہ کے تعلیمی نتائج کے حساب کو دیکھوں تو بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ ہزارہا مسلمان زادے اس تعلیم کی بدولت اپنے مذہب دین اور اخلاق اسلامی سے کوسوں دور پڑے ہوئے ملیں گے"۔

"اس وقت اگر ہم بنگلہ زبان کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ شریک ہونے اور اس میں اپنے علمی خزاین اور قومی ملفوظات کو داخل کرنے سے غافل رہیں تو ایک دن ضرور کفِ افسوس ملنا پڑے گا"۔

انگریزوں نے اپنی چالاکی سے مسلمانانِ بنگال کو فارسی زبان سے محروم کر دیا۔ یہ محرومی ایک زبان سے بے تعلقی نہیں تھی۔ بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے بے تعلقی کے مترادف تھی۔ آج ننتر اسّی سال گزرنے کے بعد جبکہ دو تین نسلیں گزر چکی ہیں ہم برطانوی استعمار کے پہنچائے ہوئے زخم کی کسک محسوس کر رہے ہیں۔ ہمارے مشرقی پاکستان کی ایک سیاسی اقلیت علیحدگی پسندی کے جو نعرے لگا رہی ہے یہ سب باتیں ہمارے خیال میں انگریزوں کی لسانی پالیسی کے برگ و بار ہیں ورنہ عام بنگالی مسلمانوں کا جذبۂ اخوت و جذبۂ ایمانی آج بھی قابل رشک ہے۔ اس زہر کا اصلی علاج بھی ہے کہ بنگلہ کو ہم اسلامی علوم و فنون خیالات و افکار سے مالا مال کر دیں تاآنکہ یہ زبان خاص مسلمانوں کی زبان ہو جائے۔

بہار میں ہندی کا اجرا

صوبۂ بہار ہمیشہ سے مسلمانوں کے علمی خانوادوں کا مرکز رہا ہے۔ اس مردم خیز صوبہ میں بھی انگریزوں کی لسانی پالیسی کی تیز چھری چلی اور اس نے مسلمانوں کی اجتماعیت اور دیرینہ روایات کو اگر پوری طرح ذبح نہیں کیا تو ان کو مجروح ضرور کر دیا۔ اس ضمن میں تفصیلات سے قطع نظر ایک

---

[1] صفحہ ۷۹ اجلاس کانفرنس دہلی ۱۹۲۶ء

[2] تقریر مولوی عبدالکریم اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کلکتہ

اقتباس سن لیجئے جو اس دور کے صف اول کے ایک مسلمان بیرسٹر کے ارشاد پر مبنی ہے۔

"قلم کی ایک حرکت نے بہار کے تمام دفاتر میں فارسی حروف کے بجائے ناگری حروف جاری کر دیئے گویا کہ جادو سے تمام سرکاری محکموں میں ایک تغیر ہو گیا۔ مسلمانان بہار کو اس قدر نقصان پہنچا کہ جس کے اثر سے وہ اب تک نہیں سنبھلے"

(تقریر سید علی امام بیرسٹر بہار اجلاس کانفرنس کلکتہ ۱۸۹۹ء)

اس صوبہ کے مسلمانوں کی برادران وطن اور انگریزوں سے جو تاریخی کشمکش ہوئی وہ حصول پاکستان کی جنگ میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ اس وقت بھی مسلمانان یو۔پی بالخصوص اس جرم عظیم کی پاداش میں بھارتی سامراج کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

صوبہ یو۔پی

چونکہ اس علاقہ کے مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار تھا اس لئے انگریز اپنے مقاصد میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ۱۸۷۱ء میں سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو، فارسی اور عربی کی بقا کے واسطے وفاداری سرکار اور انگریزی زبان کی ترقی و اشاعت کے نعروں کے درمیان خاصی جدوجہد کی[1]۔ زبان کا مسئلہ در اصل ایک سیاسی مسئلہ تھا اور انگریزوں نے اس قسم کا الجھاؤ پیدا کر کے سیاسی فوائد حاصل کئے۔ اس ضمن میں چند اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں۔

"انگریزی حکومت نے صوبجات متحدہ میں ہندی اردو کا سوال پیدا کیا۔ اردو ہندی کا سوال گو کہ بظاہر ایک غیر سیاسی اور زیادہ تر تعلیمی سوال تھا مگر وہ کلیتاً سیاسی مسئلہ بن گیا تھا"

(حیات اجمل از قاضی عبدالغفار صفحہ ۵۷)

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ ۱۸۹۹ء میں سرسید احمد خان کے دست راست مشہور ماہر تعلیم نواب محسن الملک نے اپنی تقریر میں صوبہ متحدہ کی سرکاری زبان کے مسئلہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"تیس برس کا عرصہ ہوا کہ (یعنی ۷۱-۱۸۷۰ء) ہمارے ہم وطن ہندو بھائیوں نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے سرکاری دفاتر میں بجائے فارسی حروف کے ناگری حروف جاری کئے جائیں اور اردو موقوف ہو کر ہندی زبان کو رواج دیا جائے اس وقت صوبہ کے حاکموں نے اس درخواست پر کچھ توجہ نہ فرمائی تھی اور ان کی درخواست منظور نہ ہوئی تھی اب پھر انہوں نے پرانے خیال کو تازہ کیا ہے اور گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے حضور میں ایک ایڈریس پیش کیا ہے اور انہیں دلائل سے جو بہار اور ممالک متوسط میں اس تبدیلی کے موید ہوئے۔ اضلاع شمال و مغرب و اودھ میں تبدیلی زبان اور تبدیلی حروف

---

[1] تفصیل کے واسطے دیکھئے مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد منگلوری مرحوم

کو قابلِ تعمیل اور واجب التسلیم قرار دیا ہے اور یہ مسئلہ گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے زیرِ غور ہے اس مسئلہ پر ۱۸۷۳ء میں بہت بڑی بحث ہوئی تھی اور اس زمانہ میں عموماً تمام ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے معزز مسلمانوں نے بہ سرپرستی مرحوم سر سید احمد خان کے اپنے ان نقصانات پر جو اس تبدیلی سے ہونے والے میں بہت غور کیا تھا...... صوبہ بہار میں اس تبدیلی کا نفع نقصان آپ کو معلوم ہو چکا ہے"

نواب محسن الملک نے اپنی اس تاریخی تقریر میں مزید فرمایا کہ

"سرکاری دفتروں میں زبان اور خط کا بدلنا کوئی معمولی بات نہیں ہر اس کا بہت بڑا اثر قوموں پر پڑتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کی کیفیت دیکھو کہ صرف تبدیلی خط اور تبدیلی زبان کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں پر کیا کچھ اثر پڑا۔ سرکاری دفتروں میں خصوصاً عملہ (ملازمین) میں کہیں ان (مسلمانوں) کا نشان نہیں ملتا۔ امیر لوگ سوداگروں میں کوئی نوکری وہ نہیں پا سکتے اور جو تباہی اور بربادی ان کی ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے"۔

اس موضوع پر لاہور کے مشہور رہنما جسٹس شاہ دین کے حسب ذیل خیالات تھے۔

"میرے خیال میں اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ ان حروف کی تبدیلی جس میں کوئی زبان لکھی جاتی ہو ضرور اس زبان پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بہت سے دلائل کی ضرورت نہیں ہے (مثلاً) مشہور مسلمانی نام یوسف اور زکریا بمبئی میں بوجہ تبدیلی حروف کے "جوسف" اور جاکریا لکھے جاتے ہیں اور ویسے ہی پڑھے جاتے ہیں یہ تبدیلی حروف کی گویچر کا پتلا سرا ہے جس سے یہ ارادہ (برادران وطن کا) ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی بجائے اردو کے رائج ہو جائے جو کہ مسلمانوں کے واسطے بے حد مضر ہے"۔

صوبہ پنجاب

پنجاب میں اردو کو ہمیشہ ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں اس مسلم اکثریتی صوبہ میں اردو کو خطرہ لاحق ہوا چنانچہ امرتسر میں نواب سر خواجہ سلیم اللہ مرحوم کی صدارت میں مسلمانانِ ہند کا ایک تاریخی اجتماع ہوا اور حسب ذیل ریزولیوشن پاس ہوا۔

"اس کانفرنس کی رائے میں اردو صوبہ پنجاب میں تعلیمی اغراض کے لئے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے اور بہ حیثیت زبان درسی جو رتبہ اسے مدارس میں حاصل ہے اسے قائم رکھنا ترقی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے"۔

محرک۔ شیخ عبدالقادر بار ایٹ لاء۔ مویّد۔ شیخ عبداللہ علی گڑھ

پنجاب میں ایک اور چال بھی چلی گئی جس کا منشاء یہ تھا

کہ پنجاب کی مقامی بولی پنجابی کو صوبائی درجہ حاصل ہو جائے اور اس طرح اردو کی مرکزیت مجروح کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے چنانچہ ڈاکٹر پی۔ سی۔ چٹرجی نے پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن میں اس بارے میں باقاعدہ تحریک بھی

یش کردی۔ اس سلسلہ میں تعلیمی کانفرنس کے جلسہ نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

یہ کانفرنس ڈاکٹر پی۔ سی چیٹرجی۔ سی۔ ای۔ آئی کی اس تجویز سے جو انہوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن میں پیش کی ہے کہ زبان پنجابی کو اس صوبہ میں بجائے اردو کے رواج دیا جائے اختلاف کرتی ہے اور تجویز کو بہ لحاظ قلت لغات بانی و اختلاف محاورہ ناممکن العمل اور اس صوبہ کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے۔

محرک۔ خان بہادر میاں محمد شفیع بار ایٹ لا۔ مؤید۔ سید علی امام بیرسٹر بہار

صوبۂ سی پی

سی۔ پی میں ۱۸۸۱ء تک اردو رسم الخط کا رواج تھا۔ اس زمانہ میں سرکاری دفاتر میں مسلمان اہل کاروں کی تعداد تقریباً ۵۵ فی صد تھی۔ جب اردو وہاں سے خارج کر دی گئی اور ہندی حروف جاری ہوئے آج ۵ فی صد بھی مسلمان دفاتر میں نظر نہیں آتے۔

(تقریر حافظ ہدایت حسین اجلاس کانفرنس دہلی ۱۹۲۶ء)

مندرجہ بالا مختصر اور کسی حد تک غیر مکمل جائزہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ماضی میں انگریزی حکومت کی لسانی پالیسی نے مسلمانان ہند کی وحدت و یکجہتی کو کافی صدمہ پہنچایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط نہ ہوتا تو مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی کا بیج بونے میں اس پالیسی نے ایسے قومی محرک کی حیثیت سے کام کیا تھا کہ صرف اسی بنیاد پر برصغیر کے مسلمانوں کی قومی سالمیت و وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہوتی اور پاکستان کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا۔ بلکہ ممکن تھا کہ کسی کو کبھی اس مسئلہ پر سوچنے کا موقع بھی نہ ملتا۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کو متحد رکھنے اور اس میں فکر و خیال کی ہم آہنگی و یکسانیت پیدا کرنے میں دین کے بعد زبان اور رسم الخط بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں کی یکسانیت قوم کو متحد رکھنے میں قومی محرک کی حیثیت سے کام کرتے ہیں تو دوسری طرف یہی چیزیں اگر مختلف ہو جائیں تو قوم کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا بھی ایک اہم سبب بنتی ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھ کر اور کلیتاً جذبات سے کام نہ لے کر ہمیں اس مسئلہ کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اور اب کہ غیر کا قدم درمیان سے ہٹ گیا ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو خلوص نیت سے حل کرنے کی کوشش کریں اور اغیار کی پیدا کردہ تلخی نے ہمارے لئے جذبہ اخوت و محبت میں جو کمی آگئی ہے یا ہماری ملی اور قومی سالمیت و وحدت میں جو ضعف پیدا ہو گیا ہے اس کو دور کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لیں۔ ہمیں جلد از جلد کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے جس سے ماضی کے تلخ حقائق کا پھر سامنا نہ ہو اور قوم کی ایسی شیرازہ بندی ہو جائے کہ کوئی طاقت بھی اسے آسانی سے ختم نہ کر سکے۔ پاکستان کے لئے جو دو قومی زبانوں کا مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ اسی کو جلد از جلد عملی جامہ پہنا کر قوم کو انتشار و افتراق سے بچایا جائے۔ اور کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ دوئی کی یہ خلیج بھی کچھ دنوں بعد پٹ جائے۔

یہاں یہ امر جتانا بھی ضروری ہے کہ قومی سطح پر اگر یہ بات ناگزیر ہے کہ قومی زبانوں کو اپنایا جائے ان کو ترقی دی جائے اور انکو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تو ساتھ ہی ساتھ مختلف علاقوں کو ترقی دینے کے لئے علاقائی زبانوں کی بھی سرپرستی پوری طرح کرنی لازمی ہے۔

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ　مولانا سعید احمد اکبر آبادی　میاں بشیر احمد　خواجہ غلام السیدین　رئیس احمد جعفری
ماہر القادری　فرقت کاکوروی　نواب مشتاق احمد خاں　ڈاکٹر محشر عابدی　ڈاکٹر احسن فاروقی
سید شبیر علی کاظمی　ڈاکٹر وزیر آغا۔　سید قدرت نقوی　رئیس امروہوی　اور دیگر اہل قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

"مرقع عبدالحق" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد و نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

"بزم عبدالحق" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کا تذکرہ۔

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

آفسٹ کی چھپائی　عمدہ سفید کاغذ　صفحات ساڑھے تین سو　قیمت چھ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی۔

رفتارِ ادب

ادب منزل بہ منزل

مصنف :- سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

صفحات :- ۲۲۴

قیمت :- چھ روپے

ناشر :- اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۸۱ء

زیرِ تبصرہ کتاب سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی تصنیف ہے۔ موصوفہ علمی و ادبی میدان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس سے قبل ان کی کئی تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ پیش نظر تصنیف ان کا ادبی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ مصنفہ نے ادب و شعر کے مختلف پہلوؤں، مختلف ادبی نظریات، اردو زبان و ادب کے مراکز اور علمی و ادبی شخصیات پر قلم اٹھایا ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن مصنفہ نے جس سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ انھیں ترتیب دیا ہے اس نے اس مضامین کو ایک مستقل تصنیف بنا دیا ہے۔ یہ تمام شخصیات، تحریکات، نظریات ایک سلسلہ کی مختلف کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

کسی دور کی تمام شخصیتوں، تحریکوں، اور مختلف ادبی نظریوں سے کوئی مصنف یکساں طور پر متاثر نہیں ہو سکتا مصنفہ کے لئے نہ تو ہر شخصیت ممدوح کا درجہ رکھتی ہے، نہ وہ ہر تحریک سے یکساں طور پر متاثر ہیں اور نہ ہر نظریہ ادب ان کے لئے قابل قبول ہے، لازمی تھا کہ وہ کسی کو اپنی عقیدت و محبت کا مرکز قرار دیں۔ کسی سے نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ کسی سے اختلاف کریں۔ بلاشبہ اس کتاب سے مصنفہ کے فکر و رجحان کے اس گوشے پر روشنی پڑتی ہے لیکن وہ کسی تحریک پر، کسی شخصیت پر یا کسی مکتبہ فکر کو ہدف طعن و تشنیع نہیں بناتیں وہ ان خامیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی بھی قائل نہیں ہیں بلکہ بڑی خوش اسلوبی سے اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ ان کی یہ سلامت روی اور فکری و ذہنی توازن قاری کو بہت متاثر کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مصنفہ کے خیالات میں بلندی ہے لیکن معلومات ناکافی ہیں۔ ان کے مطالعہ میں گیرائی ہے لیکن گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ مختلف تحریکوں، شخصیتوں اور نظریوں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ دلچسپ ضرور ہے لیکن یہ ان کے طرز تحریر کی خوبی اور قلم کی ندرت کاری ہے، معلومات کی بلندی اور مطالعہ کی وسعت کی خوبی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنی کم معلومات کو اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ (ا - س)

مجلہ جناح کالج / کراچی (۱۹۶۵ - ۶۶ء)

زیر تبصرہ مجلہ جناح کالج کے طلبہ کا ترجمان ہے ۔ اس میں تحقیق و تنقید، تاریخ و سیاست، مذہب و سائنس، شعر و ادب وغیرہ موضوعات پر مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے ۔ حصہ لینے والوں میں اساتذہ، طلبہ اور متعدد دیگر اہل قلم شامل ہیں ۔ مضامین معیاری بھی ہیں اور غیر معیاری بھی، ہلکے پھلکے مضامین بھی ہیں اور علمی و تحقیقی مقالات بھی ہیں ۔ سید محمد تقی ڈاکٹر سید عبد اللہ، پروفیسر عبد السلام، شاہد عشقی، عصمت اللہ خاں، مفتی انتظام اللہ شہابی اور ظفر عمر زبیری کے مقالات فکر انگیز ہیں ۔ کالج کے ایک استاد کا مضمون "تقلید" نہایت الجھا ہوا ہے ۔ اگر وہ اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتے تو اچھا ہوتا ۔ کسی کالج کے جریدے میں مذہبی مسائل پر اس قسم کے مضامین کا شائع ہونا مناسب نہیں ۔

اسی طرح بعض کہانیاں نہ صرف فن کے معیار سے گری ہوئی ہیں بلکہ ان میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں ۔ مثلاً صفحہ ۱۹۹ پر ضرب المثل "اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا" نقل ہوتی ہے ۔ یہ مثل لفظاً و محاورۃً ہی غلط استعمال نہیں ہوئی ہے بلکہ محل استعمال بھی صحیح نہیں ۔ یہ موقع "تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی" کا ہے ۔ اسی طرح صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں "ہم بدستور ماش کی طرح اینٹھے ہوئے رہتے" ماش کبھی نہیں اینٹھتا ۔ یہ صفت ماش کے آٹے کی ہوتی ہے اور مثل میں "ماش کے آٹے کی طرح اینٹھنا" استعمال ہوتا ہے ۔ یا اوپر کی مثل میں "جھونکنا" نہیں "پھوڑنا" آتا ہے یعنی اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا ۔ اس قسم کی اغلاط "حرف اول" سے حرف آخر تک متعدد نظر آئیں ۔ طلبہ کے بعض مضامین، افسانے اور غزلیں نہایت دلچسپ ہیں اور ہم اس آئینے میں ان کا مستقبل دیکھ سکتے ہیں ۔ بحیثیت مجموعی مجلہ نہایت شاندار اور قابل مطالعہ ہے اس کا ایک حصہ انگریزی مضامین پر مشتمل ہے ۔

چند مضامین اور تصاویر کے صفحات کے سوا تمام پرچہ سستے کاغذ پر شائع ہوا ہے ۔ کتابت اگرچہ سستی اور انتہائی خراب ہے لیکن آفسٹ کی چھپائی نے اس کے عیوب کی بڑی حد تک پردہ پوشی کر دی ہے ۔ (س - ب - ع)

مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری ایم ۔ اے

ناشر: مکتبۂ عثمانیہ، پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی ۵

مولانا محمد احسن نانوتوی اور اس عہد کے بہت سے بڑے بزرگوں کو قوم بھولتی جا رہی ہے حالانکہ یہ بزرگ نہ صرف اپنی پاک بازانہ زندگی کی وجہ سے بلکہ اپنی ملی اور علمی خدمات کی وجہ سے بھی ہمیشہ یاد رکھے جانے کے لائق ہیں ۔ آج ہماری زندگی میں جو مذہب، اخلاق، تہذیب اور علم و ادب کے اجلے اور ستھرے نقوش نظر آتے ہیں، چاہے ہمیں معلوم نہ ہو اور خواہ ہم ہمیشہ کے لئے انھیں فراموش کر دیں لیکن اس میں ان کا حصہ ہے ۔ حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی خاموش خدمات کی بدولت ہمارے علوم و فنون میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے ۔ ان کے ذریعے ہم علمائے سلف کے بے مثال علمی خزانوں سے نہ صرف واقف ہوئے ہیں بلکہ ان کے وارث بنے ہیں ۔ اگر ان مخلصین صادق، فدایان علوم اور شیدایان مذہب کا وجود نہ ہوتا تو علوم و معارف کے کیسے کیسے خزانے ضائع ہو جاتے ۔ ہم ان کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے ۔

محمد ایوب قادری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا محمد احسن نانوتوی کے سوانح حیات مرتب کر دیئے اور ان کی علمی و دینی خدمات اور مقام سے متعارف کرایا۔ قادری صاحب علمی و تحقیقی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کتاب کی زبان نہایت شگفتہ، طرز تحریر نہایت دلکش، معلومات بیش قیمت اور تقسیم و ترتیب مضامین اس درجہ سائنٹفک ہے کہ اس میں ترمیم اور تبدیلی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کتاب کو ایک "تعارف" اور "پیش لفظ" سے گرانبار کیا گیا ہے۔ اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ ان تحریروں کی کوئی علمی حیثیت ہے نہ ان سے کتاب کی کسی خصوصیت کا پتا چلتا ہے نہ کاروباری نقطۂ نظر سے یہ تعارف اور پیش لفظ کوئی مفید چیز ہیں۔

یہ کتاب عام کاغذ پر، اوسط درجے کی کتابت و طباعت اور خوبصورت گرد پوش کے ساتھ (۲۸۲) صفحات پر مشتمل ہے اور چار روپے میں مل سکتی ہے۔ (ا-س)

مرقع مسعود: مرتبہ جلیل قدوائی

صفحات: ۲۴۲

قیمت: چھ روپے

شائع کردہ:- راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان ناظم آباد۔ کراچی

سر سید راس مسعود، سر سید احمد خان کے پوتے اور مشہور ماہر قانون جسٹس محمود کے نامور سپوت تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیم یورپ کی درسگاہوں میں ہوئی تھی، لیکن ان کا دل ملک و ملت کی محبت سے سرشار تھا، اور ان کی خواہش تھی کہ افراد قوم کا تعلیمی اور اخلاقی معیار بلند ہو، اور عصری فنون سے متصف ہو کر اپنے ملک کا وقار بڑھائیں۔ وہ ہمارے ادب میں انقلاب انگیز تبدیلی کے حق میں تھے، ساتھ ہی وہ مشرقی روایات کو عزیز بھی رکھتے تھے۔ اپنے دادا کی طرح راس مسعود کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس شعبے میں انھوں نے غیر معمولی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کی اسی خصوصیت کی بناء پر سابق ریاست حیدر آباد نے ان کو اپنے پورے ملک کے ناظم تعلیمات کے عہدۂ جلیلہ پر بلا لیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حیدر آباد میں راس مسعود نے اپنے عہدے کو جس خوش اسلوبی سے نبھایا، وہ حیدر آباد کی تعلیمی ترقی کی کتاب کا ایک بسیط باب ہے، جس کا احاطہ ایک مستقل کام ہوگا۔ جدید حیدر آباد کے تعمیر کاروں میں راس مسعود مرحوم کا نام جلی حروف میں لکھا نظر آتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور ریاست میں اردو کی ترویج و اشاعت کے منصوبوں میں انہوں نے خاص دلچسپی لی تھی۔ اور درسگاہوں کو جدید سے جدید اصولوں پر چلانے کے امکانات پیدا کئے تھے۔

مرحوم کی تعلیمی معاملات میں اس غیر معمولی صلاحیت کے پیش نظر حکومت نظام نے انھیں جاپان بھیجا تھا، تاکہ وہاں [illegible] ان کے اس دلچسپ علمی دورے کی بہترین یادگار

ان کی کتاب "جاپان کا تعلیمی نظم ونسق ہے"۔

سر سید راس مسعود کے لازوال تعلیمی خدمات کے پیشِ نظر دربار نظام سے انہیں "نواب مسعود جنگ بہادر" کا خطاب بھی ملا تھا۔ لیکن عام طور پر وہ سر راس مسعود ہی کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک زمانہ ایسا آیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں کچھ اختلال سا پیدا ہوا اور وہاں کے مصالح کا تقاضا تھا کہ راس مسعود علی گڑھ آکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو جائیں۔ لہٰذا حیدر آباد کی نظامت تعلیمات کو چھوڑ کر وہ علی گڑھ آگئے۔ اور مسلم یونیورسٹی میں جو ضعف زوال کے آثار پیدا ہو گئے تھے، انھیں نہایت پامردی اور استقلال سے دور کرنے کی سعی کی۔ آخر میں وہ ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم کی خدمت پر مامور ہوئے۔

راس مسعود دنیا کے تقریباً تمام نامور اشخاص کے دوست تھے۔ علامہ اقبال سے تو برادرانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ کئی کئی ماہ اقبال بھوپال میں راس مسعود کے مہمان ہوتے تھے۔

کراچی میں راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان کے نام سے ایک ادارہ تقریباً پانچ سال سے قائم ہے۔ جس کا مقصد صرف یہ نہیں کہ سر راس مسعود کے نام کو زندہ رکھا جائے بلکہ مرحوم راس مسعود کے علمی اور ادبی منصوبوں پر عمل درآمد کرنا بھی ہے۔ اس سوسائٹی نے نارتھ ناظم آباد کراچی میں ایک اسکول اور ایک گراں قدر کتب خانہ بھی جاری کر دیا ہے۔ اور ہر سال راس مسعود کی یاد میں علمی اجلاس بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں مزید توسیع و ترقی کے امکانات بھی سوسائٹی کے زیرِ غور ہیں۔

چنانچہ سوسائٹی نے اس سلسلے میں اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت زیرِ تبصرہ کتاب "مرقعِ مسعود" شائع کی ہے، جس میں انگریزی اور اردو کے متعدد نامور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ شروع میں جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو کا تعارف ہے۔ اور حصہ اردو کے مضمون نگاروں میں بابائے اردو، سر عبدالقادر، علامہ اقبال، عبدالرزاق کانپوری، غلام السیدین، رشید احمد صدیقی، میاں بشیر احمد وغیرہ ہیں اور حصہ انگریزی میں ای، ایم فارسٹر، رائٹ آنریبل فشر، ڈاکٹر کرنکاؤ، کے۔ ایم۔ پانیکار وغیرہ ہیں۔

ان میں بعض راس مسعود کے دوست اور بعض مرحوم کے عقیدت مند ہیں، جن کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ راس مسعود کی سیرت و کردار اور آن کی علمی و ادبی خدمات ہی پر روشنی پڑتی ہے بلکہ نصف صدی قبل کی تعلیمی اور سماجی تاریخ بھی پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مرقعِ مسعود سوسائٹی کا قابلِ قدر علمی کارنامہ ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ اور ترتیب میں مرتب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔

(ت۔ یس)

گردوپیش

تصویر کا ایک رُخ

انگریزی کی سرپرستی

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں نرسنگ کی تربیت مکمل کرنے والی نرسوں کو ٹوپی اوڑھانے اور اسناد تقسیم کرنے کی تقریب منعقد ہوئی۔ یہ تقریب جو پاکستان کے ایک نمائندہ شہر میں ہو رہی تھی اور پاکستان کے ایک اہم شعبۂ زندگی سے متعلق تھی اور جس میں اسناد لینے والے اور دینے والے سب پاکستانی اور پاکستانی نژاد تھے مگر سننے والوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس تقریب کا تعلق ان کے اپنے ملک سے نہیں بلکہ کسی غیر ملک سے ہے۔ کیونکہ اس تقریب میں رپورٹ، خطبہ، استقبالیہ حتیٰ کہ اعلانات تک انگریزی میں ہو رہے تھے۔

اردو کے استادوں کی حالتِ زار

کلاسیکل ٹیچرز یونین لاہور کے صدر جناب مطیع الرحمان قریشی نے ملک کے دانشوروں کی بے حسی پر شدید تاسف کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ فنون لے یہ سرپرست جو اسی کے نام پر بڑی بڑی تنخواہیں اور وظائف حاصل کر رہے ہیں بڑے بڑے اداروں پر قابض ہیں۔ فنون اور زبانوں کو پڑھانے والے اساتذہ کو ایک باعزت زندگی کا موقع دلانے میں طویل عرصے سے مجرمانہ خاموشی سے کام لے رہے ہیں۔ مطیع الرحمان قریشی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ایک طرف تو اردو اور اسلامیات کو انگریزی کی طرح لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی ہے جس کی تدریس میں اتنی ہی محنت صرف ہوتی ہے جتنی انگریزی میں، دوسری طرف ہائی اسکول میں اردو اور اسلامیات پڑھانے والوں کو ایک سو پندرہ روپیہ اور انگریزی پڑھانے والوں کو دو سو بیس روپے ملتے ہیں۔ انھوں نے اس تفریق کی وجہ معلوم کرنی چاہی ہے اور اس ناانصافی پر سخت احتجاج کیا ہے۔

بلا تبصرہ دو تراشے

جناب جسٹس حمود الرحمان نے لاہور میں ۲۱ مارچ کو ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن کے ایک مذاکرہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو اور بنگلہ میں کئی الفاظ مشترک ہیں اور تھوڑی سی تحقیق کے بعد اس قسم کے مزید الفاظ دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مشترک زبان کے احیا کی کوشش کی جائے۔

"مان لیا کہ تیسری زبان وضع ہو گئی، مگر کیا وہ راتوں رات ساری قوم کی زبان ہو جائے گی۔ یقیناً اس کو قومی زبان بنانے میں جگ بیت جائیں گے۔ بے اندازہ روپیہ خرچ ہوگا قوم کی توانائی صرف ہوگی اور اس اثنا میں انگریزی بدستور برسرِ اقتدار رہے گی۔ بیس سال اور یونہی گزر گئے تو پھر انگریزی اور انگریزیت ہی باقی رہ جائے گی ہم نہیں رہیں گے۔ مشرق سے مغرب تک قوم کا اس پر بہرحال میں اتفاق ہے کہ جس طرح انگریزوں سے نجات حاصل کی گئی ہے اسی طرح انگریزی سے بھی نجات حاصل کی جائے یہ مسئلہ بحث کا نہیں عزم کا ہے۔ خود جسٹس حمود الرحمان جیسے فاضل جج کی آرزو بھی یہی نظر آتی ہے تو آخر اپنی ہی کسی زبان کو بجائے پروگرام کے تحت ایک عزم کے ساتھ ہمہ گیر کر دینے میں کون حائل ہے؟ ملک کے اہلِ فکر و نظر کے سامنے اپنی زبانیں موجود ہیں وہ حوصلے کے ساتھ کسی ایک زبان کو چن کیوں نہیں لیتے؟ کیا قومی وحدت اور ملی عزائم کا یہ تقاضا ہے کہ ایسا ہی کیا جائے؟"

(اداریہ روزنامہ حریت مورخہ ۲۸ مارچ ۷۰ء)

تصویر کا دوسرا رخ

مژدہ اے ذوقِ جنوں . . . !

مظفر آباد ۵ اپریل۔ آزاد حکومت جموں و کشمیر نے پورے علاقے میں اردو کو سرکاری اور دفتری زبان قرار دے دیا ہے۔ یہ اعلان حکومت آزاد کشمیر کے سینئر سکریٹری کے دفتر سے اردو ہی میں جاری ہوا ہے۔ اس حکم میں مندرجہ ہدایات کے مطابق اب حکومت آزاد کشمیر کے تمام دفاتر کے مابین مراسلت کا وسیلہ اردو زبان ہوگی۔ البتہ آزاد کشمیر سے باہر مراسلت کا ذریعہ انگریزی رہے گی (جو آزاد پاکستان کی وجہ سے ایک مجبوری ہے) اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت کے انتظامات بھی کئے جا رہے ہیں تاکہ دفاتر میں اور مختلف محکموں میں کام کرنے والوں کو کسی دقت کا سامنا نہ کرنا۔ پاکستان میں پہلی اور دنیا میں یہ دوسری حکومت ہے جس نے ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو اپنی دفتری زبان بنایا ہے۔ اتفاق سے آزاد کشمیر سے پہلے بھی جس حکومت نے اس کو سرکاری طور پر اپنایا ہے وہ بھی مقبوضہ کشمیر کی حکومت ہے۔ جو اردو سے کشمیر کی وابستگی اور محبت کا درخشاں ثبوت ہے۔

امریکہ میں اردو

نیویارک ۸ اپریل۔ امریکہ کی فورڈہم یونیورسٹی نے جولائی سے شروع ہونے والے تین سالہ تجرباتی کالج کے نصاب میں داخلہ لینے والوں کے لئے اردو کو لازمی قرار دیا ہے۔ اب سال رواں میں جو تیس طلب اس تجرباتی کالج میں داخلہ لے رہے ہیں۔ ان کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اردو جانتے ہوں۔ نئے قائم شدہ کالج کے سربراہ ڈاکٹر الزبتھ سوئر

نے کہا ہے کہ متذکرہ کالج کے پانچ شعبوں کے اراکین کے ایک حالیہ اجلاس میں اس اہم فیصلے کی تصدیق کی گئی ہے۔ داخلہ لینے والے طلبہ کے سامنے انٹرویو کے درمیان جب یہ شرط پیش کی گئی تو اس کا رد عمل بہت افزا ہوا۔

اچھی بات کی تقلید

مغربی پاکستان صوبائی ٹرانسپورٹ اتھارٹی نے سارے صوبہ میں موٹر گاڑیوں کے نمبر پلیٹ اردو میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حکومت مغربی پاکستان سے سفارش کی ہے کہ وہ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لئے موٹر وہیکلز آرڈیننس میں مناسب ترمیم کرے۔ یہ فیصلہ چیرمین اتھارٹی کی صدارت میں منعقدہ حالیہ اجلاس میں کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ حکومت مغربی پاکستان کی جانب سے موٹر وہیکلز آرڈیننس میں ترمیم کے بعد صوبہ میں موجود دو لاکھ موٹر گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں اردو میں تبدیل ہو جائیں گی۔ یہ واضح رہے کہ اس قسم کا فیصلہ کچھ عرصہ پہلے حکومت مشرقی پاکستان کر چکی ہے۔

مرکزی وزیر مواصلات کی تجویز

مرکزی وزیر مواصلات جناب عبدالصبور خاں نے ۷ر مارچ کو لاہور میں طلبہ کی بین الصوبائی انجمن کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے یکجہتی کے جذبہ کی پرورش پر بہت زور دیا اور کہا کہ یکجہتی کا سوال ہمارے لئے انتہائی اہم ہے کیونکہ ملک جغرافیائی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے اور ان کے درمیان ۱۲ سو میل کا فیصلہ ہے۔ انھوں نے کہا اس صورت میں یکجہتی صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ایک حصے کے عوام دوسرے حصے کے عوام کی زبان سمجھیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ بنگلہ کو تمام مغربی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اور اردو کو مشرقی پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے ارشادات

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں نے لاہور میں ۱۳ر مارچ کو ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ یونیورسٹی میں سائنسی مضامین کے لئے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا کام بتدریج جاری رہے گا۔ ایم۔ اے کے تمام امتحانات کے پرچے انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی مرتب کئے جا رہے ہیں۔ اور امیدواروں کو جوابات کے لئے دونوں میں سے اپنی سہولت کی زبان استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے کہا کہ انگریزی کی جگہ اردو کی ترویج میں حکومت کو شاید دشواریاں نظر آتی ہوں لیکن یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ اردو پڑھنے اور لکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پاتے۔ انھوں نے اس خیال کو بے بنیاد قرار دیا کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پاکستان علمی دنیا سے کٹ جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا کوئی بھی حامی انگریزی کی تدریس کا مخالف نہیں ہے۔ جناب حمید احمد خاں صاحب نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعدد مقالات اردو میں حال ہی میں لکھے گئے ہیں اور ان کے انگریزی ترجمے باہر بھیجے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہمارے کلچر کی زبان ہماری تعلیم کا ذریعہ نہیں بنتی ہم ایجاد و اختراع کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ناقص انگریزی اور ادھوری غیر ملکی زبان سیکھنے سے علم کی کوئی خدمت ممکن ہے نہ ملک کی۔ انھوں نے آخر

میں کہا کہ مناسب یہی ہے کہ تمام علوم و فنون اپنی زبان میں پڑھائے جائیں اور بیرونی دنیا سے رابطہ رکھنے کے لئے ضرورتمند اور خواہش مند لوگوں کو انگریزی سکھانے کا بندوبست رکھا جائے ۔

حق و انصاف کی آواز

مغربی پاکستان کی عدالت عالیہ کے جج جناب جسٹس انوار الحق نے لاہور میں ۱۴ مارچ کو مجلس تعمیر و ترقی کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں اپنے صدارتی خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ قومی زبان کی اہمیت کو زیر بحث لانے کی ضرورت کا احساس حصول آزادی کے ۲۰ سال بعد ہوا ہے جب کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد اس مسئلہ کا مناسب حل تجویز کیا جانا چاہیئے تھا ۔ جناب انوار الحق نے فرمایا " جب تک قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جائے گا تعلیم کے میدان میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہو سکے گی ۔ ہمارے سامنے برطانوی دور حکومت کی تاریخ موجود ہے ۔ انگریزوں نے برصغیر پر سو سال حکومت کی مگر چونکہ ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا اس لئے پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط سات فیصد سے کبھی نہ بڑھ سکا اور ان میں ایسے لوگوں کی تعداد اس تناسب کی بھی نصف نہ تھی جو انگریزی پڑھ لکھ اور بول سکتے تھے ۔ جناب جسٹس انوار الحق نے فرمایا کہ قومی یکجہتی اور استحکام کے حصول کے لئے قومی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنانا ضروری ہے انھیں عوام تک پہنچانے کے لئے مغربی پاکستان میں بنگالی اور مشرقی پاکستان میں اردو کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور اسی طرح ثقافتی ، سماجی ، اور ذہنی قربت بڑھے گی اور یکجہتی کو فروغ ہوگا ۔

اردو بنگلہ ملت کانفرنس ۔

ڈھاکہ :- ۱۵ مارچ عیدگاہ میدان میں اردو بنگلہ ملت کانفرنس میں کونسل مسلم لیگ جماعت مجاہدین اور مشرقی پاکستان کے رہنماؤں نے اپنی بنگلہ اور اردو تقریروں میں مشرقی پاکستان میں اردو کے ساتھ حق تلفی کرنے پر شدید نکتہ چینی کی ہے ۔ جلسہ کی صدارت مولانا راغب احسن کر رہے تھے اور اس جلسہ میں ہزاروں خواتین بھی شریک تھیں ۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق مرحوم کی اکلوتی صاحبزادی رئیس بیگم نے پردہ گیلری سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بنگلہ اکادمی اردو اکادمی اور ترقی اردو بورڈ کو توڑ کر قومی زبان کی اکادمی اور ایک قومی زبان کا ترقیاتی بورڈ قائم کیا جائے جس کے اراکین پکے مسلمان اور سچے پاکستانی ہوں ۔ اور وہ اردو بنگلہ زبانوں کے ماہر ہوں ۔ ان کا ایک اہم کام یہ ہوگا کہ وہ پورے ملک کے لئے یکساں اور عام فہم ایسے الفاظ تلاش کریں گے جن کا ماخذ لسان القرآن اور حروف القرآن ہوں گے ۔ اور اسی طرح دونوں بازوؤں میں تہذیبی و تمدنی ہم آہنگی اور قربت پیدا کی جا سکتی ہے ۔ انھوں نے انجمن مہاجرین مشرقی پاکستان کے دس نکاتی مطالبے کی تائید کی ۔ صوبائی کونسل مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری جناب شفیق الاسلام آرگنائزنگ سکریٹری جناب نور الزماں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ہمیں اردو کے لئے لڑنا پڑ رہا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ محمد پور میں نہ صرف اردو اسکول بلکہ اردو کالج اور اردو یونیورسٹی بھی ہونی چاہیئے ۔ اس کے علاوہ کانفرنس میں جناب صابر علی ، سید حبیب ہاشمی ، اشرف رضا فردوسی ، مولانا عبداللہ ندوی ، مولانا فخر الدین رازی ، مولانا نذیر احمد ، مولانا عبدالحنان ، اور سید شہید الحق نے اپنی بنگلہ اور اردو تقریروں میں اردو کی حمایت میں تقریریں کیں اور

مطالبہ کیا کہ اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہیئے ۔

انگریزی اسکولوں میں قومیت کا جنازہ

انجمن ترقی اردو خواتین لاہور کا اجلاس ادبستان صوفیہ میں بیگم سلمیٰ تصدق کی زیر صدارت منعقد ہوا ۔ جس میں بیگم ثریا حمید نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کو اس وقت جس بات سے سب سے زیادہ خطرہ ہے وہ ایسے انگریزی اسکول ہیں جہاں پاکستانی قومیت اور پاکستانی تہذیب کا جنازہ نکالا جا رہا ہے ۔ جہاں کے بچے بڑی تیزی اور فخر سے انگریزی تو بول سکتے ہیں مگر اردو نہ جاننے پر انھیں کوئی تاسف نہیں ہوتا ۔ انھوں نے کہا کہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہمارے یہاں ملک اور قوم کے تمام جذبات اور احساسات سے بے خبر ایک غیر ملکی زبان فروغ پا رہی ہے جو اپنے ساتھ مغربی تہذیب کے تمام جراثیم بھی تیزی کے ساتھ پھیلا رہی ہے ۔ محترمہ صفیہ طوری نے اس اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ اردو زبان کے فروغ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں کسی قیمت پر نہ داخل کرائیں اور ایسے اداروں کو ترجیح دیں جہاں اردو کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ اس جلسہ کی مہمانِ خصوصی بیگم سلمیٰ تصدق نے فرمایا کہ ملک کی ترقی میں جب تک خواتین حصہ نہ لیں اس وقت تک یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنی زبان اور روایات کی طرف خاص توجہ نہ دے ۔

جماعت اسلامی کا مطالبہ

جماعت اسلامی کا ایک جلسہ جناب میاں محمد طفیل امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان کے زیر صدارت رحیم یار خاں میں منعقد ہوا ۔ ایک قرارداد میں جلسے نے اتفاق رائے سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں انگریزی کی جگہ اردو اور بنگالی کو رائج کیا جائے تاکہ ان زبانوں کے فروغ سے پاکستان کے دونوں حصوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا ہو ۔ ایک اور قرارداد میں اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کی ترویج اور فروغ پر زور دیا گیا اور مطالبہ کیا گیا تمام نشریاتی اور اشاعتی اداروں کے ذریعہ سے اس مقصد کو حاصل کیا جائے ۔

قومی زبانیں واحد حل

" تحریک ملی " کے زیر اہتمام ڈھاکہ میں ۵ ؍ مارچ کو ایک جلسہ ہوا جس میں اس تحریک کے معتمد اعلیٰ جناب اشرف پرویز نے کہا کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اردو کو مشرقی صوبے میں نظر انداز کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے ملک کی یکجہتی اور استحکام کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ ملک جو دو صوبوں میں بٹا ہوا ہے اس کی مضبوطی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قومی زبانوں کو دونوں صوبوں میں رائج کیا جائے ۔ اس طرح نئی نسل لسانی الجھن میں مبتلا نہیں ہوگی اور اس سے ملک میں مضبوط قیادت پیدا ہوگی ۔ جلسہ میں ایک قرارداد کے ذریعہ محمد پور گورنمنٹ اسکول کو اردو میڈیم بنانے کا مطالبہ کیا ۔

اردو نوازی

پاکستان نیشنل ہیئر ڈریسرز فیڈریشن کے صدر جناب اسلام سامانی نے ملک بھر کے باربروں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی دوکانوں، مکانوں اور تنظیم کے دفتروں پر قومی زبانوں میں بورڈ لکھوائیں

اور انھیں زبانوں میں تر جمانی کے آ ویزاں کریں۔ وہ " شملہ ہیئر ڈریسنگ سیلون" کا افتتاح کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بار بر ہمیشہ قومی رجحانات کے عکاس رہے ہیں۔ سو انھیں اب بھی اپنا یہ فرض نہ بھولنا چاہیئے۔

ایک جائزہ اور کئی مسائل

اردو کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا جتنا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ اتنی ہی تعداد ان بہی خواہوں کی بڑھتی جا رہی ہے جن کو اس زبان سے اس لئے پیار ہے کہ وہ کئی اہم ترین مسائل کا واحد حل ہے۔ چنانچہ اکثر اخباری نمائندوں اور طلبہ کی بعض انجمنوں کے اراکین اردو کے سلسلہ میں سروے کرتے رہتے ہیں۔ حال میں لاہور میں ایک اس قسم کا جائزہ لیا گیا تو اساتذہ کی اکثریت نے اردو ذریعۂ تعلیم کو اختیار کرنے پر زور دیا مثلاً جب ایک استاد بشارت احمد سے یہ سوال کیا گیا تو انھیں اس سوال پر حیرت ہوئی کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میں صرف انگریزی کا مضمون انگریزی میں اور باقی تمام مضامین اردو میں پڑھاتا ہوں اور یہ مسئلہ کبھی میرے ذہن میں گرہ نہیں بنا حالانکہ میری اپنی تعلیم انگریزی میں ہوئی لیکن قومی عزم نے اردو کو میرے لئے کبھی رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ اور اب تو یہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ اس جائزے سے البتہ ایک بات کا پتہ چلا کہ اردو کا طریقۂ تدریس اور معیار اگر بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ ملک و قوم کے لئے ایک سانحہ ہوگا۔ تمام اساتذہ اس بات پر متفق پائے گئے کہ خود اساتذہ میں اردو کا معیار معقول اور معیاری نہیں کیونکہ نہ تو اُن کے لئے کورسز کا انتظام ہے نہ تربیت کا، اُن کو طریقۂ تدریس کو جاننے کا موقع دیا جاتا ہے اور نہ اُن کی تنخواہیں ایسی ہیں کہ وہ اردو سے بلا رکاوٹ محنت اور خلوص کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں اردو

فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے حالیہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقعے پر اس کالج کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کالج کے پرنسپل نے جلسے کو اردو میں خطاب کیا۔ اس اچانک اور خوشگوار تبدیلی پر طالبات نے بھی بہت چونک کر اپنے پرنسپل کو دیکھا۔ جنھوں نے واقعی ایک غیر صحت مند روایت کو چھوڑ کر ایک اچھی روایت پر عمل کرنا تو شروع کیا تھا مگر انھیں اردو میں بولنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن یہ امید کی جا سکتی ہے کہ یہ خود آگاہ پرنسپل ملک و قوم کے مستقبل کے پیش نظر برابر اپنی نئی روایت پر عمل کرتے رہیں گے کہ بہت جلد وہ انگریزی سے بہتر اردو بول سکتے ہیں۔

علمی۔ تعلیمی۔ ادبی اور تہذیبی خبریں

ایوان رفعت کا افتتاح

۲۹ مارچ کو کراچی میں عطیہ فیضی مرحوم کے خواب " ایوان رفعت " نے عملی صورت اختیار کر لی۔ اس تاریخی اور یادگار تقریب میں کمشنر کراچی بلدیہ کے چیرمین۔ نائب چیرمین

جناب سید ہاشم رضا صاحب موجود تھے۔ کمشنر کراچی نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ فنون لطیفہ، قومی تہذیب تمدن اور ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ایوانِ رفعت کا افتتاح بیگم عطیہ فیضی مرحومہ کی بڑی بہن ہر ہائی نس لیڈی نازلی رفیعہ کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔ ایوان رفعت میں بیگم عطیہ فیضی کے نوادرات کے علاوہ ان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور شوہر فیضی رحمین مرحوم کی تصویروں کا ذخیرہ بھی ہے۔ ان کے علاوہ عطیہ بیگم کی ڈائری اور رحمین کو ملے ہوئے بین الاقوامی اعزازات میڈل اور سندیں شامل ہیں۔ قدیم تاریخی سکے قیمتی اور نایاب موتی، مشاہیر برصغیر مولانا شبلی، ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، اقبال اور سروجنی نائیڈو کے خطوط اور تصاویر بھی " ایوان رفعت" کی زینت ہیں۔

پاکستانی ثقافت پر مذاکرہ

فلاح اسپیکرز فورم کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ کراچی میں ۱۱ اپریل کو منعقد ہوئی۔ اس کا موضوع تھا " پاکستانی ثقافت"۔ مذاکرہ میں کراچی یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کے ممتاز اساتذہ نے حصہ لیا۔ جن میں شعبۂ انگریزی جامعہ کراچی کے صدر ڈاکٹر علی اشرف، شعبۂ فلسفہ کے استاد ڈاکٹر منظور احمد اور روزنامہ " حریت" کے مدیر جناب حسن مثنیٰ ندوی قابل ذکر ہیں۔ مجلس مذاکرہ میں اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ پاکستانی ثقافت کی بنیاد اسلام ہے اور پاکستانی تہذیب عظیم اسلامی تہذیب کی ایک شاخ ہے جس کا تعلق ہڑپہ، ٹیکسلا اور گندھارا سے جوڑنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

اسلامیہ کالج کا جلسۂ تقسیم اسناد

مرکزی محکمۂ تعلیمات کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے ۷ اپریل کو اسلامیہ کالج لاہور کے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کی۔ اس موقع پر کالج کے پرنسپل خواجہ محمد اسلم نے کالج کی سالانہ روداد میں معتمد تعلیمات کے سامنے چند حقائق پیش کرتے ہوئے کہا کہ ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کوئی حقیقت پسندانہ اور واضح فیصلہ نہ ہونے کے باعث دنیائے تعلیم میں ایک الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی کو ہمارے نظام تعلیم میں اولیت کا وہی شرف حاصل ہے جو آزادی سے پہلے تھا دوسری طرف معاشرتی اور سائنسی علوم میں بھی ہم نے طلبہ کو امتحانی سوالات کے جواب اردو میں لکھنے کا اختیار دے دیا ہے۔ جس سے طلبہ یقیناً فائدہ اٹھائیں گے اور اس کے نتیجہ میں انگریزی کا معیار بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس صورت حال میں طلبہ سے انگریزی کے سابق معیار کا مطالبہ کرنا مناسب نہیں۔ جناب خواجہ محمد اسلم نے کہا کہ اب ضرورت اس بات کی ہے نصاب میں انگریزی کے مرتبہ و مقام کا حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق از سر نو جائزہ لیا جائے اور انگریزی کی تعلیم کا اتنا ہی اہتمام کیا جائے جتنا ہماری قوم ضرورت کے لئے ناگزیر ہے۔ انھوں نے آخر میں یہ سوال کیا کہ آخر یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ علم صرف انگریزی زبان و ادب پر عبور حاصل کرنے کا نام ہے۔

صدر مملکت کا ارشاد ۲۵ مارچ کو لاہور میں صدر مملکت محمد ایوب خاں نے پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے ایک اجتماع میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے قومی زبانوں کے سلسلہ کے سوالات کے جواب بھی دیئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ حکومت چاہتی ہے کہ وہ جلد سے جلد اعلیٰ جماعتوں میں بھی قومی زبانوں کو اس طریق پر ذریعۂ تعلیم بنائے کہ اس تبدیلی سے معیار تعلیم متاثر نہ ہونے پائے۔

اسلامی قوانین کی قاموس یمن کی حکومت نے اسلامی قوانین کی قاموس مرتب کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جس میں اسلامی عبادات۔ دیوانی اور فوجداری قوانین اور سزاؤں کے علاوہ انفرادی اور عائلی قوانین بھی جمع کئے جائیں گے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا تیس سے زاید جلدوں پر مشتمل ہوگی جس کی نگرانی ممتاز فقیہ ڈاکٹر مصطفیٰ احمد الزرقہ دیگر علماء کی اعانت سے کریں گے۔ تمام عالم اسلام کے ماہرین اسلامی قوانین سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے وزارت اوقاف کویت کے معرفت خط و کتابت کریں۔

ڈینش زبان میں قرآن مجید ڈنمارک کی زبان ڈینش میں قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہوگیا ہے جو ایک اشاعتی ادارے کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اس ادارے کے ایک ترجمان نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ ڈنمارک کے کتب فروشوں نے اس سلسلہ میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ قرآن مجید کے ترجمے کا کام یہاں ڈنمارک کے ایک ۳۸ سالہ اسکول ٹیچر عبدالسلام نے انجام دیا ہے۔ جناب عبدالسلام نے گیارہ سال قبل اسلام قبول کیا تھا اور وہ برابر دین اسلام کی اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔

روسی ایجاد اور افلاطون روزنامہ اوستیا ماسکو کی اطلاع ہے کہ ایک روسی سائنسداں نے ایک ایسا سائنسی آلہ ایجاد کرلیا ہے جس سے کام لے کر دنیا کی کسی بھی ایسی ممتاز شخصیت سے بات چیت کی جاسکتی ہے جو ہزاروں سال پہلے اس دنیا میں موجود تھی۔ سائنسدان کا دعویٰ ہے کہ اس آلہ کی مدد سے افلاطون سے براہ راست فلسفہ پر بحث کرائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ہزاروں سال پیشتر کی جنگوں میں مختلف قوموں کے لیڈروں نے جو تقریریں کیں اور نعرے لگائے وہ بھی ویسے کے ویسے سنے جاسکتے ہیں۔

آئینہ خانے میں

مولانا عبدالعزیز میمن کے خطبات عربی کے یگانۂ روزگار فاضل اور برصغیر پاک و ہند کے ممتاز عالم مولانا عبدالعزیز میمن نے ترقی اردو بورڈ کراچی کے زیر اہتمام ۳ اپریل کو عربی لغت نگاری سے متعلق خطبات کے سلسلے کا آغاز کیا انھوں نے دو گھنٹے اپنے ارشادات سے اہل علم کو نوازا۔ اس جلسے

کی صدارت جناب ممتاز حسن مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک کر رہے تھے ۔ جناب علامہ میمن علی گڑھ میں شعبۂ عربی کے صدر رہ چکے ہیں ۔ اور ان کو ۱۹۶۵ء میں صدر کا اعلیٰ کارکردگی کا تمغہ مل چکا ہے ۔ دوسرا خطبہ ۱۶ راپریل کو دیا گیا ۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا ۔ یہ خطبات ریکارڈ کئے جا رہے ہیں اور بعد میں انھیں ترقی اردو بورڈ کراچی کی طرف سے شائع کیا جائے گا ۔

ڈاکٹر افضال قادری کا اعلان حق

کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانیات کے سربراہ اور ملک کے ممتاز سائنسداں اور ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر افضال حسین قادری نے قومی زبانوں میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا ہے ۔ وہ اپنے شعبۂ کے تحت ایک مذاکرے کا افتتاح کر رہے تھے ۔ انھوں نے کہا کہ میرا عقیدہ ہے کہ سائنس کی تعلیم کا معیار اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتا جب تک اردو کو نہ اپنایا جائے ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سائنسی انقلاب کے بغیر ملک ترقی نہیں کر سکتا اور سائنسی انقلاب اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک اس کو قومی زبان میں نہ پڑھایا جائے ۔

جوش ملیح آبادی کے دستخطی نسخوں کی فروخت

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ۲۹ رمارچ کو گلڈ انجمن کتاب گھر کراچی میں رونق افروز ہوئے ، جہاں انھوں نے اپنی تصانیف کے دستخطی نسخے فروخت کئے ۔ مصنفین کے دستخطی نسخوں کی فروخت کا یہ سلسلہ انجمن گلڈ کتاب گھر کا اپنا تجربہ ہے جس کو کامیابی سے چلایا جا رہا ہے ۔ اب تک جو ادیب اور شاعر کتاب گھر میں آکر اپنے نسخے فروخت کر چکے ہیں ۔ ان میں ۔ نیاز فتح پوری مرحوم ۔ فیض احمد فیض ۔ پروفیسر احمد علی ۔ ہاجرہ مسرور ۔ عبدالعزیز خالد اور رئیس امروہوی کے نام شامل ہیں ۔ واضح رہے گلڈ انجمن کتاب گھر ، انجمن ترقی اردو اور پاکستان رائٹرز گلڈ نے متحدہ طور پر قائم کیا ہے جسے غیر تجارتی بنیادوں پر چلایا جا رہا ہے ۔

ڈاکٹر شہید اللہ کی ۸۰ ویں سالگرہ

مشرقی پاکستان کے ممتاز ادیب اور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی ۸۰ ویں سالگرہ ڈھاکہ میں ۳۱ رمارچ کو بہت عقیدت اور احترام سے منائی گئی ہے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں مرکزی وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر قوم کا ادب اس کے ثقافتی ورثے سے پرکھا جاتا ہے اور یہ ثقافتی ورثہ ہمیں ڈاکٹر شہید اللہ کی صورت میں حاصل ہے ۔

ایرانی دانشور لاہور میں

ایران کے نامور دانشور اور اخبار نویس ڈاکٹر مصطفیٰ مصباح زادہ پچھلے دنوں پاکستان تشریف لائے تھے ۔ لاہور میں آپ کے اعزاز میں ایک دعوت فرہنگ ایران کی جانب سے مادام بہنام نے بھی کی ۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مصباح زادہ نے فارسی میں فرمایا کہ پاک و ایران کی دوستی کی بنیادیں دس کروڑ پاکستانیوں اور پوری ایرانی قوم کا حصہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایران اور پاکستان کی دوستی ناقابل شکست ہے ۔

یادوں کے چراغ

شاہ حسین کا عرس

پنجاب کے عظیم صوفی اور شاعر شاہ حسین کا عرس لاہور میں نہایت عقیدت اور خلوص سے منایا گیا۔ ۲۵ر مارچ کو ادارۂ مصنفین پاکستان کی پنجابی شاخ کی جانب سے شاہ حسین کے مزار پر ادیبوں کی چادر چڑھائی گئی اور گلڈ ہاؤس میں ادیبوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں لاہور کے ادیبوں اور معزز شہریوں نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت جناب اے ڈی اظہر نے کی۔ ۲۶ر مارچ کو ادیبوں کے اجلاس میں صوبائی ریونیو بورڈ کے رکن جناب ایس ایم۔ الٰہی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ پنجابی زبان کو فروغ دینے والے قومی زبانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کو نقصان پہنچائے بغیر علاقائی زبانوں کو ترقی دی جاسکتی ہے۔

نظام دکن کی یاد میں

ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ۵ر فروری کو نعیر آباد میں نظام دکن کی وفات کے سلسلے میں ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ جس کی صدارت رانا بھگوان داس بھگوان نے کی۔ صدر جلسہ نے ایک قرارداد تعزیت پیش کی جس کو اجلاس نے باتفاق منظور کرلیا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ اجلاس عظیم محسن اردو نظام دکن کی وفات پر اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کرتا ہے اور بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے جانشین شہزادہ مکرم جاہ کو اردو کے حق میں سابق نظام دکن کا سچا جانشین ثابت کرے۔

ماتم میں ہم شریک

دو ممتاز رہنماؤں کی رحلت

۷ر اپریل اس اعتبار سے پاکستان کے لئے ایک اندوہناک تاریخ تھی کہ اس دن پاکستان کے دو ممتاز رہنماؤں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ تحریک پاکستان کے نڈر اور بے باک قائد اور سابق صوبہ سندھ کے ممتاز مسلم لیگی رہنما جناب میر جعفر خاں جمالی کا انتقال ۷ر اپریل کو کراچی میں حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوگیا اور حکومت پاکستان کے چیف پارلیمانی معتمد جناب عبداللہ ظہیر الدین لال میاں کا انتقال بھی حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے کاکس بازار مشرقی پاکستان میں اسی تاریخ کو ہوا۔ پاکستان کے ان ممتاز رہنماؤں کی رحلت پر پاکستان کے تمام ممتاز سیاستداں کارکنوں اور حکومت کے ذمہ دار حلقوں نے دلی تعزیت کا اظہار کیا۔ ادارۂ مصنفین پاکستان کی جانب سے جناب لال میاں کی افسوس ناک رحلت پر سخت رنج د

الم کا اظہار کیا گیا۔ ادارہ کے معتمد اعلیٰ جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ انھوں نے خود کو تعلیمات، ادب اور اہل علم و ادب کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ظہیر الدین لال میاں گلڈ ٹرسٹ کے چیرمین اور مرکزی کمیٹی کے رکن بھی تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے قومی یکجہتی اور ادیبوں کی بہبود کی انمول خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی موت گلڈ کا سب سے بڑا نقصان ہے یہ واضح رہے کہ لال میاں بنگلہ زبان کے نہ صرف کہنہ مشق صحافی بلکہ ایک نامور ادیب اور بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "ناؤ بلال" شائع ہو چکا ہے۔

ادارہ قومی زبان ان دونوں رہنماؤں کی رحلت پر اور بنگلہ زبان کے ایک ممتاز اہل قلم کی موت پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

شاہد لطیف کا انتقال

یہ خبر پاک و ہند کے ادبی اور فلمی حلقوں میں نہایت رنج و افسوس سے سنی جائے گی۔ کہ اردو فلموں کے ممتاز ڈائرکٹر اور پروڈیوسر جناب شاہد لطیف کا انتقال صرف ۵۰ سال کی عمر میں ۷ اپریل کو بمبئی میں ہو گیا شاہد لطیف ابتدا میں ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت میں ابھرے تھے۔ بعد میں انھوں نے فلمی دنیا سے تعلق پیدا کر لیا ابتدا میں بحیثیت کہانی نویس اور مکالمہ نگار کامیابی کی منزلیں طے کرتے رہے اور بعد میں وہ خود اپنی فلمیں بنانے لگے تھے جن میں ضدی کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی تھی۔ شاہد لطیف اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار محترمہ عصمت چغتائی کے شوہر تھے۔ مرحوم شاہد لطیف کا تعلق انجمن ترقی اردو سے بھی رہ چکا ہے۔ دہلی میں جب انجمن کی طرف سے "ہندوستانی" زبان کی لغت تیار کی جا رہی تھی تو انھوں نے بابائے اردو مرحوم کے معاون کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ادارہ قومی زبان محترمہ عصمت چغتائی سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

آئینۂ ہند

حزب اختلاف کا مطالبہ مسترد

بھارتی وزارت داخلہ نے سرکاری زبان کے مسئلہ پر اپنا رویّہ سخت کر لیا ہے اس نے مدراس کی دراوڑ کازگام حکومت اور دیگر غیر کانگریسی حکومتوں کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا ہے کہ سرکاری زبان کے مسئلہ پر آئین میں ترمیم کی جائے۔ مدراس کی دراوڑ کازگام پارٹی کا موقف یہ ہے کہ زبان کے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ دستور میں ترمیم کر کے ملک کی چودہ علاقائی زبانوں کو یکساں حیثیت دی جائے اور انگریزی کو بھی برقرار رکھا جائے۔ یہ واضح رہے کہ مدراس میں کانگریس زبان ہی کے مسئلے کی وجہ سے بری طرح ہاری ہے۔

یو۔ پی میں اردو کی واحد مخالف جماعت

لکھنؤ کے اخبارات کی اطلاع کے مطابق اتر پردیش کی تمام مخالف جماعتیں سوائے جن سنگھ کے اپنے مشترکہ پروگرام میں اردو کو ثانوی حیثیت دینے پر راضی ہو گئی ہیں۔ مخالف جماعتوں میں جن سنگھ نے جس کو سب سے زیادہ اکثریت حاصل ہے اردو کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مشترکہ پروگرام سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہے۔

[ہن]دی کے خلاف بیان

جناب انادورائے وزیر اعلیٰ مدراس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ ہم گزشتہ بیس سال سے عوامی مطالبات کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندی [کو م]لک کی واحد زبان تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اور کم از کم مدراس میں ہندی کو مسلط نہیں ہونے دیں گے۔

[ف]رقہ پرستی کی انتہا

بھارتیہ جن سنگھ کے صدر بلراج مدھوک نے ۱۳ مارچ کو دہلی میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ بھارت میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا مذہبی وجود ختم کر دیں۔ بھارت [میں ر]ہنے والا ہر شخص ہندو ہے۔ بلراج مدھوک نے علی گڑھ یونیورسٹی پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ اس یونیورسٹی کی پیداوار [ہ]یں وہ غدار ہیں کیونکہ وہ مسلم لیگی ذہنیت رکھتے ہیں۔ جن سنگھ کے صدر نے کہا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری علی گڑھ یونیورسٹی [پر] عائد ہوتی ہے۔

بہار کی انجمن ترقی اردو

ہندوستان کے حالیہ عام الیکشن میں ریاستی انجمن ترقی اردو بہار نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کہ اردو کو ووٹ کا مسئلہ بنا کر اپنے نمائندے کھڑے کئے اور جس نے اردو کا موقف اپنایا اس کی تائید کی۔ اب تک سوائے بہار کے کسی انجمن کی شاخ نے اردو کے لئے اس جرأت کا ثبوت نہیں دیا۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے پٹنہ میں کہا "چوتھے عام چناؤ میں مسلمانوں اور اردو والوں نے اہم رول ادا کیا ہے یہاں کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ کانگریس کے ۲۸ ممبروں میں سے ۲۰ کو انہوں نے ہرا دیا" انھوں نے کہا کہ اردو کے ساتھ کی جانے والی کوئی بے انصافی برداشت نہیں کی جائے گی۔

اسلام اور ہندوستان

دہلی یونیورسٹی میں ایک جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر چنتامن دیش مکھ منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر تارا چند نے ہندوستانی کلچر کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کے اثرات اور ان کے خلاف موجودہ فضا پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے ان اثرات کو ختم کرنے کے لئے آزادی کے بعد ایک بھرپور جدوجہد "پراچین تہذیب کے احیاء" کی ہو رہی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو مطعون کرنے ان سے نفرت و بیزاری پھیلانے۔ اردو کو ملیامیٹ کرنے اور ہندی اور سنسکرت کی جبری تعلیم کے لئے درسی کتب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اسباق کے ذریعہ ان کے اثرات کو مٹایا جا رہا ہے ان کوششوں کے باوجود ہندوستانی تہذیب پر اسلام اور مسلمانوں کے ڈالے ہوئے گہرے نقوش اب بھی باقی ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے کہا کہ یہ اثرات مل جل کر رہنے سہنے اور جیو اور جینے دو کے زریں اصولوں سے عبارت ہیں۔ بھلا یہ کیسے باطل ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر چنتامن دیش مکھ نے اسلام کو انسانیت پر عظیم احسان سے تعبیر کیا اور کہا کہ اسلام دنیا میں صحیح ترین جمہوریت کا نمونہ پیش کرتا ہے اور انھیں عناصر سے ہماری تہذیب بنتی اور سنورتی ہے۔

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

اشاریہ بابت ماہ اکتوبر ۶۶ء

پیش نظر اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

پیش نظر اشاریے کی ترتیب میں اکتوبر ۱۹۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

نوعیت	رسالہ	مقام	تاریخ	نوعیت	رسالہ	مقام	تاریخ
سہ ماہی	اردو	کراچی	اکتوبر ۱۹۶۶ء	ماہنامہ	کتاب	لاہور	اکتوبر ۱۹۶۶ء
ماہنامہ	اردو ڈائجسٹ	لاہور	"	"	کتابی دنیا	کراچی	"
"	البلاغ	بمبئی	"	—	بیاض (حاجی عبداللہ ہارون کالج)	کراچی	۱۹۶۵ - ۶۶ء
"	الرحیم	حیدرآباد	"	ماہنامہ	معارف	اعظم گڑھ	اکتوبر ۱۹۶۶ء
"	برہان	دہلی	"	"	منشور	کراچی	"
"	بینات	کراچی	"	"	میثاق	لاہور	"
"	تجلی	دیوبند	"	"	نقش کراچی (جنگ نمبر)		۱۹۶۶ء
"	تحریک	دہلی	"	"	نوائے ادب	بمبئی	اپریل ۱۹۶۶ء
"	ترجمان القرآن	لاہور	"	"	نیرنگ خیال	لاہور	اکتوبر ۱۹۶۶ء
"	ثقافت	"	"	ہفت روزہ	آئین	"	"
"	جامعہ	دہلی	"	"	المنبر	لائل پور	"
"	جام نو	کراچی	"	"	چٹان	لاہور	"
"	رہنمائے تعلیم	دہلی	"	"	شباب	"	"
"	زندگی	رام پور	"	"	صدق جدید	لکھنؤ	"
"	ساقی	کراچی	"	"	قندیل	لاہور	"
"	صبح امید	بمبئی	"	"	لاہور	"	"
"	طلوع اسلام	لاہور	"	"	ہماری زبان	"	"
"	عارف	"	"	روزنامہ	انجام	کراچی	(جمعہ ایڈیشن اور دیگر خصوصی اشاعتیں)
"	عالمی ڈائجسٹ	کراچی	"	"	جنگ	"	"
"	فاران	"	"	"	حریت	"	"
"	کتاب	لکھنؤ	"				

ادبیات

ادبیات اردو

اعظمی، منظر	اردو شاعری کا ہندوستانی لب و لہجہ	جامعہ، ص ۲۰۸ تا ۲۲۰، اکتوبر
اگروال، سبھاش چندر	افریشیائی ادیب اور روس چینی کشمکش	تحریک، ص ۵ تا ۶، "
بانی، کنول کرشن	مجمع البحور یا وزن کا نیا انداز	کتاب لکھنؤ، ص ۵۱ تا ۵۵،
پاشا، احمد جمال	راجہ مہدی علی خاں کی ظرافت	" " ۴۳ تا ۴۷،
چغتائی، عبدالرحمان	مغل آرٹ اور داستان امیر حمزہ کی تصویریں	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۲۷، اکتوبر
حسنین، ڈاکٹر محمد	اردو میں انشائیہ نگاری	ساقی، ص ۲۶ تا ۲۷، "
خان، عظمت اللہ	ادب کیا ہے؟	نیرنگ خیال، ص ۵ تا ۶، "
دوگیر، جی وی	کنڑی زبان میں رائج ہندوستانی الفاظ اور محاورے	نوائے ادب، ص ۶۵ تا ۹۹، اپریل
زیدی، سید علی جواد	دیوان غنی کشمیری	برہان، ص ۱۲۸ تا ۱۳۶، اکتوبر
شیخ، نور محمد	اسعد نثر کا ارتقا	بیاری، ص ۳ تا ۱۴،
طالب، اشتیاق	جنگ اور ادب	نقش، ص ۵۹۳ تا ۵۹۶، جنگ نمبر
طالب دہلوی	دلی کی شاعری کا ایک اسکول (۹)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۰ تا ۱۲، اکتوبر
عالم، پروین	فن، فطرت اور فن کار	کتاب لکھنؤ، ص ۸۵ تا ۸۸،
عظیم، سید وقار	ستمبر ۱۹۶۵ء کی شاعری	نقش، ص ۵۹۰ تا ۵۹۱، جنگ نمبر
کرامت، کرامت علی	مومن کا ایک شعر	ہماری زبان، ص ۲، یکم اکتوبر
گیلانی، سید اسعد	اسلامی ادب — مسلمان معاشرے کی ایک بنیادی ضرورت	آئین، ص ۶ تا ۷، ۲۴ "
لاشاری، رشید احمد	دکنی اردو پر سندھی کا اثر	لیاری، ص ۵ تا ۱۱،
مسیح الزماں	ناٹک فسانۂ عجائب	کتاب لکھنؤ، ص ۱۵ تا ۲۰،
مفتون کوٹوی	اردو غزل میں اداب حسن پرستی	جام نو، ص ۱۱ تا ۱۳، اکتوبر
نجید، حمید اصغر	ریڈیو پاکستان لاہور کی پندرہ روزہ محفل مشاعرہ	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۲؍۳ "
	جنگ اور ادب[1]	کتاب لکھنؤ، ص ۳ تا ۸، اکتوبر

[1] پاک بھارت جنگ پر پشتو، سندھی، سرائیکی، پنجابی اور انگریزی میں اب تک شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست۔

دیگر زبانوں کا ادب

رضوی، اختر	سندھی ادب و روایات	انجام، ص ۶، ۳ر اکتوبر
مہر، غلام رسول	فارسی شاعری کے دل آویز نوادر	چٹان، ص ۶، ۴ر "
	ترکی میں اسٹیج ڈرامہ — قدیم دور سے موجودہ دور تک	جنگ، ص ۱۴، ۳ر "
	ترکی میں جدید ڈرامہ اور تھیٹر	حریت، ص ۳، ۸ر "

تاریخ و سیاسیات

ابن، انشا	برف کی پوٹلی — بھارت نے اس جنگ میں کیا کھویا کیا پایا	نقش، ص ۳۳۵ تا ۳۴۰، جنگ نمبر
احمد، ڈاکٹر نذیر	اکبر اور اس دور کے علماء کے اختلافات	اردو، ص ۶۵ تا ۷۶، اکتوبر
احمد، شمیم	ضرورت ہے ایک احمد شاہ ابدالی کی[1]	نقش، ص ۱۸۹ تا ۱۹۸، جنگ نمبر
" "	مکتوبات مخدوم الملک	ثقافت، ص ۳۱ تا ۴۴، اکتوبر
احمد، کرنل مسعود	بھارتی لشکر کو بھاگتے ہی بنی	نقش، ص ۳۰۳ تا ۳۰۶، جنگ نمبر
ادارہ	سلسلہ واقعات (پاک بھارت جنگ کا روزنامچہ)	" " ۲۴۳ تا ۲۶۸، "
اسرار الحسن	فتح خیبر اور اس کا تاریخی پس منظر	" " ۱۰۸ تا ۱۱۲، "
اطہر مبارک پوری، قاضی	اسلامی علوم کے عوامی مراکز	البلاغ، ص ۸ تا ۲۶، اکتوبر
"	تاریخ قصبہ مبارک پور	" " ۳۱ تا ۴۴، "
اکبر خاں، میجر جنرل محمود	حدیث دفاع	نقش، ص ۱۸۲ تا ۱۸۴، جنگ نمبر
"	کروسیڈ اور جہاد	" " ۱۳۵ تا ۱۸۸، "
"	ہماری فوج قیام پاکستان کے وقت	" " ۹۳، "
البنا شہید، الامام حسن	اخوان المسلمون کی دعوت	تجلی، ص ۸۳ تا ۹۲، اکتوبر

---

[1] اس اشاریے میں ماہنامہ نقش کراچی (جنگ نمبر) کے بعض حوالے وضاحت طلب ہیں - یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے مضامین میں اسلامی تاریخ ماضی و حال میں اسلام کی سرفروشانہ روایات و تعلیمات اور پاک بھارت جنگ (ستمبر ۱۹۶۵ء) کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انصاری، تاج الدین	کشمیر کے پچاس لاکھ مظلوم انسان	چٹان، ص ۷، ۱۰ر اکتوبر
انصاری، ڈاکٹر ولی الحق	شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز	معارف، ص ۲۸۰ تا ۳۰۳، اکتوبر
ایلیا، جون	عشق جاوداں کا گروہ (آذربائیجان کی ایک داستان)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۳ تا ۲۰، ،،
بٹ، رشید	ڈاکٹر سوباندریو ــ جنہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے	جنگ، ص ۱۵، ۲۸ر اکتوبر
بٹالوی، اعجاز حسین	یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے	نقش، ص ۲۹۶ تا ۲۹۸، جنگ نمبر
جعفری، رئیس احمد	اٹوٹ انگ	،، ،، ۵۹۶ تا ۵۹۸، ،،
،،	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں[1]	انجام، ص ۱۰، یکم اکتوبر
چشتیہ بیگم، تنویر	جمہوریہ ترکی کا تاریخی پس منظر	،، ،، ۳، ۱۲ر ،،
حامدی، خلیل	افریقہ میں اسلام کا ماضی	ترجمان القرآن، ص ۳۱ تا ۴۱، اکتوبر
،،	الاخوان المسلمون	،، ،، ۴۳ تا ۵۶، ،،
حسن، ممتاز	پاکستانی ایک نئی قوم	نقش، ص ۲۱ تا ۳۸،
حفیظ اللہ پھلواری، محمد	مسلمانوں کا علمی شغف	فاران، ص ۳۳ تا ۳۷، اکتوبر
خان، صلاح الدین	سامراجیت اور اشتراکیت کی کشمکش	لاہور، ص ۱۲، ۳ر اکتوبر
خلیل اللہ، پروفیسر محمد	پاکستان کی خارجہ پالیسی	جنگ، ص ۴، ۲۸ر فروری
دہلوی، شاہد احمد	جاگ اٹھا ہے پاکستان	نقش، ص ۹۳ تا ۹۴، جنگ نمبر
راحت، مختار	بھارتی فوجیوں کی قید میں چند گھنٹے	،، ،، ۵۹۹ تا ۶۰۱، ،،
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب[2]	جنگ، ص ۱۲، یکم اکتوبر
رسل، لارڈ برٹرینڈ	بھارت کی جارحیت	نقش، ص ۲۹۹ تا ۳۰۷، جنگ نمبر
رضوی، سید نذیر احمد	پیر پگاڑو کے حر	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۰ - ۱۱، ۳ر اکتوبر
زبیری، جمیل	ہندو عداوت کا تاریخی پس منظر	نقش، ص ۲۵۱ تا ۲۶۳، جنگ نمبر
زیدی، علی جواد	بدلتا افغانستان	جامعہ، ص ۱۸۲ تا ۱۹۹، اکتوبر
سامان، مسعود سعد	لاہور	نقش، ص ۳۸۸ تا ۳۹۱، جنگ نمبر

[1] دوسری قسط کے لئے دیکھئے انجام ۱۵ر اکتوبر ص ۱۲

[2] قومی اور بین الاقوامی سیاسی و سماجی حالات و مسائل پر ہفتہ وار تبصرے کا مستقل سلسلہ ۔ دیکھئے اشاعتہائے اتوار

شاہ پوری، آباد	افریقہ	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۴۴ تا ۱۵۵، اکتوبر
"	مسلمان قومیں اشتراکیت کے سایے میں	آئین، ص ۱۳، ۱۴ اکتوبر
شاہد خاں، ابو شاہد خاں	مولانا عبیداللہ سندھی کا سفر کابل اور اس کا مقصد	الرحیم، ص ۵۳۳ تا ۵۴۱، "
شاہد، ضیا	اخوان المسلمین (مصر) کا لہو	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵ تا ۲۲، اکتوبر
صدیقی، شوکت	سیالکوٹ	نقوش، ص ۳۷۹ تا ۳۸۳، جنگ نمبر
صدیقی، میجر تفضل حسین	مشرقی پاکستان میں جنگ کے تیور	" " ۳۰۷ تا ۳۱۰، "
صدیقی، میجر عبدالرحمان	جب دشمن نے للکارا	" " ۲۹۹ تا ۳۰۲، "
" "	معرکۂ چھمب	" " ۳۲۳ تا ۳۲۷، "
عالم، ابصار	۱۸۵۷ء کے اثرات مابعد	" " ۲۲۶ تا ۲۵۰، "
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تین نشری تقریریں (پاک بھارت جنگ کے دنوں میں)	" " ۲۷۹ تا ۲۸۹، "
مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر غلام	غزوۂ بدر کی افادیت	" " ۱۰۵ تا ۱۰۷، "
فریدآبادی، سید ہاشمی	۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی	" " ۲۰۳ تا ۲۱۲، "
فتحپوری، نیاز	عساکر اسلامی کا نظام	" " ۱۲۱ تا ۱۴۴، "
گوہر، الطاف	سوجان باز	" " ۲۹۱ تا ۲۹۵، "
کامرانی، نظر	جنگ سے امن تک	" " ۴۰۲ تا ۴۱۴، "
کاظمی، حسنین	چنار جلتے ہیں	" " ۵۸۱ تا ۵۹۵، "
کاشمیری، حمید	وعدہ کی قیمت خون	" " ۵۶۹ تا ۵۸۰، "
کاسگنجوی، حسرت	چند ماہ ہندوستان میں	" " ۵۹۵ تا ۵۹۸، "
عقیل، شفیع	غازی یا شہید	" " ۳۲۸ تا ۳۴۳، "
عالم، خورشید	عبادت کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۲۱ تا ۲۸، "
عبدالرحمان	بنیادی جمہوریت کا نظام	انجام، ص ۳، ۲۰ اکتوبر
عبدالرحمان، سید صباح الدین	سولھویں اور سترھویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں	معارف، ص ۲۴۴ تا ۲۶۲، اکتوبر
علی، ڈاکٹر جواد		
نثار احمد فاروقی (مترجم)	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۸۸ تا ۱۲۷، "

سیرت و سوانح

آزاد، مولانا ابوالکلام

مصنف	عنوان	ماخذ
آزاد، مولانا ابوالکلام		
ابوسلمان شاہجہانپوری (مرتب)	الدفاع فی الاسلام	نقش، ص ۱۱۳ تا ۱۲۰، جنگ نمبر
ابوسلمان، شاہجہانپوری	مولانا ابوالکلام آزاد کا غیر مطبوعہ کلام	اردو، ص ۷۳ تا ۹۴، ‹‹
	مولانا آزاد کی یاد میں — اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر (۳) [1]	ہماری زبان، ص ۷ تا ۸ + ۱۲، یکم اکتوبر
انصاری، سعید	مولانا ابوالکلام آزاد — تعلیم اور انسان دوستی کی روشنی میں	جامعہ، ص ۱۷۱ تا ۱۸۲، اکتوبر
چمن لال، دیوان	مولانا آزاد — ایک عظیم مدبر	پیام انقلاب، ص ۴، ۱ر۰

اقبال، علامہ

مصنف	عنوان	ماخذ
شیدائی، پروفیسر اسدالحق	تصور فقر	ساقی، ص ۵۳ تا ۶۲، اکتوبر
عبداللہ، پروفیسر محمد	اقبال اور جہاد	‹‹ ‹‹ ۴۳ تا ۵۰، ‹‹
محمود حسین، میر	علامہ اقبال کی داستان دکن	صبح امید، ص ۱۱ تا ۱۵، ‹‹

غالب، اسداللہ خاں

مصنف	عنوان	ماخذ
عدلی، افتخار احمد	غالب اور سپہ گری	نقش، ص ۵۴۱ تا ۵۴۶، جنگ نمبر
فاضل، مرتضیٰ حسین (مرتب)	مثنوی ابر گہر بار (غالب)	اردو، ص ۱۱۵ تا ۱۲۸، اکتوبر

دیگر شخصیات

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوسلمان، شاہجہانپوری	حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	جنگ، ص ۲، ۱۹ر اکتوبر

---

[1] اس سلسلے کی ابتدائی دو قسطیں ۱۵ر اور ۲۲ر ستمبر کے نمبروں میں آچکی ہیں۔

ابو زہرہ، الشیخ محمد		
عبدالرحمان ناصر عسکری (مترجم)	امام مسلم بن الحجاج صاحب صحیح مسلم	المنبر، ص ۷ تا ۸، ۱۲ اکتوبر
احمد، سید ناصر	سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	انجام، ص ۱۲، ۲۲ اکتوبر
" "	شہید ملت لیاقت علی خاں	" " ۱۴، ۱۷ "
احمد، مشتاق	کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا	لیاری، ص ۵ تا ۲۳
احمد خاں، ارشاد	حضرت سید عبداللہ شاہ غازی کا مزار — (کراچی کے ایک بزرگ)	انجام، ص ۲، ۱۰ اکتوبر
ادیب، سہیم حسین ظفر	وہاب احمد غنچہ امروہوی	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۷ "
اسلام، حافظ محمد	خواجہ ناظم الدین مرحوم	جنگ، ص ۲، ۲۲ "
الرمادی، ڈاکٹر جمال الدین		
محمد قاسم جمالی (مترجم)	امام قرطبی	البلاغ، ص ۲۷ تا ۳۰، اکتوبر
انجم، ڈاکٹر خلیق	مولانا انور صابری	ساقی، ص ۷ تا ۱۳، "
انصاری، اشرف	محسن کاکوروی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸، اکتوبر
انور، صدیقی	مجاز — ایک جائزہ	جامعہ، ص ۲۰۰ تا ۲۰۷، اکتوبر
قادری، محمد	مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے	الرحیم، ص ۲۳۳ تا ۲۴۰، "
بدر منیر، محمد	راجہ غلام قادر غبار	قندیل، ص ۲، ۲۳ اکتوبر
برق داناپوری، طلحہ رضوی	کچھ اکبر کے متعلق	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ اکتوبر
بریلوی، سید الطاف علی	شہید ملت خان لیاقت علی خاں	جنگ، ص ۲، ۱۷ اکتوبر
بیتھوی، شبیر حسین	پروفیسر نظیر صدیقی	قندیل، ص ۱۹ تا ۲۰، ۲۳ اکتوبر
پاشا، ڈاکٹر سلیمان	شہید ملت لیاقت علی خاں	حریت، ص ۵، ۱۷ اکتوبر
جعفری، فضل الرحمان	پاکستان کا معمار اول (شہید ملت)	انجام، ص ۶، ۱۷ "
چشتی، مولانا یوسف سلیم	سلطان غازی نور الدین زنگی	شہاب، ص ۷، ۲ "
حسن نظامی، خواجہ	حضرت خواجہ اجمیری	حریت، ص ۱۰، ۲۲ "
حیدر شاہ، سید علی	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	لیاری، ص ۴ تا ۲۵
حسین، ڈاکٹر سید سلیمان	اسیر لکھنوی	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ اکتوبر

مصنف	عنوان	ماخذ
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	اکبر الہ آبادی اور سر سید	چٹان، ص ۱۰۰۲، ۳ر اکتوبر
"	مولانا وحید الدین سلیم — صحافی کی حیثیت سے	" " ۱۰۰۲، ۱۰ر "
دہلوی، حکیم محمد سعید	اتاترک	الاسلام، ص ۳ تا ۵، ۱۰ر "
ذوقی، خواجہ مسعود علی	نیاز فتح پوری	ہماری زبان، ص ۳، ۲۲ یکم "
ر۔ الف	تمہاری یاد ہوکر رہ گئے ہیں (لیاقت علی خاں)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۵۸ تا ۶۴، اکتوبر
راشدی، سید حسام الدین	گنجی نفنا تمریہ	اردو، ص ۵۵ تا ۴۳، اکتوبر
زکریا، محمد	حالی اور شیفتہ	ثقافت، ص ۵۴ تا ۶۴، "
زیدی، شفیق حسن	ایک ادیب — ایک شاعر — محمد عبدالوہاب خالد عاصم جے پوری	جنگ، ص ۷، ۳ر اکتوبر
ساجد، افتخار	آغا شیر احمد خاموش	قندیل، ص ۳۳، ۳ر "
"	سعید امرت	" ، ۹۰، ۱۱ر "
سخاوت علی، سید	اورنگ زیب کی شخصیت	نقش، ص ۱۹۹ تا ۲۱۱، جنگ نمبر
سرور آل احمد	سر سید احمد خاں کے کارنامے	ہماری زبان، ص ۱، ۱۵ر اکتوبر
سعید الحق	لیاقت علی خاں کے فیصلے	جنگ، ص ۷، ۱۷ر اکتوبر
شفائی جام نیری، جوہر	حضرت طالب دہلوی	رہنمائے تعلیم، ص ۲۲ تا ۲۴، "
صدیق حسن خاں، نواب	قائد ملت کے آخری دن	جنگ، ص ۱۲، ۱۷ر اکتوبر
صدیقی، شوکت	شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن (چند شہیدان وطن کا تذکرہ)	نقش، ص ۲۱۱ تا ۲۲۳، جنگ نمبر
صدیقی، محمد ریاض	حضرت اور ان کی شخصیت	منشور، ص ۵ تا ۲۱، اکتوبر
طوائفر، ایس	ترکی کا ایک باکمال شاعر — یحییٰ کمال بیاتلی	جنگ، ص ۴، ۸ر اکتوبر
عبد، عبدالرحمان	عزیز بھٹی شہید	نقش، ص ۲۹۲ تا ۲۹۴، جنگ نمبر
عثمانی، محمد یوسف	مدینۃ الہند میں اسلام کے پہلے مبلغ اعظم — حضرت خواجہ غریب نوازؒ	حریت، ص ۱۰، ۲۲ر اکتوبر
فاتح قائم آبادی، ڈاکٹر	حضرت خواجہ حسن بصری	چٹان، ص ۷، ۱۷ر "

روقی، محمود	حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	حریت، ص ۳، ۱۵ر اکتوبر
وسی، ارشاد الحق	شہید ملت لیاقت علی خاں	انجام، ص ۱۱، ۱۶ر ״
بتی، پروفیسر شبیر حسین	خواجہ اجمیرؒ	جنگ، ص ۱۱، ۱۹ر ״
شی، طفیل احمد	علامہ ابن حزم	الرحیم، ص ۳۴۱ تا ۳۵۸، ״
״	״ ״ ۱؎	لاہور، ص ۱۴ تا ۱۵، ۳ر ״
ود، محمد خالد	حکیم ترمذی کی خود نوشت سوانح عمری	الرحیم، ص ۳۷۲ تا ۳۸۹، ״
ود، وحید احمد	حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ	لاہور، ص ۹ تا ۱۰، ۱۱، ۱۰ر اکتوبر
اہری، عبدالقیوم	مولانا رشید احمد گنگوہی	خدام الدین، ص ۷ تا ۸، ۲۱ر ״
، فضل الحق	شہید ملت	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۶، ۱۷ر ״
ر، عبدالہادی	امام داؤد صاحب السنن (سوانح حیات)	الرحیم، ص ۳۵۹ تا ۳۷۱، ״
بد، حمید اصغر	سید عبدالمعبود	چٹان، ص ۵، ۳ر اکتوبر
دی، حامد اللہ	شمس العلماء مولوی عبدالرحمان شاطر	نوائے ادب، ص ۴۵ تا ۶۴، اپریل
رحسین، شاہ	میرے بچپن کے دوست (شہید ملت لیاقت علی خاں)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۴۹ تا ۵۲، اکتوبر
انی، مولانا محمد علی		
بدنفیس الحسینی (مترجم)	سیرت خواجہ گیسو درازؒ (۴)	چٹان، ص ۱۵، ۳ر اکتوبر
یس سندیلوی، پروفیسر	حضرت رسا کاسنوی	نیرنگ خیال، ص ۴۹ تا ۵۶، اکتوبر
ازی، نیرنگ	شہید ملت — خدمات کا ایک مختصر جائزہ	انجام، ص ۱۵، ۱۷ر اکتوبر
ینکٹ سنگھ چوہان، دیوان سنگھ	نور اللہ لعرقی	نوائے ادب، ص ۸۳ تا ۸۷، اپریل
———	الاستاذ سید قطب	تجلی، ص ۳۴ تا ۴۴، اکتوبر
———	جدید ترکی کا عظیم معمار مصطفیٰ کمال	جنگ، ص ۱۰، ۸ر اکتوبر
———	جنرل جودت (صدر ترکی)	قندیل، ص ۲، ۹ر ״
———	قائد ملت لیاقت علی خاں — حالات و واقعات کے آئینے میں	جنگ، ص ۵، ۱۷ر اکتوبر

۱؎ ماہنامہ الرحیم حیدرآباد سے منقول

صحافت

ــــــــــ	ترکی میں صحافت	جنگ، ص ۱۵، ۱۰ر اکتوبر

کتابیات وکتب خانے

ادارہ	اشاریہ مضامین رسالہ اردو ـــ قسط نمبر۲	اردو، ص ۳۳ تا ۴۸، اکتوبر
اطہر مبارک پوری، قاضی	امام محمد کی کتاب الآثار	معارف، ص ۳۱۳ تا ۳۱۶، ،،
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا	برہان، ص ۱۴۷ تا ۱۵۴، ،،
بیگم، ڈاکٹر حبیب النساء	بیجاپور کے ایک صوفی خاندان کے چند نادر رسالے	نوائے ادب، ص ۶۲ تا ۷۳، اپریل
جیراجپوری، اسلم	الفاروق[1]	کتابی دنیا، ص ۲ تا ۵، اکتوبر
چغتائی، محمد اکرام	دیوان ولی کے قلمی نسخے	اردو، ص ۹۱ تا ۱۱۴، ،،
ساحل، عبدالحلیم و دیگر معاونین	مقالہ نما (رسائل وجرائد کے منتخب مضامین کا اشاریہ)	نوائے ادب، ص ۱ تا ۱۳، اپریل
عمران خاں ٹونکی، حکیم محمد	ٹونک کے کتب خانے	معارف، ص ۳۰۴ تا ۳۱۲، اکتوبر
قریشی، نعیم الدین	کتب خانے ـــ وقت کی اہم ضرورت	جنگ، ص ۸، ۳۱ر اکتوبر
محمد علی		
عبدالاحد عزیز (مترجم)	سرزمین شام میں کتابیں اور کتب خانے	برہان، ص ۲۳۷ تا ۲۴۶، اکتوبر
م - خ (مشفق خواجہ)	ارمغان (کنہیا لال وحشی)	اردو، ص ۳۵ تا ۴۶، ،،
نیاز، ملک احمد	اردو اخبارات ورسائل ـ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری	کتاب لاہور، ص ۶۹ تا ۷۶، اکتوبر

لسانیات

خلیل، وقار	اتر پردیش میں اردو کے مسائل ـــ پروفیسر احتشام حسین سے بات چیت	ہماری زبان، ص ۹ تا ۱۰، ۸ر اکتوبر

---

[1] منقول از شبلی نیشنل کالج میگزین

مصنف	عنوان	ماخذ
سبزواری، شوکت	اردو کی غنہ کی آوازیں	تحریک، ص ۱۳ تا ۱۶، اکتوبر
سہنا، شیو پرشاد	اردو کی بپتا (۱)	صدق جدید، ص ۷، ۲ر "
" "	" "	" ص ۷ تا ۸، ۱۶ر "
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی	لغات کبیر ــ قسط ۳	اردو، ص ۱۳ تا ۴۲، "
قریشی، عبدالرزاق	پنجابی اور اردو مختلف نظریوں کے آئینے میں	نوائے ادب، ص ۵ تا ۲۷، اپریل
کاظمی، پروفیسر سید شبیر علی	اردو کے مختلف نام	اردو، ص ۷۷ تا ۹۰، اکتوبر
معین الرحمان، سید	انجمن ترقی اردو	کتاب لاہور، ص ۲۳ تا ۲۸، "

مذہبیات

سنت و سیرت نبوی صلعم

مصنف	عنوان	ماخذ
الاصفہانی، حافظ ابوالشیخ		
محمد احمد (مترجم)	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۱۲ تا ۱۶، اکتوبر
مختار دہلوی، مولانا حبیب اللہ	سنت نبویؐ اور قرآن کریم	" ص ۱۰ تا ۲۴، "
مجید، حمید اصغر	رسول اللہؐ کی سنت قیامت تک زندہ رہے گی[1]	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۶ر "
فارانی، ابوطاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۷، ۱۶ر "

قرآن و تفسیر

مصنف	عنوان	ماخذ
اصلاحی، مولانا امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران (۱۰)	میثاق، ص ۵ تا ۳۰، اکتوبر
" "	مقدمہ (تفسیر سورہ فاتحہ و سورہ بقر)	" " ۹ تا ۱۴، "
الحسینی، قاضی محمد زاہد		
محمد عثمان غنی (مرتب)	درس قرآن	خدام الدین، ص ۷ تا ۸ + ۱۷، ۲۳ر اکتوبر
الحسینی، قاضی محمد زاہد		
محمد عثمان غنی (مرتب)	درس قرآن	خدام الدین، ص ۱۱ + ۱۷، ۱۶ر اکتوبر

---

[1] جامعہ حنفیہ قاسمیہ کی سہ روزہ کانفرنس کی روداد اور تقاریر کا خلاصہ

تھانوی، مولانا احتشام الحق	درس قرآن (سورہ بقرہ)[1]	جنگ، ص ۳، یکم اکتوبر
قادر علی، سید	قرآن مجید کے ہندی تراجم	زندگی، ص ۳۴ تا ۴۱، "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	الذاریات (۲)	ترجمان القرآن، ص ۱۷ تا ۳۰، اکتوبر

مسائل ومباحث

اکبرآبادی، مولانا سعید احمد	ہندوستان کی شرعی حیثیت (۴)	برہان، ص ۹۷ تا ۱۰۵، اکتوبر
السباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ		
سید احتشام احمد ندوی (مترجم)	فن جرح وتعدیل	جامعہ، ص ۲۲۲ تا ۲۴۴، اکتوبر
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت	برہان، ص ۱۰۶ تا ۱۱۷، "
انور، مولانا عبیداللہ	بےحیائی اور عذاب	خدام الدین، ص ۵ تا ۶، ۲۰، "
" "	عبادات اور ذکراللہ سے مقصود ...	" " ۱۳، "
بھوپال والا، مولانا عبدالحمید	شریعت ایکٹ کے تحفظ میں	المنبر، ص ۱۱، ۷، ۲۴، "
پرویز	خدا اور سرمایہ دار	طلوع اسلام، ص ۶۷ تا ۷۴، "
پھلواروی، شاہ محمد جعفر	خلع	ثقافت، ص ۶ تا ۲۰، ۳، "
ٹونکی، مفتی ولی حسن	اسلامی قانون میں حد کا تصور	بینات، ص ۴۳ تا ۵۴، "
جیلانی، شیخ عبدالقادرؒ		
محمد داؤد راز (مترجم)	عبادالرحمان کون ہیں ؟	المنبر، ص ۵ تا ۶ + ۱۱، ۱۰ اکتوبر
صدیقی، نجات اللہ	شرکت ومضاربت کے شرعی اصول	زندگی، ص ۹ تا ۲۴، اکتوبر
ماہر القادری	جھوٹی نبوت کا جھوٹا علم کلام	فاران، ص ۱۵ تا ۲۸، "
مبین، سلطان	تناسخ کی افادیت اور اس کے ثمرات	زندگی، ص ۴۴ تا ۴۷، "
مسعود، خالد	زکوٰۃ کی حقیقت	میثاق، ص ۳۷ تا ۴۰، "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	ایک ہی راستہ (اسلام)	آئین، ص ۸ تا ۱۱، ۲۴، "
ندوی، مولانا سید سلیمان	اسلام کی تعلیم وعدالت (۳)	المنبر، ص ۱۳، ۲۴، ۱۲، "

---

[1] جمعہ ایڈیشن میں درس قرآن کا مستقل سلسلہ

قومی زبان کراچی ... ص ۲۲ ر

طاسین، مولانا محمد — حسینی اور حلال کی سرمایے کی زکوٰۃ ہونی چاہیئے — شباب، ص ۷ تا ۱۰، ۲۰ر اکتوبر

ہاشمی، رفیع الدین (مرتب) — توحید اور شرک — مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک تقریر — آئین، ص ۹ تا ۱۰، ۱۳ر اکتوبر

یالی پوتہ، ڈاکٹر عبدالواحد

سید محمد سعید (مترجم) — شاہ ولی اللہ کا فلسفہ — عبادیات، اخلاقیات — الرحیم، ص ۴۳۰ تا ۴۳۹، ۳

یوسف، محمد — اسباب تحریف شاہ ولی اللہ کی نظر میں — خدام الدین، ص ۵ تا ۶، ۱۲ر

" " — زکوٰۃ اور ٹیکس[1] — چٹان، ص ۵ تا ۱۰، ۲۲ر "

امریکہ میں مذہبی تحریک[2] — جنگ، ص ۶، ۱۰ر اکتوبر

---

[1] دوسری قسط ۱۰ر اکتوبر کے چٹان میں ملاحظہ فرمائیے

[2] دیگر اقساط کے لئے ۱۵ر اکتوبر تا ۱۷ اور ۲۲ر اکتوبر ص ۸

سہ ماہی اردو

اپریل سنہ ۶۷ء کے شمارے کے مندرجات

مسلسل مضامین

قیمت فی پرچہ : ساڑھے تین روپے ۔ سالانہ : بارہ روپے

انجمن ترقی اردو ۔ بابائے اردو روڈ ۔ کراچی ۱

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

شمارہ ۶

جلد ۳۰

جون ۱۹۶۷ء

فی پرچہ
ایک روپیہ

سالانہ قیمت
دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

شاہد احمد دہلوی

قومی زبان کا یہ شمارہ پریس جاچکا تھا کہ یہ اندوہ ناک اطلاع ملی کہ ۲۷ر مئی کو رات کے بارہ بجے
زبان کے صاحب طرز ادیب اور ماہنامہ ساقی کے مدیر جناب شاہد احمد دہلوی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا
ت کے وقت مرحوم کی عمر اکسٹھ سال کی تھی۔ انجمن کے صدر جناب اختر حسین صاحب نے جو تعزیتی
م جاری کیا ہے، وہ درج ذیل ہے "قومی زبان" کے آئندہ شمارے میں مرحوم کی یاد میں خصوصی مضامین
ع کئے جائیں گے۔

"شاہد احمد دہلوی مرحوم نے ایک صاحب طرز انشار پرداز، مدیر اور مترجم کی حیثیت سے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھنے پر انھیں جو قدرت حاصل تھی، وہ ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی، جس میں ان کا کوئی شریک نہ تھا۔ انھوں نے اپنے مشہور رسالے "ساقی" کے ذریعے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اہم حصہ لیا۔ یہ رسالہ دراصل ایک ادبی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کے بہت سے ممتاز اردو مصنفین اسی رسالے کے ذریعے منظر عام پر آئے۔

"شاہد احمد دہلوی، ادارہ مصنفین پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔ اس ادارے کے ذریعے انھوں نے ہمارے ملک کے ادیبوں کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ مرحوم کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا مشکل ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ ایک لاکھ بتیس ہزار چھ سو دس روپے تراسی پیسے (۱،۳۲،۶۱۰ روپے ۸۳) جمع ہو چکے ہیں۔ ذاتی طور پر عطیہ دینے والے اور رسائد کی فروخت سے رقم جمع کرانے حضرات اور اداروں کے نام مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ میں جو عطیات موصول ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے:-

ذاتی عطیات

جناب محمد علی خاں صاحب۔ وزیر تعلیمات حکومت مغربی پاکستان	مبلغ ایک ہزار روپے
جناب اسمٰعیل حاجی قاسم صاحب۔ ایجنٹ۔ حبیب انشورنش کمپنی کراچی	مبلغ تین سو گیارہ روپے
جناب ڈاکٹر انعام احسن صاحب۔ کراچی	مبلغ ایک سو روپے
ایک صاحب خیر۔ کراچی	مبلغ سولہ روپے

رسائد کی فروخت سے مندرجہ ذیل حضرات نے رقوم جمع کرائیں

جناب محمد بھائی صاحب بذریعہ جناب شمس لاکھا صاحب۔ ڈھاکہ	مبلغ پانچ ہزار روپے
جناب شیخ اکرام صاحب	مبلغ دو ہزار نو سو روپے
جناب محمد خلیل اللہ صاحب وائس پرنسپل اردو کالج۔ کراچی	مبلغ تین سو روپے
جناب محمود احمد خاں صاحب۔ لاہور	مبلغ تین سو روپے
جناب چودھری امانت اللہ صاحب ڈیرہ غازی خاں	مبلغ دو سو چھپن روپے
محترمہ نجمہ رفیق صاحبہ بنت محمد رفیق صاحب کراچی	مبلغ ستائیس روپے
جناب رحیم جان صاحب۔ کراچی	مبلغ بیس روپے
جناب محفوظ احمد صاحب۔ کراچی	مبلغ سولہ روپے
انجمن طلبۂ قدیم جامعہ عثمانیہ۔ کراچی	مبلغ سات سو دس روپے

آخری رقم انجمن طلبۂ قدیم جامعہ عثمانیہ کے سکریٹری جناب مرزا ظفر الحسن صاحب نے جمع کرائی ہے۔ ۲۰ مئی کو مذکورہ انجمن کی جانب سے "غالب کے اڑیں گے پرزے" کے موضوع پر ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی تھی اس تقریب میں انجمن کی رسائد فروخت کی گئیں۔ اردو کالج کے وائس پرنسپل جناب محمد خلیل اللہ صاحب نے رسائد کی فروخت کا انتظام کیا۔

حکیم محمد سعید دہلوی

بیادِ حسرت موہانی

کسی[1] ملک و ملت کے لئے سب سے بڑا المیہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے منقطع ہو جائے اور اس روشنی سے محروم ہو جائے کہ جو حال کی راہیں منوّر اور مستقبل کی شاہ راہیں روشن کرتی ہے۔ اور ان کی تاریکیوں کا پردہ چاک کرتی ہے جن میں ملت رہ نوردِ مقصد اور مقصد کی محبت سے محروم ہو کر گمراہیوں کے مختلف فتنوں کی نذر ہوئی رہتی ہے۔

زندہ قومیں بالفاظ دیگر ایسی قومیں جو اپنا مقصدِ حیات متعین کر لیتی ہیں ماضی اور حال کے رشتوں کو ہر قیمت پر جوڑے رکھتی ہیں اور ان رشتوں کے انقطاع کو ہرگز گوارا نہیں کرتیں۔ برصغیر کے دورِ غلامی میں جن مسلم اکابر نے حفظِ ناموسِ اسلام کے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں اور جن محبانِ اسلام نے برصغیر کی آزادی کے لئے عظیم قربانیاں دی ہیں اور ایک راہِ عمل متعین کی ہے اگر ہم پاکستانیوں نے ان کو فراموش کر دیا تو اس کے معنی قطعی طور پر یہ ہیں کہ ہم خود کو ایک نورِ مسلسل سے محروم کر رہے ہیں۔ اور ضلالت و تاریکی ہمیں مرغوب ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آزادی کی فضا میں سانس لینے والا پاکستان اب اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ ان اکابر میں سے کسی ایک کو بھی فراموش کر دے جن کی قربانیوں کی بدولت آج وہ آزاد ہے۔ سربلند ہے، مضبوط ہے۔ اور سینہ سپر ہے۔

آج ہم یومِ حسرت موہانی منا رہے ہیں تو در حقیقت اس گرد کو جھاڑ رہے ہیں جو بزرگانِ اسلام کے کردار سیرت اور شخصیت پر ہم نے اپنی غفلت سے جما دی ہے اور ہم اپنے ماضی اور اپنے حال کے اس رشتے کو جوڑ رہے ہیں جو ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر اب تک ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم اس تار کو جوڑ رہے ہیں۔ جس سے برق و نور ہم پر ضیا پاش ہو سکتا ہے۔

سید الاحرار مولانا حسرت موہانی رئیس المتغزلین تھے سیاسی رہنما تھے۔ بلبلِ حریت تھے یہ سب صحیح ہے اور اسے سب جانتے ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ پکے مسلمان تھے۔ اور ایک سچے مسلمان کی ان بنیادی خصوصیات اور صفات سے متصف تھے، جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا وصف تھیں۔ صدقِ مقال اور اکلِ حلال ان کے کردار کا نمایاں وصف رہا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا وہ صدق و صفا اور مہر و وفا کے پیکر تھے۔ کلمۂ حق کے اظہار و اعلان سے انھیں بڑی سے بڑی طاقت بھی نہ روک سکتی تھی۔ اس راہ میں انھیں نہ جان جوکھوں میں ڈالنے میں تامل ہوتا تھا

---

[1] ۱۳ر مئی ۱۹۷۰ء کو کراچی میں یومِ حسرت منایا گیا جس کی صدارت جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے فرمائی۔ موصوف کا خطبۂ صدارت پیش کیا جا رہا ہے۔

اور نہ مالی قربانیاں دینے میں تردد ۔ غیر حق اور باطل سے مفاہمت ان کے لئے ممکن نہ تھی ۔ خواہ بڑی سے بڑی مصلحت ہی کیوں نہ اس کی متقاضی ہو ۔ سادگی مولانا حسرت موہانی کا طرۂ امتیاز تھی ۔ ظاہر و باطن کو یکسانیت اور دل و زبان کی مطابقت ان کا امتیازی وصف تھا ۔ انھوں نے ایسا دل پایا تھا ۔ جو حرص و ہوس سے دور مذہب و ملت کے درد سے رنجور اور محبت مولا اور عشق رسول میں چور تھا ۔

مولانا حسرت موہانی نے انگریز کے خلاف اس وقت آوازہ بلند کیا جب کہ ابھی نہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا تھا نہ علی برادران میدان صحافت و سیاست میں کود دے تھے ۔ اور نہ مولانا ظفر علی خاں کی آواز سنائی دی تھی ۔ مولانا ابوالکلام نے ابھی آزاد صحافت کے خارزار میدان میں قدم نہیں رکھا تھا ۔ علی برادران اپنی اپنی ملازمتوں سے وابستہ تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں بھی دار الترجمہ حیدر آباد سے منسلک تھے ۔ ڈاکٹر انصاری بیرون ملک خدمات میں معروف تھے ۔ لیکن مولانا حسرت برطانوی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے ۔ ذہنی دیانت داری اور اپنے نصب العین پر ایمان ہی ایک صحافی کو ابن الوقت اور زمانہ ساز ہونے سے بچاتا ہے ۔ صحافی کے پاس ایک چھتری ہوتی ہے جو ضمیر کی آتش فشانی سے سماج کو محفوظ رکھتی ہے ۔ صحافی رائے عامہ کی روشن خیالی کا ہراول دستہ ہوتے ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ حسرت موہانی ایک عظیم صحافی تھے ۔ اور انھوں نے ان اخلاقیات صحافت کو جنم دیا جو آج تک ہمارے لئے مشعل راہ ہیں ۔ مولانا پہلے مسلمان صحافی تھے جنھوں نے صحافت میں سامراج دشمنی کی روایت قائم کی میری رائے میں ایک صحافی کو قلم کا دھنی اور شجیع ہونا چاہیئے ۔ دیانت داری اس کی ڈھال اور راست بازی اس کے نیزے کی انی ہونی چاہیئے ۔ اسے ہر شریف کے ساتھ شرافت پیشہ عورتوں کے ساتھ شرمیلا اور منکسر بچوں کے لئے شفیق ہونا چاہیئے ۔ اور مکار دھوکے باز حقیقتوں سے لاپروا ۔

میرا خیال ہے کہ ابھی تک کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں گزرا جو شاعر ہونے کے ساتھ دقیق النظر فلسفی نہ ہو ۔ اور نہ ایسا کوئی شاعر کبھی گزرا جس کا قلب اس کے صحیح مقام پر نہ ہو ۔ ایک عظیم شاعر کے سینے میں ایک آزاد اور حریت نواز کا سا دل ہوتا ہے ۔ غیر فانی آتش سے سلگتا ہوا ۔ سچے شاعر عظیم صداقتوں سے محبت کرتے ہیں اور انھیں محسوس کرتے ہیں بلا شبہ مولانا حسرت موہانی اردو کے ایک عظیم شاعر تھے ۔ وہ اردو شاعری کی آبرو تھے تغزل کی دنیا انھوں نے نئے سرے سے سجائی ورنہ یہ صنف سخن ختم ہوتی جا رہی تھی ۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ سچے شاعر جو چیز اپنے گیتوں سے سکھاتے ہیں بڑے مصائب سے خود سیکھتے ہیں اور اگر آپ اس میں کوئی حقیقت محسوس کرتے ہیں کہ جو شاعر ہمت و مردانگی پر نظمیں غزلیں لکھتا ہے اس کو اپنی پوری زندگی کو بھی ہمت و جرات کی نظم میں ڈھالنا چاہیئے ۔ تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ حسرت کو اس آئینہ میں ضرور دیکھئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ مولانا کی سوانح حیات کو ان کی شاعری میں تلاش کرنا چاہیئے ۔ اس میں ان کے تمام معتقدات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے ۔

میں نے مولانا حسرت موہانی کی جن خوبیوں اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بجائے خود مولانا کو جامۂ دوام کا خلعت پہنانے کے لئے کافی نہیں لیکن ان کی جولانی طبع اور جوہر کردار کا یہ عالم تھا کہ کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیان کے لئے ۔ یہ وسعت مولانا کو میدان سیاست میں نظر آئی ۔ مولانا نے سیاست کے خارزار میں دامن الجھایا ۔ لیکن اس طرح نہیں کہ چند کانٹے چبھے ہوں اور انھوں نے پسپائی اختیار کر لی ہو ۔ ان کی بلند حوصلگی کا تقاضا تھا کہ یہ کانٹے شمشیر و سنان بن جائیں ۔ چنانچہ .... اردو کا یہ منفرد غزل گو شاعر مجاہدین حریت کی صف میں سب سے آگے نظر آنے لگا

مولانا حسرت موہانی کے سیاسی افکار و معتقدات سے ان کے زمانے میں بھی کچھ لوگوں نے اختلاف کیا اور یہ حق اب بھی ہر کسی کو حاصل ہے ۔ لیکن اصول موضوعہ کی طرح ایک چیز ہر دور میں مسلم رہی اور وہ یہ کہ جس پامردی دلیری بے باکی استقلال ایثار اور عزیمت کے ساتھ انھوں نے برطانوی سامراج سے ٹکر لی ۔ وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا ۔ ان کے نکتہ چیں اور مخالف بھی ان کی سیرت اور کردار کا یہ پہلو دیکھ کر نہ صرف دنگ رہ گئے بلکہ ان کو خراج تحسین ادا کرنے اور سر نیاز خم کرنے پر مجبور ہو گئے ۔

مولانا حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ برصغیر کی پہلی شخصیت تھے ۔ جنھوں نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کی کہ یہ جماعتیں درجہ نوآبادیات کی جگہ آزادی کامل کو اپنا نصب العین بنائیں ۔ اور بالآخر مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء میں کامل آزادی ہی کو اپنی منزل قرار دیا ۔

خواتین و حضرات

حسرت موہانی میموریل سوسائٹی جس نے آج یوم حسرت موہانی کا اہتمام کیا مبارکباد کی مستحق ہے ۔ کہ اس نے ہماری تحریک آزادی کے اس بطل جلیل کی خدمات اور زندگی سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لئے یہ کوشش کی ۔ میں سوسائٹی کا ممنون ہوں کہ اس نے مجھے اس تقریب کی صدارت کا اعزاز بخشا ۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی کے پیغام کی اشاعت میں شرکت باعث مسرت اور سبب سکون ہے اور مجھ جیسے بے بضاعت انسان کے لئے یہ بہت بڑی عزت ہے ۔

ضرورت ہے کہ مولانا کی یاد یوم حسرت تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے کارناموں اور آزادی کی جنگ میں ان کے مثالی کردار کو واضح کرنے اور اس کی اشاعت کے لئے مستقل کام کیا جائے ۔ اور اہل علم اس خدمت کو انجام دیں اور قومی جذبہ رکھنے والے نوجوان سوسائٹی سے تعاون کریں ۔

میں آپ سب حضرات و خواتین کا دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے میری گزارشات سکون کے ساتھ سنیں شکریہ

○

سہ ماہی
اردو

اپریل سنہ ۶۷ء کے شمارے کے مندرجات :-

مسلسل مضامین

قیمت : فی پرچہ ساڑھے تین روپے ۔ سالانہ : بارہ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ممتاز حسن

خطبۂ صدارت

(سالانہ اجلاس حلقۂ ارباب ذوق راولپنڈی)

پاکستان میں پچھلے بیس سال کے عرصے میں اردو پر جو کچھ گزری ہے اس کے ایسے کو تو لکھنے والوں نے لکھا ہے ۔ لیکن ان اسباب پر کسی نے غور نہیں کیا ۔ جس کی وجہ سے اردو کو پاکستان میں وہ رتبہ نصیب نہیں ہو سکا جو ہمیشہ سے ہم سمجھتے آئے ہیں کہ اس کا حق تھا ۔ ثقافت کی بنیاد ایک بڑی حد تک لسانی ہے ۔ اور اردو اس برصغیر میں مسلمانوں کی ثقافت کی پیداوار ہے ۔ پاکستان کا مطالبہ ثقافت، معیشت اور سیاست کی بنیاد پر قائم ہوا ۔ اگر ان تینوں عناصر میں ثقافت غالباً سب سے اہم عنصر ہے اردو کا ہماری تحریک آزادی سے گہرا تعلق ہے ۔ سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے جو ایک زمانہ تک ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی رہے ۔ ہندی اردو کے جھگڑے ہی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ انھیں اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو مسلمان قوم کی خدمت کے لئے وقف کرنا ہے ۔ ان کے انتقال کے بعد بھی یہ ہندی اردو ہی کا جھگڑا تھا جس نے محسن الملک جیسے معتدل مزاج انسان کو انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد پر مجبور کیا ۔ جس کے وہ ہمیشہ سے وفادار چلے آتے تھے اور یہ وہی جدوجہد ہے جس کے نتیجے کے طور پر ڈھاکے میں ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی ۔ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے اردو ہندی کا جھگڑا مہاتما گاندھی نے پھر سے اٹھایا جس کی وجہ سے مولوی عبدالحق مرحوم کو ان کے خلاف سیاسی بیانات دینے پڑے اور ہندو مسلمانوں کی باہمی تلخی اور کشیدگی اور بڑھ گئی ۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں نے جب کبھی بھی اپنے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو اس میں اردو کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور آیا ۔ پھر اس کا کیا سبب ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اردو سارے پاکستان کی زبان نہ بن سکی ۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی قومی زبان تسلیم کر لی گئی اور مغربی پاکستان میں اردو ۔ لیکن یہاں بھی اردو کے لئے اب تک وہ کام نہیں ہو سکا جس کی ایک قومی زبان کے لئے توقع کی جا سکتی ہے ۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس صورت حال کی تین وجوہ ہیں ۔

اول یہ کہ ہم لوگوں نے جو اردو کے حامی کہلاتے ہیں اس زبان سے سیاست کھیلنی چاہی اور اسے اپنی سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنانا چاہا ۔ مشرقی پاکستان پر اردو کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی گئی اور ایک حد تک اسی قسم کا رجحان مغربی پاکستان میں

بھی پایا گیا۔ اس کا ردِ عمل جو ہونا تھا وہی ہوا۔

اردو کی حمایت میں ایک مستقل منفیت کا عنصر شامل رہا ہم لوگوں نے یہ کم کہا کہ "اردو کو ترقی دو اور آگے بڑھاؤ" مگر یہ زیادہ کہا کہ "مقامی زبانوں کو ختم کرو اور انگریزی کا قلع قمع کر دو"۔ میں نے اردو کے جلسوں میں یہ بات اپنے کانوں سے سنی ہے کہ "اس ملک میں ہر شخص کو، وہ کاندار ہو یا کوئی اور، انگریزی میں سائن بورڈ لکھنے کی حکومت کی طرف سے ممانعت ہونی چاہیئے اور جو سائن بورڈ انگریزی میں موجود ہیں انھیں فی النار کر دینا چاہیئے"۔

تیسری اور آخری وجہ میری رائے میں یہ ہے کہ اردو کے ادارے وہ لوگوں نے خود چلائے ہوں یا انھیں حکومت نے اپنی توجہ سے قائم کیا ہو کچھ فعّال ثابت نہیں ہوئے۔ اگلے وقتوں کی سواریوں کی طرح ہولے ہولے چلتے رہے اور ہچکولے بھی کھاتے رہے وہ چیز جسے شوق اور جنوں کی کیفیت کہتے ہیں کہیں دکھائی نہ دی یا تو ایک دوسرے پر الزام تراشے جاتے رہے۔

"یہ بولے تو نہیں چلتا، وہ بولے تو نہیں چلتا"

اور یا یہ کہ اردو کی خدمت ہمارا حق ہے آپ کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو کے بعض اداروں نے اچھا کام بھی کیا ہے مگر کس نے کیا کیا ہے کیا نہیں کیا یہ مجھ سے نہ پوچھیئے ؎

میں نے ہر اک کا کام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

اردو کے غیر سرکاری اداروں میں جیسے کہ خود حلقہ اربابِ ذوق اور اسی قسم کی بیسیوں انجمنیں ان میں ایک حد تک کام کا شوق ضرور پایا جاتا ہے اور غالباً یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اردو زبان محض چند انسانوں کی انفرادی کوشش اور محبت ہی کی وجہ سے زندہ بھی ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ سوچنے کا مقام ہے کہ کیا ہمارے ادارے سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، پرائیویٹ ہوں یا پبلک اردو کے لئے وہ کچھ کر پاتے ہیں جو اس زبان کے لئے کیا جانا چاہیئے یا نہیں۔

اردو اداروں کے خلاف مقامی زبانوں کے کارکنوں میں ایک شوق اور ایک جذبہ نظر آتا ہے جو بلاشبہ تعریف کا مستحق ہے۔ مقامی زبانوں کے اداروں نے جو کام کیا ہے وہ بحیثیت مجموعی اردو کے اداروں کے مقابلے میں زیادہ بھی ہے اور وقیع بھی۔ رہی انگریزی تو اس کا وجود اب تک ناگزیر سمجھا گیا ہے اور ہے بھی اور اس کی تعلیم اور تدریس کے لئے نہ صرف ہمارے اپنے اسکولوں اور کالجوں میں سہولتیں مہیا ہیں۔ بلکہ ہماری امداد کے لئے برٹش کونسل کے ادارے بھی ملک میں جا بجا موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں۔

اگر اردو کی یہی حالت کچھ دیر رہی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اردو بنگالی اور پاکستان کی مختلف مقامی زبانوں سے پیچھے رہ جائے اور ممکن ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہم لوگ یہ بھول ہی جائیں کہ اردو بھی کسی زبان کا نام تھا۔

اگر آپ چاہتے ہیں اور ہم میں سے کون ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ اردو کی ترقی ہو اور یہ زبان جو ہماری تاریخ اور ثقافت
، سرمایہ دار ہے مٹنے نہ پائے تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے ۔

میں گزارش کروں گا کہ اول تو ہمیں ان تینوں اسباب کو دور کرنا چاہیئے ۔ سب سے پہلے ہمیں اردو کو سیاست سے
لگ کر دینا چاہیئے یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں خود زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے اور اب کہ یہ مغربی
کستان کی سرکاری زبان قرار دی جا چکی ہے ۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اسے سرکاری زبان بننے میں مدد دیں ۔ اس کے لئے سب سے
ہلے یہ ضروری ہے کہ ہم منفیت کے جذبے کو دل سے نکال دیں ہمیں کسی اور زبان سے بغض و عناد کی ضرورت نہیں ۔ جہاں تک انگریزی
تعلق ہے اس کے اردو پر بے شمار احسانات ہیں ۔ اردو زبان زیادہ تر انگریزی عملداری ہی میں پھلی پھولی ہے ، ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا
ہنی کو ہمارے ہاں تجارت کی اجازت ملی اور یہی زمانہ تقریباً اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ
ہے انگریزی سے جو ادب ترجمے اور تصنیف کے ذریعے اردو میں منتقل ہوا وہ گراں بہا ہے ۔ آج انگریزی زبان دنیا کی سب
ے بڑی زبان ہے تقریباً ہر جگہ بولی جاتی ہے ۔ موجودہ زمانے کی سائنس ، فلسفہ ، تاریخ انگریزی میں موجود ہے اور ترجموں کے
ریعے دنیا کی دوسری زبانوں کا ادب بھی ۔ ہم انگریزی سے تعلق توڑیں گے تو ہمیں کوئی اور ایسا ذریعہ تلاش کرنا پڑے گا جو ہمیں
ن علوم و فنون کی روز افزوں ترقی سے باخبر رکھے ۔ ہم انگریزی کو چھوڑ کر کسی دوسری زبان کو فوراً نہیں اپنا سکتے ۔ ایک بنی بنائی
رت کو ڈھا دینا آسان ہے مگر نئی عمارت بنانا آسان نہیں ۔ اگر ہم انگریزی کی مخالفت چھوڑ دیں تو اس سے نہ صرف اردو
کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔ بلکہ اس کا فائدہ ہے ۔ یہ کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اردو کی ترویج میں کوشش نہ کریں اور اسے
کولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم نہ بنائیں ۔ ہرگز نہیں ۔ بنائیں اور ضرور بنائیں مگر یہ کام ایک منظم منصوبے
تحت ہونا چاہیئے ۔ محض جذباتی نعرہ بازی سے کام نہیں بنے گا ذریعہ تعلیم ہی کو لیجیئے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے
ہلے بچوں کی ابتدائی مدارس میں اردو کے ذریعے تعلیم دیں اور انگریزی کی تعلیم بھی اردو ہی میں ہو ۔ اس کے بعد ثانوی مدارس
کے بعد کالج اور اس کے بعد یونیورسٹیاں ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں بھی ہم اردو کو ذریعہ بنانا چاہیں پہلے اردو میں صحیح اور موزوں
م کی درسی کتب کی تصنیف و طباعت کا بندوبست کریں اور اساتذہ کا بھی ۔ استاد اور نصاب کے بغیر اردو کو ذریعہ تعلیم قرار
بنا اردو سے مذاق کرنا ہے ۔

رہیں مقامی زبانیں ان سے عناد رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہونا ہی چاہیئے اردو کو تو ان زبانوں سے استفادہ
ہئے اور ان زبانوں کو اردو سے اگر مغربی پاکستان میں ایسے ایسے پتھر ، دھاتیں ، پھول پودے اور جانور موجود ہیں جن کے لئے
دو میں بنائے بنائے الفاظ نہیں ملتے تو ہمیں مقامی ناموں ہی کو اختیار کر لینا چاہیئے ۔ اس کے علاوہ اگر پشتو پنجابی سندھی ، سرائیکی
۔ بلوچی میں ایسے ایسے الفاظ اور ترکیبیں موجود ہیں ۔ جن میں سے ایک خاص مطلب سادہ طریق سے براہِ راست ادا ہو سکتا ہے
ر اردو میں وہی بات پیچ دے کر کہنی پڑتی ہے تو ایسے الفاظ اور تراکیب کو مناسب تبدیلی کے ساتھ اپنا لینا چاہیئے ۔

مقامی زبانوں کا ادب خصوصاً شاعری اپنے اندر ایسی سادگی خلوص اور تاثیر رکھتی ہے جو اردو کو کم نصیب ہوئی ہے ہمیں چاہیئے کہ ان ذخیروں کو اردو میں منتقل کریں اور اردو کا بیش بہا ادب ان زبانوں میں منتقل ہوتا کہ ہر طریقے سے اردو اور مقامی زبانوں کا آپس میں ملاپ بڑھے اور وہ بیگانگی جو ان دونوں میں ایک حد تک پیدا ہوچکی ہے دور ہو۔ ادبی تراجم کے سلسلے میں ایک حد تک کام شروع ہوچکا ہے۔ مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اب اردو اور بنگالی کے باہمی تعلق کو لیجیئے اگر ہم اپنے دل میں یہ خیال بٹھالیں کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر الگ ہیں کہ ان کا آپس میں ملاپ نہیں ہوسکتا ہے تو اس قدر ناانصافی نہ اردو سے کی جاسکتی ہے اور نہ بنگالی سے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سندھی اور پنجابی کی طرح بنگالی بھی دو طرح کی ہے ایک وہ جیسے مسلمان بولتے ہیں دوسری وہ جو خالص ہندوؤں کی بولی ہے۔ مجھے اس اختلاف کا احساس پہلے پہل آج سے تینتیس (۳۳) برس پہلے ہوا جب میرے ایک بنگالی ہندو دوست نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ قاضی نذر الاسلام نے " ماتا" اور " پتا" کے الفاظ کی بجائے " آبا" اور " اماں" استعمال کرکے بنگالی زبان کو خراب کیا ہے۔ بہرحال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈھاکے کی بنگالی روایت کلکتے کی روایت سے مختلف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا انجمن ترقی اردو کراچی نے ایک فہرست ایسے الفاظ کی مرتب کرنی چاہی جو اردو اور بنگالی میں مشترک ہیں۔ چنانچہ تقریباً چار ہزار الفاظ پر مشتمل ایک فہرست انھوں نے چھاپ بھی دی ہے یہ فہرست مکمل نہیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک اور فہرست بھی تیار کی جارہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں آج بھی حالت یہ ہے کہ وہاں اردو کے سمجھنے والے مغربی پاکستان میں بنگالی سمجھنے والوں کی نسبت بدرجہا زیادہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم مغربی پاکستانیوں کو چاہیئے کہ زیادہ بنگالی سیکھیں اس سے مشرقی پاکستان میں بھی اردو کی زندگی بڑھے گی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں کے ذریعے سے اسی سلسلے میں مفید کام ہورہا ہے۔ تھوڑے بہت ترجمے بھی بنگالی سے اردو اور اردو سے بنگالی میں ہوچکے ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے ملاپ کا ایک اور ذریعہ مشاعرے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اردو کے مشاعروں کو مشرقی پاکستان میں فروغ دیں اور ان میں خاص طور پر ان شعراء کو دعوت دی جائے جو اپنے کلام کو ترنم کے ساتھ سناتے ہیں۔

اب اس کے بعد اردو کے اداروں کی بات آتی ہے۔ ان کے لئے دعا اور دوا دونوں ضروری ہیں مگر میں اس وقت حلقہ ارباب ذوق کے سوا کسی اور ادارے سے خطاب نہیں کروں گا۔ اس حلقے نے پاکستان میں اردو زبان اور ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ بیس سال سے یہ ادارہ جہاں جہاں موجود ہے وہاں باقاعدگی سے ہفتے میں ایک مرتبہ جلسہ منعقد کررہا ہے اور اس میں افسانے، ادبی مضامین اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ شاعرانہ افسانوی اور تنقیدی ادب کو اس ادارے کے ذریعے سے یقیناً فروغ ہوا ہے۔

بلکہ اس ادارے نے اس سے آگے بڑھ کر اردو کو علمی زبان بنانے میں بھی مدد دی ہے۔ لیکن ابھی بہت کام باقی ہے۔ میری رائے

میں وہ وقت آگیا ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق اب کوئی مستقل کام اپنے ہاتھ میں لے، ہر سال حلقے کی طرف سے بہترین اردو نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا رہا ہے اور "نئی تحریریں" کے عنوان سے نظم و نثر کا انتخاب بھی۔ یہ بہت اچھی مثال تھی ایسا ہو سکتا ہے کہ حلقہ اپنی مختلف شاخوں کی مدد سے اردو میں "پیلگریو گولڈن ٹریژری" کی قسم کی تالیف مرتب کرے جس میں اردو شاعری کا بہترین سرمایہ دو اڑھائی سو صفحے کی کتاب میں یک جا کر دیا جائے۔ اسی طرح اردو کے بہترین افسانوں اور دوسرے ادب کا انتخاب بھی ہو جانا چاہیئے میں دیکھتا ہوں کہ آج کل کلاسیکی ادب سے بے پروائی کا ایک رجحان چل نکلا ہے میں سمجھتا ہوں اس کا تدارک ہونا چاہیئے ماضی کے جائزے کے بغیر حال اور مستقبل کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ یہاں بھی ہمیں منفیت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ بت شکنی اچھی چیز ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہیں وہ اکثر "بت بدل" سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ایک بت توڑا تو اس کی جگہ ایک دوسرا بت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہمارے زمانے میں انسانوں کے بڑے بڑے گروہ جنھوں نے بزعمِ خویش خدا کی پرستش ترک کر دی ہوئی ہے، مرے ہوئے انسانوں کو پوجنے لگے ہیں۔ کہیں یہی حال ہمارے ادبی نونہالوں کا تو نہیں ہے۔ میں کیا کہوں گا وہ خود ہی سوچیں۔

ایک اور تجویز جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کے لئے قاعدے اور پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابیں تصنیف کی جائیں، اور یہ کام حلقہ اپنے ذمے لے۔ آج کل بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان میں سے اکثر بے کار ہیں، یہاں حلقے کی قیادت اور مدد دوررس اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے ان سب باتوں پر پیسہ خرچ ہوگا۔ اور حلقہ اصولاً کسی سے مالی امداد لینے کے حق میں نہیں ہے۔ میں عرض کروں گا کہ اگر ہم اپنے اصول کو توڑنا نہیں چاہتے تو جتنا تھوڑا بہت پیسہ ہم آپس میں چندہ کر کے جمع کر سکتے ہیں اسی سے کام چلائیں۔ اس سلسلے میں میں حلقے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی طرف سے ایک سو ایک (۱۰۱) روپیہ کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پیسے کی ضرورت اتنی نہیں ہوگی جتنا کہ سمجھتے ہیں۔

آخر میں مجھے ایک بات کو دہرانا ہے جو پہلے کہہ چکا ہوں، اور وہ ہے اردو کو تحریک کے طور پر چلانا محض اربابِ ذوق کا کام نہیں اس کے لئے اربابِ شوق کی ضرورت ہے اور میں اپنے حلقے کے ہم کاروں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے ذوق کو شوق میں بدل دیں۔ اگر ہم لوگ چاہتے ہیں کہ یہ اردو زبان جس سے پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے پھلے پھولے اور آگے بڑھے تو اس کی پرورش کے لئے محض ادبی خانقاہیں کافی نہیں اس کے لئے میدانِ عمل میں آنے کی ضرورت ہے۔ اگر حلقۂ اربابِ ذوق کا ہر رکن یہ سمجھ لے کہ اسے اردو کے تحفظ، بقا اور فروغ کے لئے کام کرنا ہے تو یہ ادارہ ہی اردو کو ایک تحریک کی طرح چلا سکتا ہے۔ یہ اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ادارے بھی اسی راستے پر چل نکلیں گے۔ یہ تحریک مختلف طریقوں سے چلائی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جب ہم ایک دوسرے کو نجی خطوط لکھیں تو اردو میں لکھنے کی کوشش کریں۔ ایک دوسرے سے گفتگو کریں تو حتی المقدور اردو میں کریں اور جب اردو میں کریں تو اس میں تا در امکان انگریزی کے لفظ نہ آنے دیں۔ انگریزی اردو کی کھچڑی نہ پکائیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہ ادارہ حلقہ اربابِ ذوق تعلیم بالغاں میں شامل ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کا ہنڈی کا حلقہ ہی اٹھ کر ساری قوم کو تعلیم یافتہ بنا دے۔ میری

توقع صرف یہ ہے کہ شہر کے کسی ایک محلے میں آپ کچھ لوگ کام شروع کر دیں، تاکہ تعلیم بھی آگے بڑھے اور اردو کا بھی کام چلے آج ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ خود ہمارے محترم صدرِ مملکت نے ایک مخصوص عرصہ اس کام کے لئے متعین کیا ہے کہ اس عرصے میں قوم کا ہر فرد بچہ، بوڑھا جوان تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے، اس کام میں آپ ہاتھ بٹائیں گے تو اس سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے۔

انجمن کی مطبوعات

پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری	از بابائے اردو	۵-۵۰ روپے
وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	۷-۰۰ "
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
کیفیہ	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	۴-۵۰ "
سید احمد خاں، حالات وافکار	از بابائے اردو	۴-۰۰ "
غالب، فکر وفن	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
تلخیص الاردو	(رسالہ "اردو" کا انتخاب)	۵-۵۰ "
مقالات گارساں دتاسی حصہ اوّل	گارساں دتاسی	۱۰-۰۰ "
اردو تھیٹر (تین جلدوں میں)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی - قیمت فی جلد	۷-۰۰ "
سعادت یار خاں رنگین (حالات و کلام)	ڈاکٹر صابر علی خاں	۵-۷۰ "
محمد حسین آزاد (جلد اوّل - حالات)	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۸-۰۰ "
محمد حسین آزاد (جلد دوم) ادبی کارنامے	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵-۰۰ "
جلال لکھنوی (حالات وانتخاب کلام)	ڈاکٹر محمد حسن	۳-۰۰ "
سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۶-۵۰ "
سودا (حالات اور تبصرہ بر کلام)	شیخ چاند مرحوم	۷-۰۰ "
نیا ادب	پنڈت کشن پرشاد کول	۴-۵۰ "
آرٹ ان اردو پوئٹری (انگریزی)	شہاب الدین رحمت اللہ	۶-۷۰ "
فن شاعری (بوطیقا)	ارسطو مترجم پروفیسر عزیز احمد	۲-۵۰ "

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو - بابائے اردو روڈ - کراچی ۱

محمد عبداللہ قریشی

معاصر شعرا اقبال کی نظر میں

اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ عالم انسانی کے مہر جہاں تاب، موجودہ دنیا کے عظیم ترین مفکر اور الہام نوا شاعر تھے۔ وہ ان شاعروں میں نہ تھے جو زندگی سے بس لطف اُٹھاتے اور اس کے گیت گاتے ہیں، بلکہ وہ ان مسیحا نفسوں میں تھے جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں ان کے حیات افروز پیغام نے دلوں کو گرمایا، روحوں کو تڑپایا، احساس کمتری کو مٹایا، حوصلوں میں ابھار پیدا کیا۔ خودی اور خودداری کے جذبے کو استقلال و استحکام بخشا اور دماغوں میں رفعت و بلندی پیدا کی۔ یہاں تک کہ قوم کی فطرت بدل گئی اور وہ باوقار زندگی کی سرحد پر جا کھڑی ہوئی۔ اقبال فرماتے تھے۔

> "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ حالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِّ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں۔ ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے۔"
>
> (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۰۸)

شاعری کیسی ہونی چاہیئے۔ اور کیسی نہ ہونی چاہیئے؟ اس سوال کو اقبال نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دو واقعے بیان کر کے اس طرح حل کیا ہے کہ ایک موقعہ پر حضور نے امرا القیس کے شعر سن کر فرمایا کہ وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے، لیکن جہنم کے مرحلوں میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔ دوسرے موقع پر عنترہ کا ایک شعر سن کر اس سے ملنے کا شوق ظاہر فرمایا۔ امرا القیس کی شاعری میں شراب ارغوانی کے دور، حسن و عشق کی ہوش ربا داستانوں اور جان گداز جذبوں۔ آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں، جو قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈال کر ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ بخلاف اس کے عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر تھا۔ جس کا مطلب

یہ تھا کہ " میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کیں تاکہ میں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔ اس سے اقبالؔ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :-

" ہر وہ استعداد جو مبدا فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ میں بخشی گئی ہے، ایک مقصد وحید اور غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو ہر انسانی صنعت اس غایت آخرین کے تابع اور مطیع ہونی چاہئے۔ اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہئے۔ کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہی پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا، اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقا کیا ہونی چاہئے۔"

شعر کے سلسلے میں اقبالؔ کی پسند اور ناپسند کا معیار یہی ہے۔ اس اصول کے ہاتھ آجانے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبالؔ جیسے عظیم شاعر نے اپنے ہم عصر شاعروں میں کس کس کے متعلق کیا کچھ کہا۔ کن اوصاف کی بنا پر کیا رائے قائم کی۔ اور ان کی خوبیوں کے اعتراف میں کتنی عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔

امیر مینائی

اقبالؔ اگرچہ شاعری میں حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے، تاہم وہ منشی امیر احمد امیرؔ مینائی مرحوم اور ان کے کمال شاعری کے بھی بہت معترف تھے۔ ان کی تصانیف اور شعری تخلیقات میں دیوان "صنم خانۂ عشق" بہت مشہور ہے۔ اس کی نسبت اقبالؔ نے یہ شعر کہا ہے ؎

عجیب شے ہے "صنم خانۂ امیر" اقبالؔ
میں بت پرست ہوں رکھدی وہیں جبیں میں نے

امیرؔ مینائی کا انتقال ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد دکن میں ہوا۔ اقبالؔ کا یہ شعر ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیرؔ
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیرؔ

اقبال نے قرآن مجید کی سورہ شعرا سے مرحوم کی تاریخ وفات بھی نکالی جواب تک یادگار ہے۔

لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْن

۱۳۱۸ھ

اقبال کا ارادہ امیر مرحوم کی زندگی اور شاعری پر ایک مضمون انگریزی میں لکھنے کا بھی تھا۔ اسے وہ ولایت کے کسی پرچے میں چھپوا کر مشرق کے اس شاعر کی عظمتوں کا اعتراف مغرب والوں سے کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء کے ہفتہ وار اخبار "پنجۂ فولاد" میں جو منشی محمد الدین فوق کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اقبال کا ایک مراسلہ میری نظر سے گذرا ہے۔ جس کا خلاصہ متن یہ ہے :-

"ماہ رواں کے کسی اخبار میں، میں نے پڑھا تھا کہ فن سخن کے استاد اور ملک نظم کے بادشاہ حضرت امیر مینائی کی لائف ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ راقم مضمون نے جناب امیر مرحوم کے اکثر تلامذہ اور بالخصوص حضرت جلیل، ریاض، مضطر، کوثر، عابد اور ان کے خلف ارشد حضرت اختر وغیرہ کو متوجہ کیا ہے کہ ایسا شاعر بے نظیر اور ان کی لائف اب تک نہ لکھی جائے...... حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک قسم کی لے پائی جاتی ہے، جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ آہ ایسے بے نظیر شخص کے حالات، جو اصل معنوں میں تلامیذ الرحمٰن کا مستحق ہو، ابھی تک گمنامی میں پڑے رہیں۔ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؛ اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی ہی میں اس کی کئی سوانح عمریاں نکل جاتیں..... میرا ایک عرصہ سے خیال تھا کہ حضرت امیر کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلمبند کروں مگر اب امیر مرحوم کی لائف کے متعلق ایک تازہ مضمون دیکھ کر پھر امنگ آئی کہ جس طرح ہو میں اپنے کام کو پورا کروں اور بہت جلد..... امید ہے کہ حضرت امیر کے نام لیوا اور ان کے تلامذہ مجھے امداد دے کر ممنون فرمائیں گے۔"

داغ دہلوی

فصیح الملک نواب میرزا داغ دہلوی غزل گو شعرا کے امام مانے جاتے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دہلی سے نکل کر رامپور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے دربار میں رہے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں ۱۸۹۱ء میں میر محبوب علی خاں نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا۔

وہیں ۱۴ر فروری ۱۹۰۵ء کو ۷۴ برس کی عمر میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ ان کے سینکڑوں شاگردوں میں بعضوں نے بڑا نام پایا۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کو بھی ان کی شاگردی پر بڑا ناز تھا۔ بعض غزلوں کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

حضرت داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں   گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبال

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

استاد کے انتقال پر "نواب میرزا داغ" یعنی شاعر کے نام ہی سے فی البدیہہ تاریخ بھی نکالی اور پھر وہ غیر فانی نظم کہی جو بانگ درا میں موجود ہے۔ اس کا ایک ایک شعر تاثیر اور حقیقت نگاری کا لاجواب نمونہ ہے۔ داغ کے کمالات کا اظہار اس سے بہتر شاید ہی کسی نے کیا ہو ؎

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے   مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت   ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا حسن و عشق کی تصویر کون ؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون ؟

ظہیر دہلوی

راقم الدولہ سید ظہیر الدین حسین دہلوی شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد اور داغ دہلوی کے خواجہ تاش تھے۔ اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کی روایات ان کے دم سے زندہ تھیں۔ پرانی شاعری کی سب رونق ان کے کلام میں موجود تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات میں کتاب "داستان غدر" لکھی ہے۔ آخری عمر میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۹ر مارچ ۱۹۱۱ء کو انتقال فرمایا۔ داغ کے تمام شاگرد انھیں اپنے استاد کی طرح واجب التعظیم جانتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی مدیر اصلاح سخن، مولوی ظفر علی خاں مدیر زمیندار، میر جالب دہلوی جائنٹ ایڈیٹر پیسہ اخبار، منشی محمد الدین فوق

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوای او بجانہا افگند شورے کہ می دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

کسی دوسرے موقعہ پر یہ قطعہ بھی کہا ؎

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دگر او را نمی از اشک سحر داد
حالی ز نواہائی جگر سوز نیا سود
تا لالۂ شبنم زدہ ما داغ جگر داد

جسٹس میاں شاہدین ہمایوں

عدالت عالیہ لاہور کے چیف جج سر میاں محمد شاہدین ہمایوں مرحوم اردو کے نہایت اچھے شاعر اور اپنے عہد میں علم و فضل کے پیکر مانے جاتے تھے۔ ہمایوں نے اپنے کلام میں اقبال کا اور اقبال نے اپنے اشعار میں کئی جگہ ہمایوں کا ذکر کیا ہے اور علامہ فصیح تک کہہ دیا ہے۔ ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو ؎

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لئے

بانگ درا میں ہمایوں پر اقبال کی نظم یقیناً ان کی بہترین نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس کے چند شعروں میں سبھی کچھ کہہ دیا گیا ہے ؎

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی	تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تن خاکی نزار و دردمند	تھی ستارے کی طرح روشن تری طبع بلند
کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا	شعلۂ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا
موت کی لیکن دل دانا کو کچھ پروا نہیں	شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

۲ر جولائی ۱۹۱۸ء کو ہمایوں کا انتقال ہوا تو اقبال نے یہ شعر ان کے لوح مزار کے لئے تجویز کیا ؎

دوش برخاک ہمایوں بلبلے نالید و گفت

اندریں ویرانہ ما ہم آشنائے داشتیم

مگر اس سے کوئی تاریخ برآمد نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے بعد میں اقبال نے دو قطعے کہے جو ہمایوں کی قبر پر کندہ ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ یہ ہے ؎

در گلستان دہر ہمایوں نکتہ سنج آمد مثال شبنم و چوں بوئی گل رمید

می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت علامہ فصیح زہر چار سو شنید

اس میں صفت یہ ہے کہ "علامہ فصیح" کے اعداد (۳۳۴) کو چار گنا کرنے سے ۱۳۳۶ھ مطلوب تاریخ نکلتی ہے۔

اکبر الہ آبادی

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اپنی طرز کے بے مثال شاعر تھے۔ وہ اپنے عصر کے حالات سے متاثر ہو کر ملک و ملت کی صلاح و فلاح اور ترقی و عروج کے خواہاں تھے۔ اپنے اشعار سے خوب کام لیتے تھے۔ ان کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھی۔ اقبال ان کو اپنا پیر و مرشد اور رہبر سمجھتے تھے۔ ایک دو مرتبہ ان سے ملنے الہ آباد بھی گئے تھے۔ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ جس میں اقبال دل کھول کر کلام اکبر کی داد دیتے تھے۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں :-

"میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنا دل چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے ؎

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے

ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے ۔ (اقبال نامہ حصہ دوم ۳۵-۳۴)

حضرت اکبر بھی اقبال کو اپنا صحیح جانشین قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے ۳ مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں اقبال کو تحریر فرماتے ہیں :-

"میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا۔ اب شکستہ حال کیا، ہمیشہ دل کے لئے شکستہ حالی اچھی رہتی ہے۔ آب رواں۔ املی کا درخت۔ قمری کی آواز۔ جنگل کا سماں، مسجد کا صحن

مدیر کشمیری میگزین اور ڈاکٹر اقبال نے باہم مشورہ کرکے ایک ماتمی جلسہ ۲۳ اپریل ۱۹۱۱ء کو لاہور میں منعقد کیا، جس کی صدارت کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:۔

" میں گزشتہ سال حیدر آباد دکن گیا تو یہ ضروری بات تھی کہ میں وہاں کے اہل کمال سے بھی ملتا۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے ہاں میری دعوت ہوئی۔ وہیں مولانا ظہیر بھی تشریف رکھتے تھے مولانا نے مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی، مگر سنانے سے زیادہ مجھے یہ شوق تھا کہ مولانا کی زبان سے کوئی شعر سنوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا۔ حضرت جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سن لوں گا اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور فرمایا اور یہ شعر سنایا۔

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو

ایک آدھ شعر اور بھی سنایا تھا مگر وہ یاد نہیں رہا۔ مولانا ظہیر اس وقت بہت ضعیف و ناتواں تھے اور اونچا سنتے تھے۔ ان کی ہستی تبرک تھی۔"

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

خواجہ عزیز الدین عزیز پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ اقبال کے کشمیری ہموطن اور فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں مثنوی ید بیضا، قیصر نامہ، اورنگ خسروی اور ہفت بند عزیزی بہت مشہور ہیں۔ وہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں ان کے فرزند خواجہ وصی الدین ڈپٹی کلکٹر ریٹائرڈ نے کلیات عزیز طبع کراکے اس کا ایک نسخہ حضرت علامہ کی خدمت میں ارسال کیا۔ اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ۹ رجون ۱۹۳۱ء کو لکھا:۔

" خواجہ عزیز مرحوم فارسی ادبیات کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے عہد سے ہوئی۔ افسوس وہ دور ہندوستان میں ان کی ذات پر ختم ہوا۔ ایرانی تخیل نظم کی شاہراہوں کی چھوڑ کر اب زیادہ تر نثر میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔ شعرائے متاخرین میں قاآنی کا آوازہ بہت بلند ہوا اور اب تک بلند ہے، لیکن خواجہ عزیز مرحوم کے قصائد و مخمسات جو انھوں نے قاآنی کی زمینوں میں لکھے ہیں، وہ فارسی زبان کی موسیقیت اور خواجہ مرحوم کی اس زبان پر قدرت کا بین ثبوت ہیں۔ مثلاً

سحرگہاں بیاد حق زطائران فرق فرق ۔۔۔ غزل سرابداں نسق کہ کودکان ہم سبق

شفیق لعلگوں وشق چناں کہ در افق شفق　　شگفتہ گل ورق ورق بسعی ابر در عرق

بہر ورق طبق طبق گہر کند نثار ہا

غزل میں ان کی نظر بیشتر روحانی حقائق پر رہتی ہے اور ان حقائق کو وہ نہایت آسانی اور لطافت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً

دو غنچہ ہست دو عالم زگلشن صنعش　　یکی شگفتہ یکی ناشگفتہ است ہنوز

زکو تر آن طرف است آنچو می مقصد تو

عنان بجانب ناب از رہ سراب انداز

برآز پردہ واحوال حبیب و داماں ہیں

تو مہوشی و تماشائیاں کتاں پوشند

رسول ملت منصورم احوالم چہ می پرسی

رسیدستم بہ معراجے کہ نام دیگرش دار است

خواجہ عزیز کے اس شعر سے ایک اور ہندی شاعر کا شعر یاد آگیا جس کے لطف سے میں آپ کو محروم نہیں رکھنا چاہتا ؎

انا الحق گفتن منصور تا دیلے نمی خواہد

گدا گم می کند خود را چو دولت می کند پیدا

اسی طرح خواجہ مرحوم کے یہ شعر بھی حقائق سے لبریز ہیں ؎

ہنوز لوح و قلم بود در سواد عدم　　کہ نقش مہر تو بر لوح دل نشست مرا

نشاط وصل تو محروم داردم از وصل

کہ در کنار چہ آئی ز خود کنارہ کنم

یہ فیض ظہوری اور نظیری کا نہیں بلکہ کلام الٰہی کا فیض ہے اور خواجہ مرحوم کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

کے از ظہوری و ز نظیری رسد عزیز

فیضے کہ از کلام الٰہی بمار سید

(روزنامہ انقلاب لاہور ۱۶ / اگست ۱۹۳۱ء)

شبلی و حالی

مولانا شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالی کے علمی، تاریخی اور شعری کارناموں سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں۔ دونوں بزرگ ایک مہینہ اور بارہ دن کے وقفے سے آگے پیچھے، مسلمان قوم کو روتا پیٹتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا شبلی ١٨ نومبر کو اور مولانا حالی ٣١ دسمبر ١٩١٤ء کو فوت ہوئے۔ اقبال نے ان دونوں بزرگوں کے انتقال پر ایک قطعہ لکھا، جو "شبلی و حالی" کے عنوان سے بانگ درا میں موجود ہے۔ اس میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تو باغ کے پرانے رازداروں سے مل کر پوچھا کہ تیرے باغ میں خزاں نے کیوں چھاؤنی چھائی ہے؟ مسلمان اقبال کی بات سن کر بے تاب ہو گیا اور غمگین ہو کر بولا کہ جب رازدار ہی نہ رہے تو پوچھا کس سے جائے؟

مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا　　غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد
کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں　　اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار　　سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں　　حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد"

مولانا حالی سے اقبال کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کے کلام میں جو خلوص، درد اور سوز و گداز پایا جاتا تھا۔ وہ اقبال کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ ١٩٠٤ء میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر جب اقبال نے اپنی نظم "تصویر درد" پڑھ کر سنائی تو مولانا حالی نے ایک شعر پسند کر کے انجمن کو دس روپیہ کا نوٹ عطا فرمایا۔ اور اس طرح شاعر کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن جب مولانا حالی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو ضعف پیری کے سبب ان کی نحیف آواز سامعین تک نہ پہنچ سکی۔ اس مشکل کو اقبال نے حل کیا۔ وہ خدائے سخن مولانا حالی کی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو پہلے یہ رباعی فی البدیہہ کہی پھر مولانا کی نظم سنائی ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی　　معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا　　نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

١٩٣٥ء میں مولانا حالی کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات میں شریک ہو کے اقبال نے نواب صاحب بھوپال کو مخاطب کر کے مولانا کو اس طرح خراج عقیدت ادا کیا۔

بہت زیادہ دلکش ہے، نصیب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزو مند ہوں ؎

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو

نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ درد سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بارِ غم جو میرے دل پر مستولی تھا۔ آپ نے اٹھالیا۔ وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن تراشوا دی۔ یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں اور آپ ماشاء اللہ ابھی کم عمر ہیں۔ آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ سوسائٹی اچھی ہو یا بری خواہ مخواہ اس کا ممبر ہو کر حتی الوسع زندگی کو شیریں کرنا ہے۔ میں سیر ہو چکا ہوں۔ صورت و معنی میں ہر طرف تبدیلی پاتا ہوں۔ کہیں صورت باقی ہے تو معنی ندارد۔ کہیں کچھ نا صاف معنی ہیں تو صورت مکروہ۔ نہایت کم ہے کہ صورت و معنی کا وہی نبوی سانچہ ہو۔ یقیناً زمانہ بدلتا رہتا ہے سازماً بساز صحیح ہے لیکن بے ضرورت با زمانہ بساز کیوں؟ کم از کم یہ کہ مجھ میں یہ قابلیت نہ رہی کہ سوسائٹی میں خوش رہ سکوں۔ میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ آپ کبھی ملیں تو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہوگی لیکن آپ کو بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی .... خیر جو کچھ ہوا اب آپ کے سپرد چارج ہے۔ ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت مول لینے پر مستعد ہیں۔ آپ کا مصرع

درگرہ ہنگامہ داری چو سپند "

ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔"

اس روحانی تربیت سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ اجلاس میں حضرت اکبر کے رنگ میں چند ظریفانہ قطعات پڑھے جو "اکبری اقبال" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان میں سے چند 'بانگ درا' میں بھی شامل ہیں۔ بعض اہل زبان نے حسب عادت ان پر اعتراضات کئے اور اقبال کو برا بھلا کہا۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۶ رجولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں حضرت اکبر کو لکھا:

"حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے، جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو۔ مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی۔ اس وقت بھی میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال ہیچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہار صداقت ہے۔

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شخص کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو، تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر کہے یا بہ الفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اسی خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے تھے مگر عوام کی جہالت و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لئے سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔"

اسی خط میں اقبالؔ نے حضرت اکبر کے ان اشعار کی داد بھی دی ہے ؎

یار کا حسن سب پہ فائق ہے — واقعی دیکھنے کے لائق ہے

ان مصائب سے کام لے اکبرؔ — غم بڑا مدرک حقائق ہے

اور لکھا ہے کہ "زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے (آخری) مصرع میں مخفی ہے۔"

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۰ ـ ۴۱)

۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں اقبالؔ لکھتے ہیں:۔

"کل خط لکھ چکا ہوں مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں

عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ ہیگل جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصوّر کرتے ہیں اور تخیئل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا، اس کا مقام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔ یا یوں کہئے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے۔

ہیگل لکھتا ہے کہ اصول تناقض، ہستی محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستی مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض، جو ہستی محدود کا خاصہ ہیں۔ گداختہ ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لئے جو مضمون اردو لٹریچر پر مجھے لکھنا ہے۔ اس میں اس شعر کا ضرور ذکر کروں گا۔ اسی رنگ کے فلسفیانہ اشعار اور بھی لکھئے کہ خود بھی لذّت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذّت میں شریک کروں۔" (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۲ ـ ۴۳)

ایک دفعہ حضرت اکبرؔ نے لنگڑا آم تحفتہً بھیجا تو اقبالؔ نے شکریے میں یہ شعر لکھا...... ؎

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

ستمبر ۱۹۲۱ء میں حضرت اکبر کا انتقال ہوا تو اقبال نے اپنے ۱۶ ستمبر کے خط میں مولانا گرامی کو لکھا:-
"اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیات میں کم بلند نہ تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی، پہلی کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لئے ایک تڑپ تھی۔ مگر گزشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے۔ کوئی خط ایسا مشکل سے ہوگا جس میں انھوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔
ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے، زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروس حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے۔
بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ میں نے تو یہ کلیہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ مسلمانان ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں ہے۔"
پھر یہ مرثیہ کہا:-

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر　　　حیا تش بحق بود روشن دلیلے
سر زمرۂ طور معنی کلیمے　　　　　　بہ بت خانہ دور حاضر خلیلے
نوای سحر گاہ او کارواں را　　　　　اذان درای پیام رحیلے
زدہا بر افگندہ لات و عزیٰ　　　　　بجا نہا کشانندۂ سلسبیلے
دماغش ادیب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

اقبال نے ابو المعانی محمد عبدالرحمٰن شاکر مدراسی، لسان العشق مولانا شیخ غلام قادر گرامی، لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، منشی محمد الدین فوق، بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، علامہ محمد حسین عباسی کیفی چڑیا کوٹی، پیرزادہ محمد حسین عارف، مولانا نادر کاکوروی، میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی اور جناب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی دوسرے موقعہ پر پیش کیا جائے گا ؎

زبان زنقطہ فرو ماند و راز من باقی ست　　　بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی ست

سید جاوید اختر

سب رس پر ایک نظر

آج سے چند برس پہلے کی بات ہے کہ ولیؔ دکنی کو اردو شاعری کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اب نئی تحقیق سے یہ بات جھٹلائی جا چکی ہے اور ثابت کیا جا چکا ہے کہ ولیؔ اورنگ آبادی (عہدِ عالمگیر) سے بہت پہلے بھی اردو زبان کے کئی مایہ ناز اور صاحبِ دیوان ہو گزرے ہیں۔ بالکل اسی طرح فضلیؔ کی "کربل کتھا" کو اردو نثر کی اولین کتاب مانا جاتا تھا۔ مگر ہمارے نئے محققین نے انکشاف کیا ہے کہ فضلیؔ سے قبل بھی اردو نثر میں متعدد کتب تصنیف کی گئی تھیں۔ انھیں ابتدائی نثر پارہ کاروں میں "سب رس" کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جسے ملا وجہیؔ کے قلم نے حیاتِ دوام بخشی۔

وجہیؔ، محمد قلی قطب شاہ کے دور کے اردو شعراء میں سب سے بڑا اور ذہین شاعر اور ادیب تھا۔ وہ گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعراء تھا اور اس کے زمانے میں آندھرا دیس میں اتنے ادیب اور شاعر پیدا ہو چکے تھے کہ اس نے زیہ اپنے وطن کے متعلق شعر کہے ہیں۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دراصل قطب شاہی بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں دکنی یعنی قدیم اردو کو پنپنے کے لئے بڑا خوشگوار ماحول ا۔ یہ فرماں روا نہ صرف علم و ہنر کے بڑے مربی تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی بڑے اونچے درجے کے شاعر ہ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰ھ) محمد قطب شاہ (۱۰۳۵ھ) اور عبداللہ قطب شاہ (۱۰۸۳ھ) کے اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ شعراء اور علماء ان بادشاہوں کے دربار کی رونق ہوتے تھے اور شبہ ان ہی کی سرپرستی اور تحریک علم و ادب کی تخلیق کا باعث ہوتی تھی۔ اگر عموماً نہیں تو خصوصاً ضرور۔

چنانچہ ملا وجہیؔ نے "سب رس" بھی عبداللہ قطب شاہ ہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ "سب رس" کے دیباچے میں اس ت کی تصدیق یوں ہوتی ہے۔ "سلطان عبداللہ، ظل اللہ، عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پرور، سکندر، عاشق صاحبِ نظر، دل کے خطرے تے باخبر...... صبا کے وقت بیٹھے تخت، یکایک غیب تے رمز پا کر

دل میں اپنے کچھ لیا کر، وجہی نادر من کوں، دریا دل گوہر سخن کوں، حضور بلائے پان دئے، بہت مان دئے۔ ہور فرمائے کر انسان کے وجود بیچ میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا ناؤں عیاں کرنا، کچھ نشان دھرنا، وجہی ہوگنی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پہ ہات دھریا۔ بھوت بڑا کام اندیشیا، بہت بڑی فکر کریا بلند ہمتی کے باد لتے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا، قدرت کے اسراراں برسایا، پادشاہ کے فرمائے پرچینیا نوی تقطیع بیتیا[۱]"

وجہی نے ۱۰۱۸ھ میں ایک اور کتاب "قطب مشتری" کے نام سے بھی لکھی تھی۔ جس میں اس نے خود بادشاہ کی بھاگ متی کے ساتھ عشق کی داستان استعارے کے پیرائے میں بیان کی ہے۔ یہ مثنوی اپنے دلکش اسلوب اور بلند خیالی کی بدولت قدیم اردو کی بہترین کتابوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وجہی کی ایک اور کتاب "تاج الحقائق" قابلِ دستیاب ہے۔ یہ نثر میں ہے اور اخلاق و تصوّف کے بعض مباحث اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ بہرحال اس موقع پر ہم صرف "سب رس" کے بارے میں کچھ عرض کریں گے"

"سب رس" ملا وجہی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ محمد قلی کے کلیات کی طرح یہ بھی قدیم اردو کی ایک بہت ہی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اگرچہ یہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے مگر وجہی کے دست و قلم نے اس میں وہ جوہر پیدا کر دئے ہیں کہ یہ خورد سال دوسری زبانوں کی کہنہ سال معیاری کتابوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تالیف کو اردو زبان کے ساتھ وہی نسبت ہے جو "مقامات بدیعی" کو عربی کے ساتھ اور "مقامات حمیدی" کو فارسی کے ساتھ ہے[۲]

جب ملا وجہی نے آنکھ کھولی، اس زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں زیادہ تر فارسی زبان کا دور دورہ تھا، اکثر شعراء اور ادباء اسی میں اپنے خیالات کو قلم کی نوک سے لفظوں کی صورت میں نکالتے تھے۔ دکنی زبان میں شعر کہنے والے موجود تو تھے لیکن خال خال اور جو حضرات تھے بھی وہ محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اس طرف رجوع کرتے تھے۔ اس عالم میں یہ وجہی کی بڑی جرأت تھی کہ اس نے اپنی ادبی مہم کے لئے اردو اور صرف اردو کو منتخب کیا۔ اور وہ بھی زیادہ تر نثر میں۔ جس میں نہ کوئی اس کا راہ نما تھا اور نہ پیش رو۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ اردو ان ایام میں صرف بول چال اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ اور اس میں ہر قسم کا ادبی سرمایہ مفقود تھا۔ نثر میں تو خاص طور پر مطلع بالکل صاف تھا۔ ان حالات میں وجہی کا اہلِ ہندوستان کے سامنے ایک دم ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف پیش کرنا، دراصل کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔ وجہی کو بذاتِ خود اپنی اس جدّت طرازی کا مکمل شعور تھا۔ غالباً اسی لئے اس نے قصّہ کی ابتدا کرتے وقت "آغاز داستان۔ زبان ہندوستان" کی بغلی سُرخی قائم کی ہے۔

---

۱ "سب رس" صفحہ نمبر ۸۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم۔ طبع اول۔

۲ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم۔ اورنٹیل کالج میگزین ۱۹۳۳ء

"سب رس" ایک تمثیل ALLEGORY ہے[۱] دنیا کی قریباً قریباً ہر زبان میں تمثیلی قصے ملتے ہیں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس صنف میں طبع آزمائی نہ کی گئی ہو۔ سنسکرت میں "ہت اپدیش" فارسی میں "انوار سہیلی" عربی میں "اخوان الصفا" اور انگریزی میں Happy Prince اور Pilgrim's Progress وغیرہ اس طرز کی مشہور نگارشات ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر قابل بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ جن ممالک میں دیو مالا یعنی علم الاصنام کا رواج رہا ہے۔ وہاں کے ادیبوں کو اس نوع کی داستانیں لکھنے میں بڑی سہولت رہتی ہے مثلاً سنسکرت یا ہندی ادب میں جہاں دولت اور علم کو مجسم کرنے کی ضرورت پڑی وہاں لکشمی اور سرستی کے کردار پیش کر دئے۔ انگریزی اور مغربی دیگر زبانوں کے ادب میں مصنفین نے یونانی دیو مالا (Mythology) سے مدد لی ہے۔ مثلاً اگر عشق کو مجسم اور جاندار بنانا مطلوب ہے تو دیوتا کیوپڈ کی شکل سامنے لے آئے اور اگر حسن کو زندگی بخشنی ہے تو وینس کا کردار لے لیا۔ لیکن اسلامی مملکتوں میں چونکہ بت پرستی خلافِ دین ہے۔ اس لئے مسلمان مصنفوں کو تمثیلیہ قصے تحریر کرتے وقت خاص مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ عشق کو عشق کہیں اور حسن کو حسن، اور کوئی صورت ان کرداروں کو زندہ کرنے کی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قصے میں وہ دلچسپی اور کشمکش (Suspense) موجود نہیں رہتی جو تمثیل کا ایک خاص وصف ہوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلامی ملکوں میں جو تصانیف اس انداز میں لکھی گئی ہیں ان کے کردار غیر دلچسپ اور بے جان پتلے محسوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نام کے ساتھ ہی ان کے پورے کردار کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور پورا ڈرامائی لطف جاتا رہتا ہے۔ "سب رس" میں بھی فنی طور پر یہی خامی موجود ہے کہ اس کے کرداروں کے نام، قصہ کی ڈھال نہیں بنتے۔ اس کے باوجود ملا وجہی نے اپنی کمال چابکدستی اور ذہنی بیداری سے اس داستان کو موثر اور رنگین بنانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم "سب رس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے سے پیشتر اس میں بیان کئے گئے قصہ کو مختصراً درج کر دیں تاکہ بات کرنے اور سمجھانے میں آسانی رہے۔ قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک ملک بنام سیستان تھا جس کا بادشاہ عقل تھا۔ عقل کا ایک بیٹا دل نامی تھا۔ باپ نے اسے تن کا شہر بخش دیا۔ ایک روز دل کے جی میں آبِ حیات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے جاسوس نظر کو اس اہم کام پر مامور کیا۔ نظر وعدہ کر کے تلاشِ آبِ حیات میں نکلا۔ راستہ میں اسے ایک جگہ سے معلوم ہوا کہ عشق بادشاہ کی بیٹی حسن کا ایک باغ رخسار نامی ہے۔ جس میں چشمہ دہن ہے۔ اور اسی چشمہ میں آبِ حیواں ہے۔ نظر آگے بڑھا۔ رقیب سے مقابلہ کرتا ہوا باغ رخسار میں جا پہنچا۔ وہاں وہ گرفتار ہونے ہی لگا تھا کہ خوش اتفاقی سے اس کی ایک بچھڑی

---

[۱] اور بعض ناقدین۔ مثلاً عزیز احمد۔ اسے ناول ثابت کرنے پر مصر ہیں

دی بہن غمزہ، شہزادی حسن کی سہیلی نکل آئی ۔ اس نے نظر کو پناہ دی ۔ اور شہزادے کو بتایا کہ وہ ہیروں کا بہت بڑا پارکھ ہے ۔ حسن کے پاس ایک ہیرا تھا جس میں ایک تصویر تھی ۔ لیکن اس تصویر کو آج تک کوئی شخص نہیں دیکھ سکا نظر نے تصویر دیکھ کر دل کے سراپے سے حسن کو مضطرب کر دیا ۔ شہزادی نے نظر سے درخواست کی کہ وہ اسے فوراً دل سے ملائے ۔ نظر، خیال نامی غلام کو ساتھ لے کر تن مملکت میں پہنچا ۔ خیال مصوّر بھی تھا اس نے اس نے حسن کی ایسی تصویر بنائی کہ دل بے قابو ہو کر اس سے ملنے پہ آمادہ ہوگیا ۔ ابھی وہ تینوں سفر کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ عقل بادشاہ کے وزیر وہم نے روڑا اٹکایا اور بادشاہ کے حکم سے ان تینوں کو قید خانہ میں ڈال دیا ۔ نظر کسی طور فرار ہو کر حسن کے پاس پہنچا ۔ حسن کے باپ عشق نے غمزہ کو نظر کے ساتھ بھیجا تاکہ خیال کو رہائی دلائی جا سکے ۔ ادھر عقل کے دست راست جہد نے اپنے بیٹے توبہ کو بھی چوکنا رہنے کی ہدایت کی ۔ غمزہ اور نظر محصور ہو گئے اور مقابلہ کے بعد انھیں فتح ہوئی ۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ شہر تن کی طرف بڑھے ۔ توبہ نے بادشاہ کو دشمن کی فوج سے خبردار کیا ۔ عقل نے دل کو آزاد کر کے حسن شہزادی کا خیال دماغ سے نکال دینے کا مشورہ دیا ۔ مگر جب وہ نہ مانا تو ایک لشکر حسن کے شہر پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا ۔ اُدھر سے عشق کے سپہ سالار قہر نے جنگ لڑی ۔ چار روز تک گھمسان کا رن پڑا ۔ آخر ہلاک سپاہی کی مدد سے عشق کو کامیابی ہوئی اور عقل میدان جنگ سے بھاگ گیا اور دل صاحب گرفتار ہوئے ۔ بڑے چرکے لگے تھے ۔ لیکن حسن کی سرپرستی نے سب زخم بھر دئے شہزادی حسن نے اپنی ایک سہیلی زلف کی مدد سے دل کو ایک کنوئیں " چاہ ذقن " میں قید رکھا ۔ وہیں سے اسے بالا خانے میں بلا کر حسن نے شراب و شباب کی محفلیں آراستہ کیں ۔ اسی اثناء میں رقیب کی نوجوان بیٹی نمیرہ، جو جادو ٹونے میں بڑی ماہر تھی، اپنے سحر کے زور پر حسن کا روپ دھار کر دل سے ہم آغوش ہوئی ۔ حسن کو پتہ چل گیا اور اس کے اور دل کے مابین تلخی پیدا ہوگئی ۔ بعد ازاں جب نمیرہ نے اقرار گناہ کیا تو یہ تلخی دور ہوئی ۔ اُدھر عقل کی فوج کا سپہ سالار صبر تو شہر ہدایت میں چلا گیا تھا ۔ لیکن ہمت نامی سپاہی عشق بادشاہ سے ملا ۔ اور صلاح صفائی کا خیال ظاہر کیا ۔ عشق نے عقل کو اپنا وزیر بنا لیا اور حسن و دل کی جلد ہی شادی ہوگئی ۔ ایک روز انھیں باغ میں حضرت خضرؑ نظر آئے ۔ دل نے ان کے قدم چومے اور خدا نے اس کو صاحب اولاد کر دیا ۔ یہی قصّہ کا اختتام ہے ۔

جہاں تک حسن و دل کے اس قصّہ کا تعلق ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں ۔ فطرتِ انسانی کے دائرہ میں چند جبلتیں ہیں جن میں سے ایک کو عشق کہتے ہیں ۔ عشق کے بغیر انسان گویا نامکمل ہے ۔ عشق کی دو صورتیں ہیں ۔ مجازی اور حقیقی ۔ عشقِ مجازی ہی درحقیقت عشق حقیقی ہے[1] ۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق کی آویزش اور آمیزش کی

---

[1] اس حقیقت کی تصدیق اکثر صوفیا کی طرح ولی دکنی نے بھی کی ہے ع حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے ۔

داستان انسانی زندگی کے ساتھ ازل سے وابستہ ہے اور اسی داستان کو وجہی نے ایک نئے انداز میں قلم بند کر دیا ہے البتہ قصہ میں جو کردار علامتوں اور استعاروں کا لباس پہن کر جلوہ گر ہوئے ہیں، وہ وجہی کی بیدار مغزی اور فنکارانہ ذہانت کی دلالت کرتے ہیں۔ "سب رس" کا قاری یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ وجہی استعاروں کا ایک جال سا بنتا جاتا ہے اور کیا مجال کہ کہیں ذرا بھی جھول آنے پائے۔

لیکن — ٹھہریئے! قبل اس کے کہ ہم وجہی کی قصہ سازی کی تعریف و توصیف میں دریائے گفتار بہائیں۔ ہمیں "سب رس" کے ماخذ پر غور کر لینا چاہئے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ حسن وعشق کا قصہ انسانی تاریخ کا ایک ایسا اہم باب ہے جو ہر دور میں تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ تو پھر کیا ضرور ہے کہ وجہی سے پہلے اس قصہ کو رقم کرنے کا خیال اور کسی مصنف کو نہ آیا ہو۔ محققین نے اس سلسلہ میں چھان پھٹک اور تلاش و جستجو کی ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "سب رس" کا قصہ ملا وجہی کی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ اس نے مولانا فتاحی[1] کی کتاب "دستور عشاق" یا "حسن و دل" سے خوشہ چینی کی ہے۔ اول الذکر تصنیف ایک مثنوی ہے، جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ اسی کے قصہ کو خود مصنف نے "شبستان خیال" اور "حسن و دل" کے نام سے الگ الگ بھی لکھا۔ قصہ "حسن و دل" بہت مشہور ہوا۔ اس کی نثر مقفٰی اور مسجع ہے اور اس میں صنائع بدائع سے خوب شان پیدا کی گئی ہے۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا یورپ میں تین مرتبہ ترجمہ بھی ہوا۔ پہلی بار ۱۸۰۱ء میں آرتھر برون نے دوسری بار ۱۸۲۹ء میں ولیم پرائس نے اور تیسری مرتبہ ایک جرمن ڈاکٹر روڈالف دوارک نے وی آنا آکادمی سے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ تین ترکی شاعروں نے بھی اس پر طبع آزمائی کی جن کا نام آہی وسن (۱۵۱۷ء) (۲) والی (سولہویں صدی کے آخر میں ہوا) اور (۳) صدقی تھے۔ سوائے صدقی کے سب نے اس قصہ میں بہت کچھ تصرف کیا۔ حتیٰ کہ عہد عالمگیر میں مرزا بیدل نے بھی اس داستان کو بے تکلف نثر میں لکھا۔ ان تمام مصنفوں نے خواہ نثر ہو یا نظم، فتاحی سے خوشہ چینی کی ہے۔ مگر ملا وجہی نے قصہ کی اصل کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ حالانکہ مولانا فتاحی کی "دستور عشاق" یا "حسن و دل" پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے قصہ کی واردات حرف بہ حرف فتاحی سے لی ہے۔ تاہم وجہی "سب رس" کے دیباچے میں یوں تعلی کرتا ہے۔ "غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیاں ہوں۔ دریا ہو کر موتیاں رولیا ہوں" اور "عیسیٰ ہو کر بات کوں جیو دیا ہوں" اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ وجہی کی اپنی ایجاد ہے اور اس کے دماغ کی اپج ہے۔ حالانکہ حقیقت نہیں۔ کیونکہ مولانا فتاحی نے "فرہاد ہو کر، دونوں جہاں تے آزاد ہو کر دانش کے تیشے سوں" یہ پہاڑ اٹھایا ہے نہ کہ وجہی نے۔

مولوی عبدالحق مرحوم کے الفاظ میں "اگر اس (وجہی) کا مطلب یہ ہے کہ قصہ کا یہ نیا ڈھنگ اس کا نکالا ہوا

[1] عہد قدیم کا ایک خراسانی شاعر

ہے تو یہ صریح غلط ہے لیکن اگر اس سے یہ مراد ہے کہ تحریر کا یہ اسلوب اردو زبان میں اس کی ایجاد ہے تو بیشک صحیح ہے۔ لیکن اس سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ وہ بار بار یہ بھی کہتا ہے جو اسے موجد اور رہنما اور استاد نہیں مانتا وہ جاہل، کمینہ اور چور ہے۔"

قطع نظر اس بحث کے "سب رس" کی کل اہمیت اس کے اسلوب کی بنا پر ہے۔ نہ کہ قصہ کی اختراع پر کہ تخلیق کا سہرا تو بہرحال فتاحی ہی کے سر ہے جو مدتوں پہلے فارسی نظم او رنثر دونوں میں خامہ فرسائی کر چکا تھا۔ وجہی نے "سب رس" کو دکنی زبان میں لکھتے ہوئے جو اسلوب نگارش اختیار کیا ہے وہ ہمارے لئے قابل غور ہے۔

عبارت کی آرائش اور قافیہ کی پابندی کے باوجود مصنف سے سلاست کا دامن کہیں نہیں چھوٹنے پایا۔ "سب رس" کے اسلوب کے جو خصائص خود وجہی نے بتائے ہیں ان میں سے اس کے نزدیک اہم ترین بات یہ ہے کہ اس نے نثر میں شعریت کا سا رنگ پیدا کیا ہے۔ "نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر" بیان کا ایسا انداز وضع کیا ہے جس کی بدولت نثر میں شعروں کی سی روانی اور چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔

اگرچہ وجہی اپنے بیان میں رچی ہوئی فارسیت کا رنگ نہیں ابھار سکا۔ جو ولی، میر اور درد کی شاعری اور غالب کی نثر میں ہے۔ تاہم فارسی اسالیب کے بعض نمونے اس کی نثر میں در آئے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ قافیوں کی مدد سے نثری فقرے، شعری سانچوں میں ڈھالنا ہے۔ اردو نثر میں قافیہ بندی کا یہ اہتمام مرزا غالب کے دور تک جاری رہا۔ "سب رس" کے چند نثری اشعار ملاحظہ ہوں :۔

(۱) "فرہاد ہو کر ...... دونوں جہاں تے آزاد ہو کر۔"

(۲) "شراب عاشق ہور معشوق کے دل کے شک دور کرتا ...... شراب دونوں کوں محبت میں چور کرتا۔"

(۳) "غیر کوں دیکھی تخت پر مست ...... دل اس سوں ہم دست ...... موں سوں موں ملائے ہے ...... سینہ سوں سینہ لائے ہے ۔۔ شد کھو رہی ہے ...... سو رہی ہے۔"

لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی ترتیب دی ہوئی "سب رس" کے مقدمے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "قافیے کے اس التزام نے نثر کی نثریت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ ہر فقرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سامنے آتا ہے۔ خیال کے تقاضوں سے نہیں۔ قافیے کے تقاضوں سے اور پھر تمام عبارت شکستہ و ریختہ معلوم ہوتی ہے۔ بیان کا تسلسل قائم نہیں رہتا۔ البتہ شعر کا رنگ شکستہ نمودار ہو کر کچھ مزہ دے جاتا ہے۔"

ہمیں ڈاکٹر عبداللہ کے مندرجہ بالا خیال سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ جہاں تک وجہی کی قافیہ پیمائی کا تعلق ہے اس سے نثر کا حسن نکھارنے میں اور اس میں شعری انداز سمونے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ فقروں کا اختصار تو بلکہ جانے پہچانے الفاظ کے قوافی سے مل کر سرور اور لطافت کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ فقرے کے ٹکڑے گویا

جڑیں ہیں اور خیال ان پر کھڑا ہونے والا درخت۔ دراصل یہ فقرہ بندی آج سے قریباً تین سو سال پہلے کی ہے پہلے دور میں مسجّع اور مقفّیٰ عبارت خوبصورت اور دلپذیر سمجھی جاتی تھی اور آج سادہ اور بے تکلف عبارت مستعمل ہے۔ پہلے اظہار و بیان کو پرکھنے کا اور معیار تھا، اب کچھ اور۔ لیکن تنقید میں صحت مند نظریہ پیش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی چیز کو پرکھتے وقت اس کے زمانہ تخلیق کے معیار کو بھی مدِنظر رکھا جائے۔

البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے، اس وقت کچھ جاندار معلوم ہوتی ہے۔ جب وجہی غیر دلچسپ باتوں کی بے جا تشریح اور توضیح شروع کر دیتا ہے۔ مگر اس کی وجہ فقروں کا ٹوٹنا نہیں بلکہ غیر دلچسپ بات کا پھیلنا ہے بہرحال ملّا وجہی کی لطافتِ نثر سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا۔ اکثر مقامات پر اس کا زورِ قلم علمی و ادبی ذوق رکھنے والے طبقے کو متاثر کئے دیتا ہے۔ مثلاً یہ فقرے ملاحظہ ہوں۔ ایسی مثالیں آپ کو "سب رس" میں متعدد ملیں گی۔

(۱) "دانا کی گھٹ کچھ اور ہے۔ ناداں کی ہٹ کچھ اور ہے۔"

(۲) "منہ میں تے بول نکلیا، پچھیں سو کیا پھر آتا ہے۔ تیر کمان تے چھوٹیا سو کیا سنبھالیا جاتا ہے۔"

اور خاص بات تو یہ ہے کہ وجہی کو مکالمہ نگاری اور کردار نگاری میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ مثلاً حسن کا روپ دیکھئے اس کا قلم کس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔

"حسن نار، اوتار، خوش دیدار، خوش گفتار، خوش رفتار، دیدیاں کا سنگھار، دل کا آدھار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آواز تے قمری کوں کرے شہ مات۔ کنول پھول کے پنکھڑیاں ہات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بال جانو کالے ناگ، گال جانو عشق کی آگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وغیرہ

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے قول کے مطابق وجہی کے فقروں کا خانوں میں بٹنا خیال پر کہاں تک گراں گزرتا ہے۔

غرض کہ یہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ وجہی نے اپنے اندازِ بیان سے اس تمثیل کو بڑی حد تک کامیاب اور جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسے پوری طرح کامیاب نہ بھی کہا جائے تو یہ اس کے اسلوب کی خامی نہیں بلکہ اسلامی ممالک میں تمثیل نگاری کی بعض رکاوٹیں اس کا اصل سبب ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

"سب رس" کی زبان آج سے قریباً تین سو برس پہلے کی ہے کہ جب جہانگیر اور شاہ جہاں کے نام کا سکہ ہندوستان میں رائج تھا۔ اس زبان میں بہت سے الفاظ اور محاورات ایسے بھی ہیں جو اب قطعی متروک ہیں اور خود اہلِ دکن بھی انھیں استعمال نہیں کرتے۔ اور گو اس قدیم زبان کے بعض پرانے محاورات اور الفاظ آج کل ہماری سمجھ سے باہر

ہیں، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وجہی نے "سب رس" کو ضبط تحریر میں لاتے وقت اپنے عہد کی شستہ اور فصیح ترین زبان سے کام لیا۔ اور اس امر کا اظہار خود اس نے اپنے دیباچے میں کیا ہے۔ وجہی نے اپنی زبان کو "دکنی" نہ کہہ کر "ہندی" کے نام سے پکارا ہے۔ چنانچہ قصّہ کی ابتدا اس نقلی سُرخی سے ہوتی ہے "آغاز داستان زبان ہندوستان"۔ سب رس کے عمیق مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے اس کتاب میں عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ بھی بکثرت استعمال کئے ہیں۔ اسلوب کے اس ڈھانچے سے ہم کو زبان کی وہ حالت معلوم ہوتی ہے، جو اب سے تین سو سال پہلے تھی۔ نیز اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا کہ زبان اس وقت ایک انتشاری کیفیت کو خیر باد کہہ کر ایک مرتّب اور منظّم صورت اختیار کر چکی تھی[۱] اور جب ہم وجہی کے ان اسالیب کا موجودہ زبان کے اسالیب سے موازنہ کرتے ہیں تو ان میں بہت معمولی فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) چور پر مور پڑیا (۲) اوّل خویش بعد از درویش (۳) دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پیتا۔

اور بعض روزمرّہ اور محاورات تو آج بھی جوں کے توں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) خالہ کا گھر (۲) کہاں گنگا تیلی اور کہاں راجہ بھوج (۳) دیکھا دیکھی (۴) بھانڈا پھوڑنا (۵) ڈاواں ڈول اور (۶) تین گناہ خدا بھی بخشتا ہے۔ وغیرہ۔

گریمر کے لحاظ سے اس قدیم دکنی یا اردو زبان میں اور موجودہ اردو میں متعدد تغیر و تبدل پائے جاتے ہیں، اور جن میں چند ایک یہ ہیں:۔

(۱) مذکر اور مؤنث کی جمع " اں " سے ہوتی ہے جیسے ہاتھ سے ہاتاں۔ بات سے باتاں وغیرہ

(۲) فاعل اگر مؤنث ہے تو فعل بھی مؤنث ہوگا۔ مثلاً لڑکے نے پانی پیا۔ لڑکی نے پانی پی۔ اس عورت نے کھانا کھائی۔

(۳) فاعل اگر مؤنث جمع ہے تو فعل بھی جمع آئے گا۔ مثلاً "اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دوسرے کوں اپنا حسن دکھلانا گناہ جانتیاں ہیں"

(۴) ایسی جیسی اور جتنی کی جمع ایسیاں، جیسیاں اور جتنیاں آیا ہے۔

(۵) ہائے ملفوظ اکثر درمیان سے غائب ہے۔ مثلاً نہیں کے بجائے نیں اور کہتا کے بجائے کتا۔

(۶) اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کر دیا ہے۔ مثلاً نفع سے نفا۔ طمع سے طما وغیرہ۔

پروفیسر شیرانی نے اپنے عالمانہ مضمون میں یہ وضاحت کی ہے کہ "سب رس" میں ہندوستان کی قریباً تمام

---

[۱] پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔ مضمون اورنٹیل کالج میگزین ۱۹۳۴ء

اہم بولیوں کے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال استعمال کئے گئے ہیں ۔ وجہی دوہرے گوایا الیسے اور کہاوتیں ہندی زبان سے لاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ "سب رس" لسانی لحاظ سے بھی، مگر بیان کی عمارت گری کے لحاظ سے خاص طور پر ، رنگارنگ مواد کی مدد سے تعمیر کی ہوئی عبارت کا اولین نادر نمونہ ہے ۔ اس میں زبان ہی کا نہیں ، بیان کا بھی وسیع تر ہندوستان گیر تصور موجود ہے ۔ یعنی ایک ایسی قوم کے اظہار کا مشترک سانچا جس کے افراد اپنی اپنی جگہ رنگا رنگ بولیاں بولتے ہیں ۔

آخر میں، مضمون ختم کرنے سے پہلے ، میں ملا وجہی کے نظریہ فن کے بارے میں بھی چند سطریں لکھنا چاہتا ہوں "سب رس" اس لحاظ سے بھی ایک مستقل اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے ہمیں وجہی کے، جو آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے کا مصنف تھا ۔ نظریہ فن کی فصاحت ہوتی ہے "سب رس" میں ۔ "درنیت کتاب گوید و در نام کتاب گوید" ___ یا "سبب تالیف کتاب و مدح بادشاہ" کے عنوان سے جو حصہ ہے اس میں وجہی نے اپنے نظریہ فن کا اظہار کیا ہے ۔ جس کی اساس پر ہم اس کے نظریۂ ادب کی تشکیل بھی کر سکتے ہیں ۔ اور اس کی مزید فصاحت "قطب مشتری" میں "در شرح شعر" کے عنوان سے کی گئی ہے ۔

ہمیں "سب رس" میں جو فنی اصول نظر آتے ہیں ۔ وہ زیادہ تر شاعرانہ تعلّی کے سے ہیں ۔ تاہم یہ نظریاتی قدم اردو تنقید کے اصولوں کی تدوین کی اولین سعی ہے ۔ علاوہ ازیں ان اصولوں کا انداز "تجزیاتی" یا "شبہاتی" نہیں بلکہ "یقینی" ہے ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مشرق میں بحث کی ابتدا الیقین سے ہوتی ہے ۔ جبکہ مغرب میں شبہ اور تذبذب سے ۔

وجہی نے اپنے نظریۂ ادب میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ اہم ہونے کے علاوہ بنیادی نوعیت کے حامل بھی ہیں ۔ سب سے پہلا سوال اس نے یہ اُٹھایا ہے کہ ادب کیا ہوتا ہے ؟ دوسرا یہ کہ تخلیق ادب کا مقصد کیا ہے ؟ اور ثالثاً ، ادیب کیسے کہا جاتا ہے ؟

وجہی کے نزدیک ادب ، خواہ شعر ہو ، خواہ نثر پارہ ، ایک الہام ہوتا ہے ۔ "سب رس" میں وہ یوں رقم طراز ہے ، "یو بات اعجاز ہے ۔ اس بات میں خدا کا راز ہے ۔ یو بات غیب کی آواز ہے ۔"

عہد پارینہ میں شاعری ، عطیہ خداوندی سمجھی جاتی رہی ہے ، نہ صرف ہندوستانی بلکہ یونان اور دیگر ممالک میں بھی یہی نظریہ ایک طویل مدت تک کارفرما رہا ۔ مگر آج یہ نظریہ جوں کا توں تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ اگر تخلیق ادب ایک اضطراری اور الہامی عمل ہو تو پھر خالق کی اپنی کاوش اور ذہانت کو اس میں کچھ دخل نہیں رہتا ۔ یہ کوئل کی "کوکو" اور پپیہے کی "پی کہاں ہے" کا سا عمل نہیں ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک جگہ خود وجہی نے غیر شعوری طور پر اپنے اس نظریہ کی تفریق کی ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ادب میں نزاکت و ندرت ہو اور الفاظ چُنے ہوئے ہوں ،

اگر وجہی ہی کی مؤخرالذکر بات کو مان لیا جائے تو تخلیق ادب کا الہامی ہونا بے معنی سا لگتا ہے۔

وجہی کے خیال کے مطابق تخلیقِ ادب کا مقصد "مسرت" ہے۔ اور اس نظریہ کو وجہی سے لے کر حالی سے پہلے تک سبھی شاعر اور نثر نگار سینے سے لگائے رہے۔ کسی نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی ادب کو "مفید" بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ وجہی نے اپنے اس نظریہ ادب کی بھی غیر شعوری طور پر (یا سے اس کا ابہام کہہ لیجئے) تردید کی ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ:۔

"کس جاگا پر کیسے کیسے بھید کھولیا ہے۔ ہم گلاب میں آبلوچ گھولیا ہے۔ ہم ماتاک موتی رولیا ہے۔.....
کے کچھ سنپڑے، کسے کچھ فیض انپڑے۔" اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجہی افادیت کا بھی قائل تھا۔

اور ادیب کے متعلق وجہی کے نظریہ کا اندازہ اس کی درج ذیل عبارات سے ہوتا ہے۔

"میں یو بات نئیں کیا ہوں۔ عیسیٰ ہو کر بات کو جیو دیا ہوں۔"

"فرہاد ہو کر، دونوں جہاں سے آزاد ہو کر، دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اٹھایا تو یو شیریں پایا تو یو نوی بات پیدا ہوئی۔ یو بات آیا۔"

"روشن ضمیر، صاحب تدبیر۔ ہر فن میں ماہر۔ چھپیا سب اس کے آنگے ظاہر۔ خدا کا واصل صاحب دل عاشق کا رہنما صاحبِ حال صاحب حاصل۔ ہاتف غیب کا آواز — محرم اسرار محرم راز......"

غرض وجہی نے ادب کی پرکھ کے جو اصول اور معیار بتائے ہیں ان میں اصلاح و تبدیلی تو کی جاسکتی ہے لیکن ان کی یکسر تردید کرنا ناممکن ہے، یہ معیار عمومی معیار ہیں اور انھیں ادب کی کسی بھی صنف کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ تمثیل ہو یا غزل — مثنوی ہو یا انشائیہ — افسانہ ہو یا ناول۔ نظم ہو یا کچھ اور!

تحسین سروری

اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ

(۱۰)

تذکرہ مشاہیر کاکوری

مولفہ

حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی

صوبۂ اودھ کے چند مردم خیز قصبات میں کاکوری کا نام بھی نمایاں ہے - بلگرام کی طرح کاکوری کی سرزمین نے بھی ایسے صاحبان کمال پیدا کئے کہ ہم ان پر آج بھی فخر محسوس کرتے ہیں - علم و فن، صنعت و حرفت اور تدبر و فراست میں اس خطے کے اصحاب نے کافی شہرت پائی -

قصبۂ کاکوری شہر لکھنؤ سے جانب غرب نو میل کے فاصلے پر واقع ہے - مورخین نے پانچویں صدی ہجری سے اس بستی کے وجود کو ڈھونڈ نکالا ہے - جب کہ یہاں کا حاکم راجہ کنس والی کسمنڈی تھا - ۴۲۲ھ میں کسمنڈی اور کٹولی کے درمیان حضرت سید سالار مسعود غازیؒ اور راجہ کنس میں سخت لڑائی ہوئی - آخر الامر راجہ کنس اور اس کا خاندان مارا گیا، اور ملک اس کا مجاہدین کے قبضے میں آگیا - اور کاکوری پر مسلمانوں کا تسلط ہوا - مسلمان یہاں ۴۲۵ھ سے ۱۰۳۳ء تک قابض رہے ویسے سید سالار مسعود غازیؒ کی شہادت کے بعد یہ قصبہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر راجہ قنوج کے زیر حکومت بھی رہا، لیکن یہ چند روزہ دور تھا - پھر اس کے بعد سنہ ۱۰۵۰ء میں قوم بھر نے خروج کر کے سلطنت قنوج کو تاراج کر دیا - اور وہ ۱۲۲۵ء تک قابض رہی -

۱۱۹۳ء سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی - سلطان شہاب الدین غوری نے فتح پائی - ۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک نے اودھ اور بہار کو فتح کر کے بختیار خلجی کو حاکم مقرر کر دیا - ۱۲۲۵ء میں سلطان شمس الدین التمش نے ملک ناصر الدین کو مہم قنوج پر مامور کیا، جس نے قوم بھر کا خاتمہ کر دیا - تب سے یہ علاقہ سلاطین دہلی کے قبضے میں آگیا جب کا سلسلہ سلاطین تغلق تک قائم رہا - جب ۱۳۹۴ء میں خواجہ جہاں معروف بہ ملک الشرق نے جونپور میں سلطنت شرقیہ کی بنیاد ڈالی - تو خاندان تغلق کا زوال شروع ہو گیا - اور افراتفری اور خانہ جنگی نے پھر ایک بار قوم بھر کو ابھرنے کا موقع دیا اور ہر طرف تسلط اس قوم کا ہونے لگا - ان کا سربراہ راجہ ککور تھا - اسی راجہ نے لکھنؤ کے جنوب میں ککور گڑھ کے نام سے

ایک کچا قلعہ بھی بنایا تھا۔ یہ علاقہ اتنا وسیع تھا کہ موجودہ کاکوری اسی کے احاطہ میں آباد تھا۔ یہ ککور گڑھ ہی ہے جو کثرت استعمال سے کاکوری ہوگیا۔

سنہ ۱۴۰۲ء میں سلطان ابراہیم شرقی نے تخت نشین ہوتے ہی قوم بھر پر فوج کشی کردی اور مانک پور کے قریب ان کو ایسی شکست دی کہ اس کے بعد سے اس قوم کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ اس کے بعد ابراہیم شرقی نے ککور گڑھ میں اسلامی نوآبادی قائم کی جو ۱۴۲۸ء تک باقی رہی۔

اس کے بعد بھی قصبۂ کاکوری اور اس کے آس پاس کا علاقہ مختلف جنگوں اور انقلابات کی آماجگاہ بنتا رہا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر کی تخت نشینی ہوگئی، اور اکبری فوج کو افغانی فوج سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ آخرکار لب آب بتیہ متصل قصبہ کاکوری سخت لڑائی ہوئی۔ نتیجۃً افغان بھاگ گئے اور شہنشاہ اکبر کی مستقل حکمرانی قائم ہوگئی۔ اسی عہد میں ایک نئے صوبے سرکار لکھنؤ کا وجود عمل میں آیا، اور اسی سے متصل ایک نیا پرگنہ کاکوری بھی قائم ہوا۔

عہد اکبری سے محمد شاہ کے ابتدائی عہد تک امن و امان قائم رہا۔ جب خود سلطنت دہلی میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگے اور خانہ جنگیوں کی نوبت آگئی تو دربار دہلی کی طرف سے برہان الملک نواب سعادت خاں صوبہ دار مقرر ہوئے، جنھوں نے کاکوری کی سکونت اختیار کرلی۔ اور یہاں کے امرا و اکابر کو جمع کرکے استعانت کے خواہاں ہوئے۔ اس طرح یہاں کی شورشیں رفع ہوئیں۔

زیر نظر کتاب ہندوستان کے اسی قصبۂ کاکوری کے مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ جو مطبع اصح المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں شیخ محمد قادر بخش کے زیر اہتمام چھپ کر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ (۵۱۰) صفحات کی اس کتاب میں مولف کتاب سمیت (۲۵۹) مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ ان مشاہیر میں ہر فن اور ہر نوع کے لوگ شامل ہیں۔ چنانچہ سرورق پر ہی یہ صراحت کردی گئی ہے کہ اس کتاب میں "علمار، فقرار، شعرار، مشاہیر امرار کے دلچسپ حالات، ان کے نثر و نظم کلام کے انتخابات، قصبۂ مردم خیز کاکوری کے تاریخی واقعات وغیرہ وغیرہ ہیں"

کتاب کے شروع میں تمہید اور اسی میں فہرست مآخذ ہے۔ جس سے پتا چلا کہ اس تذکرے کی تیاری میں (۵۵) مطبوعہ اور قلمی تذکروں اور تاریخوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس کے بعد پانچ صفحات میں کاکوری کی مختصر تاریخ ہے، جس کا خلاصہ میں نے مضمون کے شروع میں پیش کردیا ہے۔ اس کے بعد سے مشاہیر کاکوری کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ آخر کے (۹) صفحات پر تاریخی قطعات اور تقریظیں ہیں۔

تذکرے کی تقسیم نہ ابواب پر ہے نہ مشاہیر کے پیشے اور فن کے اعتبار سے ہے بلکہ بترتیب حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے۔ حروف تہجی میں بھی شعرا کے تخلص کے نہیں بلکہ ان کے اصل نام کے حرف کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مشاہیر کاکوری میں اشخاص کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ پیدائش و انتقال کی تاریخ کے علاوہ

عہدہ، پیشہ اور سکونت و اولاد و امجاد کی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں، اس لحاظ سے یہ تذکرہ بڑا وقیع اور اس انداز موجودہ زمانے کے اہل قلم کے لئے قابل تقلید ہے۔ اس تذکرے میں (۹۵) شاعر اور انشاپرداز بھی ہیں، لہٰذا "اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ" میں اس حصے کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

بعض کے نام فارسی اور عربی کے شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے آئے ہیں، لیکن میں نے انھیں بھی اس فہرست میں لے لیا ہے، اس لئے کہ یہ سب مولدًا کاکوروی ہیں، اور کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق اردو ادب و شاعری سے ہو جاتا ہے۔ جو اصحاب تخلص کی وجہ سے محض شاعر معلوم ہوتے ہیں، وہ مختلف موضوع پر بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں اسی طرح جو شاعر نہیں ہیں، وہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۔ بخشی ابو البرکات خاں غالب جنگ بینا، و کلیم شاگرد خان آرزو و قزلباش خاں امید ص۱۴
۲۔ منشی احمد علی مخدوم زادہ۔ ابن منشی مومن علی مفتون (مؤلف شباب لکھنؤ) ص۲۰
۳۔ حاجی شیخ ناظم حسین منتظم، شاگرد محمد رضا صبر کاکوروی ص۲۲
۴۔ منشی کاظم حسین غنی " " " ص۲۲
۵۔ ارتضا علی شرر، شاگرد داغ و جلال و امیر (مصنف تصانیف کثیرہ) ص۲۷

۔ خان بہادر منشی اطہر علی اظہر، شاگرد صبر کاکوروی ص۳۱
۔ مفتی اکرام اللہ افسوس، شاگرد عبد المجید سحر ص۳۴
۔ منشی محمد امتیاز علی صوفی، شاگرد مولانا غلام امام شہید ص۴۱
۔ امجد علی بلیغ، شاگرد ہادی علی اشک لکھنوی ص۴۶
۔ منشی امیر حسن صدیقی (مترجم، تاریخ ریاست چرکھاری، طبقات تاریخ اسلامی اندلس، کتاب الصرف عربی اس کے علاوہ رینالڈز کے چند ناولوں کا بھی ترجمہ کیا تھا) ص۵۰
۔ امیر حسن خاں تبسم شاگرد شیخ غلام مینا ساحر کاکوروی ص۵۱
۔ انعام الدین خاں شوق ص۶۲
۔ مولوی باسط علی باسط ص۶۴
۔ مولوی بشیر الدین شاکر، شاگرد ساحر کاکوروی ص۶۶
۔ خان بہادر منشی محمد تاج الدین جذب، شاگرد صبر کاکوروی ص۷۵
۔ حضرت غوث ملت مولانا شاہ تراب علی تراب قلندر قدس سرہٗ (مصنف تصانیف کثیرہ و شاعر اردو و فارسی) ص۷۶

له درد صاحب مذکورالصدر بزرگ حکیم محمد حبیب علی صاحب حبیب (نمبر ۲۲) کے فرزند ہفتم ہیں۔ جن کا تذکرہ صاحب ترجمہ کے فرزندوں میں ضمناً آیا ہے۔ کسی نے اس جگہ اپنے قلم سے یہ حاشیہ لکھا ہے کہ "میر نذر علی درد کے نام سے مشہور ہیں"
میں بھی حضرت درد کاکوروی کے نیازمندوں میں ہوں۔ اور بہت دن سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ پہلے اورنگ آباد دکن میں رہتے تھے۔ اب کراچی میں ہیں۔ (تحسین سروری)

۶۲ - خان بہادر مفتی عنایت احمد ص۲۹۹

۶۳ - اقتدار الدولہ غلام صفدر خاں تسلیم ص۳۰۰

۶۴ - منشی غلام مرتضیٰ ص۳۰۵

۶۵ - شیخ فضل حق عرف غلام مینا ساحر ص۳۰۸

۶۶ - منشی مرتضیٰ احسن معروف بہ حبش نواب فدا حسن خاں (ہائی کورٹ حیدرآباد دکن) ص۳۱۷

۶۷ - مولانا حاجی فرید الدین خاں محدث ص۳۱۸

۶۸ - مولوی شیخ فرید علی فلک شاگرد قاضی سعید الدین خاں و ذوق کاکوروی ص۳۲۰

۶۹ - منشی فیض بخش مورخ ص۳۳۰

۷۰ - منشی کاظم علی ص۳۳۲

۷۱ - مولوی محمد احسن احسن (برادر خورد محمد محسن کاکوروی) شاگرد محسن ص۳۳۹

۷۲ - منشی محمد رضا صبر شاگرد شیخ عبد الرؤف شعور (شاگرد مصحفی) ص۳۴۵

۷۳ - محمد قاسم قیصر ص۳۵۶

۷۴ - محمد محسن محسن (مشہور نعت گو) شاگرد ہادی علی اشک بجنوری ص۳۶۷

۷۵ - محمد مہدی شیدا ص۳۸۱

۷۶ - محمد ہاشم افسر شاگرد ذوق کاکوروی ص۳۸۸

۷۷ - مولوی محی الدین ذوق ص۳۸۹

۷۸ - مولوی حاجی مسیح الدین خاں بہادر میر منشی گورنر جنرل ص۳۹۹

۷۹ - منشی مشرف علی مضطر شاگرد منشی ظہور الدین احمد ظہور ص۴۰۰

۸۰ - منشی مقبول احمد محو - شاگرد منشی محمد رضا صبر . (برادر معظم خود) منشی مقصود احمد نطق ص۴۰۹

۸۱ - منشی مقصود احمد نطق شاگرد منشی محمد رضا صبر ص۴۱۰

۸۲ - منظور الدین خاں سرمد ص۴۱۹

۸۳ - منشی مومن علی خاں مفتون شاگرد ساحر کاکوروی ص۴۲۰

۸۴ - قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاں بہادر اشرف جنگ ثاقب ص۴۳۲

۸۵ - منشی نظیر حسن اوج شاگرد صبر کاکوروی ص۴۵۵

۸۶ - مولوی حاجی شاہ علی نقی بہادر خاں مسیح و تسلیم ص۴۵۹

۸۷ - مولوی حاجی نورالحسن نیّر ابن حضرت محسن کاکوروی (مولف نوراللغات) ص۲۶۱

۸۸ - نورالدین احمد کیفی ابن ظہور الدین احمد ظہور شاگرد عبدالرؤف شعور ص۲۶۳

۸۹ - منشی واحد علی بسمل شاگرد امیر مینائی ص۲۷۰

۹۰ - مولوی وسیم الدین اختر ص۲۷۳

۹۱ - قاضی وصی علی خاں ص۲۷۴

۹۲ - منشی محمد وہاج الدین ص۲۷۶

۹۳ - منشی ہادی حسن خاں مخمور شاگرد امیر حسن خاں بسمل ص۲۷۹

۹۴ - مولوی یوسف علی ص۲۸۴

۹۵ - (مؤلف مشاہیر کاکوری) حافظ محمد علی حیدر علوی ص۲۹۲

انجمن ترقی اردو کی دیگر مطبوعات

سودا
شیخ چاند مرحوم

اردو تنقید و تحقیق میں شیخ چاند کی ذات شعلۂ مستعجل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرحوم نے بہت کم عرصے میں بعض ایسی تحریریں ہمارے ادب کو دیں جو علمی و ادبی اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں مرزا رفیع السودا کے حالات زندگی اور کلام پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی۔ اب دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

قیمت : چھ روپے

آرٹ اِن اُردو پوئٹری (انگریزی)
شہاب الدین رحمت اللہ

اس میں اردو زبان کی تاریخ اور شاعری کا ارتقاء نیز اہم شعراء کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ مؤلف مصور بھی ہیں۔ اور انہوں نے بعض اشعار کو تصاویر کی صورت میں بھی ڈھالا ہے۔ کتاب بڑے سائز پر نہایت نفاست سے طبع کی گئی ہے۔

قیمت: چھ روپے پچھتر پیسے

فن شاعری (بوطیقا) :-
تصنیف :- ارسطو۔ ترجمہ عزیز احمد

ارسطو کے مشہور رسالے "بوطیقا" کا مستند ترجمہ مع حواشی۔ شروع میں مترجم نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں ارسطو کے نظریۂ شاعری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

قیمت :- دو روپے پچاس پیسے

مقالات حالی (اوّل)
مولانا الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کے علمی، ادبی اور دینی مضامین جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

قیمت :- تین روپے

خطبات عبدالحق
بابائے اردو

یہ بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مکمل مجموعہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔

قیمت نو روپے

سب رس
ملا وجہی

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت محنت اور تحقیق کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہے۔

قیمت : چھ روپے

انجمن ترقی اُردو بابائے اُردو روڈ کراچی ۱

عابد رضا بیدار

اختر شہنشاہی

(اشاریہ)

(۲)

۹۵۔ **البیلا** ۔ بدایوں ۔۔ ، ہفتہ وار ، ۴ ورق خورد ۔۔ ، مالک علی امجد حسین زردار اثنا عشری ۔ ایڈیٹر علی ارشد حسین ۔۔ ، اجراد اشتہار یکم اپریل ۱۸۸۶ء

۹۶۔ **امیر الاخبار** ۔ بمبئی ۔۔ ، ہفتہ وار ، ۴ ورق اوسط ۔۔ ، مالک سید امیر علی حیدر آبادی ، ایڈیٹر منشی امراؤ علی ۔ اجرا یکم مئی ۱۸۶۸ء

۹۷۔ **امیر الاخبار** ۔ لوہارو ۔ بحکم ۔۔ نواب علاؤ الدین احمد خاں ۔۔ ، پندرہ روزہ ورق کلاں ۔۔ ، مہتمم مرزا عبد القادر بیگ ۔۔ ، اجرا ، جنوری ۱۸۷۲ء

۹۸۔ **امیر الاخبار** ۔ کلکتہ ۔۔ ، مہینے میں آٹھ مرتبہ ، ۴ ورق اوسط ۔۔ ، مالک غلام حضرت خستہ ۔۔ ، اجرا یکم اپریل ۱۸۸۲ء

۹۹۔ **ٹونک** ۔ ٹونک ۔۔ ، مالک سید محمد نائب بخشی الملک ، مہتمم سید سیف الدین ۔۔ ، اجرا ، اشتہار یکم ستمبر ۱۸۸۴ء

۱۰۰۔ **امامیہ** ۔ لکھنؤ ۔۔ ، عشرہ وار ، ۸ ورق خورد ۔۔ ، مالک سید عباد علی ، مہتمم عابد رضوی ۔۔ ، اجرا ۱۵ / اکتوبر ۱۸۸۲ء

۱۰۱۔ **امجد الاخبار** ۔ بدایوں ۔۔ ، ہفتہ وار ، ۴ ورق خورد ۔۔ ، مالک علی امجد حسین ۔۔ ، ایڈیٹر علی ارشد حسین ۔۔ ، اجرا ۱۵ / فروری ۱۸۸۶ء

۱۰۲۔ **امپیریل پیپر** ۔ لاہور ، ہفتہ وار ، ۸ ورق اوسط ۔۔ ، مالک سید رجب علی شاہ ، مہتمم سید رحمت علی شاہ ۔۔ ، ۲۰ / مارچ ۱۸۸۶ء

۱۰۳۔ **اندر پرستپر کاش** ۔ دہلی ۔۔ ، ہفتہ وار ، ۴ ورق خورد ناگری مشترک ۔۔ ، مالک پنڈت جنتی پرشاد ۔ یکم جون ۱۸۸۳ء

۱۰۴۔ **اخبار انجمن ہند** ۔ لکھنؤ ہفتہ وار ، ۸ ورق اوسط ، اجرا ۱۸۶۲ء

۱۰۵۔ **اخبار انجمن اسلامی** ۔ کلکتہ ، ماہوار ۵ ورق خورد ۔۔ ، میر مجلس ۔ عبد اللطیف خاں ـــــ جنوری ۱۸۶۳ء

۱۰۶۔ **اخبار انجمن پنجاب** ۔ لاہور ۔ ہفتہ وار ، ۸ ورق اوسط ۔۔ ، ایڈیٹر پیرزادہ محمد حسین ـــــ جنوری ۱۸۷۰ء

۱۰۷۔ **اخبار انجمن رفاہ** ۔ گرنڈہ ۔۔ ، ماہوار ، ۸ ورق خورد ۔ پہلے باہتمام گلاب رائے ۔۔ ، اب ۱۸۸۲ء سے منشی کرپا دیال ، اجرا یکم جولائی ۱۸۷۰ء

۱۰۸۔ **اخبار انجمن مناظرہ** ۔ دہلی ۔۔ ، ماہوار ، ۲ ورق خورد ۔۔ ، سکریٹری ۔ نذیر علی ـــــ ۱۵ / جولائی ۱۸۷۱ء

۱۰۹۔ **اخبار انجمن شاہجہاں پور** ۔ شاہجہاں پور ۔۔ ، ہفتہ وار ۱۲ ورق اوسط ۔۔ ، مہتمم سید محمد طاہر ـــــ ۲۱ / جولائی ۱۸۷۳ء

۱۱۰۔ اخبار انجمن مذاکرہ علمیہ: پٹنہ۔۔ ماہوار۔ ۶ اورق خورد۔۔ نائب میر مجلس۔۔ سید ولایت علی خاں۔ ـــــ ۸ مارچ ۱۸۷۴ء

۱۱۱۔ اخبار انجمن مفید عام۔ لاہور، ماہوار، ۸ ورق خورد۔۔ مہتمم مرزا فتح محمد بیگ۔۔، اندر سکریٹری حافظ حبیب الرحمٰن۔۔ اجراء ۸ مارچ ۱۸۷۴ء

۱۱۲۔ اخبار انجمن اسلام: لکھنو، ماہوار، ۱۳ ورق اوسط۔۔ میر مجلس سید امتیاز علی علوی۔۔ ـــــ ۱۸۷۵ء

۱۱۳۔ اخبار انجمن تہذیب: کانپور۔۔ سہ ماہی ۱۲ ورق خورد۔۔ مہتمم سید حافظ عبداللہ بلگرامی ـــــ ۱۸۷۵ء

۱۱۴۔ اخبار انجمن اسلام۔ جبلپور، ماہواری۔۔ ۸ ورق، اجراء ۱۸۸۱ء

۱۱۵۔ اخبار انجمن علمی۔ بدایوں۔۔ ماہواری، ۸ ورق خورد۔ سکریٹری حافظ فضل اکرم، آنریری سکریٹری اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی۔۔ اجراء ۱۶ اگست ۱۸۸۲ء

۱۱۶۔ اخبار انجمن پشاور۔ پشاور، ۱۲ ورق خورد، سالانہ، اجراء ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۴ء۔

۱۱۷۔ اخبار انجمن عقل افروز۔ رتلام، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد، مالک قادر بخش، اجراء جون ۱۸۸۳ء

۱۱۸۔ اخبار انجمن رفاہ عام۔ لدھیانہ، ماہواری، ۸ ورق خورد۔۔ ایڈیٹر مرزا عبداللہ، اجراء ۱۳ جنوری ۱۸۸۴ء

۱۱۹۔ اخبار انجمن زراعت۔ بجنور۔۔ ۱۱ وراق ماہواری۔ سکریٹری، پنڈت سری لال ـــــ ۳۰ اپریل ۱۸۸۴ء۔

۱۲۰۔ اخبار انجمن فیضان عام۔ گوجرانوالہ۔۔ ۴ ورق خورد، ماہواری۔۔ مہتمم دیوان چند ـــــ یکم جون ۱۸۶۶ء

۱۲۱۔ الانوار الشمس۔ یہ رسالہ قانونی۔۔ لاہور سے ہفتہ وار چھوٹے ۱۵ اوراقوں پر۔۔ شائع ہوتا ہے۔۔ مالک دیوان بوٹا سنگھ۔۔ اجراء ۱۸۶۷ء

۱۲۲۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ علی گڑھ۔۔ انگریزی مشترک، ہفتہ میں دوبار ہوگیا۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ مجاریہ سین ٹیفک سوسائٹی پہلے اس اخبار کا نام سنٹیفک سوسائٹی تھا جب مہتمم حافظ عبدالرزاق وایڈیٹر مولوی محمد اسمٰعیل تھے اب ایڈیٹر اس کے۔۔ سید احمد خاں۔۔ اور مہتمم لالہ گلاب رائے۔۔ اجراء ۱۸۶۶ء

۱۲۳۔ انسٹی ٹیوٹ۔ منظفر نگر، ماہواری، ۸ ورق خورد، سکریٹری نہال چند مہتمم محمد ذکریا ـــ یکم جون ۱۸۶۷ء

۱۲۴۔ انسٹی ٹیوٹ۔ پٹنہ۔۔ ہفتہ وار، ۲ ورق کلاں۔۔ انگریزی مشترک۔۔ میر مجلس سکریٹری شمس العلماء مولو محمد حسین۔۔ مہتمم محمد اسحاق۔۔ اجراء یکم جولائی ۱۸۸۶ء

۱۲۵۔ انڈین پنچ۔ لکھنؤ۔۔ ہفتہ وار۔۔ ۶ ورق اوسط۔۔ نوروز علی خاں شیدا مرحوم نے جاری کیا۔ بعد وفات شیدا۔۔ باہتمام کرشن چندر قیصر کے نکلا۔۔ اجرا یکم جنوری ۱۸۸۰ء

۱۲۶۔ انڈین کرانکل۔ پٹنہ۔۔ ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔ ایڈیٹر رحمت اللہ۔۔ بالفعل اس کی اشاعت ملتوی ہے۔۔ اجراء یکم جولائی ۱۸۸۱ء۔

انڈین لار پورٹ۔ آگرہ۔۔، ۱۲ ورق، ماہواری۔۔ مالک محمد حسین، اجرا یکم جنوری ۱۸۸۱ء
انڈین لار پورٹ۔ فتح پور، ۱۵ ورق خورد، ماہواری۔۔ مالک کنج بہاری لال ــــ یکم جنوری ۱۸۸۱ء
انڈین رپورٹ۔ امرتسر، ماہواری، ۲۰ ورق خورد، رسالہ فیصلہ جات ہائی کورٹ۔ مہتمم بابا نرائن سنگھ۔۔، اجرا یکم جنوری ۱۸۸۶ء
انیس بہار۔ پٹنہ۔۔، روزانہ، دو ورق کلاں۔۔ مالک سید اصغر علی ــــ اجرا ۱۸۷۶ء
انیس ہند۔ آگرہ۔۔، پندرہ روزہ۔۔، مالک مرزا اشتیاق حسین نظم اثنا عشری۔۔، ایڈیٹر سید لیاقت علی۔۔، یکم ستمبر ۱۸۸۳ء
انیس۔ پٹنہ۔۔، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط۔۔، مالک عبد القادر، ایڈیٹر عابد حسین ــــ ۱۶ اگست ۱۸۸۷ء
انتخاب قوانین۔ کانپور۔۔، ماہواری قانون ونظائر کا رسالہ، ۲۴ ورق خورد۔۔، مالک شیام لال، یکم جنوری ۱۸۷۸ء
انتخاب۔ لکھنؤ۔۔ شعر وسخن کا ماہواری چھوٹے ۱۲ ورقوں کا رسالہ، مالک سخاوت علی خاں مروج۔۔، یکم نومبر ۱۸۸۴ء۔
انتخاب الحکمت۔ گورداس پور، ماہواری، ۶ ورق خورد، حکمت کا رسالہ۔۔، مالک وایڈیٹر گیا رام یکم جنوری ۱۸۸۶ء
اودھ اخبار۔ لکھنؤ۔۔، روزانہ، ۶ ورق اوسط۔۔، مالک نولکشور۔۔، از مطبع نولکشور پریس، اجرائے مطبع ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء، اجرا اخبار ۱۸۵۹ء
اودھ گزٹ۔ لکھنؤ۔۔ مالک حبیب، مہتمم گنگا پرشاد۔۔، اجرا ۱۸۶۱ء
اودھ گورنمنٹ گزٹ۔ لکھنؤ۔۔، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔، اجرا ۱۸۶۳ء
اودھ پنچ۔ لکھنؤ۔۔، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط۔۔، مالک سجاد حسین۔۔، اجرا یکم جنوری ۱۸۷۷ء
اودھ ریفارمر۔ لکھنؤ۔۔، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔، مالک خواجہ محمد وزیر۔۔، ۲۷ نومبر ۱۸۸۳ء کو اشتہار جاری ہو کر اخبار اب تک جاری نہیں ہوا۔
اوناؤ اخبار۔ اوناؤ۔۔، ہفتہ وار، ۴ ورق۔۔، مالک یعقوب علی۔۔، اخبار اب تک جاری نہیں ہوا۔ اجرا اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۷ء
آئینہ عیب نمائے ہند۔ لاہور، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ مالک ٹی۔ بی۔ نالوی۔۔، اجرا یکم اکتوبر ۱۸۷۰ء
آئینہ علم۔ الہ آباد، ماہواری، ۱۸ ورق خورد، نظائر واحکام مضامین قانونی۔۔۔ مالک سوہن لال۔، اجرا ۱۸۶۰ء۔
آئینہ آئین ہند۔ گوجرانوالہ، ماہواری، ۶ ورق خورد، خلاصہ نظائر جمیع ہائی کورٹ ہندوستان۔ مترجم فتح سنگھ، اجرا جنوری ۱۸۸۶ء

۱۴۵۔ **آئینہ ریاضی۔** شاہجہاں پور، ماہواری، ۶ ورق خورد۔۔ مالک نجا ورسنگھ۔۔ یکم جنوری ۱۸۷۹ء

۱۴۶۔ **آئینہ سکندری۔** مراد آباد۔، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط۔، مالک احمد بخش۔۔ مہتمم نظام الدین۔۔ یکم مئی ۱۸۸۱ء

۱۴۷۔ **آئینہ تہذیب۔** سید پور ضلع غازی پور، ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط۔۔، مالک شیو پرشاد۔۔ مہتمم محمد لیلین شفق۔۔۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۸۲ء

۱۴۸۔ **آئینہ ہند۔** لاہور۔۔ ماہواری، ۱۶ ورق خورد۔۔ مالک رنگی رام مختار۔۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۳ء

۱۴۹۔ **آئینہ طبابت۔** آگرہ، ماہواری، ۱۴ ورق خورد۔۔ مالک امام الدین احمد۔۔ ۱۸۶۹ء

۱۵۰۔ **آئینہ نمائش۔** کلکتہ۔۔ روزانہ ایک ورق کلاں بزمانہ ایام نمائش ۳ ماہ تک جاری رہا۔ مالک غلام ہمدانی ۔۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۸۳ء۔

۱۵۱۔ **آئینہ اخلاق۔** لاہور۔۔۔ ۴ ورق خورد۔۔ ایڈیٹر عبدالعزیز (غالباً ہفتہ وار)۔۔ یکم دسمبر ۱۸۸۴ء

۱۵۲۔ **آئینہ تجارت۔** کارخانہ تجارت کی سالانہ روداد۔۔ مراد آباد۔۔ باہتمام امجد علی۔۔ ۱۲ ورق خورد۔۔ ۱۸۸۲ء

۱۵۳۔ **آئینہ تجارت۔** آگرہ۔۔ ہفتہ وار، مالک مرزا اشتیاق حسین نظم، مہتمم مرزا عاشق حسین بزم، ایڈیٹر سید لیاقت علی۔۔ اجرا اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۱۵۴۔ **آئینہ سخن۔** فتح پور۔۔ ماہواری، ۸ ورق خورد۔۔ مالک صدیق احمد قادری، اجرا ۱۸۸۶ء

۱۵۵۔ **آئینہ روزگار۔** غازی پور۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد۔۔ مالک پانڈے رام سرن لال۔۔ غالباً اجرا ۱۸۸۸ء

۱۵۶۔ **آئینہ انگریزی سوداگری۔** لندن۔۔ مالک گلبرٹ۔ اور۔ ورنگٹن۔۔ ۳۶ ورق اوسط، سہ ماہی۔۔ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۵۷۔ **اتچیسن گزٹ۔** گورگانوں۔۔ پندرہ روزہ۔۔ مالک چودھری پنڈت جیتی جیالال سرادگی۔۔ اشتہار یکم فروری ۱۸۸۵

۱۵۸۔ **ایران۔** طہران۔۔ زبان فارسی، ہفتہ وار ۲ ورق کلاں۔۔۔ ۱۸۸۴ء

۱۵۹۔ **ایڈورٹائیزر۔** دہلی۔۔۔ پندرہ روزہ۔۔۔ یکم جون ۱۸۸۴ء

۱۶۰۔ **آئرن منگر۔** لندن۔۔ انگریزی وجرمنی واٹالین وڈچ اردو زبان میں تتمہ بھی اردو میں ہوتا ہے اجرا اشتہار ۱۸۸۶

۱۶۱۔ **اعجاز۔** یہ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اجرا جنوری ۱۸۵۷ء

۱۶۲۔ **انبالہ گزٹ۔** انبالہ۔۔۔ ہفتہ وار، ۸ ورق خورد۔۔ مالک ہربنس رائے۔۔ یکم اگست ۱۸۸۷ء

۱۶۳۔ **انجینئرنگ گائیڈ۔** لاہور۔۔ ماہواری، ۶ ورق اوسط۔۔ مہتمم کریم بخش۔۔ یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۱۶۴۔ **امرتسر گزٹ۔** امرتسر، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ مالک نیاز علی خاں۔۔ اجرا ۵ جنوری ۱۸۸۸ء

۱۶۵۔ **اسکول ماسٹر۔** فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ۔۔ ہفتہ وار۔۔ ۴ ورق خورد۔۔ منشی محبوب عالم مالک۔۔۔ اجرا یکم فروری ۱۸۸۷ء۔

- باوا آدم پنچ ۔ بنارس ہفتہ وار ۴ ورق اوسط ۔۔ ایڈیٹر ڈاکٹر اشفاق حسین ۔۔ اجراء ۱۲ راکتوبر ۱۸۸۱ء
- بنارس پنچ ۔ بنارس۔ ضمیمہ باوا آدم پنچ، مہتمم ڈاکٹر اشفاق حسین، ۲ ورق اوسط ـــــ ۱۲ راکتوبر ۱۸۸۱ء
- باغبان ۔ لاہور، ۳۲ ورق خورد، ماہواری ۔۔ مالک نورالدین فلک ۔ ایڈیٹر عزیزالدین ۔۔ یکم دسمبر ۱۸۸۲ء
- بادِ صبا ۔ بنگلور، ہفتہ میں چار بار، دوسرے روز، ۲ ورق اوسط ۔۔ مالک محمد ابراہیم طپش، ایڈیٹر عبدالقادر
- بحرِ حکمت ۔ لاہور، پندرہ روزہ، ۸ ورق اوسط ۔۔ مالک رائے ہر سکھ رائے ۔۔ ـــــ ۱۸۶۲ء
- بحر الاسلام ۔ بنگلور، مجاریہ انجمن زمرۂ احباب، سکریٹری۔ عبدالمجیب ـــــ یکم مئی ۱۸۷۵ء
- بدّیا بلاس۔ جموں، ریاست کشمیر، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط، ناگری مشترک ۔۔ مالک پنڈت نبکٹ رام شاستری ـــــ ۱۸۶۷ء
- برقِ خاطف ۔ بمبئی ۔۔ ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط ۔۔ مالک سید مظفر حسین، مہتمم امیرالدین نزہت ـــ ۱۸۵۸ء
- برق ۔ بمبئی ۔۔ ماہواری شعر و سخن، ۹ ورق خورد کا گلدستہ ۔۔ مالک نواب علی حسرت لکھنوی مہتمم ابوالحسن جوہر بلوی ـــــ یکم جولائی ۱۸۸۵ء
- برادرِ ہند ۔ لاہور، ماہواری ـــــ یکم جون ۱۸۸۲ء
- بریلی تت بودھنی تپرکا۔ بانس بریلی ۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مہتمم گلاب شنکر ـــــ ۱۸۶۰ء
- بزمِ سخن ۔ دہلی، شعر و سخن کا گلدستہ ـــــ اجرا، اشتہار جنوری ۱۸۷۷ء
- بلند اختر۔ مرادآباد ۔۔ ماہواری ۔ ۸ ورق ۔۔ مالک مشیرالدولہ سفیرالملک قاضی سید جمشید علی جم ۔۔ یہ اخبار شامل اخبار جامِ جمشید ہو گیا ـــــ ۵ر دسمبر ۱۸۷۰ء
- بنارس گزٹ ۔ بنارس ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مالک گوبند رگھوناتھ ـــــ ۱۸۵۴ء
- بنارس گزٹ۔ بنارس ۔۔ مالک، بوسدہ گوپال ۔۔ ایڈیٹر اشرف علی، ہفتہ وار ۶ ورق اوسط ـــ ۳ر اپریل ۱۸۸۲ء
- بنگال پنچ ۔ کلکتہ ۔۔ ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط، مالک اسفندیار خاں ۔۔ ایڈیٹر غلام حضرت خان ۔۔ ۔۔ یکم جولائی ۱۸۸۰ء
- بنگلور اخبار۔ بنگلور ۔۔ ہفتہ میں دو بار ۔۔ ۲ ورق خورد ۔۔ ـــــ جولائی ۱۸۸۷ء
- بوستان العاشقین۔ لکھنؤ ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مالک مول راج ۔۔ ایڈیٹر دیو پرشاد ـــ ۷ر دسمبر ۱۸۷۷ء
- بہارِ انجمن ۔ فیض آباد، گلدستہ شعر و سخن، ماہواری، ۲۴ ورق خورد ۔۔ مہتمم نواب عباس مرزا خان صاحب محیط نبیرۂ نواب شجاع الدولہ، ایڈیٹر عباس مرزا ہوش ۔۔ ـــــ ۵ر مئی ۱۸۸۲ء
- بہارِ شملہ ۔ شملہ، ہفتہ وار، مالک عبدالقادر تائب ـــــ اجرائے اشتہار اکتوبر ۱۸۸۶ء

۱۸۶۔ **بہارستانِ شوخی**۔ بلند شہر۔۔ ماہواری، ۸ ورق خورد، شعر و سخن کا رسالہ ۔۔ ـــــ اجراء اشتہار ۱۵ جولائی ۱۸۸۵ء

۱۸۷۔ **بہارِ بے خزاں**۔ میسور۔۔ گلدستۂ نعتیہ، ضمیمۂ گلدستۂ وظائف۔ مجاریہ انجمن کمالیہ، میر مجلس عبداللہ سیٹھ خوشحال شاگرد رحمت میسوری۔۔ ماہواری۔۔ مہتمم محمد علی خاں بیدار ـــ اجرائے اشتہار ۰ رجنوری ۱۸۸۶ء

۱۸۸۔ **بہارِ ہند**۔ کلکتہ۔۔ (۴ ورق)۔۔ مالک عمر محمد ناخدا، مہتمم سید عبدالرحیم ابد۔۔ ـــ اجرائے اشتہار مئی ۱۸۸۵ء

۱۸۹۔ **بہارِ ہند**۔ آگرہ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ مالک مشرف حسین خاں ۔۔۔ ایڈیٹر سید مومن حسین صفی ۔۔، اجراء جون ۱۸۸۱ء۔

۱۹۰۔ **بہارِ ہند**۔ لکھنؤ۔۔ ماہواری، ۱۲۰ ورق۔۔۔ مالک اصغر علی، محمد علی تاجران عطر، مہتمم مرزا محمد تقی عرف چھوبیگ عاشق ۔۔۔ اجراء اشتہار یکم اکتوبر ۱۸۸۷ء۔

۱۹۱۔ **بہارِ سخن**۔ رنلام) ۱۰ ورق خورد۔۔۔ مالک رام کشن جوش۔۔ مہتمم سید نادر علی شوقی ـــ یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۱۹۲۔ **بہارِ سخن**۔ کانپور۔۔ ماہواری، ۸ ورق خورد۔۔ مالک عنایت حسین خاں ـــ ۱۵ رجون ۱۸۸۵ء

۱۹۳۔ **بہارِ سخن** گورکھپور۔۔ ماہواری، ۸ ورق، مالک جلیس رئیس مچھلی شہر، مہتمم حافظ محمد طٰہٰ نشتر۔ ۱۵ راگست ۱۸۸۸ء

۱۹۴۔ **بہارِ پنچ**۔ پٹنہ ۔۔ ہفتہ وار ۴ ورق اوسط۔ مالک محمد اکبر خاں، مہتمم نوروز علی خاں شیدا۔ ۲۶ رنومبر ۱۸۷۶ء

۱۹۵۔ **بے نظیر**۔ لکھنؤ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ ایڈیٹر پنڈت شیونا تھ سنگھ، اجراء اشتہار ۱۵ رجنوری ۱۸۸۴ء

۱۹۶۔ **بھاگل پور نیوز**۔ بھاگل پور۔۔ پندرہ روزہ، انگریزی و ناگری مشترک، ۴ ورق کلاں۔۔ مالک شب چند بازجی ایڈیٹر فراں سیس آں تنے ـــ ۱۸۸۲ء

۱۹۷۔ **بیاگھر پادپرکاشک**۔ تلعۂ بے سواں۔ ضلع علی گڑھ۔ مالک ٹھاکر گورپرشاد برم رئیس اعظم و تعلقہ دار ریاست بے سواں، مہتمم دوار کا پرشاد۔۔ اجراء ۱۸۷۰ء

۱۹۸۔ **بیربر**۔ دہلی۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ مالک افضل خاں۔۔ اجراء اشتہار، مارچ ۱۸۸۵ء

۱۹۹۔ **بیربر**۔ سیالکوٹ۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد۔۔ مالک گیان چند، مہتمم برج لال۔۔ یکم اپریل ۱۸۶۶ء

۲۰۰۔ **برار پنچ**۔ کھولا پور ضلع امراؤتی ۔۔ مالک کرشن لال جوش ۔۔ ـــ مارچ ۱۸۸۶ء

۲۰۱۔ **بلبلِ ہند**۔ مراد آباد۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔ مالک مرزا احمد حسین بیگ تسخیر، مہتمم کشن سروپ۔ اجراء ۱۶ رجنوری ۱۸۸۸ء

۲۰۲۔ **پنجابی اخبار**۔ لاہور۔۔ ہفتہ وار ۸ ورق اوسط۔۔ مجاریہ سید محمد عظیم مرحوم۔ ایڈیٹر حافظ عمر دراز فائق اب ہفتہ میں دوبار۔۔، اجراء ۔۔ ۱۸۶۵ء۔

۲۰۳۔ **پنجاب پنچ**۔ لاہور۔۔ ہفتہ وار ۲ ورق اوسط۔ مجاریہ فتح الدین، مالک نہال الدین، ایڈیٹر فیروز الدین ۔۔ ضمیمہ۔۔ اخباروں کی قبلہ گاہ۔۔، اجراء ۱۸۷۸ء۔

۲۰۴۔ **پنجاب لوکل سلف گزٹ**۔ گوجرانوالہ ۔۔۔ ماہواری ۔۔ ۲۵ ورق سے ۱۲۵ ورق خورد تک۔ مالک و مہتمم مرزا انور علی
اجراء ۱۵ نومبر ۱۸۸۴ء۔

۲۰۵۔ **پنجاب سماچار**۔ پنجاب سماچار۔ قصبہ ادنہ ۔۔۔ ہوشیارپور عشرہ وار ۔۔۔ ۴ ورق خورد ۔۔ مالک سردار پرتاپ سنگھ
اجراء ۲۵ راکتوبر ۱۸۸۶ء

۲۰۶۔ **پنجاب اوپی نین**۔ عرف نابھ پیپر۔ ہوشیارپور۔ ہفتہ وار، چار ورق خورد۔ سسندھی خاں صفی نے چھاپا ـــــــ،
بالک رام مالک منیجر ۔۔ اجراء ۱۵ اپریل ۱۸۸۶ء۔

۲۰۷۔ **پنجاب ریویو**۔ امرتسر ۔۔ ماہواری، ۸۰ ورق خورد ۔۔ ایڈیٹر و مالک پادری رجب علی ۔۔ یادگار فیضی ابوالفضل
سابق ایڈیٹر اخبار وکیل ہند و مخبر ہند و شمس الاخبار، و کوکب عیسوی اور ہند دیر کاش اجراء یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۲۰۸۔ **پیام یار**۔ لکھنؤ۔ ماہواری گلدستہ۔ ۱۲ ورق خورد، مہتمم نثار حسین نثار ۔۔ اجراء ۱۸۸۲ء

۲۰۹۔ **پیام عشاق**۔ لکھنؤ۔ ماہواری گلدستہ ۔۔ ۸ ورق خورد ۔۔ مالک سید تصور حسین خاں ۔۔ اجراء ۲۳ رمئی ۱۸۸۳ء

۲۱۰۔ **پیام عاشق**۔ قنوج ۔۔۔ ضلع فرخ آباد ۔۔ ۱۰ ورق خورد۔ ماہواری گلدستہ۔ مہتمم بھگو خاں۔ رحیم ۔۔ اجراء ۴ راپریل ۱۸۸۴ء

۲۱۱۔ **پیام**۔ ناگپور، ہفتہ وار، ۴ ورق ۔۔ مہتمم و ایڈیٹر جہانگیر خاں بصیر ۔۔ اجراء ۔۔ ۴ رجولائی ۱۸۸۷ء

۲۱۲۔ **پبلک اوپی نین**۔ بنارس ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مالک محمد حنیف ۔۔ انگریزی مشترک ۔۔۔ آنریری
ایڈیٹر۔ اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف ۔۔۔ اجراء ۴ رمئی ۱۸۸۳ء۔

۲۱۳۔ **پبلک نیوز**۔ لاہور ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ۔۔ ضمیمہ راوی۔ مہتمم ہرگوپال ۔۔ ونا تری اجراء ۹ راپریل ۱۸۸۷ء

۲۱۴۔ **پیک آصفی**۔ حیدرآباد ۔۔ دو ورق اوسط، روزمرہ ۔۔ مالک سید احمد ۔۔ اجرائے اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۲۱۵۔ **پیک صبا**۔ کلکتہ ۔۔ دو ورق اوسط، روزانہ، مالک محمد نا خدا، ایڈیٹر سید عبدالرحیم ابد ۔۔۔ ۔،
اجراء یکشنبہ ۲۶ راپریل ۱۸۸۵ء

۲۱۶۔ **پرکالۂ آتش**۔ قنوج ۔۔ فرخ آباد ۔۔ دوسرا نام قنوج پنچ۔ پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط ۔۔ اہتمام سے
بھگو خاں رحیم ۔۔ اجراء یکم اگست ۱۸۸۵ء

۲۱۷۔ **پولیس گزٹ**۔ لاہور۔ ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ۔۔ مالک تچین انسپکٹر جنرل ۔۔ پولیس پنجاب ۔۔ اجراء ۱۸۷۱ء۔

۲۱۸۔ " " " الہ آباد۔ ہفتہ وار، چار ورق اوسط ـــــ اجراء ۱۸۶۲ء

۲۱۹۔ **پرنس آف ویلس گزٹ**۔ کیمپ میرٹھ ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ۔۔ مالک رائے گنپتی لال ـ ایڈیٹر لالہ خوشوقت
رائے ۔۔۔ اجراء ۱۸۷۶ء۔

۲۲۰۔ **پاٹے خاں**۔ لاہور ۔۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ۔۔ مالک عبدالرحمن ۔۔۔ اجراء جنوری ۱۸۸۶ء

۲۲۱۔ **پیسہ اخبار** ۔ گوجرانوالہ۔ ہفتہ وار، ۴ ورق خورد۔۔ مالک منشی محبوب عالم ۔اجرا، ۱۸۸۷ء

۲۲۲۔ **پیکر** ۔ گورکھپور۔۔ ماہواری ۸ ورق خورد۔، مالک عبداللطیف خاں۔ مہتمم خواجہ محی الدین لکھنوی۔۔۔، اجرا، اشتہار اپریل ۱۸۸۷ء۔

۲۲۳۔ **تاج الاخبار** ۔ لکھنؤ۔۔ مہینہ میں پندرہ بار۔ چار ورق اوسط۔۔۔ باہتمام لالہ گوکل پرشاد۔۔اجرا، یکم جنوری ۱۸۷۴ء

۲۲۴۔ **تاج الاخبار** ۔ رام پور، مقام در دولت غربی۔۔ روہیل کھنڈ۔، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔ مالک امیر احمد مینائی اوستاد وزئی ریاست۔۔، مہتمم حافظ محمد احمد قمر لکھنوی اجرا، یکم ستمبر ۱۸۷۵ء

۲۲۵۔ **تاج الاخبار** ۔ راولپنڈی، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط۔۔، مالک بابو نرائن داس ۔۔۔، ایڈیٹر منشی رام سہائے اجرا، یکم نومبر ۱۸۸۴ء۔

۲۲۶۔ **تحفۂ پنجاب** ۔ امرتسر، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔، مالک بلرام سنگھ ۔۔، اجرا، ۱۸۷۵ء

۲۲۷۔ **تحفۂ کشمیر** ۔ سری نگر، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔۔ مالک ہرسکھ رائے ،، اجرا، ۱۸۷۶ء

۲۲۸۔ **تحفہ** ۔ مدراس۔۔، پندرہ روزہ۔۔ سولہ ورق خورد۔۔ مالک زین الدین احمد۔، اجرا، یکم جولائی ۱۸۸۴ء

۲۲۹۔ **تحفۂ عشاق** ۔ لکھنؤ۔ ماہواری گلدستہ۔۔، مالک معصوم علی محشر۔۔، اجرا، ۱۰ مئی ۱۸۸۴ء۔

۲۳۰۔ **ترجمان** ۔ ناگپور۔۔ ہفتہ وار، چار ورق اوسط۔۔، مالک عثمان خاں۔۔، اجرا، یکم مارچ ۱۸۸۴ء

۲۳۱۔ **ترجمان حقیقت** ۔ قصور، ضلع لاہور، ہفتہ وار، ۸ ورق۔۔۔ مہتمم ولی اللہ سکریٹری انجمن مفید عام۔ اجرائے اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۶ء

۲۳۲۔ **تجارت الاخبار** ۔ کلکتہ۔، ہفتہ وار، ۸ ورق اوسط۔، مالک احسان اللہ عرف بادشاہ کمپنی سوداگران۔ اجرا، یکم مئی ۱۸۸۰ء

۲۳۳۔ **تہذیب الاخلاق** :۔ علی گڑھ، پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط مالک سید احمد خاں۔ مہتمم منشی مشتاق حسین ۔۔، اجرا، ۱۸۷۰ء۔

۲۳۴۔ **تہذیب الآغاز** ۔ سیتاپور۔۔ ماہواری، ۸ ورق خورد۔۔ مجاریہ منی لال بلگرامی۔۔ ایڈیٹر۔۔، اجرا، یکم ستمبر

۲۳۵۔ **تہذیب** ۔ مرادآباد۔۔ ہفتہ وار، ۶ ورق اوسط۔، مالک راحت علی خاں ۔۔۔ ۱۸۸۲ء

۲۳۶۔ **تہذیب سخن** ۔ کمولاپور، ضلع امراؤتی۔۔، گلدستہ شعر و سخن، ۴ ورق خورد ماہواری۔۔، مارچ ۱۸۸۶ء

۲۳۷۔ **تہذیب سخن** ۔ کانپور۔۔ گلدستہ، ۸ ورق نہایت خورد، ماہواری، مالک شیخ احمد علی احمد۔۔ جولائی ۱۸۸۷ء

۲۳۸۔ **تصویر سخن** ۔ متھرا۔ شعر و سخن کا ماہواری گلدستہ، ۸ ورق خورد۔، مالک وسیع اللہ شوخ۔ یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۲۳۹۔ **تکمیل الحکمت** ۔ لاہور۔۔ ماہواری۔۔ ۱۴ ورق خورد۔، مالک حکیم احمد علی۔۔ ایڈیٹر ڈاکٹر سید امیر شاہ۔۔، یکم اپریل ۱۸۸۰ء

۲۴۰۔ **تکملہ** ۔ آگرہ۔ ۱۰ ورق خورد۔، ماہواری پرچۂ رسالہ فلاسفر کا تکملہ۔۔۔ مہتمم کرامت علی۔ یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۲۴۱۔ **تیرہویں صدی**۔ آگرہ ... ماہواری، ۱۲ ورق اوسط، مالک مولوی ناصر علی .. یکم جنوری

۲۴۲۔ **تفریح الناظرین**۔ آگرہ ...، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد ..، یکم جنوری ۱۸۵۶ء۔

۲۴۳۔ **تبیان الاخبار**۔ لکھنؤ..، ہفتہ وار، ۶ ورق خورد۔ مالک مرزا محمد علی اثنا عشری، اجرا ۱۸۸۱ء

۲۴۴۔ **تائید الاسلام**۔ ملقب بہ رد نیچیر و نصاری۔ فہرست مضامین وسبب اجرائے رسالہ (۱) سید احمد خان صاحب بہادر کا جھوٹ (۲) سید احمد خاں صاحب بہادر کی جہالت (۳) سید احمد خاں صاحب بہادر کا مذہب (۴) سید احمد خاں صاحب بہادر کی رائے تذبذب۔

مراد آباد..، ماہواری، ۱۰ ورق اوسط، مالک امجد علی ...، ایڈیٹر قاضی احتشام الدین ...، اجرا یکم شعبان ۱۲۹۸ھ/ ۲۹ جون ۱۸۸۱ء۔

۲۴۶۔ **تعویذ**۔ متھرا، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد..، مالک بانکے لال زار بدایونی، اجرائے اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۲۴۔ **تیس مار خاں**۔ لاہور..، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد..، مالک سردار علی اختر..، اجرا ۶ جنوری ۱۸۸۶ء

۲۴۔ **جام جہاں نما**۔ کلکتہ..، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط..، مالک غلام حسین مہتمم منصور حسین..، اجرا ۱۸۴۲ء

۲۴۔ **جام جہاں نما**۔ لکھنؤ..، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط..، مالک کشن چند قیصر..، اجرا یکم اگست ۱۸۸۳ء۔

۲۴۔ **جام جمشید**۔ مراد آباد..، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط..، مالک مشیر الدولہ سفیر الملک سید قاضی جمشید علی نجم..، اجرا ۱۸۷۶ء

۲۵۔ **جام الحق**۔ دہلی..، مجاریہ انجمن انصاری، ماہواری، ۸ ورق خورد..، اجرا اشتہار یکم مئی ۱۸۸۳ء

۲۔ **جامع الکلام**۔ لکھنؤ..، پندرہ روزہ، ۸ ورق اوسط، حسب الارشاد راجہ امیر حسن خاں.. رئیس محمود آباد ۱۸۷۲ء

۲۔ **جامع مسائل علم طب**۔ گوجرانوالہ، ۱۰ ورق خورد، ماہواری، مالک سردار بوٹا سنگھ سوداگر، ایڈیٹر حکیم ماشی علی ..، ـــــ ۱۸۸۳ء

۲۔ **جامع العلوم**۔ مراد آباد، ماہواری، ۸ ورق خورد، مالک نرائن داس..، یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۲۔ **جامع الاخلاق**۔ لکھنؤ..، پندرہ روزہ، ۴ ورق اوسط..، مالک سید محمد حسین اغلب موہانی..، ایڈیٹر سید نظام علی..، ۱۵ مارچ ۱۸۸۴ء۔

۲۱۔ **جادو**۔ دہلی..، شعر و سخن کا ماہواری ۶ ورق کا رسالہ..، مالک رکن الدین جاوید، مہتمم بدیع الزماں شیون ..، ــــ یکم جنوری ۱۸۸۵ء

۱۔ **جریدۂ اعلامیہ**۔ حیدر آباد دکن، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مہتمم مرزا زین العابدین شیرازی..، دولت آصفیہ کے جملہ احکامات (گزٹ)..، ۱۸۶۹ء۔

۱۔ **جریدۂ روزگار**۔ مدراس، دوسرے روزہ۔ ۲ ورق کلاں..، مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی، اب ہفتہ وار، اجرا ۱۸۷۵ء۔

۲۵۸- جریدہ نمائش ۔ کلکتہ... ہفتہ میں دو بار... دو ورق اوسط... صرف بغرض اشاعت نمائش ... اجرا یکم نومبر ۱۸۸۳ء سے آخری فروری ۱۸۸۴ء تک۔

۲۵۹ جریدہ وطن کلکتہ، ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط، مالک فرید الحق۔ اجرا اشتہار یکم جولائی ۱۸۸۴ء۔

۲۶۰- جریدۂ انتظامیہ۔ احکام مصدرہ محکمہ نیابت ریاست بھوپال مجاریہ نواب عبداللطیف خاں صاحب، سی، آئی ای سکریٹری انجمن اسلامیہ کلکتہ، ۲ ورق اوسط، ماہواری اجرا یکم ماہ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء

۲۶۱- جعفر زٹلی ۔ (اشتہار مجریہ غلام احمد خاں بریاں از قصبہ جھجر بر ہانہ۔ ضلع رہتک، پنجاب۔ ۸ یکم جولائی ۱۸۸۵ء سے شروع ہوگا۔)

۲۶۲- جعفر زٹلی ۔ لاہور۔ ورق ۴ مہینہ میں چار دفعہ ..، اجرا ۴ مارچ ۱۸۸۷ء۔

۲۶۳ جلوۂ طور۔ میرٹھ ..، ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ... مالک گینڈی لال ..، اجرا ۱۸۶۱ء۔

۲۶۴- جلوۂ ایزدی ۔ میرٹھ، ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں .. ،مالک محمد خلیل ..، یکم فروری ۱۸۸۶ء

۲۶۵ جلوۂ سخن ۔ مدراس ..، عشرہ وار ..، مالک سید علی قادر بہار ... یکم فروری ۱۸۸۷ء۔

۲۶۶- جموں گزٹ ۔ سری نگر... ہفتہ وار اوسط، مجاریہ سید نثار علی شہرت ..، یکم جنوری ۱۸۸۴ء

۲۶۷- جھجر پنچ ۔ جھجر ضلع رہتک ..، ہفتہ وار، ۲ ورق خورد ..، مالک غلام احمد خاں، ایڈیٹر غلام محمد خاں اجرائے اشتہار یکم ستمبر ۱۸۸۴ء۔

۲۶۸ جونس گزٹ ۔ لکھنؤ ... ہفتہ وار، ۴ ورق اوسط ..، مالک کرشن چندر قیصر ..، ۸ جنوری ۱۸۸۴ء۔

۲۶۹- جوہر سخن ۔ حیدرآباد، ۱/۴ ورق خورد، ماہواری شعر و سخن کا گلدستہ ..، مالک عبداللہ خاں ضیغم ..، ۱۹ مئی ۱۸۸۵ء

۲۷۰- جوبلی پیپر ۔ لکھنؤ ... پندرہ روزہ ...، مالک حکیم سید حسن جعفر صاحب جاہ ... ، بیادگار جشن جوبلی قیصر ہند۔

۲۷۱- جوبلی گزٹ ۔ میرٹھ، ہفتہ وار۔ ۴ ورق اوسط ..، ناگری مشترک ... ایڈیٹر کشن سروپ ..، ۲ اگست ۱۸۸۷ء

۲۷۲- جے پور گزٹ ۔ جے پور، ہفتہ وار، ۴ ورق کلاں ..، ایڈیٹر و مالک بند لال ... اجرا ۱۸۷۹ء

۲۷۳ جیون دھرم ۔ لاہور ..، پندرہ روزہ۔ چار ورق اوسط ..، مالک پنڈت شیو نرائن اگنی ہوتری۔ ایڈیٹر برمھا دیوی ستیانند اگنی ہوتری ..، اجرائے ۱۳ جنوری ۱۸۸۳ء

۲۷۴- جین پرکاش ہندوستان :۔ قصبہ فرخ نگر ضلع گوڑگانوں ..، مالک پنڈت چودھری جینی جیالال ..، ماہواری، ۴ ورق خورد۔ ناگری مشترک ... یکم مئی ۱۸۸۴ء

۲۷۵ چشمۂ خورشید ۔ سیالکوٹ، پندرہ روزہ، چار ورق اوسط ..، اجرا اپریل ۱۸۸۷ء، مہتمم دیوان چند۔

۲۷۶- چشمۂ فیض ۔ سیالکوٹ، ہفتہ وار، ۲ ورق اوسط .. یکم جولائی ۱۸۸۳ء، مہتمم دیوان چند۔

محمد مصطفیٰ
(علی گڑھ)

غالب اور فقہ

خلاصہ یہ کہ خدا تو خدا ہے ، بندۂ خدا کا ملنا بھی کارے دارد ، عارفین کاملین کی صحبت میسّر آنا چیزے دیگر اور
عین کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنا چیزے دیگر، جو لوگ قولاً و فعلاً یا حالاً طمطراق دکھاتے ہیں وہ اکثر بے بہرہ ہوتے ہیں ؎

اے مرغِ سحر عشق زپروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند — کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

مسلّمہ ہے کہ شاہد کی کمر نازک ہوتی ہے اور جب کمال نزاکت دکھاتے ہیں تو "کمر" کو بال سے زیادہ باریک
تے کرتے معدوم قرار دیتے ہیں ؎

کیا ہے جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

اب ہستی مطلق چونکہ شاہد ہے اس کی کمر بھی ہونا ضروری اور ایسی ویسی نہیں بلکہ نہایت نازک اور وہ ہے ،
عالم، جس کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ وہ مثل چھوئی موئی کے ہے۔ اس لئے "ہے" بھی اور "نہیں" بھی، پس
سے شاہد مطلق کے ساتھ وہی نسبت ہوئی جو کمر کو سراپائے محبوب کے ساتھ ۔
مرزا اور ترقی کرتے ہیں کہ ہم تو برائے نام بھی اس کے قائل نہیں کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے ، کیونکہ
الم تو یکسر عدم ہے ، کسی لحاظ سے بھی اس پر وجود کا اطلاق درست نہیں ۔
فلسفے کے شیدائی غور کریں گے کہ تصوریت Idealism میں یہ مضمون اس خوبی ، اس شیرینی اور اس
اکت کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے یا نہیں ۔ بیّنو توجدو !

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں؟

یہ شعر خلوص عاشقانہ اور تسلیم و رضائے مشتاقانہ میں کس قدر ڈوبا ہوا ہے ، عاشق کے جگر میں محبوب کے
بت نازک سے ایک زخم لگا ہے بہت وسیع ، دامن دار ، گہرا اور کاری ، تماشائیوں کا ایک مجمع ہے کہ اسے دیکھ رہا
ہے ، کوئی کہہ رہا ہے ، افسوس اسے کس نے مارا ، کون ایسا سفاک ہے ۔ اللہ ہی ہے جو یہ غریب اب بچے ۔

عاشق کو نہ اس کی پروا ہے کہ زخم جاں کاہ ہے نہ یہ شکایت ہے کہ محبوب بے وفا ہے، اسکی وصیت ہے
تو یہ کہ ع ۔ رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے ، ہاں غم ہے تو بس یہی اور وہم ہے تو محض یہی کہ محبوب کے دست
و بازو کو لوگوں کی نظر نہ لگ جائے کہ ایسا ضرب کا لگانے والا اور ایسا جنیو کا ہاتھ مارنے والا کوئی بڑا ہی شہ زور ہے
عارفین کاملین پر بھی ایسے واردات گزرتے ہیں ، امراض ہیں کہ لاعلاج ۔ لوگ ہیں کہ عیادت کو آرہے اور
دارو درمن کر رہے ، کوئی کہتا ہے یا اللہ ہم ایسے گنہگار مبتلائے مصائب ہوں تو ہوں صدقے جائیے تیری مشیت کے
کہ اپنے محبوب نبیوں پر بھی اس طرح لطف و کرم کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔
اس لئے بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات چاہتے ہیں کہ کوئی ان کے حال سے واقف نہ ہو اور وہ
احکام قضا و قدر کے سامنے رضامندی کی گردن جھکائے رہیں ؎

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۵۳۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں ، خلوت ہی کیوں نہ ہو

حضرات نقشبندیہ کے اصول میں " خلوت در انجمن " بھی ہے ، ع ، ادھر مخلوق میں شامل ، ادھر اللہ سے واصل ،
مرزا صاحب نے ان کا حال جو اس درجے کے نہیں ہیں قلم بند فرمایا ہے ، یعنی " انجمن در خلوت " منعقد کی ہے ،
فرماتے ہیں انسان کو خطرات قلبی اور خیالات ماسوا پر قابو پانا بہت مشکل ہے ۔ بظاہر وہ خلوت ہی میں سہی
تاہم حقیقتہً وہ انجمن میں ہے ۔ کیونکہ خیالات کا ایک ہجوم ہے جو امڈا ہوا چلا آرہا ہے ، ایک طوفان ہے کہ اس کے
قلب کو سکون سے محروم رکھنے کے لئے اندر ہی اندر شور کر رہا ہے ۔
ظاہری انجمن میں تو وہ آنکھوں کے دروازے بند کر کے صورتوں سے اور کانوں کے دریچے بند کر کے آوازوں
سے محفوظ رہ سکتا تھا ۔ یہاں اس انجمن میں دیو پیکر خیالات اور شیطان صفت خطرات سے کھیل کر حصار عافیت
میں رہے ؎

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است	ہشدار و گوش دل بہ پیام سروش دار

۵۴۔ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے ، وحشت ہی کیوں نہ ہو

بعض لوگوں نے تارک الدنیا ہونے کے معنی یہ سمجھ لئے ہیں کہ یگانوں سے بیگانے ہو جائیں ، مخلوق سے ترک تعلقات
کر دیں اور شہر اور بستی چھوڑ کر جنگل میں دھونی رمائیں ۔
ان لوگوں کے حق میں مرزا کا یہ قول آب حیات سے کم نہیں ، کہتے ہیں اے بیراگی یا اے سادھو یہ طریقہ حکمت
اخلاق ، تمدن بلکہ منشا ء قدرت کے خلاف ہے کہ تو صلۂ رحم نہ کرے ۔ خدمت عیال اللہ کے محبوب مشغلے کو ترک

ے محض اس لئے کہ میں علائق سے وارستگی اور آزادی چاہتا ہوں، یہ علائق عوائق نہیں ہیں۔ اگر تجھے
ہی کرنی ہے تو اپنے ہی نفس سے کر (حالانکہ اس کا بھی ایک حد تک تجھ پر حق ہے) یہ کونسی خوبی ہے کہ
مخلوق سے وحشت اور اپنے نفس سے اُنس و الفت، اللہ کے بندے تو غیروں کو اپنے نفس پر مقدم
ہیں اور فقر و فاقہ میں بھی ایثار ان کا شیوہ ہے (وَیُؤثِرُونَ علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔
(قرآن کریم)

مشائخ کا قول ہے" اعدیٰ عدوک نفسک التی ھین جنبیک" سب سے بڑا دشمن تو نفس امّارہ ہے۔
ے ہو تو اسی سے، غفلت ہو تو اسی سے، وارستگی ہو تو اسی سے۔ بیگانگی ہو تو اسی سے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھایئے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے

صد کثرت کا افادہ کرتا ہے، اور غیر محدود ہے Definite used indefinitely ددید
مصدر ہے۔ یہاں بمعنی 'دیدار' ہے ہے اگر انسان آنکھ اُٹھا کر دیکھے تو مناظر و مظاہر فطرت میں کہ
تجلیات الٰہی ہیں بے شمار جلوے دیکھے گا اور بالآخر اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ میں کماحقہٗ 'دیدار' کی
نہیں رکھتا، فارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً و ھو حسیرٌ (قرآن)
نگاہ ماندہ و حیران ہو کر ناکام واپس آئے گی،" مژگاں اٹھانا" استعداد و عزم و عمل کی جانب اشارہ ہے
دید کا احسان" بتا رہا ہے کہ اس وقت بھی جو 'دیدار' ہے وہ بھی ایک احسان ہے، معاوضہ نہیں، اب
فَ تُوَلُّوا فثمَّ وجہُ اللہ کو بھی تبرکاً اور تدبراً پڑھ لیجئے۔

دیوار بارِ منّت مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احسان اُٹھایئے

شعر ماسبق میں احسانِ خالق کا ذکر تھا۔ جس سے انسان سبکدوش ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ انسان کا وجود
احسان الٰہی ہے اور اس شعر میں مخلوق کے احسان کا ذکر ہے۔ کہ حتی الامکان اس سے گرانبار نہ ہونا
کیونکہ الانسان عبد الاحسان" پس مناسب یہی ہے کہ ایک ہی کا بندہ بنے۔
شاعر نے اس کی دلیل نہ عقلی دی نہ نقلی، بلکہ ایک پیش پا افتادہ چیز پر نظر غائر ڈالی اور اپنے دعوے
نت میں اُس کو پیش کر دیا، یعنی دیکھ لو دیوار کو کہ وہ جھکی پڑتی ہے، آخر کیوں، اس لئے کہ اس پر
بارِ احسان ہے، نہ وہ اس کو بناتا نہ سر بلند کرتا نہ یہ حالت ہوتی۔
اللہ اکبر! غریب مزدور اور اس کے احسان میں بھی یہ قوت کہ سر بفلک دیوار کو جھکائے دیتا ہے۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اٹھایئے

جب جب میں نے سنا کہ" براتِ عاشقاں بر شاخ آہو" تو گونہ صدمہ ہوا کہ یہ بے چارے محروم ہی

رہتے ہیں ۔ الحمد للہ مرزا کی زبان سے سُن لیا تو اطمینان ہوا کہ ان حضرات کو توجنونِ عشق کے آذوقہ کے لئے ایک نہیں بلکہ بہت سے "چیک" ملتے ہیں جن کے وصول کرنے سے ان کا جنون پنپتا رہتا ہے اور وہ کیا ہیں! پتھر جو لڑکے ان پر مارتے ہیں کہ " دیوانہ ہے دیوانہ !

عجب نہیں جو اس شعر میں ملامیّت کا بیان ہو، اور " طفلان "سے مراد ہوں وہ غیر بالغ النظر اہل ظاہر جو حقیقت کار سے واقف نہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ ملامتی حضرات کو مخلوق سے طعن و تشنیع سُننے میں بہت لطف آتا ہے ، اور تسترّ احوال اور صبر کی بنا پر ان کے مراتب میں بھی اضافہ ہوتا ہے ۔

۳۴ گر خامُشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ایک زمانہ تک میں یہ سمجھتا رہا کہ مرزا نے اپنی دقّت پسندی اور مُغلق کلام کی تعریف کے لئے ایک پہلو نکالا ہے کہ میرا کلام اس لئے مشکل ہے کہ قال میں بھی اخفائے حال رہے ۔ تاکہ ذوق تکلم سے بھی تلذذ رہے اور اخفائے حال کی وجہ سے خاموشی کی برکات سے بھی تمتع رہے ۔ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مُدّعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

آج مجھے اس شعر میں ایک دوسرا پہلو بھی نظر آیا کہ من عرف اللّٰہَ کلّ لسانہ عرفائے کاملین کے بعض اقوال اور مقالے علمائے قشر کی فہم سے باہر ہوتے ہیں ، (حالانکہ وہ قرآن وحدیث کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور وہ ایسا اسلوبِ کلام اس سبب سے اختیار کرتے ہیں کہ اہل مستفید ہوں اور نا اہل محروم رہیں ۔

۳۵ • ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

میں ایسی بات کے فریب میں نہیں آتا ، کیونکہ جب تمام عالم حلقۂ دام خیال ہے تو یہ بات بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی ، پھر میں نے تو یہ پڑھا ہے ربّنا ما خلقتَ ھذا باطلاً ، ہاں اگر معنی یہ ہیں کہ عالم کا وجود وجوب ذاتی نہیں رکھتا تو صحیح آمنّا وصدقنا کلّ شیٔ ھالک الا وجھہ

۳۶ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

اللہ جلّ شانہ بے نیاز ہے واللہ غنیٌّ عن العالمین ، اور وہ اپنے پیارے نبی سے فرماتا ہے فلا وربّک لا یومنون الآیہ یعنی کمال ایمان کے لئے لازم ہے کہ امور تکوینی اور خدا و رسول کے احکام تشریعی میں راضی برضا رہے اور سر تسلیم خم رکھے ۔

۳۷ بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

والعصر ان الانسان لفی خسر الآیۃ ، بے شک عمر ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ، جو لمحہ یاد الٰہی

غفلت میں گزرے۔ انسان کے لئے باعث حسرت ہے۔ اہل جنت کو کسی بات کی حسرت نہ ہوگی سوا اس کے کہ کاش اور زیادہ یادِ خدا کرتے۔

۳۸؎ کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی　　آئینہ دار بن گئی حیرت نقشِ پا کہ یوں

مقام قرب کے آداب کا بیان ہے، تغزل کی زبان میں، کوے وکوچہ میں نقش پا ہوتے ہیں اور کوئے یار میں تو بدرجۂ اولیٰ کہ رہگذر ہے۔ طالبانِ باوفا اور سالکانِ باصفا کی، نقش پا کو جب مجسم مانتے ہیں (Personified) تو حیرتی کہتے ہیں (جس طرح آئینہ کو بھی حیرتی باندھتے ہیں)، اور نقش پا ظاہر ہے کہ خاک نشیں و خاکسار ہوتا ہے، پامال ہوتا ہے، اور اُف تک نہیں کرتا، بلکہ اوروں کی خاموش زبان سے رہنمائی کرتا ہے۔

انگلستان کا ایک مشہور شاعر (غالباً لانگ فیلو) کہتا ہے۔

Lives of great men all remind us,
We can make our lives sublime,
And departing leave behind us,
Footprints on the sands of times.

مطلب یہ ہے کہ کوچۂ جاناں میں رہنے کے آداب واصول سے میں نابلد تھا کیونکہ وہاں رسائی ابھی ہی ہوئی تھی۔ کہ "نقش پا" کی حیرت نے مجھ پر یہ امر آئینہ کر دیا کہ اس طرح خاک میں مل کر، اور جلوۂ محبوب سے متحیر و مبہوت ہو کر رہا کرتے ہیں،

اب یہ نقش پا زید کے ہیں، خالد کے ہیں، یا غالب کے ہیں، یہ تعین ترجیح بلا مرجح ہے، اگر پہلی صورت ہے تو وہ حضرات السابقون الاولون ہیں، جن کے نقش قدم پر دوسرے چلتے ہیں، اور دوسری شکل ہے تو بھی درست ہے کیونکہ انسان اپنے آثار و حرکات وسکنات سے بھی نظر عبرت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے ؎

بند آنکھیں کئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے　　ہے ترا نقشِ قدم راہ نمائی کرتا

مشائخ کا قول ہے، مقرباں را بیش بود حیرانی۔

۳۹؎ نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا　　جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

محبوبِ حقیقی کو برقِ حسن سے تعبیر کیا ہے۔ حدیث شریف کا مضمون بھی اسی کے قریب قریب ہے کہ اگر حجابات مرتفع ہو جائیں تو تمام عالم سوخت ہو جائے، جوش بہار میں کیا ہوتا ہے؛ ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا، کہتے ہیں کہ یہ مظاہر حسن تجلیات الٰہی کے لئے آئینہ نہیں، بلکہ نقاب ہیں گل محبوب ہے تو بلبل کا، لیلیٰ محبوب ہے تو

قیس کی، شیریں معشوقہ ہے تو فرہاد کی، ہمارا محبوب ان سب سے وراء الوراء ہے، اِن کا نظارہ تو اس کے لئے نقاب ہے، مانع ہے۔ حجاب ہے۔

اے طالب دیدار اگر تو اپنی پاک نظروں سے اس نقاب کو الٹ بھی دے جو تیرے بس کی بات نہیں تو یاد رکھ برقِ حسن تجھ کو جلا کر رہے گی، کیا طور کا واقعہ سُنا نہیں ؟ حضرت موسیٰ کی بیہوشی دیکھی نہیں ؟

۴۰ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

مسکنت کی بادشاہی پر اور قناعت کی دولت پسندی و امارت پر ترجیح اور اس حکیمانہ طرز پر کہ عالم اور عامی دونوں اس پر صاد کردیں بے شک اس قابل ہے کہ ساکنانِ عالم بالا بھی اس کی داد دیں تو عجب نہیں ۔

یہ تو مشہور ہے ہی کہ جمشید کا پیالہ عجیب و غریب تھا۔ جسے حکما نے اس کے لئے ترکیب دیا تھا، بیشک یہ عزیز الوجود، بے نظیر اور بے بدل تھا، اب اس کے مقابلے میں ایک دوسرا پیالہ ہے جو اتنا ہی ادنیٰ و اسفل ہے جتنا کہ جام جم اعلیٰ تھا اور وہ ہے ایک غریب مسکین کا مٹی کا پیالہ، ایک ماٹی کے ڈھیر کا پیالہ،

اس بھری پُری دُنیا میں کون ہے ایسا جو اپنے مٹی کے پیالے کو دل سے لگائے اور جام جم سے بھی زیادہ، ہاں وہ شخص جس نے من قنع شبع (جس نے قناعت اختیار کی وہ سیر ہو گیا) کا درس سُنا ہے، اور علم وراثت سے بھی بہرہ یاب ہوا ہے نہ اپنے ہی دل کو آسودہ رکھ سکتا ہے بلکہ دوسروں کے ذہن و فہم کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔

یہاں بھی اس عمل کا مظاہرہ ہے کہ دو کوڑی کے پیالہ نے جام جم کو مات کر دیا، اور اس مضبوط دلیل سے کہ جام جم ٹوٹ جائے تو پھر کہاں اور مٹی کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو کیا مضائقہ، تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی !!

۴۱ بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

عاشقی معشوقی کو طاق پر رکھئے، میں تو فقیری کا ذکر کر رہا ہوں، فقیر دو قسم کے ہیں ایک در بدر بھیک مانگنے والے۔ دوسرے اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے۔ بعض نے اس فرق کا لحاظ کر کے پہلے گروہ کا نام درویش رکھا ہے (دال کے زبر سے) اور دوسرے زمرے کا نام دُرویش (دال کے پیش سے)

شعر میں دونوں پہلوؤں کا امکان ہے، گدیہ گروں کو یہ سبق دیا ہے کہ اپنی آبرو ریزی نہ کرو، زور بازو سے پیدا کرو۔ کھاؤ اور کھلاؤ، اور حقیقت میں معذور ہو تو نگاہ درویشاں عین سوال است، کوئی نہ کوئی اللہ کا سخی تم پر نظر کرم کر ہی دے گا ؎

رحم آگیا کریم کو محتاج دیکھ کر حاجت ہی اس غریب کی حاجت روا ہوئی

اور اللہ والے گروہ کا (جس کو حزب اللہ کہنا چاہیئے) یہ ذکر ہے کہ حق سبحانہ تعالےٰ کے محتاج تو سب ہیں

شاہ بھی گدا بھی، اولیا بھی انبیا بھی، لیکن مقربان خدا کا مطلوب محض خدا، اور رضائے خدا ہے۔ وہ احتیاج بشری کے اظہار کے واسطے دست دعا دراز کرتے ہیں، لیکن دل راضی برضا ہوتا ہے، علمہٗ بحالی حسبی من سؤالی۔ اصل یہ ہے کہ طالب صادق تکمیل وفا کے بعد خود مطلوب ہوتا ہے اور مطلوب کا مطلب بیشتر بے طلب حاصل ہوتا ہے، اور اس مزے کو ناز و نیاز والے ہی خوب، پہچانتے ہیں۔

۴۲
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

کیا یہاں تحقیر یہ ہے، ارباب طب قائل ہیں کہ خون اور وہ اور شرائیں کے ذریعہ تمام بدن میں دورہ کرتا اور تمام اعضا کو سیراب و شاداب کرتا ہے، اخلاط اربعہ میں یہ سب سے افضل ہے۔ حتیٰ کہ بعض کے نزدیک تو زندگی دوسرا نام ہے خون کا۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے نزدیک تو خون کی تعریف یہ ہے کہ آنکھ سے ٹپکے، محض رگوں میں دوڑنا پھرنا اور آنکھوں سے نہ ٹپکنا خواہ اطبائے متفلسفین کے مذہب میں باحث حیات ہو لیکن احبائے مشتاقین کے مشرب میں تو ضرور علامت ممات ہے۔ ان کے یہاں تو زندگی بس یہ ہے ؎

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

اس سے ظاہر ہوا کہ جو خون آنکھ سے ٹپکے اور کسی کے عشق میں بہے وہ صالح و محمود ہے اور جو رگوں ہی میں دوڑتا پھرے اور آنکھوں سے دور دور رہے وہ ردی و فاسد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گریہ و زاری و اشکباری پر بہت سی کامگاری موقوف ہے۔ مولاناؒ ؎

تا نگرید ابر کے خندد چمن تا نگرید طفل کے جوشد لبن

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند میل مارا جانب زاری کند

عارف شیراز خواجہ حافظؒ ؎

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است بایں راہ و روش می رو کہ با دلدار پیوندی

اور دلدار کون ہے، جو دل کا مالک، خالق، اور قدردان اور وہ حق سبحانہ تعالیٰ۔ مولاناؒ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار عشق را با حیؒ با قیوم دار

قرآن پاک میں بھی ایسے رونے والوں کی تعریف ہے سُجَّداً وَّبُکِیّاً اور مشائخ کے ملفوظات میں ہے۔ رکعتان فی العشق لا یصح وضوئھما الا بالدم عشق کی نماز دوگانہ کے وضو کے لئے خون افشانی لازم ہے ؎

جسے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

۱۴۳ اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

رسوائی جو لوازم مستی سے ہے کسبی نہیں، وہبی ہے ؎

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند — ما دل بہ عشوۂ کہ دہیم؟ اختیار چیست

جب محبوب چاہتا ہے تو ذرا سی جھلک دکھا کر کیا سے کیا کر دیتا ہے ؎

آوارہ و مجنونے، رسوا سر بازارے

۱۴۴ کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

یہ تمام جلوے پردے ہیں شاہد حقیقی کے رُخ انور پر، کون اِن پردوں کو اُٹھا کر اسے بے نقاب و بے حجاب دیکھ سکتا ہے۔

پردہ درِ کعبہ کا اُٹھانا تو ہے آسان — پر پردۂ رخسار صنم اُٹھ نہیں سکتا

شیخ ابن فارض قصیدۂ تائیہ صغری میں فرماتے ہیں:

مُسربلۃُ بُردینِ قلبی و مُہجتی

محبوبہ دو چادریں اوڑھے ہوئے ہے یعنی میرا دل اور میری روح

۱۴۵ ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اس شعر نے 'ہمہ اوست' کے معانی کا مطلع بالکل صاف کر دیا۔ پہلا مصرع گویا ترجمہ ہے آیت کریمہ کا فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ" اور دوسرا مصرعہ بھی ترجمہ ہے آیت کریمہ کا "لیس کمثلہٖ شیٔ"

اب تو عینیّت کے احتمال کی کوئی گنجائش نہ رہی، ہر ایک شئے میں تو ہے، بیان ہے وہو الظاہر والباطن کا اور یہ ظاہر ہے کہ ظاہر و مظہر میں تغایر ہوتا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں کمال تنزیہ و تقدیس کی صراحت ہے۔

جب آئینہ مجلّی جو آفتاب کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ فیضانِ شمسی سے تجلّی زار بن جاتا ہے تو بادی النظر میں کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ بھی آفتاب یا جگر گوشۂ آفتاب ہے لیکن حقیقت بین نگاہوں پہ یہ امر آفتاب کی طرح روشن ہے کہ چراغ مردہ کجا، نور آفتاب کجا۔

اسی طرح بعض حضرات قدسی صفات کے قلوب مُصفّیٰ مبدأ فیاض کی تجلیات صفائی سے متجلّی ہو کر مخلوق کے حق میں بمنزلۂ آئینہ آتشیں ہو جاتے ہیں، کسی سے صفت احیاء موتی کا ظہور ہوتا ہے، مایوس العلاج مریض بھی ان کی دُعا سے شفایاب ہوتے ہیں۔ (مثلاً جناب عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور کسی کے فیضان سے قلوب مُردہ زندہ ہو جاتے ہیں، علوم و معارف و حقائق کے خزانے کھل جاتے ہیں، عالم جمادات و نباتات و حیوانات، حتیٰ کہ کائنات انجم و سماوات اور ملأ اعلیٰ میں بھی ان کی سربلندی کے شہادت نامے پیش کئے جاتے

ہیں، تحسین و آفرین و تبریک کے نیاز نامے گزارے جاتے ہیں (مثلاً جامع صفات و محاسنِ نبوت سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن بایں ہمہ وہ حضرات رہتے ہیں مخلوق ہی، نہ وہاں استحالہ ہے نہ حلول نہ پرتجدسی تو کوئی شئے نہیں ہے

۴۴؎ کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردہ میں لاکھ گل کے جگر چاک ہوگئے

حدیث پاک میں ہے کہ جب بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں، اللہ اکبر! کیا کہنا اس قدردانی کا، اس قدر افزائی کا۔

یہ ناچیز عرض کرتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ مؤثر ہے، متاثر نہیں، نالۂ بلبل نے تو گل کو جگر چاک کردیا لیکن یہاں ہمارے اقوال، افعال، اور احوال کا اس پر کچھ اثر نہیں واللہ غنی عن العالمین بہرحال جو کچھ اہل محبت پر ظاہر ہوتا ہے وہ محض لطف و کرم ہے۔ مولانا؎

میلِ معشوقاں نہانست و ستیر — میلِ عاشق باد و صد طبل و نفیر

اے خنک آں کو نکوکاری گرفت — زور را بگذاشت، او زاری گرفت

با تفرع باش تا شاداں شوی — گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی

اے خوشا چشمے کہ آں گریانِ اوست — وائے ہمایوں دل کہ آں بریانِ اوست

۴۷؎ ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

جب برق جمال نظارہ سوز ہے تو تماشائی کی نگاہ یقیناً ناکام رہے گی، (اور جاتی بھی رہے تو عجب نہیں) بے شک ان عنصری آنکھوں سے کوئی محبوب حقیقی کا دیدار اس عالم میں نہیں کرسکتا، اسی مضمون کو تاکید کے ساتھ "لن ترانی" سے ظاہر فرمایا ہے، یہاں ناکامیٔ نگاہ خبر مقدم ہے اور برق نظارہ سوز مبتدا ے مؤخر،

رہا معراج شریف میں دیدار باری، تو بعض کے نزدیک تو وہ رویت قلبی تھی نہ کہ عینی اور اکثر کے نزدیک جو عینی تھی اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق عالم دنیا سے نہیں تھا، اور آخرت میں تو مؤمنین بھی اس سے شرف یاب ہوں گے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم۔

۴۸؎ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

انسان تجلی گاہ اعظم ہے اور حقیقت محمدیہ (علی صاحبہا الف سلام و تحیہ) اس کا مظہر اتم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقت کلیہ نے جب چاہا کہ عالم ناسوت کو اپنا جلوہ زار بنائے تو حضور پر نور محمد صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ کو پیدا کیا تاکہ ظاہر و مظہر میں مناسبت کاملہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ کا وجود باجود نہ ہوتا تو عالم امکان بھی نہ ہوتا۔

۲۹ ؎　　اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جہاد دو قسم کا ہے، ایک اصغر دوسرا اکبر، اور دونوں کے مجاہدین اور شہدا رضی اللہ عنہ رفیع القدر ہیں — "تیرے شہیدوں" کا اشارہ اس جانب ہے کہ یہاں ذکر ہے۔ کشتگانِ کربلائے محبت کا، جن کا مطمحِ نظر نہ حور ہے نہ قصور، بلکہ رضائے محبوب پر جاں نثاری، اگر حوریں ان کو حسرت کی نگاہ سے دیکھیں تو کیا ہوا، یہ تو عاشقانِ الٰہی ہیں، عرفی ؎

در چمن ہائے محبت ہر قدم چوں کربلا　　از نسیم عشوہ فرش ارغواں انداختہ

ولہ ؎　　حُلّہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت　　تا شہیدانِ تو خونیں کفنے ساختہ اند

ن ؎　　جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن　　بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

انسان کو ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن محبوب کی یاد میں ڈوبا ہوا رہے تو ع

عمرِ خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی

بزرگوں نے اس کا نام مراقبہ رکھا ہے، یعنی دل کو یادِ محبوب سے پُر نور اور خیال ماسوا سے دور رکھنا، قرآن کریم میں ہے واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون، اور اس میں کثرت کی صراحت ہے اور والذین ھم فی صلاتھم دائمون میں دوامِ ذکر کا اشارہ ہے،

ا ؎　　دیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتبِ غمِ دل یا درسِ عشق، بالفاظ دیگر، علم سینہ کی وسعت کا بیان ہے کہ مدت سے سبق لیتا ہوں، اور سبق بھی یہ ہے کہ رفت گیا اور بود تھا، یعنی ہنوز مبتدی ہوں، ماضی کو یاد کر رہا ہوں "ہائے دل گیا، ہائے دل گیا" ورد زبان ہے، دل جواب دلدار کے پاس ہے کبھی ہمارے پہلو میں بھی تھا۔ یہ کب گیا اور کیونکر گیا یاد نہیں۔

مراد یہ ہے کہ عاشق ہوئے مدت ہوگئی، لیکن ہنوز تکمیلِ عشق نہ کر سکا، اور مرتبۂ فنا سے مقامِ بقا تک نہ پہنچ سکا، نہ دل میرے پاس، نہ میں دلدار کے پاس،

صوفی کو نقدِ وقت کا لحاظ لازم ہے، مولنا ؎

تو مگر خود مردِ صوفی نیستی　　نقد را از نسیہ خیزد نیستی

دیکھئے، سات سمندر پار کا ایک شاعر بھی یہی مضمون ادا کر رہا ہے۔

Trust no future, howe'er pleasant,
Let the dead past, bury its dead,
Act, act in the living present.
Heart within & God o'erhead.

Not enjoyment and not sorrow
Is our destined end or way.
But to act that each tomorrow
Find us farther than today.

۵۲ چاہئے اچھوں کو جتنا چاہیئے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

اچھوں سے مراد ہیں نیک لوگ، آپ کہیں کہ نہیں، اس سے مراد ہیں حسین، تو میں کہوں گا کہ ضد اچھی نہیں، اور آپ نہیں مانتے تو یہ بھی سہی اور وہ بھی سہی۔

کہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے حسینوں سے محبت کیجئے، یاوریٔ قسمت سے یہ آپ کو چاہنے لگیں تو بس سب کچھ پا یا۔ کوئی نعمت اس سے بڑی ہے ہی نہیں۔

ارشاد ہے کہ طالب صادق تکمیل محبت کرے، اور دوسرے مصرع میں ہمت افزائی ہے کہ اس تکمیل کے بعد محبوب کا محبوب بن جائے۔ مرید سے مراد ہو جائے اور منزلِ " فاتبعونی" سے مقام (یحببکم اللہ) پر نائز المرام ہو " گر" کی شرط استغنائے محبوب کی مشعر ہے۔ مطالب یہ ہے کہ طالب کو اپنے عمل پر تکیہ نہ چاہیئے۔ بلکہ محبوب کے لطف وکرم کا منتظر رہے۔

ماهنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

سنہ ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبد اللہ | مولانا سعید احمد اکبرآبادی | میاں بشیر احمد | خواجہ غلام السیدین
رئیس احمد جعفری | ماہر القادری | فرحت کاکوروی | نواب مشتاق احمد خاں
ڈاکٹر محشر عابدی | ڈاکٹر احسن فاروقی | سید شبیر علی کاظمی | ڈاکٹر وزیر آغا
سید قدرت نقوی | رئیس امروہوی | اور دیگر اہلِ قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

"مرقع عبدالحق" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد نادر و نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

"بزم عبدالحق" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیاز مندوں کا تذکرہ

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

* آفسٹ کی چھپائی * عمدہ سفید کاغذ * صفحات ساڑھے تین سو * قیمت چھ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

اپنے وطن پاک میں ایک خبر کے مطابق راولپنڈی میں ایک خصوصی تقریب میں مرکزی وزیر قانون جناب ایس۔ ایم ظفر مہمان خصوصی تھے، یہ ایک اجتماعی اور قومی تقریب تھی۔ جس میں دارالحکومت کے تمام معززین موجود تھے مگر اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کا پتہ چلانا بہت دشوار تھا کہ یہ تقریب کسی آزاد ملک میں منعقد ہو رہی ہے اور اس ملک کا تعلق ایشیا سے ہے۔ اس تقریب میں سپاسنامہ انگریزی میں تھا۔ اس کا جواب انگریزی میں تھا۔ اعلانات انگریزی میں تھے۔ حتیٰ کہ مذاق اور نجی گفتگو بھی انگریزی میں تھی جس کی تاب نہ لا کر حفیظ صاحب بول اُٹھے۔ "اب انگریزی بہت بولی جا چکی۔ کچھ انصاف اپنی قومی زبان اردو کے ساتھ بھی ہو جائے۔"

تصویر کا دوسرا رُخ

ڈویژنل کونسلوں کو ہدایت حیدرآباد ۱۱رمئی۔ وزیر بنیادی جمہوریت جناب یسین خاں وٹو نے ڈویژنل کونسلوں اور ڈسٹرکٹ کونسل کے افسران کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے معائنے کی تمام کارروائی اردو میں تحریر کریں۔ انھوں نے کہا ہے کہ میں نے اپنے دورہ کے دوران متعدد کونسلوں میں جو ریکارڈ دیکھا ہے وہ انگریزی میں ہے۔ جسے ہمارے ممبران بنیادی جمہوریت بالکل نہیں سمجھتے اس لئے ایسے تمام متعلقہ افسران اور اداروں کو اپنی تمام کارروائی اردو میں قلمبند کرنی چاہیئے تاکہ ممبر اسے پڑھ کر استفادہ بھی کر سکیں اور خود بھی کوئی مفید رائے دے سکیں۔

سرکاری اصطلاحات کا اردو ترجمہ مغربی پاکستان کی سرکاری لسانی کمیٹی کے اعزازی معتمد جناب حکیم احمد شجاع

نے لاہور میں ۱۴ر مئی کو بتایا ہے کہ انگریزی زبان کے ۶۰ فیصد محاوروں اور اصطلاحات کا جو ملک کی سرکاری زبان میں مستعمل ہیں۔ اردو زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ یا ترجمہ شدہ الفاظ پر نظر ثانی کر کے انھیں معیاری بنا دیا گیا ہے۔ حکیم احمد شجاع نے یہ بھی بتایا کہ ۳۰,۰۰۰ ۳۲۲ اصطلاحات کا ترجمہ ایک ڈکشنری کی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ جس کا نام "سرکاری اصطلاحات اور محاورات کے اردو ترجمے" ہے۔ اس ڈکشنری کو تمام صوبائی محکموں اور اداروں کو بھیج دیا گیا ہے۔ مزید براں تعلیمی اداروں۔ اخباروں اور عوام کی سہولت کے لئے یہ ڈکشنری فروخت بھی کی جا رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب یہ ڈکشنری مکمل ہو جائے گی تو اس میں اسی ہزار الفاظ ہوں گے۔ جو کہ حکومت مغربی پاکستان کے تمام محکموں میں استعمال ہونے والے انگریزی محاوروں اور الفاظ سے بیس ہزار کی تعداد میں کم ہیں ان بیس ہزار الفاظ کے بارے میں جناب حکیم احمد شجاع نے بتایا کہ جانچ پڑتال کرنے سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ کے تراجم پہلے ہی سے معاصر انگریزی اردو لغات میں موجود ہیں اور معیاری ہیں ان کا ترجمہ کرنا غیر ضروری تھا۔

قرارداد ترویج اردو

جامعہ محمدی (جھنگ) کے زیر اہتمام "یوم تاسیس" کے موقع پر موتمر تعلیمات اسلامیہ عربیہ پاکستان کا یہ اجلاس ارباب اختیار کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کراتا ہے کہ قیام پاکستان کو تقریباً بیس سال کا عرصہ گزر جانے پر بھی حکومت قومی زبان اردو کے ملک گیر نفاذ کے بارے میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔

یہ اجتماع اکابر ملت کی ان مساعی کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ جو پاکستان کی قومی زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ نیز ان تمام محب وطن حلقوں کو آئندہ بھی اپنے مکمل اشتراک عمل اور پر زور تائید کا یقین دلاتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مزید تاخیر کئے بغیر اردو کو جو پاکستان اور اسلامیان برعظیم کی قومی اور مقبول زبان ہے، تمام سرکاری۔ نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں جلد نافذ کر دے۔ تاکہ ملت کے نونہالوں کو تعلیم و ترقی کے حصول میں سہولت ہو سکے۔

قومی لسانی پالیسی کا چار نکاتی فارمولا

اردو بنگلہ ملت کانفرنس، عیدگاہ میدان محمد پور ڈھاکہ میں اتوار ۵ مارچ ۱۹۶۷ء کو مولانا راغب احسن کی صدارت میں منعقد ہوئی مشرقی پاکستان کی انجمن مہاجرین و جماعت مجاہدین کونسل مسلم لیگ کے قائدین نے اردو بنگلہ کی یکساں ترقی پر زور دیا۔ مولانا محمد عبداللہ ندوی، مولانا عبدالحنان، مولانا نور الزماں ایم اے، مسٹر شفیق الاسلام ایڈوکیٹ، سید شہود الحق ایڈوکیٹ، مسٹر محمد صابر علی اور شیر بنگال مولوی فضل الحق کی اکلوتی صاحبزادی رئیسی بیگم صاحبہ نے اردو پاک بنگلہ حروف القرآن کی تائید میں تقریریں کیں۔ مردوں کے علاوہ ہزاروں خواتین پردہ گیلری میں شریک ہوئیں۔ محترمہ رئیسی بیگم صاحبہ کی تحریک پر مندرجہ ذیل قرارداد کانفرنس نے پاس کی۔

(الف) اس حقیقت کے مدنظر کہ جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان میں حکومت نے دو جداگانہ سرکاری ادارات بنام (۱) بنگلہ اکادمی اور بنگلہ ترقی بورڈ اور (۲) اردو اکادمی اور اردو ترقی بورڈ قائم کر رکھے ہیں اور یہ دونوں ادارات پاکستان کی دو مسلمہ دولتی زبانوں اردو و بنگلہ کو دو بالکل متضاد و مخالف سمتوں کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ بنگلہ اکادمی اور بنگلہ بورڈ جدید بنگلہ کے لئے نئے نئے الفاظ و فنی اصطلاحات سنسکرتی براہمنی ماخذوں سے سنسکرتی حروف میں اپنا رہے ہیں۔ اور اردو ترقی بورڈ حروف القرآن میں عربی و فارسی سے نئے الفاظ و اصطلاحات اخذ کر رہے ہیں۔ اور اس طرح پاکستان کی دونوں دولتی زبانوں اور دونوں خطوں میں وصل کی جگہ بعد المشرقین بڑھتا جا رہا ہے اور ملت پاکستان کا ذہنی افتراق و تہذیبی انتشار روز افزوں ہے اور یہ بات برصغیر ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی گزشتہ ہزار سالہ قومی تاریخ و تہذیب اور نشو و ارتقار کی توحیدی روایات کے بالکل مخالف اور ملک و ملت کے اتحاد و ارتباط کے لئے زہر قاتل ہے اور ان ملت شکن رجحانات سے مزید غفلت پاکستان کے لئے مہلک ہوگی۔

لہٰذا اردو بنگلہ ملت کانفرنس ڈھاکہ حکومت اور قوم سے عرض کرتی ہے کہ بنگلہ اکادمی اور بنگلہ ترقی بورڈ اور اردو اکادمی اور اردو ترقی بورڈ کے دو جداگانہ تنظیموں کو ختم کر کے ایک کل پاکستانی قومی تنظیم بنام پاکستان قومی زبان اکادمی اور انجمن ترقی قومی زبان قائم کی جائے جس کا مقصد پاکستان کی دو مسلمہ دولتی زبانوں اردو و بنگلہ کی۔

(۱) جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کے اسلامیہ نظریہ نصب العین کے مطابق۔ (۲) لسان القرآن (۳) حروف القرآن (۴) ہندوستان و پاکستان میں ملت اسلامیہ کی گزشتہ ہزار سالہ قومی تاریخی روایات کے اساسات پر ہم آہنگ یکساں و متحدہ، ترقی و توسیع کی منصوبہ بندی و رہنمائی کرنا مقرر کیا جانا چاہیئے۔

(ب) اردو بنگلہ ملت کانفرنس کی سنجیدہ رائے میں یہ ضروری ہے کہ پاکستان کی ساری زبانوں کو سنسکرتی، براہمنی، ہندوانہ اثرات و رسم الخط و اصطلاحات سے تعلق توڑ کر۔ (۱) جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کے اساسی اسلامی نظریہ و نصب العین کے مطابق اور (۲) لسان القرآن (۳) حروف القرآن اور (۴) برصغیر میں ملت اسلامیہ کی گزشتہ ہزار سالہ تاریخ و تہذیب اور نشو و ارتقار کی زندہ روایات کے مشترکہ ماخذوں سے رشتہ استوار کرنا اور ہم آہنگ ترقی کی قومی اساس پر منصوبہ بندی کرنا لازمی ہے۔ اس طرح اردو بنگلہ ایک دوسرے سے منقطع و متفرق ہونے کی جگہ ہم منزل و ہم مسلک ہم آہنگ و ہم رنگ ہم مزاج و ہم خیال، قریب و مربوط ہو جائیں گی اور ملک و ملت کی توحید و ترقی و شوار کی ضامن ہوں گی۔

(ج) پاکستان قومی زبان اکادمی اور انجمن ترقی و قومی زبان کے لئے ایسے ممبروں اور کارکنوں کا تقرر ضروری ہے۔ جو راسخ العقیدہ مسلمان ہوں اور پاکستان کے اسلامی نظریہ و نصب العین و تقدیر پر کامل ایمان و عقیدہ رکھنے والے ہوں اور علمی و ادبی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

(د) پاکستان قومی زبان اکادمی و انجمن ترقی قومی زبان کے لئے یہ اصول اساسی مقرر کیا جائے کہ پاکستان کی قومی زبانوں کے لئے اگر نئے الفاظ و اصطلاحات کی ضرورت ہو تو (۱) پاکستان کے اسلامی نظریہ و نصب العین کے مطابق (۲) لسان القرآن - (۳) حروف القرآن اور (۴) برصغیر کی گزشتہ ہزار سالہ قومی اسلامی تاریخ نشو و ارتقا اور تہذیبی روایات کے زندہ مشترکہ روایات کے ماخذوں سے اخذ اور وضع کئے جائیں تاکہ اردو بنگلہ میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت و ہم آہنگی و ہم مزاجی قائم ہو اور کسی حال میں برا ہمی مشترکہ سنسکرتی اثرات و مصطلحات کو قومی زبانوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے - کیونکہ وہ اسلامی توحید و ملت کے سراسر منافی ہیں۔" اس کانفرنس کی رائے میں ملت اسلامیہ اور جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کے اتحاد و استحکام و استقلال کے لئے مذکورہ بالا اصول پر قومی لسانی پالیسی کی ترتیب و تشکیل لازمی ہے۔

اردو کے لئے خواتین کی جدوجہد

انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کا سالانہ جلسہ ۲۹ راپریل کو زیر صدارت بیگم چودھری خلیق الزماں وزیر صحت و سماجی فلاح و بہبود مغربی پاکستان منعقد ہوا۔ جس میں بیگم صاحبہ نے خواتین کو مشورہ دیا کہ وہ ملک میں اردو زبان کی ترقی کے لئے بھرپور جدوجہد کریں - وزیر صحت کو صدر انجمن ترقی اردو خواتین نے جو سپاسنامہ پیش کیا اس میں مطالبہ کیا کہ مرکزی دفتر- اردو کالج اور کتب خانے کے لئے حکومت زمین کا انتظام کرے۔

اردو کی حمایت میں فتوے

اردو کی حفاظت اور اس کی ترقی کی کوشش کرنا دوسرے الفاظ میں مذہب کو فروغ دینا ہے کیونکہ مسلمانان برصغیر نے اس زبان میں جو مذہبی علوم منتقل کئے ہیں اس کی مثال شاید ہی کسی اور زبان میں ملتی ہو - اردو کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ احیاء العلوم کی تمام کاوشیں اسی زبان کے ذریعہ کی گئی ہیں - چنانچہ شیخ الاسلام مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ تھا کہ اردو کی حفاظت دینی و شرعی فریضہ ہے - کیونکہ ۹۵ فی صد عوام الناس کو اسلام کا علم اردو اور صرف اردو کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر اردو مٹا دی گئی تو عوام' اسلام کا علم حاصل کرنے کے واحد ذریعہ سے محروم ہو جائیں گے۔" اردو کی اس افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ابھی حال میں پاکستان کے اور جید علما نے بھی اردو کے حق میں فتوے دیئے ہیں۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی صاحب نے فرمایا ہے کہ اردو کو فروغ دینا ایک اسلامی فریضہ ہے اور اردو کو مٹانے کی کوشش اسلام کو مٹانے کی کوشش ہے۔ نیز مشرقی پاکستان کے ممتاز مفتی مولانا فیض اللہ صاحب نے اپنے فتویٰ میں کہا ہے کہ عربی کے بعد اردو دینی زبان کی حیثیت رکھتی ہے - اور اردو کی ترقی میں جو دینی منافع متوقع ہیں وہ اور کسی زبان سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

علمی۔ ادبی۔ تعلیمی۔ تہذیبی خبریں

عہ کراچی کا جلسۂ تقسیم اسناد

۲۲ مئی کو جامعہ کراچی کی سالانہ تقریب تقسیم اسناد اپنی روایتی شان و شوکت اور علمی وقار سے منائی گئی۔ جلسۂ
م اسناد کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی تمام کارروائی اردو میں ہوئی اور اس وقت ایک
ت خوشگوار لمحہ آیا جب سینٹ جوزف کالج کی پرنسپل نے اپنی طالبات کو اردو تعارف کے ساتھ
کیا۔ امسال یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اعزازات تقسیم کئے گئے۔ ۱۷ طلبہ و طالبات کو
میڈل دیئے گئے اور پانچ امیدواروں کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دی گئیں۔ جن میں اردو میں زوالوجی
ٹریٹ حاصل کرنے والے طالب علم نعیم الحسن نقوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جلسۂ تقسیم اسناد میں سب
یادہ تالیاں اس وقت بجائی گئیں۔ جب تاج بیگم کو بابائے اردو کا طلائی تمغہ دیا گیا اور پانچ سو روپیہ
کئے گئے۔ یہ تمغہ اور نقد رقم انجمن ترقی اردو کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اس تقریب میں چار ہزار طلبہ
البات کو اسناد دی گئیں۔ جامعہ کراچی کے شیخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس موقعے پر فرمایا کہ
عات کا مقصد صرف ڈگریاں دینا نہیں بلکہ انسانی علم کی سرحدوں کو وسعت دینا بھی ہے۔ انھوں نے
سٹی کی مالی مشکلات کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ مشکلات علمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ انھوں نے طلبہ کو نظم و
کا مشورہ دیا اور کہا کہ اپنے دماغ کو خوف اور لالچ سے آزاد رکھیں اور خدا پر بھروسہ کریں۔

، اور فیضی پر کتابیں

ناشروں کی ایک امریکی فرم نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر کو عرفی اور فیضی پر کتابیں لکھنے کے لئے مامور کیا ہے۔ ڈاکٹر
قر فارسی کے جید عالم ہیں اور یہ دونوں شاعر فارسی کے بے مثل شاعر ہیں جن کا تعلق برصغیر پاک و ہند
ہے۔

، کتابوں پر انعام

انجمن مصنفین پاکستان کی جانب سے آدم جی اور داؤد ادبی انعامات برائے بنگلہ زبان و ادب کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ بنگال ادب کے لئے ۵-۵ ہزار کے
امات فرخ احمد کو حاتم طائی پر اور ابوالفضل کو چترا پر دیئے گئے ہیں۔ اتنی ہی رقم کے داؤد انعامات
ستار کو ارانیا جنا پاھے پر اور استاد منشی رئیس الدین کو سات راگ پر دیئے گئے ہیں۔

، ادیبوں کا دورۂ پاکستان

روسی ادیبوں کا ایک خاص وفد ادارۂ مصنفین پاکستان کی دعوت پر پاکستان کی سیاحت کے لئے آیا تھا۔ وفد نے تمام بڑے شہروں کی

سیر کی ۔ ادبی جلسوں میں شرکت کی اور خیر سگالی جذبات کا اظہار کیا ۔ ۶ رمئی کو یہ وفد کراچی سے سیلون کے لئے روانہ ہوگیا ۔ اس وفد کے اعزاز میں ادارۂ مصنفین کراچی کی شاخ کی جانب سے ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں وفد کے قائد جناب کوچی نوف نے تقریر کرتے ہوئے پاکستانی ادیبوں کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور کہا ہم روسی ادیبوں کے لئے پاکستانی ادیبوں کی طرف سے خیر سگالی کے جذبات لے کر جارہے ہیں ۔ ادارۂ مصنفین پاکستان کے معتمد عمومی جناب جمیل الدین عالی نے روسی ادیبوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں جو بھی خیر سگالی جذبات لے کر آتا ہے وہ ہمیں پرجوش استقبال کے لئے تیار پاتا ہے ۔ جناب عالی نے کہا کہ ہم چاند تک اسپوتنک تو نہیں اڑا سکے لیکن ہمارے یہاں روشنی کے بہت سے بلند مینار ضرور ہیں ۔ انھوں نے روسی ادیبوں کو پاکستانی ادب کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا ۔ روسی ادیبوں کے اس وفد نے انجمن ترقی اردو کا بھی معائنہ کیا ۔ انجمن کے صدر جناب اختر حسین نے وفد کا استقبال کیا اور اراکین وفد کو انجمن کے کاموں سے روشناس کرایا ۔

شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ادبیات کے زیر اہتمام برصغیر کے مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ ادب و ثقافت کی روشنی میں مرتب کی جارہی ہے ۔ اس تاریخ کی ۱۴ جلدیں ہوں گی جو ساڑھے سات ہزار صفحات پر مشتمل ہوں گی ۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تقریباً ڈیڑھ سو محققین ، ادیب ، مورخین اور ماہرین لسانیات شب و روز اس اہم کام میں مصروف ہیں ۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے غیر ممالک میں مقیم پاکستانی دانش وروں سے بھی رابطہ قائم کیا جارہا ہے ۔

ایک اہم تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے تنقیدی مضامین کا اہم مجموعہ " فن کی جانچ " شائع ہوگیا ہے ۔ یہ مجموعہ نیشنل بک ڈپو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے ۔ اس مجموعے میں ادب کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی و تحقیقی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی کی ایک خبر مظہر ہے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی دوسری جلد کا پندرہواں حصہ شائع ہوگیا ہے جس میں اغالبا سے لے کر افغانستان تک مقالات شامل ہیں ۔ اس حصے میں نہایت دلچسپ اور معلومات انگیز مضامین شامل ہیں جو افراسیاب ، افریقیہ اور افغان کے بارے میں نئے نئے زاویہ ہائے نظر پیش کرتے ہیں ۔ یہ نمونہ ۵ روپیہ میں پنجاب یونیورسٹی کے سیلز ڈپو سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

آئینہ خانے میں

یان ماریک کی تقریر چیکوسلواکیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور اقبال کے پرستار جناب یان ماریک

[...] جوان دنوں پاکستان کے دورہ پر آئے ہوئے تھے روٹری کلب کے ایک ظہرانہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا [کہ] پاکستان اور چیکو سلواکیہ کے تعلقات بڑے قدیم اور دوستانہ ہیں۔ انھوں نے ان دونوں ملکوں کے [در]میان ادیبوں اور فنکاروں کے باہمی تبادلوں پر بہت زور دیا اور کہا کہ اس طرح نہ صرف ان دونوں عظیم [ملک]وں کے درمیان تعاون بڑھے گا بلکہ دوستانہ تعلقات کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔ یان مرنیک صاحب نے [کہا] ہے کہ ثقافتی۔ اقتصادی اور فنی شعبوں میں پاکستان اور چیکو سلواکیہ کے درمیان تعلقات کے فروغ کے [وس]یع مواقع ہیں۔ ڈاکٹر یان ماریک نے یہ بھی بتایا کہ علامہ اقبال کے کلام کا ترجمہ متعدد زبانوں میں کیا جا رہا ہے۔

[فن]کاروں سے ملکہ فرح کا خطاب

۷ / مئی کو تہران میں کاخ سفید میں ملکہ ایران فرح پہلوی نے ڈھائی سو ایرانی ادیبوں، شاعروں اور مصنفین سے [خط]اب کرتے ہوئے فرمایا کہ فارسی شاعری، ادب، آرٹ اور طباعت کے فن کو ترقی دینے کے لئے فنکاروں [کو] ادارے قائم کرنے چاہئیں اور کانفرنسیں منعقد کرنا چاہیئں۔ آپ نے انھیں مشورہ دیا کہ اس سے پہلے [مص]نفین کو قواعد و ضوابط اور منشور مرتب کرنے کے لئے کانگریس بلانی چاہیئے۔

[ممت]از حسن کے افکار

غزالی کالج حیدرآباد میں یوم اقبال میں نیشنل بنک کے مینیجنگ ڈائرکٹر ممتاز حسن نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اقبال کے افکار کا سب سے بڑا محرک رسول اکرم [کی] ذات تھی۔ آپ ہی وہ انسان کامل تھے جن کی اقبال کو تلاش تھی۔ ممتاز حسن صاحب نے یورپ کے سائنسی [دو]ر اور مسلمانوں کے عہد کے سائنسی تجربات کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جدید سائنس اور یورپ [کو] اپنے انکشافات اور ایجادات پر اتنا زعم ہوا کہ وہ خدا کی ذات سے منکر ہوگئے۔ لیکن اب یہ سارا خطہ [تبا]ہی میں سرگرداں ہے اور وقت آگیا ہے کہ مسلمان پھر پہلے کی طرح سائنس میں اپنی برتری منوائیں۔ ممتاز حسن [صاح]ب نے بعض ایجادات پر یورپ والوں کے جھوٹ کی پول بھی کھولی کہ انھوں نے مسلمانوں کے کارناموں کو اپنے [نام] سے منسوب کر لیا۔

یادوں کے چراغ

[یو]م اقبال

اس سال شاعر مشرق علامہ اقبال کی برسی اعلیٰ پیمانے پر منائی گئی اور اس کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ پاکستان کے طول و عرض ہی میں نہیں لندن اور امریکہ میں بھی یہ برسی حسب [ساب]ق نہایت خلوص اور عقیدت سے منائی گئی۔ کراچی میں یوم اقبال کی اصل تقریبات کا ۵ روزہ پروگرام شاعر [مشر]ق کے شایان شان تھا۔ اولڈ راوینز ایسوسی ایشن، اقبال اکادمی، اپوا اور اقبال سرکل نے مشترکہ طور پر

چار تقریبات کا انتظام کیا ۔ یوم اقبال کے اجتماع کو مرکزی وزرار نے خطاب کیا اور جلسۂ عام کے علاوہ تصویروں کی نمائش ، شام موسیقی ، ادبی اجلاس اور مشاعرہ اس پروگرام کی خاص محفلیں تھیں۔ اس اہم اور یادگار موقعے پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے گورنروں کے علاوہ شاہِ افغانستان نے بھی پیغام خصوصی ارسال کیا۔ غیر ملکی مندوبین میں مفتیِ اعظم فلسطین ، روسی ادیبوں کے وفد کے رہنما کوچن تو ، چیکوسلواکیہ کے دانشور جناب یان ماریک اور ایران کی خانم مریم بہنام نے علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ اس موقعے پر صدر پاکستان نے اپنے پیغام میں کہا کہ اقبال نے پاکستان کا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ مذہبی افکار کی فعال تفسیریں بھی پیش کیں"۔ یوم اقبال پر مختلف ملکوں کے سفیروں اور پاکستان کے ممتاز دانشوروں نے اقبال کے پیغام ، فن اور فلسفے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

حسرت موہانی کی یاد میں ۱۳ مئی کو کراچی میں رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کی سولہویں برسی بڑی عقیدت اور احترام سے منائی گئی ۔ جلسے کی صدارت حکیم محمد سعید دہلوی کر رہے تھے ۔ اس موقعے پر جن حضرات نے پیغامات میں مولانا کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اُن میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین ، مولانا مودودی ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جامعہ پشاور کے وائس چانسلر شامل ہیں۔ حکیم سعید نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کی یاد یوم حسرت تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے کارناموں اور آزادی کی جنگ میں ان کے مثالی کردار کی وضاحت اور اشاعت کا مستقل انتظام کیا جائے ۔

آئینۂ ہند

ڈاکٹر ذاکر حسین صدر ہو گئے ہندوستان کے مسلم رہنما ، دانشور ، جامعہ ملیہ کے سرپرست اور ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کو ۹ مئی ۱۹۶۷ء کو ہندوستان کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ آپ حزب اختلاف کے نمائندے کو شکست دے کر صدر منتخب ہوئے ہیں ۔ اس سے پہلے آپ ہندوستان کے نائب صدر تھے ۔

علمار کی عزت افزائی صدر جمہوریہ نے سنسکرت کے تین ، عربی کے ایک اور فارسی کے ایک عالم کو اعزاز کی سند عطا کی ہے ۔ اس اعزاز کے لئے عربی میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی اور فارسی میں قاضی سجاد حسین کو منتخب کیا ہے ۔

اردو کی اہمیت جنرل الیکشن میں اردو کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی طرف سے پورے ملک کے طول و عرض میں جو اشتہارات بھیجے گئے تھے ۔ اُن کی اعداد و شمار حسب ذیل

ہیں - انگریزی پوسٹر ۲۵۹۵۰ ہندی پوسٹر ۲۵۷۲۴ اور اردو پوسٹر ۳۹۱۰۰ -

یوم قلی قطب شاہ

دکنی ادب کے تاجدار اور والیٔ گولکنڈہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ۳۵۵ ویں برسی پر سہ روزہ تقاریب کا آغاز ۱۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو بڑے شاندار طریقے پر ہوا۔ اس موقعے پر حیدرآباد کے ممتاز ادیب، دانشور، سیاست داں، فنکار اور شعرا شریک ہوئے تھے۔ نواب ہوش مہدی نواز جنگ نے کہا "اس گنبد کے اندر جو جسم دفن ہے اس کی روح کے پیام کو سمجھنے اور مل جل کر رہنے کا سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے" ممتاز مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اپنے پیغام میں کہا کہ محمد قلی کا شمار ذہین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس طرح اور بھی ادیبوں اور اہم شخصیات کی جانب سے پیغامات موصول ہوئے۔

ایک ماہنامہ

ادارۂ اشاعت اردو بمبئی کی جانب سے ایک علمی - ادبی اور تہذیبی ماہنامہ شائع ہو رہا ہے جس کا نام ہے روبرو۔ یہ رسالہ $\frac{20\times30}{8}$ سائز پر اور ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوگا - جوہر امروہوی مدیر رسالہ نے اہل قلم سے تعاون کی اپیل کی ہے۔

تلخیص الاردو :-

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے سی سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے گیارہ علمی و ادبی مقالات شامل ہیں۔

قیمت پانچ روپے پچاس پیسے

اردو تھیٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی) نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے۔ جس میں ڈراموں ڈرامہ نگاروں، اداکاروں اور ڈرامہ کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل اردو ڈرامے کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

قیمت فی جلد سات روپے

سعادت یار خاں رنگین :-

ڈاکٹر صابر علی خاں

یہ کتاب سعادت یار خاں رنگین کے حالات زندگی اور جائزہ تصانیف پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف کو اس تحقیقی کارنامے پر پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت پانچ روپے پچہتر پیسے

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

عنوانات

ادبیات اردو

تحقیق و تنقید

ادبی مجالس اور دیگر ادبی سرگرمیاں

دیگر زبانوں کا ادب

اردو زبان اور اس کے مسائل

تاریخ و سیاسیات

تعلیم

تہذیب و تمدن

خود نوشت

شخصیات

اقبال

غالب

دیگر شخصیات

صحافت

کتابیات و کتب خانے

مذہبیات

تفسیر قرآن مجید

سیرت و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مسائل و مباحث

مکاتیب

پیش نظر اشاریے کی ترتیب میں ماہ نومبر ۶۶ء اور بعض دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور (خاص نمبر) ستمبر اکتوبر ۶۶ء	ماہنامہ رہنمائے تعلیم دہلی نومبر ۶۶ء	ماہنامہ اعظم گڑھ نومبر ۶۶ء
،، افکار کراچی (نئی تخلیق نمبر) اکتوبر نومبر ۶۶ء	،، زندگی رام پور ،، ،،	،، منشور کراچی ،، ،،
،، الارشاد جدید ،، اگست ستمبر ۶۶ء	،، ساقی کراچی ،، ،،	،، میثاق لاہور ،، ،،
،، البلاغ بمبئی نومبر ۶۶ء	،، سب رس حیدرآباد دکن اکتوبر نومبر ،،	،، نصرت (اسلامی سوشلزم نمبر) لاہور ستمبر اکتوبر ،،
،، الرحیم حیدرآباد ،،	،، سیارہ لاہور نومبر ،،	،، نگار پاکستان کراچی اکتوبر نومبر ،،
ساہی العلم کراچی جولائی تا ستمبر ۶۶ء	،، سیارہ ڈائجسٹ ،، ،، ،،	،، نوائے سیفیہ بھوپال نمبر حصہ ۲
ماہنامہ المنبر لائل پور اکتوبر نومبر ،،	،، صبا حیدرآباد دکن اگست ستمبر ،،	،، ہندوستانی ادب حیدرآباد دکن اکتوبر نومبر ۶۶ء
،، انجمن اسلامیہ میگزین کراچی اکتوبر ،،	،، صبح دہلی اکتوبر ،،	ہفت روزہ المنبر لائل پور نومبر ،،
،، برہان دہلی نومبر ،،	،، طلوع اسلام لاہور نومبر ،،	،، آئین لاہور ،، ،،
،، بینات کراچی ،، ،،	،، عارف ،، ،، ،،	،، چٹان ،، ،، ،،
،، پیام عمل لاہور ،، ،،	،، عالمی ڈائجسٹ کراچی ،، ،،	،، خدام الدین ،، ،، ،،
،، تجلی دیوبند ،، ،،	،، فروغ اردو لکھنؤ ،، ،،	،، شہاب ،، ،، ،،
،، تحریک دہلی ،، ،،	،، فکر و خیال کراچی ستمبر تا نومبر ،،	،، صدق جدید لکھنؤ ،، ،،
،، تہذیب الاخلاق لاہور اکتوبر نومبر ،،	،، قومی زبان ،، نومبر ،،	،، قندیل لاہور ،، ،،
،، ثقافت ،، نومبر ،،	،، کاروان بہاول پور اکتوبر نومبر ،،	،، لاہور ،، ،، ،،
،، جامعہ دہلی ،، ،،	،، کتاب لاہور نومبر ،،	روزنامہ انجام کراچی جمعہ و اتوار ایڈیشن
،، چراغ راہ کراچی اکتوبر نومبر ،،	،، کتابی دنیا کراچی ،، ،،	،، جنگ ،، ،، ،،
،، خاتون پاکستان ،، اکتوبر ،،	،، گل خنداں لاہور اگست تا اکتوبر ،،	،، حریت ،، ،، ،،
،، خاتون دکن (سالنامہ) حیدرآباد دکن اکتوبر نومبر ،،	،، مجلہ جناح کالج کراچی ۶۵-۶۶ء	

ادبیات اردو

تحقیق و تنقید

ابوسلمان، شاہجہانپوری	مولانا ابوالکلام آزاد کا غیر مطبوعہ کلام[1]	تحریک، ص ۳ تا ۹، نومبر
احمر رفاعی	ذوق کی قصیدہ نگاری	قومی زبان، ص ۵۵ تا ۶۲، نومبر
اختر، بشیر محمود	نذیر احمد کی ناول نگاری کا فن	نگار پاکستان، ص ۷۹، اکتوبر
اختر، سلیم	ادب تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل	" " ۴۳ تا ۴۹، نومبر
ارشاد، سید نقی احمد	مرثیہ شاد عظیم آبادی اور اصلاح صفیر و دبیر[2]	" " ۳۶ تا ۴۸، اکتوبر
ارشد، عبدالحمید و دیگر حضرات[3]	احمد عقیل ودانی کی نظم پر تنقید	کارواں، ص ۲۲۶ تا ۲۳۲، اکتوبر نومبر
ادیب، ڈاکٹر لطیف حسین	قصیدہ خزینۃ البرکات	قومی زبان، ص ۴۱ تا ۴۴، نومبر
اسلام، ڈاکٹر محمد	جگر کے نقاد	سب رس، ص ۵۶ تا ۶۲، "
اسمتھ، ڈیٹس سی	بچوں کی کتابیں	کتاب، ص ۵۵ تا ۵۸، "
اشرف، حکیم عبدالرحیم	مرزا غلام احمد کی نفسیات اور ان کا اسلوب کلام	المنبر، ص ۱۰ تا ۱۷، ۲۸ر اکتوبر
اعظمی، قمرالحسن	خیالات و احساسات	فروغ ادب، ص ۷۰ تا ۷۲، نومبر
انصاری، اسلوب احمد	تعلیم و تدریس	ساقی، ص ۲۵ تا ۲۷، "
آردی، شمس تبریز خاں	جگر کا اسلوب تغزل	جامعہ، ص ۴۶۵ تا ۴۶۷، "
آل احمد، سید و خالق تنویر	ادب اور نئی نسل	کارواں، ص ۵، اکتوبر نومبر
آئینسکو، یوجین		
خیرالنساء (مترجم)	ہمارے ادبی مسائل	صبا، ص ۵۶ تا ۶۸، اگست ستمبر
پراچہ، احمد	اردو افسانے کا ارتقا	قندیل، ص ۱۹، ۲۰ر نومبر
تابش، ذوالفقار احمد	بچوں کے ناول	" " ۲۳ تا ۲۶، ۳۰ر اکتوبر

---

[1] منقول از سہ ماہی اردو، کراچی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء

[2] رسالہ "اردو" کراچی میں مطبوعہ مرثیے کے متعلق

[3] وسیم خالد، علی احمد رفعت، سید محمود جعفری۔ جمیل اختر اور خالد تنویر

جوہر، نربھے رام	نیاز (فتح پوری) مرحوم اپنے خطوط کے آئینے میں	نگار پاکستان، ص ۸۵ تا ۹۵، نومبر
حارث، سجاد	شاعری میں موضوعات مرگ کی نیرنگیاں	تہذیب الاخلاق، ص ۷۱ تا ۷۲، "
حرمت الاکرام، سید	شاد عارفی کی غزل گوئی	صبح، ص ۳۳ تا ۳۷، اکتوبر
حسرت، کاسگنجوی	اردو ادب اور جاسوسی ناول	ساقی، ص ۴۹ تا ۵۲، نومبر
حسین، انتظار	بچوں کی کتابوں کی زبان	انجام، ص ۹، ۱۴ر نومبر
حسین، آغا افتخار	چند معروضات (ادب)	افکار، ص ۹۷، اکتوبر نومبر
حسین، مجتبیٰ	اردو میں آزاد نظم کا تجزیہ	" " ۸۵ تا ۸۹، " "
حنیف رامے	کتابیں اور تصویریں	حریت، ص ۷، ۱۴ر نومبر
خالد، انور محمود	احمد ندیم قاسمی سے ...... ایک ملاقات	ادب لطیف، ص ۱۷ تا ۱۱۱، خاص نمبر
خاں رضوانی	سوئیکی کی رزمیہ شاعری	جنگ، ص ۹، ۱۱ر نومبر
دانش، عقیل	(خواجہ میر) درد اور تصوف	فکر و خیال، ص ۷۲ تا ۸۰، ستمبر
درانی، فرخ	ایج ایجری اور اردو شاعری	کاروان، ص ۳۵ تا ۷۵، اکتوبر نومبر
ذکاء الرحمٰن	آج کا ادب اور ادیب	ادب لطیف، ص ۷ تا ۱۴، خاص نمبر
رتن پنڈوری	لطائف الادب	رہنمائے تعلیم، ص ۱۲ تا ۱۴، نومبر
زیدی، علی جواد	یادوں کے چراغ	صبح، ص ۴ تا ۱۱، اکتوبر
ستنام محمود، ڈاکٹر مسز	اردو میں بچوں کا ادب	کتاب، ص ۱۲ تا ۱۸، نومبر
شاہ رخ، سلمان	بچوں کی کتابیں	جنگ، ص ۵، ۱۹ر "
شمس لکھنوی، سید محمد باقر	غازی الدین حیدر کا عہد اور ان کی زبان و شاعری	نگار پاکستان، ص ۵۰ تا ۵۷، نومبر
صادق کاشمیری، خواجہ	ٹیڈی شاعری	چٹان، ص ۷، ۱۴، ۷ر نومبر
صدیقی، انور	نئی غزل کا مزاج	صبح، ص ۸ تا ۳۹، اکتوبر
صدیقی، ظہور احمد	تحقیق و تنقید	ساقی، ص ۱۲ تا ۴۵، نومبر
صدیقی، عظیم الشان	فسانۂ لطافت	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ر "
صدیقی، محمد اکبر الدین	علم سلوک (ایک قدیم مثنوی)	[illegible]، ص ۷۲ تا ۷۵، "
صفدر علی بیگ، مرزا	فلسفۂ حسن و عشق	معارف، ص ۳۶۵ تا ۳۸۱، "
طالب، اشتیاق	کچھ آزاد نظم کے بارے میں	نگار پاکستان، ص ۶۰ تا ۶۲، "

طالب، اشتیاق	ادب منزل بمنزل (تصنیف سیدہ انیس فاطمہ) کا سرسری جائزہ	العلم، ص ۹ تا ۱۶، جولائی تا ستمبر
طالب، دہلوی	دلی کی شاعری	رہنمائے تعلیم، ص ۲۶ تا ۲۷، نومبر
عبدالسلام، شیخ	تاجور (ناول از سلطانہ مہر)	کتاب، ص ۱۲ تا ۴۲، نومبر
عثمانی ندوی، طیب	ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور	سیارہ، ص ۳۲ تا ۳۵، ″
علوی، عمر	قومی ادب کا مسئلہ	ادب لطیف، ص ۴۷ تا ۵۶، خاص نمبر
علی احمد، پروفیسر	بچوں کی تعلیم میں صحیح و غلط	کتاب، ص ۱۵ تا ۴۵، نومبر
جابر علی، سید	ہیگل کا تصورِ المیہ	کاروان، ص ۱۶ تا ۲۹، اکتوبر نومبر
عمر، منور	دود چراغ محفل (ذکار الرحمان کا ناول)	ادب لطیف، ص ۵۷ تا ۶۰، خاص نمبر
عنایت اللہ	زہریلا ادب	کتاب، ص ۵۹ تا ۶۶، نومبر
فاروقی، ڈاکٹر، محمد احسن	تنقید اور احساس کمتری	ساقی، ص ۴ تا ۶، ″
فراہی، سعد اللہ	کمیونزم اور اردو ادب	فروغ اردو، ص ۴۲ تا ۴۷، نومبر
فرمان فتحپوری	اردو میں منظوم ڈرامائی افسانوں کا آغاز و ارتقا[1]	نگار پاکستان، ص ۴۳ تا ۵۲، اکتوبر
″ ″	نذر عرش پر ایک نظر	″ ″ ۶۷ تا ۷۴، نومبر
قریشی، ڈاکٹر وحید	مولانا محمد علی جوہر کی شاعری	لاہور، ص ۵ تا ۱۲، ۱۲ نومبر
قریشی، معین الدین	جوش — حیدرآباد میں سترہ برس بعد	صبا، ص ۳۱ تا ۴۴، اگست ستمبر
محسنی، رضیہ	مثنویات میر پر ایک نظر	جامعہ، ص ۲۶۸ تا ۲۷۳، نومبر
محمد سعید دہلوی، حکیم	بچوں کا ادب	جنگ، ص ۱۱، ۱۹ نومبر
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	بچوں کا ادب الفاظ و انداز بیان کی اہمیت	کتاب، ص ۶۵ تا ۶۹، نومبر
مذنب، رحمان	بچوں کا ڈراما	″ ″ ۷۰ تا ۷۲، ″
معین الرحمان، سید	حرف معذرت (مقالہ بزم فروغ اردو، لاہور میں پڑھا گیا)	کاروان، ص ۱۴ تا ۴۴، اکتوبر نومبر
مفتوں کوٹوی	قرینے (مجموعہ کلام ابرار حسن گنوری) میں شاعرانہ قرینے	رہنمائے تعلیم، ص ۱۰ تا ۱۳، نومبر
مقبول، الہی	اردو کے عظیم شاعر عبدالعزیز خالد کی نئی تخلیق منحمنا	شہاب، ص ۸ تا ۱۰، ۲۰ ″

---

[1] دوسری قسط کے لئے دیکھئے شمارہ نومبر ص ۴۳ تا ۴۸ ـ

منظر، شہزاد	ٹیگور اور ان کا تضاد	نگار پاکستان، ص ۵۸ تا ۶۲، اکتوبر
منہاس، کسری	طنز بدیہہ	ادب لطیف، ص ۱۷ تا ۲۴، خاص نمبر
مہدی، جمیل	حسرت (موہانی) اور تہذیب عاشقی	نگار پاکستان، ص ۷ تا ۱۴، اکتوبر
نظامی، خواجہ حسن	سرمد نامہ	عارف، ص ۳۶ تا ۴۴، نومبر
نظامی، عابد	خواجہ میر درد کی شاعری	سیارہ، ص ۳۶ تا ۴۱، "
ناز، ایس ایم	بلوچی کی لوک کہانیاں	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۲۱، ۲۳ نومبر
ناہید، ثانی، ڈاکٹر	پرانے موسموں کی آواز ــــ کمار پاسی کے مجموعہ کلام پر ایک نظر	ادب لطیف، ص ۳۹ تا ۴۴، خاص نمبر
نوشاہی، گوہر	قدرت کلام اور ندرت بیان کی شاعری	" " ۳۳ تا ۳۸، "
وزیر آبادی، عبدالعزیز	فن خطاطی اور خطاط	جنگ، ص ۹، ۷ نومبر
وصی الحسن	اکبر طنز و مزاح کے آئینہ خانے میں	فروغ اردو، ص ۱۳ تا ۱۶، نومبر
"	چکبست کے مرثیے	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۲۲ "
ہاشمی، اختر نذیر	قصہ رودگی کے قصیدے کا	کاروان، ص ۵۸ تا ۶۰، اکتوبر نومبر
ہما میرٹھی	آئینہ حقیقت (سرور جہاں آبادی اور شاکر میرٹھی کے متعلق)[1]	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۱۵ نومبر
یاسمین، زینت	ڈراما اور ڈراما نگار	جنگ، ص ۱۵، ۱۴ نومبر
———	اردو ڈرامے کا ارتقا	ساقی، ص ۵۸ تا ۶۲، "
———	افکار پریشان ــــ کچھ کیانی کے اور کچھ اپنے	چراغ راہ، ص ۱۸ تا ۲۵، اکتوبر نومبر
———	تنقید اور تحقیق	ادب لطیف، ص ۵۶ تا ۶۲، خاص نمبر

ادبی مجالس اور سرگرمیاں

بہرام	پنڈی کی ادبی سرگرمیاں	ادب لطیف، ص ۷۶ تا ۹۹، خاص نمبر
کوثر چاندپوری	بات ایک دور کی (بھوپال کی ایک محفل مشاعرہ)	نور کے سفینہ، ص ۷ تا ۹،
ہمعصر	لاہور کا ادبی جائزہ	ادب لطیف، ص ۵۶ تا ۶۶، خاص نمبر

[1] اسی مجلے میں ایک مراسلہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کا اسی شمارے کے ص ۸ پر چھپا ہے۔

مجید، حمید اصغر	ہر لبشر روح میں ناسور لئے پھرتا ہے (ریڈیو پاکستان کا مشاعرہ)	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۱، ۷ر نومبر

دیگر زبانوں کا ادب

فاروقی، شمیم اختر	موجودہ تمدن کے سنوارنے میں عربی زبان کا حصہ	فروغ اردو، ص ۷ تا ۱۹، نومبر
قزوینی، مرزا محمد خاں بن عبدالوہاب		
حبیب انصاری (مترجم)	موجودہ فارسی کی سب سے پرانی کتاب	نگار پاکستان، ص ۶۹ تا ۷۲، اکتوبر
مہر، غلام رسول	فارسی شاعری کے دلآویز نوادر	چٹان، ص ۷، ۲۴ر اکتوبر

اردو زبان اور اس کے مسائل

اعظمی، عبداللطیف	اردو کا مسئلہ	صبح، ص ۵ تا ۶، اکتوبر
آغا، ڈاکٹر اے ایس	قومی زبان	قندیل، ص ۱۸، ۱۳ر نومبر
تحسین سروری	اردو زبان کے غیر ادبی ماخذ (بوستان اودھ)	،، ،، ۶۵ تا ۶۸، ،،
حسن خاں، ڈاکٹر مسعود	دکن میں اردو	نگار پاکستان، ص ۵۳ تا ۶۴، اکتوبر
رحمان، جسٹس ایس اے	اردو انجمنوں کی مجلس مشاورت	قومی زبان، ص ۱۹ تا ۲۲، نومبر
سنہا، شیو پرشاد	اردو کی بپتا[1]	صدق جدید، ص ۷، ۲۱ر اکتوبر
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	قائد اعظم اور اردو	امروز، ص ۲۲۳، ۵ر دسمبر
معین الرحمان، سید	انجمن ترقی اردو	کتاب، ص ۱۳ تا ۳۷، نومبر
نظامی، خواجہ حسن	ہندوستان کی قدیم بولی	ہندوستانی ادب، ص ۲۹ تا ۳۲، اکتوبر، نومبر

تاریخ و سیاست

ابو سلمان، شاہجہانپوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے اخلاقی و مذہبی حالات	الرحیم، ص ۳۵ تا ۴۴، نومبر
اسرار احمد	تحریک جماعت اسلامی — نقش غزل (۳)	میثاق، ص ۳۴ تا ۵۴، ،،

---

[1] دیگر قسطیں ۲۸ر اکتوبر اور ۴ر نومبر کے پرچوں میں دیکھیے

احمد، آفاق	مہدی افادی اور بھوپال	نوائے سیفیہ، ص ۶۳ تا ۷۳،
احمد، سلطان	شیرشاہ کا ہندوستان	ہندوستانی ادب، ص ۴۵ تا ۵۵، اکتوبر نوم
احمد، ممتاز	اقوام متحدہ ـــ معاشی اور سیاسی بحران کی زد میں	چراغ راہ، ۵۰ تا ۵۷، " "
آباد شاہ پوری	مسلمان قومیں اشتراکیت کے سائے میں	آئین، ص ۱۴ تا ۱۵، ۱۹ر نومبر
بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین	انیسویں صدی کے انگلستان کی کہانی مرزا اعتصام الدین کی زبانی	قندیل، ص ۲۳، ۱۳ر نومبر
بریلوی، سید مصطفےٰ علی	انگریزوں کی لسانی پالیسی اور مسلمان	العلم، ص ۵۰ تا ۵۶، جولائی تا ستمبر
پیام شاہجہانپوری	قائداعظم کانگریس سے کیوں بددل ہو گئے؟	امروز، ص ۲، ۲۵ر دسمبر
تیموری، ڈاکٹر حامد رضا	قلعہ رائے سین (بھوپال)	نوائے سیفیہ، ص ۱۴،
جلالی شاہجہانپوری	ہندی تہذیب و ثقافت اور صنعت و تجارت کے مختلف ارتقائی دور	سب رس، ص ۱۷ تا ۲۴، نومبر
جعفری، رئیس احمد	موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے کارنامے	ثقافت، ص ۵۷ تا ۶۴، "
" "	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں[1] (۴۳)	انجام، ص ۱۲، ۵ر نومبر
چغتائی، جہاں قدر	بیتے دنوں کی بیتی باتیں (بھوپال کی زندگی)	نوائے سیفیہ، ص ۱۵ تا ۱۶،
چغتائی، عنبر	سر راس مسعود بھوپال میں	العلم، ص ۸۳ تا ۸۹، جولائی تا ستمبر
حسن، سید سبط	ماضی کے مزار ـــ غار التیرا کا نگارخانہ	افکار، ص ۱۳ تا ۶۸، اکتوبر نومبر
حسین، زوار	فکر انسانی میں انقلاب کی ضرورت	کارواں، ص ۴۷ تا ۵۲، " "
خاں، پروفیسر حامی الدین محمد احمد صدیقی (مترجم)	برصغیر پاک و ہند کے افغان حکمراں	العلم، ص ۹۰ تا ۱۰۰، جولائی تا ستمبر
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب[2]	جنگ، ص ۱۲، ۱۵ر نومبر
دسنوی، عبدالقوی	سر راس مسعود بھوپال میں	نوائے سیفیہ، ص ۳۶ تا ۴۶،
" "	سرزمین بھوپال	" ، ۴ تا ۵،

---

[1] اس سلسلے کی دیگر اقساط کے لئے دیکھئے ۱۹ر اور ۲۶ر نومبر کا انجام

[2] عالمی سیاسی مسائل اور واقعات پر تبصرے کا مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔

خاں، عظیم اللہ	بھوپال کے فرقہ وارانہ تعلقات	نوائے سیفیہ، ص ۱۳،
راہی، نثار	بھوپال نئی اور پرانی تہذیب کا سنگم	" " ، ۱۷ تا ۱۸،
رضوی، ڈاکٹر سلیم احمد	بھوپال قدیم و جدید	" " ، ۱۱ تا ۱۳،
شرر، مولانا عبدالحلیم	لکھنؤ کے بانکے	عالمی ڈائجسٹ، ص ۷۴ تا ۷۶ + ۸۱، نومبر
صہیب، محمد	ارشمیدس کے کارنامے	فکر و خیال، ص ۳۷ تا ۴۸، ستمبر
طنطاوی		
نعیم صدیقی اعظمی (مترجم)	ایک حاکم (ابراہیم پاشا) ایک عالم (شیخ سعید) کی بارگاہ میں	ثقافت، ص ۴۳ تا ۴۸، نومبر
عالم، خورشید	بھارت کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۶۵ تا ۷۲، نومبر
عباسی، پروفیسر منظور احسن	اصحاب صفہ	آئین، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۶ر نومبر
عبدالرحمان، سید صباح الدین	سولھویں اور سترہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں	معارف، ص ۳۲۵ تا ۳۴۶، نومبر
" "	ہندوستان امیر خسروؒ کی نظر میں	صدق جدید، ص ۲، ۱۱ر نومبر
علی، ڈاکٹر اشفاق	بھوپال کی کہانی	نوائے سیفیہ، ص ۱۰،
علی، ڈاکٹر جواد		
نثار احمد فاروقی (مترجم)	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۱۹۷ تا ۲۰۳، نومبر
فاروقی، ضیاء الحسن	یونانی تہذیب کا پھیلاؤ	جامعہ، ص ۲۲۷ تا ۲۳۸، "
قادری، نور احمد	پاکستان اور انڈونیشیا	انجام، ص ۵، ۵ر نومبر
قدوسی، ارشاد الحق	اشاعت اسلام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا حصہ	" " ۱۰۰۳، ۵ر "
قطب الدین، ڈاکٹر محمد	دریائے نیل (۱۳) (افریقی کی کہانی)	العلم، ص ۵۷ تا ۶۹، جولائی تا ستمبر
کاظمی، سید غلام حسین شاہ	چترال کے حکمراں خاندان (قسط سوم)	" " ۱۷ تا ۲۸، " "
کرٹن، ایڈورڈ	کیمونزم کے انچاس برس	تحریک، ص ۱۱ تا ۱۲، نومبر
گزدر، ایم ڈبلیو	خلیفہ کے تعلقات مسلمانوں سے	ثقافت، ص ۴۶ تا ۵۶، "
لطیف احمد خاں	انڈونیشیا	حریت، ص ۱۰، ۵ر "
مسعود، اقبال	بھوپال کی کچھ یادیں	نوائے سیفیہ، ص ۱۹ تا ۲۰،

متل، گوپال	اسلام کے تئیں سوویٹ روس کا مصالحانہ رویہ	تحریک، ص ۲۲ تا ۲۳، نومبر
ماہر القادری	صحابہ کرامؓ اور مولانا مودودی[۱]	شہاب، ص ۸ تا ۹، ۳۰ر اکتوبر
ملک، منظور	ہماری خارجہ پالیسی	فکر و خیال، ص ۲۳ تا ۳۴، اکتوبر نومبر
مہر، مولانا غلام رسول	عالمگیر اعظم کی سیرت	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱+۱۴، ۴ر نومبر
نجیب آبادی، مولانا اکبر شاہ	خلافت عثمانی پر ایک نظر	آئین، ص ۲، ۲۲ر نومبر
ندوی، ساجد علی	شبلی اور بھوپال	نوائے سیفیہ، ص ۲۷ تا ۲۸،
یزدانی، خواجہ عبد الحمید	ملا بدایونی اور فیض	کارواں، ص ۳۰ تا ۳۴، اکتوبر نومبر
	اوچ شریف	لاہور، ص ۶ تا ۷، ۱۲ر نومبر
	سجاح بنت حارث (ایک مدعیہ نبوت)	المنبر، ص ۲۵ تا ۲۹، ۲۸ر اکتوبر
	لندن میں قائد اعظم کے شب و روز	گل خنداں، ص ۷ تا ۹، اکتوبر

تعلیم

اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو	مجوزہ اقامتی اردو کالج (کراچی)	قومی زبان، ص ۳ تا ۵، نومبر
اعظمی، عبد اللطیف	یوم تاسیس اور کانووکیشن کے جلسے (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)	جامعہ، ص ۲۸۰، نومبر
بختیاری، پروفیسر قیصر حسین خاں	تعلیم کے میدان میں پاکستان کی تیز رفتار ترقی	فکر و خیال، ص ۱۷ تا ۱۹، اکتوبر نومبر
چودھری، پروفیسر عبد الغفور	استاد اور اس کے مسائل	تہذیب الاخلاق، ص اکتوبر
”	اسلامی نظام کا پہلا ضابطہ تعلیم	ثقافت، ص ۱۹ تا ۵۴، نومبر
خاں، خالد یار	سائنس کا چیلنج اور تعلیم	فکر و خیال، ص ۲۵ تا ۳۰، اکتوبر نومبر
رسولپوری مبارکپوری، مولانا احمد حسینؒ	التحصیل والتکمیل (تعلیم و تدریس کے موضوع پر ایک مستقل کتاب جس کی اشاعت بالاقساط ہو گی)	البلاغ، ص ۱۳ تا ۲۱، نومبر
عبد اللہ، ڈاکٹر سید	کچھ نظام تعلیم کے بارے میں	قومی زبان، ص ۲۳ تا ۳۰، ”
فاروقی، ڈاکٹر احسن	تعلیم خود بینی نہیں جہاں بینی ہے۔	نگار پاکستان، ص ۱۰ تا ۱۳، ”

---

[۱] اس سلسلے کی دیگر اقساط ۶ تا ۲۰ر نومبر کے شماروں میں دیکھیے۔

قطب الدین، ڈاکٹر محمد	جمہوریہ سوڈان میں تعلیم	العلم، ص ۷۰ تا ۸۷، جولائی ستمبر
کشفی، سید ابوالخیر	ہمارا نظام تعلیم اور فکری وعملی آزادی	نگار پاکستان، ص ۳۹ تا ۵۴، اکتوبر
مجیب، پروفیسر محمد	جامعہ کی رپورٹ	جامعہ، ص ۲۳۹ تا ۲۴۴، نومبر
سیفیہ ــــ ایک عظیم درس گاہ (بھوپال)		نوائے سیفیہ، ص ۳۳،

تہذیب و تمدن

امین، مولانا محمد تقی	ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت	خاتون پاکستان، ص ۷ تا ۴۴، اکتوبر نومبر
درانی، عبدالصمد	بلوچ شادی اور اس کی رسومات	〃　〃　〃 ۴۹ تا ۵۱، 〃 〃
نجیب آبادی، مولوی حمید اللہ خاں	خود غرضی اور ہمارا معاشرہ	العلم، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴، جولائی تا ستمبر

خود نوشت

ادیب، صفدر	میرے بچپن کا مطالعہ (ابتدائی مطالعے سے متعلق مشاہیر لاہور سے چند سوالات اور ان کے جوابات)	کتاب، ص ۱۲ تا ۱۸، نومبر
غلام احمد، مرزا	مرزا غلام احمد کی کہانی	المنبر، ص ۸ تا ۱۰، ۲۵ مئی
〃	مرزا غلام احمد کی کہانی ان کی زبانی	〃 〃 ۱۱ تا ۱۴، ۲۸ اکتوبر
ناظر کاکوروی، مشیر احمد علوی	آشفتہ سیری میری (خود نوشت)	العلم، ص ۷۹ تا ۸۲، جولائی تا ستمبر

شخصیات

اقبال

حسن خاں، ممنون	اقبال بھوپال میں	نوائے سیفیہ، ص ۱۳ تا ۲۰،
عطا، شاہ حسن	اقبال کا سرسید احمد خاں سے انفعال	تہذیب الاخلاق، ص ۶ تا ۱۶، نومبر
یوسف، ڈاکٹر سید محمد	علم و عشق اقبال کی نظر میں	نگار پاکستان، ص ۱۴ تا ۲۷، 〃

غالب

حسین، مختار	غالب کا فکری کارنامہ	افکار، ص ۶۹ تا ۸۰، اکتوبر نومبر

سحر، ڈاکٹر ابو محمد	غالب سے منسوب ایک شعر	ہماری زبان، ص ۸، ۲۲ر نومبر
سرور، آل احمد	دیوان غالب	کتابی دنیا، ص ۹ تا ۱۲، نومبر
صدیقی، آنسہ نصیر انور	یہ ترا بیان غالب	گل خنداں، ص ۲ تا ۸، اگست ستمبر
فاضل، مرتضیٰ حسین	دیوان غالب کی نادر شرح	قومی زبان، ص ۳۱ تا ۴۴، نومبر
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی	نگار پاکستان، ص ۸۲ تا ۹۳، نوم
کمل، کاملہ حمید	غالب اور فلسفہ زندگی	خاتون دکن، ص ۳۲ تا ۲۷، اکتوبر
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق	غالب دل گداختہ	کارواں، ص ۹ تا ۱۵، اکتوبر نومبر
مصطفیٰ، محمد	غالب کے بعض اشعار	نگار پاکستان، ص ۴۰ تا ۴۳، نومبر

دیگر شخصیات

ابراہیم، محمد	مولانا شاہ ابوالحسن ادیب	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۲۲ر نومبر
ابوالجلال ندوی	حضرت مریم علیہا السلام	خاتون پاکستان، ص ۲۴ تا ۲۵، اکتو
ارشد، رشید احمد	مصر کے مشہور افسانہ نگار	نگار پاکستان، ص ۴۴ تا ۴۹، نومبر
ارشد، عبدالحمید	تابش الوری — ایک انسان ایک فنکار	کارواں، ص ۲ تا ۸، اکتوبر نومبر
اسلام شاہ، سید محمد	شاد امرتسری	چٹان، ص ۷ ۰ ۱۸، ۷ر نومبر
اسمٰعیل، حافظ محمد	حافظ خلف بن سالم — قرون اولیٰ کا ایک جلیل القدر سندھی محدث	الرحیم، ص ۴۳۴ تا ۸۳۴، نومبر
اطہر مبارکپوری، قاضی	خانوادہ حضرت شاہ کرم دیوان لہراوی	البلاغ، ص ۹۳ تا ۲۴، "
اظہر، ظہور احمد	توفیق الحکم — مصر کا عظیم ڈرامہ نگار	تہذیب الاخلاق، ص ۱۷ تا ۳۷، اکـ
اعظمی، عبداللطیف	وہ ادیب جن کا ستمبر میں انتقال ہوا	صبح، ص ۷ تا ۳۲، اکتوبر
افسر امروہوی	خیام الہند حیدر دہلوی	قومی زبان، ص ۷ تا ۱۲، نومبر
" "	" " [1]	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۸ر نومبر
اقبال، محمد	سلطان ٹیپو	گل خنداں، ص ۴ تا ۵، اگست ستمبر

---

[1] قومی زبان کراچی سے نقل کیا گیا۔

حسن البنا شہیدؒ

مصنف	عنوان	ماخذ
معروف شاہ شیرازی (مترجم)	مذاکرات حسن البنا — ڈائری کے چند اوراق	چراغ راہ، ص ۱۰ تا ۱۷، اکتوبر، نومبر
الحسینی، سید نفیس	حضرت خواجہ گیسو درازؒ	چٹان، ص ۵ تا ۱۴ + ۱۸، ۷ر نومبر
"	سیرت خواجہ گیسو درازؒ	" " ۱۵، ۱۴ر نومبر
انجم اعظمی	مومن کا عشق اور رنگ تغزل	افکار، ص ۹۰، اکتوبر نومبر
انصاری، ماسٹر تاج الدین	مولانا ابوالحسنات قادری اور اتحاد اسلامی	انجام، ص ۷، ۲۶ر نومبر
ایوبی، محمد الدین	حضرت ابوبکر صدیقؓ	چراغ راہ، ص ۲۷ تا ۳۸، اکتوبر نومبر
آروی، شمس تبریز خاں	ابن دقیق العید	معارف، ص ۳۴۷ تا ۳۶۴، نومبر
باری، سلطان	میکسم گورکی	منشور، ص ۱۷ تا ۲۵، نومبر
بدر منیر، محمد	الماس رقم (محمد صدیق سے انٹرویو)	کتاب، ص ۲۵ تا ۳۰، "
بریلوی، سید الطاف علی	ایک بہادر دوست — ارتضیٰ حسن	العلم، ص ۱۰۰ تا ۱۱۵، جولائی تا ستمبر
"	نقصان عظیم — مولوی محمد عظیم الدین	" " زائد ورق " "
بریلوی، شفیق	بی اماں	خاتون دکن، ص ۲۷ تا ۲۸، اکتوبر نومبر
بلوچ، عبدالعزیز	آغا شورش کاشمیری	چٹان، ص ۴ + ۱۲، ۲۸ر نومبر
جان، ایم	شمس العلماء، ڈاکٹر سید علی بلگرامی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۹ تا ۱۵، اکتوبر
جعفری، رئیس احمد	مولانا شوکت علی	انجام، ص ۷، ۲۹ر نومبر
چشتی، مولانا محمد عبدالعلیم	تذکرہ حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی	الرحیم، ص ۴۳۹ تا ۴۵۶، نومبر
حسن، سید موسیٰ	جابر بن حیان	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۱۹ تا ۱۲۲، "
حسنی، یونس	سراج میر خاں سحر	نوائے سیفیہ، ص ۲۹ تا ۳۰، "
حیدری، اظہار	خیام الہند حیدر دہلوی	حریت، ص ۳، ۲۸ر نومبر
خلیل، محمد انور	آئن اسٹائن	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۶ تا ۲۸، نومبر
خلیل، وقار	یوم زور (ڈاکٹر محی الدین قادری)	سب رس، ص ۲۹ تا ۳۶، اکتوبر
زہرہ بلگرامی	رانی جودھا بائی	جنگ، ص ۳، ۱۲ر نومبر
زیدی، سید رضا حسین	ایم ۔ ایف ۔ حسین	صبح، ص ۲۵ تا ۲۸، اکتوبر
ساجد، اعتبار	ایاز صدیقی	قندیل، ص ۸، ۳۰ر اکتوبر

شہابی، انتظام اللہ	مشاہیر اولیا، ہند و پاکستان	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶۵ تا ۸۰، اکتوبر
صدیقی، آفاق	وادی مہران کا ایک ماہر تعلیم (میاں حسن علی)	فکر و خیال، ص ۲۳ تا ۲۵، ستمبر
عابدی، ڈاکٹر امیر حسن	دیوان شریف کا	سب رس، ص ۳ تا ۷، نومبر
"	ثنائی مشہدی	معارف، ص ۳۸۲ تا ۳۹۱، نومبر
عبدالکبیر، محمد	مولوی سعد اللہ لدھیانوی	المنبر، ص ۲۱ تا ۲۳، ۲۵ر نومبر
عبدالواحد، ابوظفر	نئی شاعری کا نقیب حالی	خاتون دکن، ص ۲۰ تا ۲۲، اکتوبر، نومبر
عرفان، ایم	مولانا برکت اللہ بھوپالی	العلم، ص ۴۰ تا ۴۹، جولائی تا ستمبر
علی، خالد	شوکت علی	حریت، ص ۴، ۲۸ر نومبر
علی خاں، میر	جذب عالم پوری	سب رس، ص ۸ تا ۱۶، "
عمر خاں، ڈاکٹر غلام	ڈاکٹر زور	" " ۲۱ تا ۲۲، اکتوبر
غفور روف، پروفیسر بی۔ جی	نہرو اور ان کی شخصیت	جامعہ، ص ۲۴۵ تا ۲۵۳، نومبر
فاروقی، ضیاء الحسن	علامہ شبلی، بہ حیثیت مورخ [1]	نگار پاکستان، ص ۲۴ تا ۳۴، اکتوبر
قریشی، فضل حق	نیاز فتح پوری	" " ۱۵ تا ۳۲، "
کوثر، حمید	میجر محمد طفیل شہید	ساقی، ص ۴۴ تا ۴۸، نومبر
کھنہ، بھارت چند	ڈاکٹر زور	سب رس، ص ۸ تا ۱۰، اکتوبر
محب، احسن	پروفیسر مظفر حسین رزمی	قندیل، ص ۲، ۱۳ر نومبر
مسیح الزماں، پروفیسر	دکن کا ایک قدیم مرثیہ گو — مرزا	تہذیب الاخلاق، ص ۹ تا ۱۶، اکتوبر
معظم، ڈاکٹر انور	سید محی الدین قادری زور کی اہم شخصیت	سب رس، ص ۱۷ تا ۲۰، اکتوبر
ملا، پنڈت آنند نرائن	خواجہ حیدر علی آتش	فروغ اردو، ص ۵ تا ۱۲، نومبر
نادم، سیتاپوری	آہ نیاز فتح پوری	نگار پاکستان، ص ۷ تا ۹، "
ناز، ایس ایم	حافظ مولانا ابو الحسنات	قندیل، ص ۲ تا ۳، ۲۰ر "
نجید، حمید اصغر	مولانا ظفر علی خاں	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۲، ۲۸ر "
"	حضرت امام شافعی	" " ۱۳، ۱۴ر "

[1] ماہنامہ جامعہ دہلی سے نقل کیا گیا۔

نظامی، سراج	مولانا ظفر علی خاں	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۳ تا ۱۹، نومبر
نظامی، عابد	ملا واحدی	قندیل، ص ۹ تا ۲۲، ۷ر "
ودیا لنکار، ونشی دھر	ڈاکٹر زور اردو کے عظیم خدمت گزار	سب رس، ص ۲۲ تا ۲۵، اکتوبر
یونس، محمد	حکیم مومن خاں مومن	خاتون دکن، ص ۲۶ تا ۲۹، اکتوبر نومبر
———	سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ	عارف، ص ۱۱ تا ۱۵، نومبر
———	مولانا شوکت علی	جنگ، ص ۱۰، ۸ر "
———	میجر حبیب شہید	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۹۹ تا ۱۰۵، نومبر

صحافت

اثر، اخلاق	عمدۃ الاخبار، بھوپال	نوائے سفینہ، ص ۳۱ تا ۳۳
بیدار، ڈاکٹر عابد رضا	رسالہ تعلیم و تربیت علی گڑھ	صبح، ص ۴۰ تا ۴۴، اکتوبر
خاں، جی۔ ایم	"ہندوستانی ادب" ستائیسویں سال میں	ہندوستانی ادب، ص ۲ تا ۸، اکتوبر نومبر
وشال، بدری	ہندی کی ادبی صحافت	صبا، ص ۳۲ تا ۴۴، اگست ستمبر
	برطانیہ میں صحافت	جنگ، ص ۲ و ۱۱، ۵ر نومبر

کتابیات و کتب خانے

ابو سلمان، شاہجہانپوری	نئے خزانے (اپریل ۷۶ء کے رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۸۱ تا ۹۵، نومبر
انیس خورشید	قومی تعمیر و ترقی میں لائبریری کی اہمیت	کتابی دنیا، ص ۲ تا ۸ و ۴۴، "
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	" " ۴۲ تا ۴۷، "
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا (معارف کے مضامین کا اشاریہ)	برہان، ص ۲۰۵ تا ۲۱۵، نومبر
خالدہ شیخ	لائبریریاں	قندیل، ص ۱۹، ۳۰ر اکتوبر
شفیع عقیل	بچوں کے لئے علیحدہ لائبریریوں کی ضرورت	جنگ، ص ۹، ۱۴ر نومبر
عارف خاں	مشرق اور مغرب کے کتب خانے	انجام، ص ۷، ۷ر "
مرزا، سخاوت	نوادرات کتب خانہ سالار جنگ بہادر	العلم، ص ۲۹ تا ۳۳، جولائی تا ستمبر

مذہبیات

تفسیر قرآن مجید

اصلاحی، امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران (۱۱)	میثاق، ص ۲۹ تا ۴۳، نومبر
" "	مقدمہ (تفسیر قرآن)	" " ۱۹ تا ۲۲، "
" "	نجات کی راہ ــــ سورہ والعصر کی روشنی میں	" " ۷ تا ۱۸، "
الحسینی، قاضی محمد زاہد		
محمد عثمان غنی (مرتب)	درس قرآن[1]	خدام الدین، ص ۷ تا ۱۳، ۲۸ اکتوبر
آزاد، مولانا ابوالکلام	قرآن فہمی کے اہم اصول	المنبر، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۱ نومبر
تھانوی، مولانا احتشام الحق	درس قرآن ــ سورہ بقرہ[2]	جنگ، ص ۵، ۵ نومبر
دریا بادی، مولانا عبدالماجد	سورہ ملک (۱)[3]	صدق جدید، ص ۵، ۲۸ نومبر
نقی، علامہ علی	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، نومبر

سیرت و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

الاصفہانی، حافظ ابوالشیخ		
محمد احمد (مترجم)	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۷ تا ۱۵، نومبر
فاران، ابوطاہر	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم	لاہور، ص ۵، ۷ نومبر
مختار دہلوی، محمد حبیب اللہ	سنت نبویہ اور قرآن کریم	بینات، ص ۸ تا ۳۲، "

مسائل و مباحث

اسد، علامہ محمد	اسلامی حکومت اور اقتصادی تحفظ	نصرت، ص ۱۱۱ تا ۱۲۰، ستمبر اکتوبر

---

[1] درس قرآن کا مستقل سلسلہ خدام الدین کے ہر شمارے میں دیکھیے

[2] درس قرآن کا مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں

[3] بقیہ اقساط ۴، ۹ و ۱۱ نومبر کے شماروں میں دیکھیے۔

مصنف	عنوان	ماخذ
احمد شیخ افتخار		
بشیر ساجد (مترجم)	اسلام، سرمایہ داری یا سوشلزم	نصرت، ص ۱۷۷ تا ۲۱۶، ستمبر اکتوبر
اصلاحی، مولانا امین احسن	قرآنی زندگی کے خدوخال	المنبر، ص ۴ تا ۶، ۱۱ر نومبر
اطہر مبارکپوری، قاضی	اسلام اور عیسائیت	البلاغ، ص ۲۲ تا ۳۳، نومبر
افغانی، مولانا شمس الحق	فلسفہ معراج رسولؐ	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۳ر "
امام الدین رام نگری، حافظ	مصباح العمل کا تحقیقی جائزہ (۲)	تجلی، ص ۵۷ تا ۸۰، نومبر
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۱۸۶ تا ۱۹۶، "
انور، مولانا عبید اللہ		
خالد سلیم (مرتب)	بہترین آدمی .... (اور) .... بہترین عمل	خدام الدین، ص ۱۸۰۴، ۱۸ر نومبر
انور، مولانا عبید اللہ		
خالد سلیم (مرتب)	تحفہ معراج	" " ۱۸۰۴، ۵ر "
انور، مولانا عبید اللہ	شکر اور ایمان	" " ۵ تا ۶، ۲۵ر "
" "	صبر اور ایمان	" " ۵، ۲۸ر "
بشارت علی، ڈاکٹر ایم		
محمد حسین زیدی (مترجم)	واردات مذہب	تہذیب الاخلاق، ص ۲۸ تا ۵۴، نومبر
بلوچ، فقیر بخش	اسلام کا معاشی نظام	نصرت، ص ۱۲۹ تا ۱۵۲، ستمبر اکتوبر
پرویز، غلام	ظلم کا انجام	طلوع اسلام، ص ۱۷ تا ۲۰، نومبر
" غلام احمد	اسلامک سوشلزم	نصرت، ص ۷۶ تا ۹۷، ستمبر اکتوبر
پھلواروی، مولانا شاہ محمد جعفر	ملکیت زمین	" " ۱۲۱ تا ۱۲۸، " "
حنیف رامے	اسلامی سوشلزم	" " (ابتدائی ۱۲ صفحات) "
تھانوی، مولانا احتشام الحق	نماز میں آمین	الارشاد جدید، ص ۶۳ تا ۶۷، ۱۴ اگست تا ۴ ستمبر
حبیب اللہ، صاحبزادہ	اسلام اور کمیونزم	خدام الدین، ص ۱۰ تا ۱۱ و ۱۴، ۲۸ر اکتوبر
حنیف ندوی، محمد	نظریہ توحید اور اقدار حیات	ثقافت، ص ۵ تا ۱۸، نومبر
خالد، ایم یعقوب	اسلامی قوانین میں اجماع کی اہمیت	انجام، ص ۲، ۱۹ر نومبر
خیری، ڈاکٹر احمد	خدا ہندوستانی کلچر میں	زندگی، ص ۴۹ تا ۵۱، "

سرور، پروفیسر محمد	شاہ ولی اللہؒ اور اسلامی سوشلزم	نصرت، ص ۱۶۵ تا ۱۷۲، ستمبر اکتوبر
سعید الرحمان، حافظ	کیا موت کے بعد دوسری زندگی ممکن ہے؟	الارشاد جدید، ص ۸۳ تا ۹۴، ۳۱ اگست یکم ستمبر
سومار، عبدالکریم	اسلام سوشلزم کے سہارے کا محتاج نہیں	نصرت، ص ۵۰ تا ۵۸، ستمبر اکتوبر
شاہ، نظر علی	معاشی نظام اسلام کے آئینے میں	" " ۱۵۳ تا ۱۶۴، " "
شیرازی، حکیم آزاد	شاہ ولی اللہؒ اور اسلامی سوشلزم	" " ۱۷۲ تا ۱۷۶، " "
صدیقی	اسلامی سوشلزم	" " ۷۴ تا ۷۸، " "
صدیقی، نجات اللہ	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	زندگی، ص ۱۷ تا ۳۹، نومبر
صدیقی، نعیم	اسلام کا معاشی نظام ... اور ہمارے مسائل (ایک تقریر)	آئین، ص ۱۷، ۲۶ نومبر
ظفر حسن امروہوی، سید	پردہ	پیام عمل، ص ۱۶ تا ۱۹، "
عثمان، پروفیسر محمد	اسلامی سوشلزم	نصرت، ص ۹۸ تا ۱۱۰، ستمبر اکتوبر
متعدد اشخاص و اخبارات[1]	اسلامی سوشلزم ــــ ایک قومی بحث	" " ۹ تا ۴۹، " "
مسعود، خالد	زکوٰۃ کی حقیقت	میثاق، ص ۳۷ تا ۴۲، نومبر
معشوق یار جنگ	تصوف واہل تصوف	تہذیب الاخلاق، ص ۴۹ تا ۵۶، اکتوبر
معصومی، محمد صغیر حسن	بیسویں صدی میں اسلام	الرحیم، ص ۴۶۸ تا ۴۷۲، نومبر
مہر، مولانا غلام رسول	اسلام اور اسلامی سوشلزم	نصرت، ص ۵۱ تا ۵۶، ستمبر اکتوبر
میر، محمد صفدر	اسلام اور اشتراکیت	" " ۶۹ تا ۷۹، " "
ندوی، مولانا تقی الدین	امام اعظم ابوحنیفہؒ اور علم حدیث	الرحیم، ص ۴۵۷ تا ۴۶۷، نومبر
نیونبی، ڈاکٹر محمد	امام غزالیؒ اور ان کا نظریہ توحید	برہان، ص ۱۶۱ تا ۱۸۵، "
ہالی پوتر، ڈاکٹر عبدالواحد		
سید محمد سعید (مترجم)	شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ ـ حصہ اول ـ (مبادیات اخلاقیات)	الرحیم، ص ۳۲۴ تا ۳۳۴، نومبر

---

[1] عبدالکریم سومار، عبداللہ حر، نظر علی شاہ، راشد چودھری، میاں لیٰسین خاں وٹو، اکبر علی، چودھری محمد احسن، الیس ملک حسنی، ایم ایچ حکیم، احسان علی شاہ، حکیم آزاد شیرازی اور دیگر حضرات نیز روزنامہ حریت کراچی اور کوہستان لاہور

یوسف، محمد	زکوٰۃ اور ٹیکس	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۶، ۲۲ اکتوبر

مکاتیب

شبلی، نعمانی	مکتوب بنام پروفیسر نواب علی	افکار، ص ۱۸ تا ۲۲، اکتوبر نومبر
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی	مکتوب بنام ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	" " ۲۳ تا ۲۸، " "
مجاز، اسرار الحق	مکتوب بنام ایس ایم مستقیم	" " ۱۹ تا ۲۳، " "
نواب علی، پروفیسر سید	مکتوب بنام مولانا ابوالکلام آزاد	" " " ۲۹، " "

انجمن کی چند زیر طبع کتابیں

تذکرہ ہمیشہ بہار	تصنیف :- کشن چند اخلاص	ترتیب :- ڈاکٹر وحید قریشی
تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار	" نصر اللہ خویشگی	" ڈاکٹر اسلم فرخی
تذکرہ عروس الاذکار	" نصیر الدین نقش	" افسر امروہوی
مقامات ناصری	" میرزا ناصر علی مرحوم	" انصار ناصری
کندمالا (ڈرامہ)	" ون نگا اچاریہ	ترجمہ :- صمدانی نقوی
شمالی ہند کی نثری داستانیں	" ڈاکٹر گیان چند	
شمالی ہند کی منظوم داستانیں	" ڈاکٹر فرمان فتح پوری	
سلطان باہو کا کلام	" سلطان باہو	ترجمہ :- عبدالمجید بھٹی
روسی مسلمانوں کی تاریخ	" مزمل لیلین	
اردو لٹریچر (جلد چہارم)	" ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	
فارسی زبان و ادب	(رسالہ اردو کے مضامین کا انتخاب)	ترتیب :- پیر حسام الدین راشدی
انجمن کے فارسی و عربی مخطوطات	(اجمالی فہرست)	" سرفراز علی رضوی
مخطوطات انجمن (جلد دوم)	(اردو مخطوطات کی توضیحی فہرست)	" افسر امروہوی

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

خاص ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لئے اس کی جامعیت، اور افادیت کو درجۂ استناد حاصل ہے۔

اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔

انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی محاورے یا روزمرہ سے اردو محاورہ یا روزمرہ، انگریزی مثل کے لئے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔

انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر ڈال دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آسکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دیکر واضح کیا گیا ہے۔

باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلے درجے کے بائیبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لئے اپنا نسخہ

جلد از جلد حاصل کرلیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف